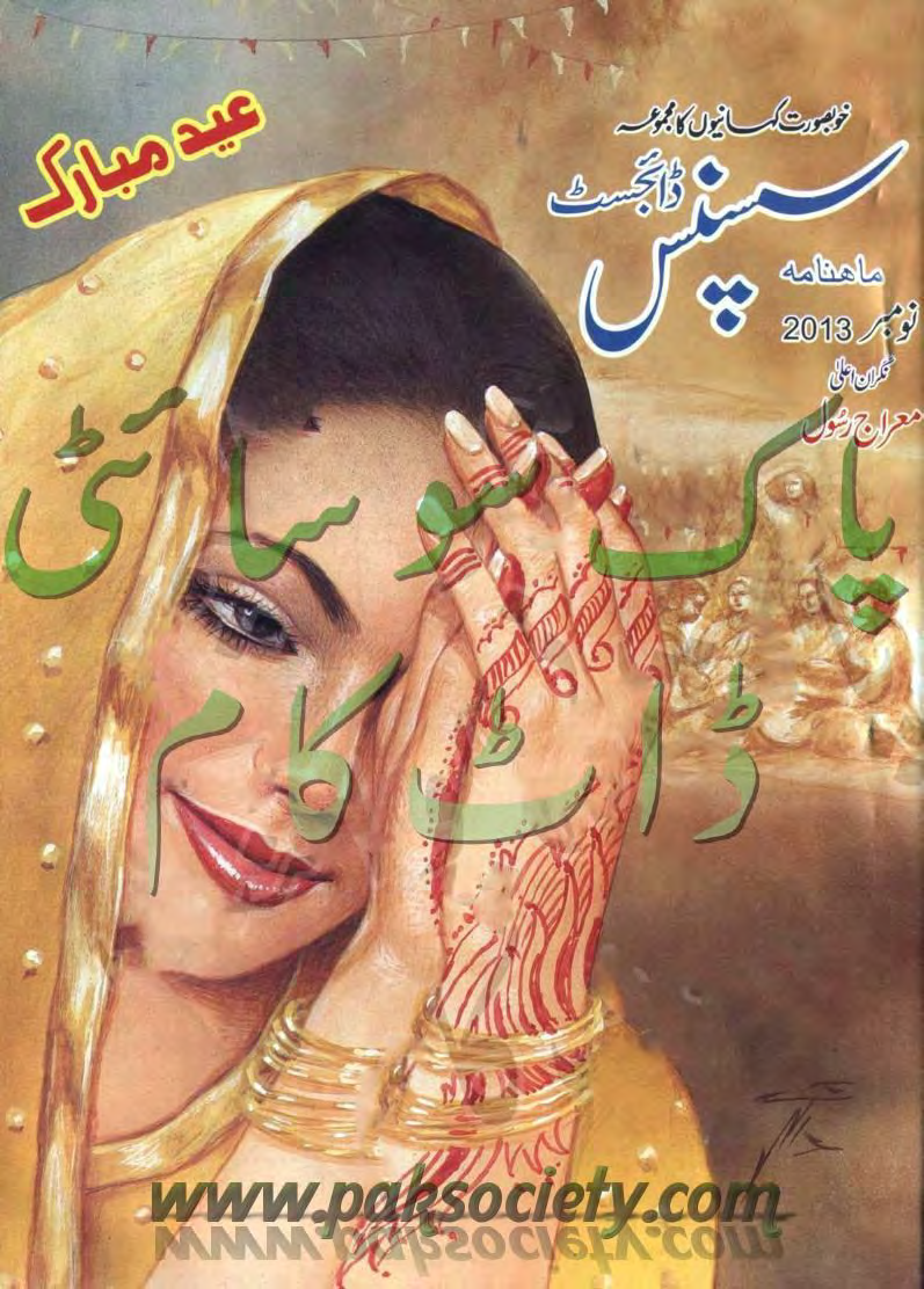

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ
نومبر 2013
نگران اعلیٰ
معراج رسول
عید مبارک
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com

انشائیہ — جون ایلیا — 7
پاکستان کے اولین مسائل میں سے ایک پر صاحب دانش و بینش کا تبصرہ

آپ کے خط — مدیر اعلیٰ — 8
سسپنس کی مجلس مشاورت و قارئین کی تلخ و شیریں باتیں، گلے شکوے اور پرخلوص مشورے

یہ دشت ہے ٹھگوں کا — الیاس سیتاپوری — 16
ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

سوچ کی نسل — کاشف زبیر — 65
مختلف تہذیبوں اور روایات کی دلچسپ اور انوکھی معلوماتی تحریر

کشکول — انوار صدیقی — 84
اسرار اور تحیر کے پردے میں لپٹا ایک منفرد طویل سلسلہ

تصویر کی گواہی — امجد رئیس — 117
مجرم کی چالاکی اور ایک عاشق کی تفتیش کا دلچسپ ماجرا

بازی گر — مرزا امجد بیگ — 124
محبتوں کا سودا کرنے والے ایک بازی گر کا قصہ...... بیگ صاحب کا دلچسپ انداز

آلودگی — ڈاکٹر شیر شاہ سید — 149
گھر سے بے گھر اور بے حال ہونے والے لوگوں کا عبرت اثر احوال

سسپنس ڈائجسٹ

محفل شعر و سخن — قارئین — 156
آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ آپ کی پسند، آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

مرغا — شوکت علی ظفر — 159
"مال مفت دل بے رحم" کی عملی تفسیر... دو شکاریوں کی دلچسپ تصادم

مسافر — ناصر ملک — 162
گل و گلزار سے راہ پرخار تک ایک مسافر بے نوا کی روداد حیات

ایماندار — ثمر عباس — 207
غفلت سے بند آنکھوں کو کھولنے کا ایک کامیاب نسخہ

تلاش — تنویر ریاض — 209
دل کی سرگوشیوں کو نظرانداز کرنے والے کم ہمت عاشق کا احوال

محیط عالم — ضیا تسنیم بلگرامی — 219
اللہ کے برگزیدہ بندوں کی عبادت ریاضت اور عشق حقیقی کا سحر انگیز احوال

کلید نجات — نشور ہادی — 234
خوب صورت رشتوں کی آزمائش اور مہکتے جذبوں کا عجیب سنگم... زندگی کے معنی بدلنے والی اچھوتی داستان

کترنیں — ادارہ — 000
دنیا بھر سے ادھر ادھر سے لطیفے، چٹکلے اقتباسات، مسکراہٹیں اور قہقہے سب کچھ آپ کے لیے

جلد 43 • شمارہ 11 نومبر 2013 • زرسالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313(021) فیکس 35802551(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکسٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

انشائیہ

جون ایلیا

بنیادی مسئلہ

جس ملک کی تہتر فیصدی یا غالباً اس سے بھی کچھ زیادہ آبادی کے پاس رہنے کو گھر، پہننے کو کپڑا اور کھانے کو روٹی نہ ہو، کیا اس ملک کے چند افراد کو تمام عیاشیوں کا حق دیا جاسکتا ہے؟ اس سلسلے میں نہ کسی بحث کی گنجائش ہے اور نہ کسی سیاسی نظریے یا سماجی فلسفے کا حوالہ دینے کی ضرورت، یہ تو ایک بالکل صاف اور سادہ سی بات ہے۔ اس ملک کو آزاد کرانے میں قوم کے ہر طبقے نے حصہ لیا تھا۔ پاکستان پوری قوم کی قربانیوں اور کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اسے بھی چھوڑیے، اس بات کا جواب دیجیے کہ وہ کون سی منطق اور کون سا نظام اخلاق ہے جس کے پیش نظر چند بے ضمیر، موقع پرست اور قابو یافتہ افراد نے پوری قوم کو لوٹنے اور کھسوٹنے کا حق پالیا ہے اور سماج میں ان...... تباہ کن اور ہلاکت آفریں رجحانات کو فروغ دینے کی اجازت حاصل کرلی ہے جن کی موجودگی میں ایک شریف، صحت مند اور باضمیر سماج کے قیام کا تصور دیوانے کے خواب سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

یہ دور پاکستان کی زندگی کا بڑا نازک دور ہے۔ اگر اس دور میں سماج کی منفی قدروں کو استحکام حاصل ہو گیا تو یہ ملک نفسیاتی، اخلاقی، تہذیبی اور سیاسی اعتبار سے دیوالیا ہو کر رہ جائے گا اور پھر اس کا ازالہ کسی طرح بھی ممکن نہ ہو سکے گا لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ قوم کے بااثر طبقے نے ان زہرناک اور ہلاکت خیز قدروں کو سماجی زندگی میں بنیادی حیثیت دے دی ہے۔ یہاں تک کہ اب ان قدروں کو حوالے کے طور پر پیش کیا جانے لگا ہے۔ چنانچہ آج پاکستان میں امیر اور غریب جیسے شرمناک الفاظ گفتگو میں بار بار استعمال کیے جاتے ہیں اور گویا اخلاقی اور سماجی طور پر اس بات کو تسلیم کرلیا گیا ہے کہ پاکستان میں دو قومیں آباد ہیں، ایک غریب اور ایک امیر۔ ایک کرسی نشین اور ایک خیمہ بردار۔ وہ قوم جو زندگی کا کوئی اعلیٰ تصور نہ رکھتی ہو، جو شرمناک جہالت اور المناک غربت میں مبتلا ہو، اس کے حق میں بااثر طبقے کا یہ اندازِ نظر اور طرزِ عمل نفسیاتی طور پر جس قدر مہلک ثابت ہوگا، اس کا تصور مشکل نہیں۔ آج ہمارے ملک میں امیر سے امیر ترین بننے کی جو دوڑ ہو رہی ہے، اس نے پوری قوم کے دماغ کو ماؤف اور ذہن کو خراب کردیا ہے، جو لوگ ملک کی ذہنی تعمیر و ترقی سے دلچسپی رکھتے ہیں، جنہیں اس قوم کے مستقبل سے ذرا بھی ہمدردی ہے انہیں اس صورتِ حال کے خلاف سخت احتجاج کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں اہلِ قلم کا فرض ہے کہ وہ اعلیٰ سماجی تصورات اور اقدار کو فروغ دینے کی کوشش کریں لیکن وہ تو اپنا یہ فرض پہلے ہی سے انجام دے رہے ہیں۔ قوم میں یہی تو ایک طبقہ ہے جس نے اپنے فرائض کو کبھی فراموش نہیں کیا، جس نے اس ملک میں آج تک صرف فرائض کی زندگی گزاری ہے۔

کسی اعلیٰ تصورِ حیات اور سماجی نصب العین کے بغیر کوئی قوم ترقی نہیں کرسکتی لہٰذا اس سلسلے میں قوم کے ذمہ دار افراد کو سب سے پہلے جو کام کرنا ہے وہ یہ ہے کہ افلاس اور جہالت کے خلاف ایک ہمہ گیر اور طاقتور مہم شروع کی جائے کیونکہ ہم اس وقت معاشی پستی، سماجی زبوں حالی اور تعلیمی پسماندگی کی جس منزل میں ہیں، وہاں کوئی اعلیٰ تصورِ حیات اور کوئی بلند نصب العین ہمارے درد کا درماں نہیں بن سکتا۔ تعمیر و ترقی کا سفر اسی وقت شروع ہو سکتا ہے جب ہم موجودہ منزل سے کافی دور نکل جائیں، یہ ہے وہ بنیادی مسئلہ جس پر ہمارے اربابِ اقتدار کو سوچنا اور عمل کرنا ہے۔ ورنہ خوش آئند باتیں کرتے رہنا ایک دلچسپ مشغلہ سہی لیکن ایک ہوشمندانہ اور نتیجہ خیز طریق کار ہرگز نہیں۔ قوم کو شاندار کوٹھیوں اور قیمتی کاروں کی کوئی ضرورت نہیں، اسے اسکولوں، کالجوں، تربیت گاہوں، شفاخانوں، لہلہاتے کھیتوں اور کارخانوں کی ضرورت ہے۔ ہمیں اس انداز میں سوچنا ہے۔ سوچنا ہی نہیں، عمل کرنا ہے کہ ان مسئلوں کے سامنے باقی تمام مسئلے ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

آپ کے خط

عزیز قارئین

السلام علیکم!

نومبر 2013ء کا دلچسپ شمارہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ امید ہے کہ عید قرباں کے موقع پر آپ نے نہ صرف خوب مزے کیے ہوں گے بلکہ اپنے آس پاس ضرورت مندوں کو بھی عید کی خوشیوں میں شریک کیا ہوگا...... بے شک عیدالاضحیٰ ہمیں سنتِ ابراہیمیؑ کی پیروی کی تلقین کرتی ہے جب مسلمانانِ عالم حج بیت اللہ کے لیے ایک جگہ سر کو جھکا کر اپنے معبودِ برحق کو راضی کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ جبکہ عہدِ حاضر کے بدترین حالات میں ہمیں عبادات اور دعاؤں کی اشد ضرورت ہے۔ ہر بار سوچتے ہیں کہ ملک کے سیاسی حالات کو نظر انداز کر کے دوسرے موضوعات پر بھی قلم اٹھایا جائے مگر افسوس ہر بار کوئی نہ کوئی واقعہ ایسا رونما ہوتا ہے کہ ان واقعات کو نظر انداز کرنا مشکل ہو جاتا ہے جیسا کہ بلوچستان کے علاقے آواران میں عوام زلزلے کی ناگہانی آفت میں گرفتار ہوئے تو امدادی کارروائی کا باقاعدہ آغاز دو دن بعد ہوا جو تا حال جاری تو ہے مگر ساتھ ہی لوٹ مار کا بازار بھی گرم ہے۔ یہ کیسا ملک ہے جہاں حکمران آپس کی لڑائیوں میں عوام کو بھول گئے ہیں جہاں کسی کی عزت اور جان و مال محفوظ نہیں...... آئے دن دل دہلا دینے والی خبریں عوام کو ذہنی طور پر بیمار کرتی جارہی ہیں۔ قیمتی جانوں کے اس زیاں پر ہر پاکستانی غمزدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایسے سانحات سے بچائے اور ہمیں دل سے نیکی کرنے کی ہدایت دے (آمین) نومبر کے اس شمارے میں آپ کے پسندیدہ سلسلے "مسافر" کا اختتام ہورہا ہے۔ 21 اقساط پر مبنی اس سلسلے پر آپ کی آرا، پسند اور ناپسندیدگی کا اظہار ہوتا رہا۔ ادارے کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ آپ کے لیے بہترین اور دلچسپ تحاریر پیش کرنے کی روایت پر عمل کرے۔ 9 نومبر...... شاعرِ مشرق علامہ اقبال کا یومِ پیدائش...... جن کے خواب کی تعبیر ارضِ پاکستان...... مگر نظم و نسق تعبیر سے الٹ...... لیکن امید کا دامن چھوڑنا نہیں چاہیے اور جستجو و لگن سے اپنے حصے کا کام کرتے رہنا چاہیے کہ یہی ہمارے بڑوں کا پیغام بھی تھا اور خواہش بھی...... خواب و خیال کی ان باتوں سے نکل کر اب ذرا چلتے ہیں اپنی شوخ و چنچل محفل کی جانب کہ جہاں بہت سے اہم سندیسے ہمارے منتظر ہیں۔

☩ **عروہ خان**، کراچی سے محفل میں تبصرہ کے ساتھ جلوہ گر ہیں "اپنے بارے میں صرف اتنا ہی کہوں گی کہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے اور ملک گیر لوڈ شیڈنگ کے باعث تپتی دوپہروں اور حبس زدہ شاموں میں بادِ بہار کے جھونکے غیر متوقع مگر وارم ویلکم کے قابل تو ہیں ہی۔ ستر ہ ستمبر کی ایک سنہری چمکیلی صبح جب سسپنس نے سورج کی اولین کرن کے مانند قلب و نظر کو روشن کیا تو اسی وقت اچانک ہی دل میں ابھرتی ایک معصوم سی خواہش نے پل بھر میں ہی کسی شریر اور ہٹ دھرم بچے کی سی ضد کا روپ دھار کر ہمیں محفل میں آٹھ چاند لگانے کے لیے خط لکھنے پر مجبور کر ہی دیا۔ دیہات کے پس منظر میں وہ الھڑ مٹیار، البیلی نار کسی دلکش تصور میں کھوئی شرم سے گلنار ہوتی مجھے شبے میں مبتلا کر گئی۔ اداریے میں آپ کی فکر انگیز باتیں پڑھیں۔ ملک میں اور خاص کر کراچی میں امن تو بس ہم کراچی والوں کے لیے ایک خواب بنتا جارہا ہے۔ دوستوں سے اپیل ہے اپنی دعاؤں میں شہر کراچی کو خصوصی طور پر یاد رکھیں۔ کرسیٔ صدارت پر براجمان مہرین ناز کو مبارک باد۔ تبصرہ اچھا تھا۔ قیصر اعوان بھیا تہِ دل سے دعا ہے آپ کے لیے بلکہ سبھی قیدی بھائیوں کے لیے کہ وہ جلد از جلد باعزت بری ہو کر...... اپنوں سے ملیں۔ اے ایم چوہدری یعنی آسیہ چوہدری اصل نام بتا دیا تو پھر اصل نام کے ساتھ آنے میں کیا قباحت ہے؟ تبصرے بھی اچھے تھے مگر ٹاپ آف دی لسٹ تھا تفسیر عباس کا تبصرہ۔ کہانیوں میں سب سے پہلے کشکول پڑھی۔ شیخ حامد اگر ڈان ہے تو کوئی غیر مرئی مخلوق ہر گز نہیں ہے جو مرتا ہے اور نہ کسی کے ہاتھ آتا ہے۔ صابن کی چوری میں نک ویلوٹ کو اپنی فیس کے لیے کافی لمبا کھڑاگ کرنا پڑا۔ مجموعی طور پر کہانی اچھی رہی۔ کاشف زبیر کی تحریر ایکشن سے بھرپور مگر میرے نزدیک صرف گزارے لائق تھی۔ مریم کے خان کی دشمن جاں پڑھ کر تو اندیشہ لاحق ہو گیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک دن اچانک ہی ہم پر بھی اپنے غیر زمینی ہونے کا انکشاف ہو اور پھر ہم اپنا سیارہ ڈھونڈتے پھریں۔ سلیم انور کی مختصر تحریر نے بے اختیار مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ ویسے مغرب کے زیادہ تر مرد اپنی بیویوں کی وجہ سے مجرم بنتے ہیں۔ نیلا جھوٹ اس ماہ کی بہترین کہانی۔ سفید جھوٹ سننے کے تو عادی ہوتے جارہے ہیں مگر نیلا جھوٹ پڑھ کر حقیقتاً رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس قسم کے عبرت انگیز واقعات پڑھ کر اپنے معاملات اور اپنے اعمال پر غور کرنے کی ضرورت پیش آجاتی ہے۔ ستمبر کے شمارے میں طاہر جاوید مغل کی تحریر شائع ہوئی تھی مگر میں اس بار تبصرہ نہیں کر پائی تھی۔ اتنی محبت سے محبت لکھنے والے اس رائٹر کی میں جتنی بڑی فین ہوں میں آپ کو بتا نہیں سکتی اور میں منتظر ہوں آخری صفحات پر ان کے ایک شاہکار ناول کی۔ اچھا جی، چھبیس اکتوبر کو میری چھوٹی بہن کی سالگرہ ہوتی ہے تو پیپی برتھ ڈے تو مائی سویٹ اینڈ کیوٹ سسٹر اور عیدالاضحیٰ کی بھی مبارک باد سبھی قارئین کو۔"

☩ **ثمینہ حبیب**، کوئٹہ سے محفل کی زینت بنی ہیں "شمارہ 21 کو ملا۔ سرورق پر رنگوں کا امتزاج اور پس منظر میں گاؤں کا خوب صورت دیدہ زیب منظر آنکھوں کو بھلا لگا۔ انشائیہ نے دعوتِ فکر دی سیلاب کی طغیانیاں جو کہ تعصب، نفرت، انتقام کی شکل میں ہے۔ معاشروں کو گھن کی طرح چاٹ جاتی ہیں اور جیسا کہ جون صاحب نے لکھا خوش رہنے کے لیے بہت زیادہ ہمت بلکہ بہت زیادہ بے حسی چاہیے۔ یہ بات سو فی صد آج کے پاکستانی معاشرے پر صادق آتی ہے۔ اداریہ پڑھ کر میں بھی انکل جی کی طرح پاکستان کے لیے دعا گو ہوئی کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ملک کو اپنی حفاظت میں رکھے، آمین جہاں تک حکمرانوں کے ہمدرد ہونے کی بات ہے تو وہ صرف ایک دوسرے کے ہمدرد ہیں۔ ہاں وہ عوام کے ہمدرد ضرورت کے وقت بنتے ہیں۔ ماریہ فاروق، کامیابی مبارک ہو۔ تفسیر عباس بابر صاحب حسبِ معمول بہترین تبصرے کے ساتھ محفل میں موجود تھے۔ خطوط میں مہرین ناز، محمد خواجہ، تصویر العین اور شبانہ کے تبصرے اچھے رہے۔ کہانیوں میں صرف صابن کی چوری، احسان، وبال جان اور مبارک باد پڑھ پائی ہوں۔ منظر امام کی کہانی مبارک باد نے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ بکھیر دی۔ کترنوں میں طارق کلیر اینڈ کرم علی چوہان کا مراسلہ دلچسپ رہا۔ باقی رسالہ زیرِ مطالعہ ہے۔"

☩ **راجا ثاقب محمود جنجوعہ**، پنڈ دادن خان سے تشریف لائے ہیں "اکتوبر کے سسپنس ڈائجسٹ کا ٹائٹل دل کو چھو لینے والا تھا۔ ٹائٹل کی حسینہ شرم و حیا کا پیکر نظر آئی۔ جون ایلیا کا سیلاب کے بارے میں انشائیہ بہت اثر انگیز تھا۔ ان کی ہر بات دل کی گہرائیوں میں اتر گئی۔ الیاس سیتاپوری کی تاریخی کہانی یار وفادار نے مغل بادشاہ فرخ سیر کی ناکامی کے اسباب سے آگاہی دی۔ فرخ سیر کے انجام کے بارے میں پڑھ کر ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کاشف زبیر کی زرد لہو تجسس سے بھرپور اور بہت ہی سبق آموز تھی۔ نجمہ سودی کی صابن کی چوری نک ویلوٹ کی ذہانت اور حاضر دماغی کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ ملک صفدر حیات کی کہانی نیلا جھوٹ بہت حیرت انگیز اور عبرت کا سامان تھی۔ کشکول اور مسافر کی قسطیں بہت زبردست تھیں۔ ضیا تسنیم بلگرامی نے میاں میر، بالا پیرؒ کے حالاتِ زندگی اور حیران کن واقعات سے آگاہ کیا۔ محفلِ شعر و سخن میں کنول زریں اور تفسیر عباس بابر کے اشعار بہت داد کے قابل تھے۔"

☩ **ذیشان بدر منیر**، نیو کشمیر ٹاؤن دینہ سے چلے آرہے ہیں "تقریباً دو سال بعد ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ میں اپنی پیاری محفل کا حصہ بن رہا ہوں (خوش آمدید) ایک یہ وجہ جس سے سسپنس سے دوری بڑھی کہ طاہر جاوید مغل صاحب کا بے حس ہونا، بھلا آپ جاسوسی میں لمبی لمبی کہانیاں لکھ سکتے ہیں تو سسپنس کے لیے محبت سے بھرپور کہانیاں کیوں نہیں؟ (عنقریب آپ کی یہ شکایت بھی دور ہو جائے گی) خیر گلے شکوے اپنی جگہ جب ایک قاری کی اہمیت ہی نہیں تو درخواست کیسی؟ (اب آپ کی کیا رائے ہے اپنے بارے میں) دوستوں آپ سب کو بہت یاد کرتا ہوں اور سچ بات یہ ہے کہ آپ کی محبت ہی مجھے واپس لے کر آجاتی ہے۔ بشریٰ افضل جی آپ کو سلام و دعائیں، باقی دوستو! آپ سب کہاں گم ہو؟ بھیا اے بے کسانہ، رضوان تنولی، امین انجم آپ ڈاکٹر بن گئے کہ نہیں ہم تو ڈاکٹر نہ بن سکے کوشش ضرور کر رہے ہیں۔ ہماری شادی کی سالگرہ ہے چھ اکتوبر کو اور ایک چاند سا بیٹا بھی عطا کر دیا ہے اللہ نے (ڈبل مبارک باد وصول کریں) 14 اگست کو یومِ آزادی پاکستان کے خوب صورت ماہ میں اتنا خوب صورت بیٹا، اللہ تیرا شکر یہ جو مجھ پر رحمت اور محبت کی بارش کر دی۔ اس ماہ کا شمارہ اٹھارہ ستمبر کو ہاتھوں میں آیا۔ اپنا نام صدارت پر تلاش کرتے کرتے غصہ اور مایوسی میں سکتہ میں چلے گئے۔ مس روز، بشریٰ افضل، بابر عباس، روشنی رشید آپ سب کے لیے دعائیں۔ کہانیاں سب زیرِ مطالعہ ہیں۔"

☩ **طاہرہ گلزار**، پشاور سے محفل میں شرکت کر رہی ہیں "انشائیہ میں جون ایلیا اور معراج انکل کی دل کی باتیں، آرزوئیں اور لوگوں کے لیے دل میں درد پڑھا تو آنکھوں سے آنسو سیلاب کی طرح بہہ گئے۔ تین مہینے میں ہر چیز کی قیمت تین بار بڑھی اسکول اور خاص کر کالجوں کی فیس یک دم بڑھا کر غریب کے سر سے یہ چادر بھی کھینچ لی۔ سب سے پہلے ہمایوں سعید کو منگنی بہت بہت مبارک باد ہو۔ اب اسی بہانے ہمایوں پشاور کے چکر لگائے گا۔ ہاہاہا۔ احسان سحر بڑی بات ہے آپ بابر بھائی کو ستر سال کا کیوں کہہ رہے ہیں۔ بابر عباس بھائی 48 سال کے ہو گئے ہیں۔ بشریٰ افضل جی بڑا زبردست تبصرہ تھا۔ سویٹ ماریہ فاروق دعائیں دینے کا بہت بہت شکریہ۔ ماریہ فاروق ایف ایس سی میں پاس ہونے پر مبارک باد قبول کیجیے۔ قیصر اعوان بھائی یہ غلط بات آپ کو کس نے پٹی پڑھائی کہ اعجاز احمد راحیل اچھے انسان اور اچھے دوست ہیں۔ قیصر اعوان آپ کے ہم نام قیصر اقبال بھائی کو دل بڑا اور نظر وسیع کرنے کا مشورہ کسی بادشاہ بیگم نے دیا ہے۔ تنولی بھائی شرارتیں کم کریں۔ تصویر العین جی ہمایوں اب قیدی بن گئے ہیں اب سدھر جائیں گے۔ کبھی غلطی سے ہم غریبوں کو بھی پوچھا کریں۔ شکر ہے کہ تفسیر عباس، بابر بھائی کا تبصرہ تو آیا۔ تبصرہ بہت جاندار اور دلکش تھا۔ ہم سسپنس والے تو ایک خاندان کی طرح ہیں۔ غیر حاضر دوست واپس آجائیں۔ شیر علی خان بس جی شادی اب پرانی ہو گئی ہے۔ ماہا ایمان جی، دلنشین بلوچ اور آمنہ پٹھانی پلیز حاضری دیں۔ جہاں الیاس سیتاپوری کا نام آئے تو آنکھیں خود بہ خود کھل جاتی ہیں۔ الیاس سیتاپوری صاحب کے قلم کا یہ کمال ہے کہ وہ قاری کو اپنے ساتھ اس دربار میں لے جاتے ہیں پھر مریم کے خان کی تحریر دشمن جاں کیا موزوں نام ہے کہانی کا۔ سائنس فکشن پر، بہت پسند آئی۔ آخری کہانی احمد اقبال کی تحریر بہت پسند آئی۔ خانم پور کے کوچبان یعنی تانگہ چلانے والے کا کردار کافی پسند آیا۔ ناصر ملک صاحب کی تحریر مسافر بہت تیزی سے سیڑھیاں چڑھ رہے ہیں تھوڑا ہاتھ ہولے رکھیں جی۔ کشکول تو اب میں صرف ایس پی اور رنگ زیب کی وجہ سے پڑھتی ہوں۔ مغربی کہانیوں میں سلیم انور کی کہانی وبال جان بہت اچھی لگی، اپنی بیوی سے ایسے بھی جان بچائی جاسکتی ہے۔ منظر امام صاحب ایسی ایسی اچھوتی تحریر لاتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ تنویر ریاض کی تحریر احسان بددیانت محسن اور ایماندار احسان مند کے درمیان معرکہ آرائی پر زبردست تحریر تھی۔ محفلِ شعر و سخن کے اشعار بھی بہت زبردست لگے، پہلے نمبر پر میرے چھوٹے اور بہت اچھے بھائی ابرار وارث کا شعر بہت پسند آیا۔ نیلا جھوٹ حسام بٹ کی تحریر ملک صفدر حیات کی ڈائری سے ایک سبق آموز کہانی لگی۔ عورت تو اپنی جان دے دیتی ہے لیکن اس کی بددعا کبھی نہ کبھی اپنا اثر دکھاتی ہے۔"

☩ **بشریٰ افضل**، بہاول پور سے محفل کی زینت بنی ہیں "17 ستمبر کو سسپنس ملا۔ ذاکر انکل نے شاہکار ٹائٹل بنایا ہے۔ انشائیہ میں جون ایلیا خود تو چلے گئے مگر اپنی تحریر میں اپنی یادیں چھوڑ گئے۔ ہم ان کی ایک علمی معلومات سے استفادہ حاصل کرتے ہیں۔ اپنی محفل آپ کے خط میں پہنچے شکریہ ہم بھی محفل میں موجود تھے۔ مہرین ناز کرسیٔ صدارت مبارک ہو۔ تبصرہ خوب صورت پیرائے میں لکھا تھا۔ مظہر سلیم آپ کے پاس کوئی ثبوت ہے کہ ہمایوں سعید تاکا جھانکی کرتے ہیں۔ تمام اسٹاف، عذرا رسول اور معراج رسول صاحب کو پیشگی عید مبارک باد ہماری طرف سے۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس، معدیہ، ہما، شیخ مظہر سلیم سبھی بہت ریسٹ ہو گیا واپس آجایئے کچھ نہیں کہا جائے گا۔ میاں میر بالا پیرؒ ان کی ایمان افروز باتیں ہمارا دل چھو لیتی ہیں۔ مکمل تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ دشمن جاں مکمل سائنس فکشن پر مبنی کہانی تھی۔ سائنس کے بارے میں باریک بینی سے معلومات ہم تک پہنچائی گئی ہیں۔ وبال جان مختصر مگر پُر تاثیر کہانی تھی۔ صابن کی چوری، نک کی کہانیوں کا یہ خاصہ ہے کہ جو بھی چیز چوری کرواتا ہے وہ اس کی تہ تک پہنچ کر مجرم کو کیفرِ کردار تک پہنچاتا ہے، مبارک باد۔ لڑکوں

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے لیے بطور خاص نصیحت کا پہلو اس کہانی میں موجود ہے۔ ان کو سنبھل جانا چاہیے۔ میڈیا نے لڑکوں کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ محفلِ شعر و سخن، ابرار وارث خوب صورت شعر لکھنے پر اور پہلے نمبر پر مبارک ہو۔ رضوان تنولی آپ کے شعر میں بڑا درد تھا اچھا لگا شعر۔ پارچہ بھی پڑھے، مزہ آیا۔ دردِ دلِ محبت ہو تو ایسی ویکس نے صرف شیلا کی خاطر جان دی کہ اس پر کسی قسم کا الزام نہ آئے۔"

✠ **سید شکیل حسین کاظمی**، اسلام آباد سے تشریف لائے ہیں "ایک دفعہ پھر آپ کی محفل پر دستک دے رہا ہوں اس امید پر کہ جولائی کی طرح اس بار بھی میرا تبصرہ منظر عام پر نہیں آنے دیا جائے گا (یہ غلط فہمی کیوں ہوگئی آپ کو؟) سسپنس ڈائجسٹ ستمبر کی سترہ تاریخ کو دستیاب ہو گیا۔ سرورق اس دفعہ پنجاب کے رنگوں سے سجا ہوا تھا۔ خاتون کے شرمانے کے سبب پر قیاس آرائی سے گریز کرتے ہیں۔ انشائیہ پر پہنچے تو جون ایلیا اور معراج رسول صاحب دونوں قلم کے آنسوؤں سے سیلاب برپا کیے ہوئے تھے۔ کافی دردناک اور حسرت بھری تحریر تھی۔ اس کے بعد سیدھا محفل کی طرف نکلے تو مہرین ناز کے مختصر مگر جامع تبصرے کو پسندیدہ قرار دیا گیا، بہت مبارک باد وصول کریں۔ باقی تمام محفل ایک سے بڑھ کر ایک اور بہترین خطوط سے مزین تھی۔ مظہر سلیم صاحب کا تبصرہ بہت جاندار اور اچھے انداز میں لکھا ہوا تھا۔ بشریٰ افضل صاحبہ بھی پھر سے شریک محفل ہوگئی ہیں جو کہ ایک اچھی بات ہے۔ زویا اعجاز آپ کا تبصرہ آپ کے گہرے مشاہدے کی عکاسی کرتا ہے۔ تصویر العین آخرکار تین ماہ کی غیر حاضری کے بعد محفل میں شامل ہو ہی گئیں۔ لاہور سے شبانہ آپ منظر کشی اچھی کر لیتی ہیں ویسے۔ تنویر عباس بابر ہمیشہ کی طرح اپنے منفرد اسلوب کے ساتھ محفل میں رونق افروز نظر آئے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے کشکول کا مطالعہ کیا۔ بے شک یہ ایک بہترین کہانی ہے مگر اس میں کردار نگاری کے حوالے سے کافی پھیلاؤ ہے۔ دوسرا تھوڑا پراسراریت کم ہوتی تو زیادہ مزہ آتا۔ ناصر ملک صاحب کی مسافر بھی اس بار بہت اچھی رہی۔ آخر میں اچھا سسپنس رکھا گیا۔ امید ہے کہ یہ میڈم کے لوگ ہوں گے جو شہریار کے پیچھے نظر رکھتے آئے ہوں گے۔ غزالہ کی طرف لوٹنا ایک اچھا فیصلہ ہے شہریار کا۔ کاشف زبیر صاحب کی زرد لہو اس ماہ کی بہترین کاوش تھی۔ وین برائن اور شیلا مارک کی مثبت سوچ نے جوزف اور جیکب مائن کے لوگوں کے لیے ایک خوشگوار اور محفوظ زندگی کا راستہ فراہم کر دیا۔ نجمہ سودی کی صابن کی چوری اس دفعہ معمول سے ہٹ کر تھی اس لیے متاثر کر گئی۔ ملک صفدر حیات صاحب اس دفعہ عبرت ناک اور سبق آموز نیلا جھوٹ لے کر حاضر ہوئے جسے پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ منظر امام صاحب کی مبارک باد مختصر مگر شگفتہ پیرائے میں لکھی گئی کہانی تھی۔ عجیب و غریب خاندان کی عجیب و غریب منصوبہ بندی حیران کن تھی جبکہ سلیم انور صاحب کی وبالِ جان بہت عمدہ تھی۔ یہ شادی شدہ لوگوں کے لیے ایک سبق آموز تحریر ثابت ہوگی۔ مریم کے خان کی سائنس فکشن دشمن جاں اچھی کہانی ثابت ہوئی گو کہ موضوع کے اعتبار سے اس میں کچھ نیا نہیں تھا۔"

✠ **اعجاز احمد راحیل**، نامعلوم مقام سے چلے آرہے ہیں "بندۂ ناچیز آپ کی خیریت کے لیے دعاگو ہے۔ پچھلے تین ماہ سے مسلسل میرے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ کبھی تو ہمارا خط غائب تو کبھی بلیک لسٹ مقدر بن رہی ہے۔ آج یہ سوچ کر قلم ہاتھ میں لیا ہے کہ یہ میرا اپنے سسپنس کے لیے آخری خط ہے (اُف — جذباتی بلیک میلنگ) زندگی میں کیا کیا دوست رہ و رسمِ دوستی نبھانے آئے۔ کبھی میری آوارگی سے گھبرا کر اپنی اپنی بستیوں کو لوٹ گئے اور میں کل کی طرح آج بھی درد کے کرب زار میں تنہا محوِ سفر ہوں مگر نہیں سسپنس اور سسپنس والوں کی محبتیں میرے ساتھ ہیں۔ ماہ اکتوبر کا منفرد شمارہ خوش فہم نظروں کے سامنے آیا تو سرورق پر موجود محبوبۂ دل نواز، گلے میں آنچل ڈالے آنکھیں بند کیے شرماتی ہوئی دیہاتی دوشیزہ کو دیکھا تو دل کمالِ مصوری پر عش عش کر اٹھا۔ فہرست سے آگے نگاہوں نے بے اختیار محی الدین نواب صاحب کی ماروی کو بوسہ دیا، بہت خوشی ہوئی۔ جون ایلیا صاحب اینڈ معراج رسول صاحب بھی سیلابِ غم میں ڈوبے نظر آئے۔ اداریہ ہمیشہ کی طرح حالاتِ حاضرہ کی صحیح عکاسی کرتا محسوس ہوا۔ اس بار شعرِ محبت والے بازی لے گئے۔ حیدرآباد سے مہرین ناز کی آمد پر پھول مہکی راہوں پر قدموں سے گونج اٹھے، مبارک ہو۔ مظہر سلیم بھی زورِ قلم پر مخالفوں کے چھکے چھڑوانے میں کامیاب رہے۔ مظہر بھیا ہمایوں اپنی فطرت سے مجبور ہے۔ ماریہ فاروق کو بہت بہت مبارک ہو۔ ہمایوں سعید صاحب کے سعدیہ بخاری کے بارے میں لگائے گئے غلط اندازے سے محسوس ہوتا ہے کہ موصوف کا تعلق بھی زمانۂ قدیم کی مخلوق سے ہے۔ تصویر العین صاحبہ یہ جو ہمایوں جوگی ہے نا یہ آپ کی صنف کو دنیا کی نام نہاد بے وقوف مخلوق سمجھتا ہے۔ شبانہ بی بی آپ میرے شاعر ہونے کی تصدیق قیصر لالہ سے کر سکتی ہو۔ بہر کیف کچھ ماہ بعد میرا مجموعۂ کلام کچھ خواب جو ادھورے رہ گئے، منظرِ عام پر آجائے گا۔ ابتدائی صفحات پر یار وفادار کے ساتھ الیاس سیتاپوری جلوہ افروز تھے زندگی کے نشیب و فراز، رنگینیوں، سازشوں، محبت و نفرت پر مبنی اچھی تحریر ثابت ہوئی۔ یہ حقیقت ہے تقدیر کے کام کبھی تدبیر سے نہیں نکلتے۔ ناصر ملک کا مسافر بھی اپنی مسافت طے کر رہا ہے حسبِ سابق ہنگامہ خیزیاں اپنے عروج پر ہیں۔ چندرماہی کی محبت شہریار کو پُرخطر راستوں پر دھکیل دیتی ہے۔ کشکول کی موجودہ قسط پہلے کی نسبت کافی بہتر محسوس ہوئی۔ دشنو کا قصہ بھی تمام ہوا۔ جگا کا کردار بہت زبردست ہے۔ لیاقت علی اینڈ پرتاب بھوشن کا آمنا سامنا ہو رہا ہے جیت خیر کی ہی ہوگی۔ چشم دید گواہ از احمد اقبال کی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ محبت میں انسان ہر حد سے گزر جاتا ہے۔ خانم کی داستان اچھی لگی۔ وزیر خان کی اپنی بیٹی سے محبت قابلِ تحسین ہے۔ وبالِ جان، نہ جانے کیوں کچھ مرد اپنی شریکِ حیات کو اہمیت کیوں نہیں دیتے ہیں حالانکہ میاں بیوی کا رشتہ محبت سے ہی قائم رہتا ہے۔ دشمن جاں از مریم کے خان محبت جیسے مقدس رشتے پر لکھی تحریر عمدہ لگی محبت تو محبت ہے بس یہ ہو جاتی ہے۔ نیلا جھوٹ ملک صفدر حیات کی ڈائری سے ایک عبرت ناک داستان پڑھ کر ربِ کائنات کا خوف دل میں آگیا۔ مبارک باد محبت میں جھوٹے وعدے کرنے والوں کو پرکھنے کا اہم راز۔ صابن کی چوری تک کے تازہ کارنامے نے مزہ دیا۔ آخر میں صوبیہ فرام راول پنڈی اور گل مروت صاحب سے درخواست ہے کہ محفل میں حاضری دیں۔ محفلِ شعر و سخن میں عائشہ ملک، مہرین ناز، راحیلہ اعجاز، لالہ قیصر اقبال گجر، قیصر اعوان، تنویر عباس بابر کے اشعار پسند آئے۔ کترنیں بہت عمدہ تھیں۔"

✠ **رانا حبیب الرحمٰن** قیدی سزائے موت سینٹرل جیل سے محفل میں شریک ہوئے "انکل بہت عرصہ بعد اپنی اس پیاری محفل میں آنے کی

جسارت کر رہا ہوں۔ امید ہے جگہ دے کر زندگی کی اس خوشی سے ہمکنار ہونے کا موقع دیں گے۔ قید کی اس سختی میں سسپنس ایک ٹھنڈی میٹھی ہوا کے مانند ہے جس سے مجھے زندہ رہنے کا احساس ملتا ہے۔ اس طرح مہرین ناز صاحبہ کو کرسیٔ صدارت پر دیکھ کر دل خوشی سے معمور ہو گیا۔ صدارت مبارک ہو۔ اس پیاری محفل میں اپنے پیاروں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ احسان سحر بھی اچھا لکھنے لگے ہیں۔ محفل ۔ میرے محسن رضوان تنولی کا خط پڑھ کر دل کو مزید تسلی ہوئی کہ ٹل فنز گروپ میری بھی مدد کر سکتا ہے۔ قیصر اعوان، بخشی حماد اور قیصر گل میرے ہمدم اور ہم غم ہیں۔ اللہ پاک ہم سب کو آزادی کی فضا میں سانس لینے کا موقع دیں۔ سب ساتھیوں سے دعا کے منتظر ہیں۔ اعجاز احمد راحیل بہت نرم دل انسان ہیں۔ شبانہ صاحبہ کے تبصرے میں ہم قیدیوں کے لیے دعا اچھی لگی۔ اشعار کی محفل میں عائشہ ثاقی، راحیلہ اعجاز، رضوان تنولی، ابرار وارث کے بہترین انتخاب ہیں۔ کہانیوں میں کشکول اور مسافر بے حد پسند آئی۔ برائے مہربانی میرا یہ خط ضرور شامل کریں۔ شاید یہ میری زندگی کا آخری خط ہو۔" (اللہ آپ کی مشکل آسان کرے، مایوسی کفر ہے)

✠ **سعدیہ بخاری**، اٹک سے محفل میں شرکت کر رہی ہیں "دیسی اسٹائل کی حسینہ دیہات کے خوب صورت پس منظر میں بھوسے کے دومانیاں، دریا کے کنارے بیٹھا تغیرِ موسمِ خزاں کی تمام تر خوب صورتی اپنے اندر سموئے اکتوبر کا سسپنس نہایت شاندار لگا۔ کہانیوں کی فہرست پر نظر دوڑائی مستند اور کہنہ مشق رائٹرز کے نام دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ انشائیہ میں جون ایلیا آفتِ سیلاب کی تباہ کاریوں پر اظہارِ خیال کر رہے تھے لیکن ان کے دیرینہ دوست معراج رسول نے بہت پتے کی بات کی کہ ہمارے اندر سیلاب زیادہ تباہ کن ہے اور اس کی تازہ ترین مثال پشاور میں ہونے والا بم دھماکا ہے۔ اللہ ہمارے حال پر رحم فرمائے، آمین۔ مہرین ناز کرسیٔ صدارت مبارک ہو خدا نے آپ کی بھی سن لی۔ مظہر سلیم بجا فرمایا آپ نے اپنے ہم صنفوں کی فطرت سے خوب واقف لگتے ہیں۔ ماریہ فاروق ڈھیر ساری مبارک باد امتحانات میں کامیابی کی اور اے ایم چوہدری ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ ہمایوں سعید آج کل کے دور میں تو جعلی ڈگریاں تک مل جاتی ہیں جعلی دستاویزات اور جھوٹے گواہ پیش کرنا کون سا مشکل کام ہے۔ نیلا جھوٹ ملک صاحب کو درپیش منفرد کیس عذابِ قبر کے حوالے سے ایک نہایت عبرت اثر واقعہ کہانی کی صورت میں ہمارے سامنے تھا۔ حفیظ جٹ کو اپنے گناہ کی سزا دنیا میں بھی اطمینانِ قلب سے محروم رہا اور قبر میں بھی سخت عذاب سے دوچار ہوا۔ آخری صفحات کا تحفۂ خاص چشم دید گواہ میں احمد اقبال کے بے ساختہ انداز اور برجستہ جملوں نے کافی محظوظ کیا۔ مسافر میں شہریار کو آخرکار غیر متوقع طور پر اپنی بہن پروین مل گئی۔ شمارے میں نئی سلسلے وار کہانی کا ایڈ دیکھ کر لگ رہا ہے کہ مسافر اپنی منزل کے قریب ہے جبکہ ہمارا خیال تھا کہ مسافر ابھی آغاز میں ہے یہ خبر بہت حیران کن ہے۔ کشکول میں اگرچہ سیٹھ حامد کے گرد گھیرا تنگ کیا جا رہا ہے لیکن وہ آکٹوپس کسی کے ہاتھ نہیں آرہا۔ قسط کا اینڈ لیاقت حسین اور پرتاب بھوشن کے ٹاکرے پر ہوا۔ اسلامی تاریخ پر مبنی کہانی میاں میر بالا پیر میں شیخ محمد کی کرامات حقیقتاً حیران کن ہیں اور دلچسپ بھی۔ مختصر کہانیوں میں زرد لہو، صابن کی چوری، بہروپ زبردست تھیں۔ دشمن جاں سائنس فکشن پر مبنی کہانی تھی ثابت ہوا کہ انسان ہو یا روبوٹ نما انسان محبت اپنا اثر دکھاتی ہے۔ دوسروں کو ہنسانے کے کمالِ فن سے واقف منظر امام بہت منفرد کہانی لے کر آئے۔ محبت میں آزمائش کا انداز کافی انوکھا تھا۔ محفلِ شعر و سخن میں تنویر عباس، پرنس راجا، افتخار حسین اور حبیب احمد کا انتخاب پسند آیا۔"

✠ **رمضان پاشا**، کراچی سے محفل کی زینت بنے ہیں "اکتوبر 2013ء کا شمارہ مل گیا۔ ہمیشہ کی طرح اس ماہ کا بھی گیٹ اپ بہت اعلیٰ درجے کا تھا۔ انشائیہ اس بار جون ایلیا صاحب نے قاری کو رُلا ہی دیا کم از کم مجھے۔ خطوط کی محفل میں اول نمبر آنے والی محترمہ مہرین ناز صاحبہ کو مبارک باد۔ موصوفہ نے میرے تبصرے کو سراہا اور میرے شعر کو بھی پسند کیا ان کو دوبار شکریہ۔ بشریٰ افضل صاحبہ آپ نے میرے بارے میں جو جملے تحریر کیے ہیں وہ ادھورے لگے۔ اگلی بار وضاحت کریں۔ ماریہ فاروق آپ نے جو نکتہ اٹھایا ہے وہ پرانا ہو گیا ہے میں تائب ہو گیا تھا۔ ایڈیٹر نے بھی مجھے معاف کر دیا تھا، کوئی نئی بات کیجیے۔ تاریخی کہانی یار وفادار میں جو قصہ بیان ہوا ہے وہ پہلے کبھی نہیں پڑھا نہ سنا۔ فرخ سیر کے بارے میں تو مجھے کچھ بھی نہیں معلوم تھا۔ زرد لہو بہت ہی دلچسپ کہانی تھی۔ پتا ہی نہیں چلا لائٹ آگئی اور موم بتی بجھ گئی کیا خوب کہانی تھی۔ لاکھوں قارئین کے پسندیدہ قلم کار محی الدین نواب کی آئندہ کہانی ماروی کا اشتہار آگیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کشکول یا مسافر میں سے کسی ایک کا ڈراپ سین ہونے والا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟ (بالکل درست ہے جناب) صابن کی چوری تک و طوٹ حسبِ روایت اپنے مشن میں کامیاب رہا۔ اس بار گوریا بھی ایکشن میں آگئی۔ سحر کرآرا کی کہانی نیلا جھوٹ واقعی ایک سبق آموز اور عبرت اثر کہانی تھی۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ کہانی آخر میں نیلا سچ ثابت ہوئی۔ سو فی صد حقیقت پر مبنی بہروپ نہایت پُراثر بھی تھی۔ احسان بھی کافی دلچسپ کہانی تھی۔ مبارک باد یہ کوئی حقیقی روایت نہیں فقط ایک مفروضہ ہے، کہانی مزے دار تھی۔ وبالِ جاں نہایت مختصر نہایت پُرلطف۔ سائنس فکشن کہانی دشمن جاں بہت اچھی لگی۔ چشم دید گواہ کہانی بہت ہی دبنگ تھی مگر اس میں مذکور ریاست خانم پور کے بارے میں پہلے کبھی نہیں سنا۔ بہرحال کہانی نے خوب لطف بہم پہنچایا آخر احمد اقبال کی تحریر ہے۔ اشعار کی محفل میں مہرین ناز اور اظہر حسین کے اشعار پسند آئے۔"

✠ **امین مراد انصاری**، نیو کراچی سے تشریف لائے ہیں "اکتوبر 2013ء کا شمارہ بیس ستمبر کو ملا۔ اس شمارے میں آپ کا تحریر کردہ اداریہ پڑھ کر دل خون کے آنسو رونے لگا۔ واقعی اس ملک میں حکومت نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ قیامِ پاکستان سے لے کر اب تک جتنے بھی حکمران آئے ہیں سب نے اپنا بینک بیلنس بڑھایا ہے ملک اور قوم کی کسی نے بھی پروا نہیں کی۔ خطوط کا یہ کالم ڈائجسٹ کی جان ہے اور دوسرے ڈائجسٹوں سے بہت مختلف بھی کیونکہ خطوط کے اس کالم میں نہ صرف ڈائجسٹ کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں بلکہ سماجی، سیاسی، مذہبی، ادبی اور معاشرے کے دیگر مسائل پر بھی کھل کر اظہار کرتے ہیں۔" (ارے صاحب کہانیوں پر تبصرہ کہاں غائب کر دیا؟)

✠ **قیصر اقبال گجر**، بھکر سے چلے آرہے ہیں "یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ سسپنس نے ہمیں بہت سے ان دیکھے پُرخلوص دوست

WWW.PAKSOCIETY.COM

عطا کیے ہیں۔ جن کی محبت دیکھ کر جہاں اپنی ایسی قسمت پر مالک کائنات کا شکر ادا کرتا ہوں وہاں اپنے پیارے سسپنس ڈائجسٹ کو بھی چوم لیتا ہوں۔ ان دوستوں میں ایک نام چارسدہ کے عادل خان کا ہے جس نے ہم سے اپنی محبت کا ثبوت دیا کہ اپنی خوب صورت تصاویر کا تحفہ ہمیں بذریعہ ڈاک پوسٹ کر کے بھیج دیا۔ عادل بھیا، اس محبت کا شکریہ اور جس کی وساطت سے یہ محبت ملی۔ جی ہاں، پیارے سسپنس آپ کا بھی شکریہ۔ بدلتا موسم اور اکتوبر کا سسپنس سرورق کی لڑکی کا شرمانا نظرانداز کر کے جون ایلیا مرحوم کی سیلاب کی تباہ کاریاں بیان کرتا انشائیہ پڑھ کر داخل ہوئے اپنی محفل میں۔ برادر احسان سحر کیا بات ہے آج کل خطوط پر تبصرہ بہت کم کر دیا ہے؟ مظہر سلیم، سب کی خوب کلاس لیتے نظر آئے اور مظہر بھیا آپ کی نظر کا کمال ہے کہ آپ کو زویا کے قلم کی گرہیں کھلتی نظر آ گئی ہیں۔ ماریہ فاروق صاحبہ کامیابی مبارک ہو۔ ہمایوں سعید، بخاری صاحبہ ہیں کو اب کچھ نظر آتے ہیں کچھ، توصیف بھیا، بابر عباس نے جو لمبی پھینکی ہے اس پر توبہ مت کرو۔ تصویر العین شعر پسند کرنے کا شکریہ۔ بخاری صاحبہ یہ ہمایوں سعید تو کچھ مستند گواہ بھی پیش کرنے کے چکر میں تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ جن پر تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔ کہانیوں میں مسافر سب سے پہلے پڑھی۔ شہریار کا ڈاکٹر شاہ جی اور پروین سے اچانک ملنا اچھا لگا۔ کشکول میں شیخ حامد کا میڈم روبی تک پہنچ جانا۔ اس کی طاقت کا ثبوت اور آخر میں لیاقت حسین کا مقابلہ۔ احمد اقبال کی چشم دید گواہ سسپنس کے آخری صفحات کے شایانِ شان کہانی پسند آئی۔ ملک صاحب کی نیلا جھوٹ سب کے لیے ایک سبق آموز تحریر تھی۔ یار وفادار میں تاریخ کے گم گشتہ واقعات سے آگاہی ہوئی۔ ولیوں کے واقعات پر مشتمل میاں میر بالا پیر میں اللہ تعالیٰ کے ایک کامل ولی کے حیران کن واقعات معلومات کا خزانہ ثابت ہوئے۔ نجمہ سودی صابن کی چوری کی صورت میں نک ویلٹ کا ایک اور شاندار کارنامہ لے کر آئیں۔ کاشف زبیر کی زرد لہو ایک بہترین تحریر تھی اور مریم کے خان کی دشمن جاں بھی بہت اچھی اسٹوری تھی۔ منظر امام کی مبارک باد میں سچ کو پہچاننے کا گر ملا تو تنویر ریاض کی احسان میں محسن اور احسان مند کی معرکہ آرائی کا احوال پڑھا جہاں ساحر جمیل کی بہروپ میں ظاہر اور باطن کا فرق نظر آیا وہیں سلیم انور کی وبالِ جان بھی اچھی تحریر تھی۔ محفلِ شعر و سخن میں بھی اس دفعہ اچھے انتخابات پڑھنے کو ملے۔"

✠ **مظہر سلیم، رحیم یار خان** سے محفل میں شریک ہوئے "واہ! اکتوبر کا شمارہ تمام تر تابانیوں کے ساتھ ہاتھوں میں ہے۔ اس ماہ کے سرورق کو سال کا بہترین سرورق کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ واہ! ذاکر صاحب کمال کر دیا۔ جون ایلیا کے انشائیہ میں پہنچے تو دائیں ہاتھ کے صفحے پر ایک انکشاف خوش خبری کی صورت میں ہمارا منتظر تھا۔ محی الدین نواب صاحب بہت جلد ماروی کے ساتھ جلوہ افروز ہونے والے ہیں۔ بھئی واہ! اکتوبر کا شمارہ تو قدم قدم پر تحفے گل کھلانے پر آمادہ تھا۔ جون ایلیا کا انشائیہ سیلاب سے متعلق تھا۔ ایک ایسے انقلابی سیلاب کی منتظر عوام بھی ہے جس سے دلوں کے بغض، عداوتیں اور نفرتیں انسانی ذات کے نہاں خانوں سے خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں۔ آپ کے خط میں اداریہ حسبِ سابق اچھا لگا۔ فاقوں سے تنگ آ کر بچوں کو قتل کر دینے والی بات ہمیں ملول اور افسردہ کر گئی۔ خطوط میں مہرین ناز کا خط اعزازی قرار پایا۔ مہرین سے ہمارا ایک سوال ہے کہ قلم مان لیا آپ کا، یہ لفظ کس کے ہیں؟ سینئر تبصرہ نگار بشریٰ افضل کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح بہترین رہا۔ زویا جی ادھوری خواہشیں انسان کے اندر ایک بے نام خلش اور کسک پیدا کرتی ہیں۔ تبھی تو ایک شاعر، ایک ادیب اور ایک مصور کو تحریک ملتی ہے۔ ہمایوں سعید آپ سعدیہ بخاری کی کیا بات کرتے ہیں ہم نے تو آپ کے بارے میں سنا ہے کہ جب قرارداد پاکستان منظور ہوئی تھی ان دنوں آپ اپنی دسویں سالگرہ کی موم بتیاں بجھا رہے تھے۔ تصویر العین آپ نے زویا کو جشن آزادی کی مبارک دی تو دی کیا پاکستان کا پرچم بھی چھت پر لہرایا؟ شیر علی خان اگر آپ ہنی مون منا کر قطب شمالی سے واپس آ گئے ہیں تو محفل کی طرف رخ کرنے میں کون آڑے آ رہا ہے؟ باقی تبصرہ نگاروں میں تفسیر عباس، سعدیہ بخاری، آسیہ چوہدری شبانہ، رضوان تنولی، قیصر اعوان اور ماریہ فاروق کے تبصرے اچھے لگے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے مسافر پڑھی۔ تلخ و شیریں احساسات و جذبات کی ترجمان اس داستان میں شہریار ایک پٹھان کے روپ میں غزالہ تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب رہا لیکن...... آخری صفحات کی کہانی چشم دید گواہ ایک دریافت شدہ نئی ریاست خانم پور کے اجڑے در و بام کی عکاسی کرتی ہوئی داستان، روایتی نوابوں کی عیاشیوں کو طشت از بام کرتی دل کے تاروں کو چھو گئی۔ منظر امام کی مبارک باد ایک انوکھی مبارک باد ثابت ہوئی۔ مبارک بادوں کا سلسلہ بالآخر ارم اور ندیم احمد کی شادی پر ختم ہوا، کہانی پڑھ کر بہت محظوظ ہوئے۔ ملک صفدر حیات اس بار ایک عبرت اثر روداد نیلا جھوٹ کے عنوان سے لے کر آئے۔ حفیظ جٹ غزالہ نامی لڑکی کی بددعا کا شکار ہو کر عذاب قبر سے دوچار ہوا۔ منظورے پھل فروش کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ ساحر جمیل سید کی بہروپ شمارے کی بہترین کہانی تھی۔ منصور عرف پھل ساری زندگی بدمعاشی کرتا رہا تاہم خدیجہ بیگم اور اس کی بیٹیوں کی عزت کا دفاع کرتے ہوئے جان کی بازی ہار بیٹھا۔ اللہ کے برگزیدہ بندے پر مشتمل ضیا تسنیم بلگرامی کا مضمون قلب کو روشن کرنے کے اسباب پیدا کر گیا۔ تاریخی کہانی یار وفادار تاریخ کے اوراق سے کشید کی گئی داستان متاثر کن رہی۔ کشکول ہم پڑھتے نہیں ہیں لہٰذا اس پر تبصرہ کرنے سے قاصر ہیں۔ اللہ ہم سب کو اپنی امان میں رکھے، آمین۔"

✠ **طاہر الدین بیگ، میرپور خاص** سے فرماتے ہیں "کچھ عرصہ سسپنس سے دوری تھی کچھ ہمارے تبصرے سسپنس کے معیار پر پورے نہیں اترتے تھے اس لیے ضائع کر دیے گئے کچھ ہم سب بیماری لکھ نہیں پائے تھے۔ (اللہ آپ کو صحت دے، ناراض نہ ہوا کریں) سسپنس ایک معیاری ڈائجسٹ ہے اور اس میں شامل کہانیاں بھی لاجواب ہوتی ہیں۔ کچھ کہانیاں ایسی ہیں کہ بھلائے نہیں بھول پاتے جیسے زنداں میں پھول اور بازگشت یہ ایسی کہانی تھی جسے پڑھتے وقت ہم کہانی میں ایسے کھوئے کہ ختم کر کے ہی سکون آیا۔ سلسلے وار کی کہانیوں میں زیادہ دلچسپی ہوتی ہے بڑے ذوق و شوق سے اگلی قسط کا انتظار کرتے ہیں۔ تھوڑا سا کشکول کے لیے عرض کر دیں اگر مزاج دشمناں ناساز نہ ہوں تو شروع میں یہ خوب رہی مگر جیسے جیسے کردار بڑھتے گئے کہانی کا معیار کمزور سے کمزور ہوتا گیا۔ انوار صدیقی صاحب کے دماغ میں آکٹوپس اس طرح سمایا ہے کہ وہ مر کے بھی زندہ ہے اور سب کو چکرا رہا ہے۔ آپ کی محفل میں کہیں مہرین ناز اپنے خوب صورت تبصرے کے ساتھ ہیں، کہیں بشریٰ افضل ہیں کہیں آپ کو زویا اعجاز اور کہیں تصویر العین اپنے اچھے تبصروں کے ساتھ

ملیں گی۔ یہ خواتین کا بھی من پسند ڈائجسٹ ہے۔"

✠ **عبدالشکور شاہ، کراچی** سے جلوہ گر ہوئے ہیں "20 ستمبر کو شمارے کے دیدار سے خوشی ہوئی۔ جون ایلیا کا انشائیہ ہمیشہ مطابق حال رہا ہے۔ اس پرچے کے حرف حرف سونے سے تراشنے کے قابل ہیں۔ ایک ایک ہیرا بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ قارئین کے خطوط میں تمام تبصرے اچھے تھے۔ مہرین ناز اور احسان سحر کا خط پسند آیا جو بات زیادہ دل کو لگی، احمد خان توحیدی کا تبصرہ ہے۔ ادارے نے اس کو موقع دیا اور مناسب و اچھے الفاظ میں حوصلہ بھی۔ کہانیوں میں کشکول پہلے پڑھا۔ صدیقی صاحب فارم میں ہیں، کہانی تیزی سے اختتامی انجام کو پہنچنے والی ہے۔ پہلی بار شیخ حامد فل ایکشن میں نظر آیا۔ پچھلی بار مسافر نے مکمل بور کر دیا ہے۔ شہریار اور میڈم کی ملاقات میں جو چاشنی اور لگاوٹ محسوس ہوئی وہ غزالہ کی شہریار سے ملاقات میں نظر نہیں آئی۔ احمد اقبال صاحب کے چشم دید گواہ نے آخر تک گرویدہ بنائے رکھا۔ پتا ہی نہیں چلا کب کہانی ختم ہو گئی۔ واقعی قلم کا وار تلوار کی دھار سے تیز ہے۔ مریم کے خان کی دشمن جان دل کو لگنے والی اچھی کاوش تھی۔ منظر امام کی مبارک باد مختصر، پراثر، لبوں پر لطیف مسکراہٹ سجانے والی سماج پر بنی پیاری تحریر تھی۔ نیلا جھوٹ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے نمونوں پر مشتمل سبق آموز واقعہ ہے۔ باقی کہانیاں بھی اچھی ہیں اور کچھ زیر مطالعہ ہیں۔ کترنیں پسند آئیں۔"

✠ **حکیم خان سلامت پوری، لاہور** سے محفل میں شریک ہوئے ہیں "زندگی کی بھاگ دوڑ میں ہم ساری عمر حکمت کے میدان میں اپنی توانائیاں صرف کرتے رہے۔ یہ تو چند ماہ پہلے کی بات ہے کہ ہمارے شاگردِ خاص منے میاں نے ہمارے ہاتھ پر ایک رسالہ رکھا اور ہمیں بتایا کہ استاد جی اس رسالے میں آپ کا نام شامل ہے گو کہ ساری زندگی ہمارا واسطہ کسی بھی رسالے سے نہیں پڑا مگر منے میاں کا دیا گیا رسالہ سسپنس ڈائجسٹ ہم نے زندگی میں پہلی بار پڑھا تو ہمیں بہت افسوس ہوا کہ ہم ساری زندگی اس سے دور کیوں رہے۔ بہرحال اب یہ دوری نہیں رہے گی اور سسپنس ہماری زندگی کا ساتھی ہوگا (خوش آمدید) اکتوبر کے رسالے کی حسینہ کو دیکھ کر ہم اپنی جوانی کے دنوں میں کھو گئے تب ہمیں منے میاں نے جھنجوڑا اور سیدھا لے کر گیا محفل میں۔ پہلے نمبر پر مہرین ناز بی بی کا خط دیکھ کر منے میاں نے ہمارے کان میں کہا۔ استاد جی کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے، پانچ بار کی ریکارڈ بلیک لسٹ ہولڈر ہیں یہ ناز بی بی۔ بشریٰ افضل عزیزی محفل میں دوڑ مت لگاؤ۔ اب کوئی ہماری عمر دوڑ لگانے کی ہے۔ ہمایوں سعید کے خط میں ان کی نیت کا فتور نظر آتا ہے۔ عزیزم توصیف احمد اور پاشا بابر عباس کی فرصت کرو۔ ان کے ذہن کا علاج ہم کشتۂ ذہن صفا سے کریں گے۔ عزیزی شبانہ، زویا اعجاز تو جہاں تھیں سو تھیں۔ آپ کہاں تھیں۔ دونوں آتی رہا کریں ناں۔ سعدیہ بخاری ہم آپ کو کیسے مخاطب کریں کیونکہ عزیزم ہمایوں کا خط پڑھ کر ہم پریشان ہو گئے ہیں کہ اتنی معمر خاتون محفل میں کیسے آ پہنچی ہیں۔ موجودہ دور کی عکاسی کرتی کہانی مسافر بہت پسند آئی۔ خیر و شر سے متعلق کشکول بھی اچھی کہانی ہے۔ سب سے زیادہ ہمیں سسپنس میں پہلی تاریخی کہانی یار وفادار اور اولیائے کرام کے سلسلے کی کڑی میاں میر، بالا پیر پسند آئی اور آخری کہانی تو ہوتی ہی لاجواب ہے۔"

✠ **گل مروت، لکی مروت** سے محفل میں تشریف لائیں "کسی کے بہت زیادہ اصرار پر سسپنس میں دوسرا خط لکھ رہی ہوں۔ اکتوبر کا رسالہ بیس ستمبر کو ہاتھ میں آیا۔ سرورق پر سجایا گیا خوب صورت چہرہ، پراندے میں شرما کر چہرے کا چھپانا اچھا لگا۔ جون ایلیا مرحوم کا سیلاب جس کا حاصل یہ ہے کہ بے شک غم بہت زیادہ ہیں اور خوشی بہت کم۔ اپنی محفل میں آ کر دیکھا تو مہرین ناز کو سب سے پہلے لڑکھڑاتے دیکھا۔ کیوں مہرین ناز آپی قیصر اعوان کا دل بڑا اور نظر وسیع کرنے پر آپ نے انہیں وزیراعظم کی سیٹ دے دی ہے۔ بشریٰ آنٹی ہمیشہ اچھا لکھتی ہیں۔ ماریہ فاروق امتحان میں کامیابی پر مبارک باد۔ قیصر اعوان بھائی اللہ آپ لوگوں کی مشکلات آسان فرمائے۔ ہمایوں سعید آپ کو منگنی کی بہت بہت مبارک باد۔ اب ذکر ناصر ملک کی مسافر کا۔ اپنے اختتام کی جانب بڑھتی کہانی میں شہریار اور پروین کا ملاپ اچھا لگا۔ کشکول میں لیاقت حسین کا مقابلہ پھر پرتاب بھوشن سے ہونے والا ہے۔ پہلی کہانی یار وفادار بہت پسند آئی۔ آخری کہانی چشم دید گواہ نے آخر تک اپنے حصار میں لیے رکھا۔ ملک صاحب کی نیلا جھوٹ میں قانونی داؤ پیچ بہت پسند آئے۔ آخر میں میری طرف سے سب بھائیوں اور بہنوں کو اس بہن کی طرف سے عید قربان مبارک ہو۔"

✠ **شبانہ، لاہور** سے محفل کی زینت بنی ہیں "ذاکر انکل نے اپنے پنجاب کی مٹیارن کو ٹائٹل گرل بنایا۔ انکل معراج رسول اینڈ جون ایلیا نے سچ کہا ہے کہ اپنے اندر کے انتقام، نفرت، حسد اور تعصب کے سیلاب سے ہمیں کون بچانے آئے گا۔ مہرین ناز کرسی صدارت مبارک ہو۔ شکر ہے کہ کچھ نئے لوگ نامزد ہو رہے ہیں۔ ایک انسان کے دو نام ملک رحمت، ملک سجاد چودہ سال بعد آپ نے کس کے کہنے پر قسم توڑ دی؟ مسٹر ہمایوں کیوں سب کی عمروں کی جانچ پڑتال کرتے ہیں۔ کیا آپ نے زائچے بنانے ہیں۔ توصیف احمد آپ جاسوس تو نہیں سب کی خبر رکھتے ہیں۔ بھائی تفسیر عباس بابر آپ نے بجا فرمایا کہ رشتے احساس، خلوص، محبت اور درد کے ہوتے ہیں لیکن کچھ لوگ بے حس ہوتے ہیں۔ مظہر سلیم اینڈ جاوید شبیر اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا کرے سیلاب زدگان کی مدد کرنے پر۔ ظالموں اور مظلوموں کی کہانیوں کا اختتام کر دیں۔ سکندر اعظم، چنگیز خان، سقراط، افلاطون، نپولین اور شیکسپیئر ان لوگوں کو سسپنس کے پہلے صفحات کی زینت بنائیں۔ مسافر شروع سے بیسٹ اینڈ بیسٹ جا رہی ہے۔ کشکول میں بلی تھیلے سے باہر آ گئی ہے۔ آکٹوپس کی شامت کس کے ہاتھوں آتی ہے۔ لیاقت حسین بھی ایکشن میں آنے والا ہے۔ احمد اقبال کی چشم دید گواہ، نجمہ خانم کی طرح بننا چاہتی تھی لیکن وہ یہ بھول گئی کہ ہر عورت خانم کی طرح خوب صورت اور عقل مند نہیں ہوتی۔ ساحر جمیل سید کی بہروپ، کوئی بھی انسان پیدائشی برا نہیں ہوتا حالات اور معاشرہ اسے پھل بنا دیتے ہیں۔ نیلا جھوٹ ملک صفدر حیات کی ڈائری سے ایک سبق آموز واقعہ ہے ان مردوں کے لیے جو محبت کا کھیل کھیلتے ہوئے یہ نہیں سوچتے کہ ان کا احتساب اسی دنیا میں ہو سکتا ہے۔ منظر امام کی مبارک باد، میں ایک نصیحت تھی لڑکیوں کے لیے۔ کاشف زبیر کی زرد لہو، واقعی منفی سوچیں انسان کو غلط راستوں پر لے جاتی ہیں۔ صابن کی چوری نک ویلٹ نے معمولی سے صابن کا ٹکڑا چوری کر کے ایک بڑا مسئلہ حل کر دیا جسے انشورنس والے نہ حل کر سکے۔ تنویر ریاض کی احسان کارل نے استارم کی معصومیت سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

قاسمہ اٹھایا لیکن اسے نقصان ہوا جب کہ کارل اسے اپنا محسن مانتے ہوئے دوبارہ قسمت آزمانے کا مشورہ دے گیا۔ مترجم کہانیوں کے اور بجلی لکھنے والوں کا بھی نام دیا جائے تو ہماری معلومات میں اضافہ ہوگا۔ ضیا تسنیم بلگرامی اور سسپنس کی ٹیم کا شکریہ کہ حضرت میاں میر کے متعلق پڑھ کر ہماری معلومات میں اضافہ ہوا۔ کترنیں مناسب تھیں۔ تمام اسٹاف سمیت انکل معراج رسول آنٹی عذرا رسول اور تمام قارئین کو ہماری طرف سے ذوالحجہ اور عید الاضحیٰ بہت بہت مبارک ہو۔“ (آپ کو بھی مبارک ہو)

✠ **آغا فرید احمد خان، بکھر** سے محفل میں شریک ہوئے ”طویل عرصے کے بعد خط لکھ رہا ہوں لیکن ہم بتانا چاہتے ہیں کہ کبھی ہم بھی محفل کی جان ہوا کرتے تھے۔ جب آمنہ افضل، سعدیہ ہما، بابر عباس، حرا بخاری، ریاض بٹ، فرح ناز، راجا ثاقب، حفظ غزل کا طوطی بولتا تھا۔ اب دیکھتے ہیں کہ نئے دوست کیسے استقبال کرتے ہیں۔ جس دن یہ رسالہ دوستوں کے ہاتھ لگے گا اس دن قریب قریب میری سالگرہ گزر چکی ہوگی یعنی 11 اکتوبر (پھر بھی نیا نیا محفل کی جانب سے آپ کو سالگرہ مبارک ہو) سسپنس اٹھارہ کو ہاتھ آیا۔ حسینہ سرورق اٹریکٹو تھی۔ سب سے پہلے تو اپنے دوستوں کی محفل میں قدم رنجہ فرمائے جہاں میری پڑوسن مہرین ناز کو کرسی صدارت نصیب ہوئی۔ باجی جی مبارک ہو۔ آپ نے محفل والوں کو بنا چھیڑے ڈپلومیٹک جوابات سے نوازا ہے، بھئی کیا کہنے۔ بشریٰ افضل باجی آپ کی واپسی بہت اچھی لگی لیکن وہ دم خم نہیں دیکھ رہا جو آپ کا خاصہ ہوا کرتا تھا۔ ماریہ فاروق آپ کی طرف سے عید کی مبارک باد تو ہم نے قبول کر لی لیکن ایک بات کا تو پتا چل گیا کہ آپ کتنی فاسٹ چلتی ہیں۔ کریزوی بھائی بابر بھائی کی جوانی تم نے نہیں دیکھی۔ ہم گواہ ہیں یا پھر بشریٰ افضل۔ چیکو تھے چیکو بھائی ہے جو صنف احمقاں سے کوئی اسے چھیڑے، چیک ہی جاتے تھے۔ ہمایوں بھائی لگتا یہ ہے کہ کسی نے آپ کے پر کاٹ لیے ہیں۔ چھاپلیز اپنی ادا ذکر پر آؤ۔ تصویر العین آنٹی ہمایوں سعید کو نہ چھیڑو بات گلے پڑ جائے گی۔ شبانہ جی خط پورا پورچ میں لکھوایا اسٹور میں بیٹھ کر ماری تو صرف ہونگیاں ہی ہیں۔ تعبیر بھیا جب بھی آپ خط لکھیں تو پلیز آسان اردو میں لکھیں۔ اب آپ کا خط پڑھ جانے کے لیے لکھنوسے آدمی بلوانے سے تو ہم رہے۔ ہم جون ایلیا کو آسانی سے پڑھا اور سمجھ لیتے ہیں پر آپ کا خط نہیں۔ سعدیہ بخاری یہ کیا حماقت ہے، بھائی کوئی تو کام کی بات بھی لکھیں اپنے خط میں۔ کہانیوں کی ابتدا مسافر سے کی۔ چو کے ملنے بعد تو لگتا ہے کہانی ختم ہو جائے گی پر نہیں، ابھی تو شیر ے کو کچھ اور بھی لاشیں گرانی ہیں۔ صاف پتا چل رہا ہے کہ شیر افزالہ سے ہی شادی کرے گا۔ آخری صفحات پر احمد اقبال چشم دید گواہ لائے۔ بڑے ماہرانہ انداز میں کہانی کو آگے بڑھایا اور اختتام بھی دلکش انداز سے ہوا۔ مزاح کے رنگ میں رنگی یہ کہانی دل کو چھو گئی۔ ویل ڈن احمد اقبال۔ ملک صاحب کا نیلا جھوٹ بھی ہمیشہ کی طرح ایک ہی نشست میں ختم کیا، لاجواب تحریر تھی۔“

✠ **فوزیہ مسکین، مانسہرہ** سے محفل میں جلوہ گر ہوئیں ”اس بار سسپنس ڈائجسٹ کا شمارہ 24 ستمبر کو خاکی جنرل اسٹور سے مل گیا۔ سرورق کی لڑکی بہت خوب صورت ہے مگر یہ شرما کس سے رہی ہے؟ خطوط کی محفل میں لوگ وہی ہیں جو ہر ماہ پتا نہیں کیسے اتنا لمبا لمبا چھوڑتے ہیں۔ کشکول اور مسافر میں پچھلے صفحات کے دو دو صفحے بھرنے کے بجائے دو صفحات آگے ڈال دیں۔ بھائی ہم تو ہر کہانی قسط وار پڑھتے ہیں۔ آپ کو بتاؤں ہم سب کے انکل محمد ہمایوں تنولی عرصہ 25 سال سے سسپنس پڑھ رہے ہیں۔ بس اس سال جون سے چھوڑ دی ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ لکھاری لوگ لفظوں کے جادوگر ہیں قاری کو ایسا باندھ دیتے ہیں کہ وہ کہیں نہیں جا سکتا۔ جہاں قاری سوچتا ہے کہ مسافر کے شہر یار کے ساتھ یہ ہوتا مگر لکھاری تو اس کے ارمانوں کا خون کرنے پر تلا ہوتا ہے۔“

✠ **محمد قدرت اللہ نیازی، خانیوال** سے حاضر محفل ہوئے ہیں ”اکتوبر 2013ء کا شمارہ بروقت مل گیا۔ حسینہ گرمیوں کے اختتام سے خوش نظر آ رہی ہے۔ انشائیہ میں جون ایلیا اور معراج رسول ظاہر و باطن کے سیلاب پر کڑھتے نظر آئے، اور یہ حکمرانوں کی تبدیلی اور حالات کی تبدیلی کی امید سے حزیں تھا اور حقیقت صرف پرانے چہروں نے اپنی باری لی ہے، نہ نظام بدلا ہے نہ عوام کی حالت بدلے گی۔ سب سے پہلے کشکول پڑھی یوں محسوس ہو رہا ہے کہ کر نومبر میں کشکول کی آخری قسط ہوگی۔ پرتاب بھوشن اور لیاقت حسین آمنے سامنے ہیں دوسری طرف لوچن، بگا اور ایس پی شیخ حامد کی تاک میں ہیں۔ افضل خان کا ایکشن پسند آیا۔ مسافر میں پھر میڈم شکیلہ ہی چھائی رہی۔ شہریار کو اینڈ میں پھر گن پوائنٹ پر لے لیا گیا۔ بیاجی کے خدشات کے سبب یہ کہانی بھی اختتام کے قریب محسوس ہو رہی ہے۔ احمد اقبال کی چشم دید گواہ بہتر رہی۔ راجا کا کردار شاید بزدل کے کردار سے متاثر ہو کر لکھا گیا۔ دشمن جاں مریم کے خان ایک تخیلاتی تحریر در آمد کر کے لائیں تاہم اس میں محبت فطری نظر آئی۔ سلیم انور کی وبال جان مختصر مگر دلچسپ رہی جولیا کے شوہر نے اپنے گلے سے بلا اتار کے اس کے عاشق کے سر ڈال دی۔ منظر امام مبارک باد لے کر آئے اچھی گپ تھی تاہم ارم کو ندیم کی صورت میں سچی محبت ضرور مل گئی۔ تنویر ریاض کی احسان سوسوری کسی کا زخم ور نگین استادم کی زندگی بدل گیا ورنہ حقیقت یہی ہے کہ گی بندھی نوکری چھوڑنا بہت دل گردے کا کام ہے۔ ساحر جمیل سید بہروپ لے کر تشریف لائے۔ سچ ہے ظاہر سے باطن کا اندازہ لگانا ممکن نہیں۔ اب آتے ہیں محفل کی طرف۔ مہرین ناز اپنے مختصر تبصرے کے ساتھ کرسی صدارت پر خوشی سے لوٹ پوٹ ہو رہی تھیں۔ مہرین ناز بجا جی کی طرف خیر ہی ہے اور یہ آپ کو بھی پتا ہے۔ منظر سلیم، زویا اعجاز کو زیادہ شاباشیاں نہ دیں ورنہ کل سر پر بیٹھ کر ناچیں گی محترمہ۔ سیف علی اعوان آپ شاید موت کے سوداگر کے اختتام کو اقلیم علیم صاحب کی رحلت سے تعبیر کر بیٹھے ہیں؟ ہماری ادارے سے گزارش ہے کہ ان کو بگڑ ذرے والوں کے ساتھ آخری صفحات کے لیے کہانی لکھنے پر بھی آمادہ کیا جائے (آپ کی یہ فرمائش نوٹ کر لی گئی ہے) بشریٰ افضل جی، جب عورت گھر کو اپنی تیز ہی فطرت سے سرکس بنا رکھے تو مرد حضرات نے عزت بچانے کے لیے کونے کھدروں میں ہی چھپنا ہے۔ ماریہ فاروق ایف ایس سی میں فرسٹ ڈویژن کی مبارک ہو۔ ہمایوں سعید بابر عباس نے درفطنی چھوڑی ہے۔ میری طرح آپ کی بھی کئی بار فون پر ان سے بات ہوئی ہے وہ ہرگز ستر سال کے نہیں ہیں۔ اے ایم چوہدری آپ نے آخر اپنا پس منظر بتا ہی دیا اچھا کیا کچھ لوگ پریشان تھے کہ یہ ہے کیا چیز۔ تصویر العین تبصروں کو کس طرح ٹیسٹ

کرتی ہیں کوئی کھٹا میٹھا، کوئی نمکین؟ تفسیر عباس بھی آپ کو ایک راز کی بات بتاتی ہے کان ذرا قریب لائیں اور قریب جی تو بات یہ ہے کہ اب ماما ایمان والا ڈراما بند کر دیں کیونکہ بہت سے لوگ آپ کو پہچان گئے ہیں۔ محفل شعر و سخن بھی بہترین انتخاب سے سجی تھی۔“

✠ **تفسیر عباس بابر، اوکاڑہ** سے تبصرہ کر رہے ہیں ”منفرد...... دیدہ زیب اور جاذب نظر سرورق اور کسی کی بے تاب نظروں کی تاب نہ لا کر شرماتی ہوئی دوشیزہ، سرورق کے حسن جہاں سوز نے متاثر کیا۔ جون ایلیا کا انشائیہ حسب روایت عہد نا گوار کے تلخ حالات کا دلخراش نوحہ...... بپھرے ہوئے پانیوں کی طغیانیوں اور نافرمانیوں کا چشم کشا احوال دعوت فکر دے گیا۔ ماروی ماہر نباض دوراں کی بھرپور آمد کی نوید...... سو ہم بصد شوق و خلوص تہ دل سے چشم براہ ہیں۔ صدارت کے سنگھاسن پر حیدر آباد سے مہرین ناز کا مفصل و مربوط تبصرہ اور چٹکی چٹپٹی باتیں جو کہ...... خواتین کا خاصہ ہیں بغور و فکر ملاحظہ کیں۔ (مبارکباد) اور سعدیہ بخاری ذہنی مسائل سے عرصہ طویل سے دوچار ہیں ان کی اوٹ پٹانگ بونگیوں پر کان نہ دھریں۔ مستند تبصرہ نگار بشریٰ افضل کی دوبارہ واپسی اور باقاعدہ حاضری نیک شگون ہے۔ لاہور سے زویا اعجاز بزم یاراں میں بہترین اضافہ۔ حمیرا رضا اور تصویر العین کے بعد، ہم آپ کا تبصرہ بصد شوق پڑھتے ہیں۔ اوکاڑہ سے تصویر العین کا منفرد انداز بیاں اور لاہور کینٹ سے شبانہ کے بہترین اظہار خیال نے متاثر کیا۔ حافظ آباد کی بڑی اماں اس ماہ غیر حاضر...... باعث تشویش اور مقام توبہ ہے۔ عرصہ دراز کے بعد الیاس سیتاپوری کے انمول و نایاب الفاظ کا بیش قیمت خزینہ...... یار وفادار کی صورت میں دریافت ہوا۔ فرخ سیر کے المناک انجام نے نہایت مغموم و افسردہ کیا۔ آخری صفحات پر پسندیدہ و ہر دلعزیز مصنف احمد اقبال کے شہ پارہ شبنم نشان قلم کا شاخسانہ چشم دید گواہ...... ریاست کی غلام گردشوں میں گردش کرتی ہوئی سیاستیں، سازشیں، منافقتیں اور عیاریاں و مکاریاں...... نجمہ کے بہترین کردار اور ہمت و عزم صمیم نے بے حد متاثر کیا۔ ملک صفدر حیات کی اثر انگیز و عبرت آموز تحریر نیلا جھوٹ نے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ کاشف زبیر کی داستان خونچکاں، زرد لہو، حرص و ہوس کے اسیروں کی بے حسی بے ثباتی اور شقی القلبی کہ اپنے اغراض و مفادات کے لیے انسانی خون کو بھی...... پانی سے ارزاں کر دیا۔ انور صدیقی کی کشکول دلچسپ و سنسنی خیز اور یقیناً آخری مراحل سے گزر رہی ہے۔ صابن کی چوری، سنگ ولیوٹ کا ایک تازہ ہلکا پھلکا پر مزاح قصہ ثابت ہوا۔ ساحر جمیل سید کی اثر انگیز تحریر بہروپ نے بہت زیادہ متاثر کیا۔ سلسلہ مسافر اپنی مثال آپ ہے۔ میڈم شکیلہ بہت اہم اور پاور فل کردار۔ شہر یار اپنے گاؤں میں...... دیکھیے کیسے پذیرائی ہوتی ہے۔ منظر امام کی مبارکباد محبت کا انوکھا اور منفرد انداز...... بوجھل لمحوں کے لیے اکسیر قلب...... سلیم انور کی وبال جان بھی خوب رہی۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی منفرد و نایاب تحریر و تحقیق میاں میر بالا پیر نے ایمان تازہ اور معلومات میں اضافہ کیا۔ مریم کے خان کی دشمن جاں جو کہ جان سے بھی پیارے ہو گئے، نے دل چھو لیا۔ بزم شعر و سخن میں قارئین کا بہترین ذوق اور منفرد انتخاب ہمارے ذاتی کلام کی باقاعدہ اشاعت کے لیے از حد نوازش...... ساتھ ہی سرکار کے اور قارئین کے گوش گزار تے چلیں کہ...... ہمارا دوسرا شعری مجموعہ...... سلسلہ دل کا ہے عنقریب شائع ہو رہا ہے۔“ (بے حد مبارکباد)

✠ **محمد خواجہ، کورنگی، کراچی** سے محفل میں اپنے خوب صورت تبصرے کے ساتھ شرکت کر رہے ہیں ”اکتوبر کا ماہنامہ 16 تاریخ کو ہی مل گیا۔ سرورق پر دیہات کا منظر اور گھنا درخت کے نیچے بیٹھا ہے۔ اتنے عمدہ سرورق پر ادارہ کی سلیکشن کے لیے مبارک باد۔ مہرین صاحبہ کو پہلے نمبر پر آنے کی مبارک باد قبول ہو۔ آپ نے مختصر لیکن جامع خط لکھا۔ ستمبر کے ماہنامہ میں میرے خط پر مدیرہ عالی کی نظر عنایت سے پہلا نمبر دیا گیا۔ بہت شکر گزار ہوں۔ بہت سے مہربان قارئین نے مبارک باد دی سب کا شکر گزار ہوں، خاص طور پر احسان سحر کا انداز تحسین بہت خوب صورت لگا۔ رمضان پاشا نے بڑی بے نیازی دکھائی اور مجھے اس محفل میں نیا ممبر قرار دیا۔ حالانکہ میں سسپنس کا بہت پرانا قاری ہوں۔ جون ایلیا اور معراج رسول صاحبان نے باہر اور اندر کے سیلاب کی خوب تشریح کی۔ باہر کا سیلاب موسم کا ہے لیکن اندر کا سیلاب ایک مستقل عذاب ہے۔ ہمارے یہاں انقلاب کی باتیں بہت ہوتی ہیں۔ ابوالکلام آزاد نے پاکستان بنتے وقت کہا تھا کہ انقلاب ذہنی ہونا چاہیے لیکن ذہنی انقلاب نہیں آیا اور آلودہ ذہنوں نے اس پیاری سرزمین کو کس مقام پر پہنچا دیا۔ ناصر ملک کی مسافر میں ہر ذائقہ موجود ہے جو مزہ ہی مزہ دے رہا ہے لیکن یہ کیا کہ اس قسط میں لگا کہ میڈم شکیلہ جلدی جلدی کام تمام کر کے بوریا بستر باندھ رہی ہیں۔ شاید ناصر ملک صاحب کہانی کو اختتام کی طرف موڑ دے رہے ہیں۔ (آپ کا اندازہ صد فیصد درست ہے) ملک صفدر حیات کا نیلا جھوٹ بڑی اصلاحی اور عمدہ پیشکش ہے۔ نجمہ سودی کی صابن کی چوری نے کچھ زیادہ مزہ نہیں دیا۔ زرد لہو میں کاشف زبیر نے اچھی میہماتی کہانی لکھی۔ مبارک باد منظر امام کی ہلکی پھلکی تفریحی کہانی ہے۔ اگر ایسا ہونے لگے تو لوگ محبت کرنے سے پہلے سو مرتبہ سوچیں گے۔ وبال جان بڑی ہی مختصر کہانی لیکن تھی بڑی انوکھی۔ دشمن جاں یوں تو دوسرے سیاروں کی مخلوق کے گرد کہانی نے احاطہ کیا ہوا ہے۔ یار وفادار الیاس سیتاپوری تاریخ کے بہت سے پوشیدہ اور گمشدہ واقعات کو منظر عام پر لاتے ہیں۔ برصغیر میں بادشاہت کی تاریخ نفرت، حسد، سازش سے بھری پڑی ہے۔ بہروپ ساحر جمیل سید کی تحریر بڑی اچھی ہے۔ ظاہر اور باطن کی پہچان بڑی مشکل سے ہوتی ہے۔ مجمل ایسا کردار ہے جو سر سے پیر تک برائی کا مجسمہ تھا۔ جب یہ مجسمہ ٹوٹا تو ایسا انسان باہر آیا کتنی مختلف کتنی مضبوط شخصیت یک مرد مومن کی طرح۔ احمد اقبال کی چشم دید گواہ ایک طویل کہانی ثابت ہوئی۔“

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

انجم ریاض، نیول کالونی ڈالمیاں، کراچی۔ رضوان تنولی کریزوی، اورنگی ٹاؤن، کراچی۔ عبدالغفور خان ساحری جھنگ، ضلع اٹک۔ ہارون رشید، مردان۔ ماریہ فاروق، چمن۔ احسان سحر، میانوالی۔ ملک قیصر اعوان، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا۔ سیف علی اعوان، نور پور اعواناں۔ عباسہ مغل، ڈونگہ، گجرات۔ محمد جاوید، علی پور۔ سید محی الدین اشفاق، فتح پور، لیہ۔ تابی اور بابو، صفدر آباد۔ حبیب احمد چنائے، الگڈی، کرک۔ شیر علی خان، راولپنڈی۔ محمد ہمایوں سعید، بنوں۔ سید اکبر شاہ، اوگی مانسہرہ۔ محمد صفدر معاویہ، خانیوال۔ ابرار وارث، سندلیانوالی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہ دشت ہے ٹھگوں کا

الیاس سیتاپوری

عہدِ جدید ہو یا عہدِ قدیم... ہمیشہ سے ہی نیکی بدی، اچھائی برائی، اندھیرے اور روشنی کا متوازی سفر ساتھ ساتھ رہا ہے۔ البتہ ان کے ہم سفر کردار اپنے مزاج کے مطابق کبھی مثبت اور کبھی منفی انداز میں انہیں واضح کرنے کا سبب ضرور بنتے رہے ہیں۔ تاریخی کردار "فرخ سیر" کی عبرت ناک ہلاکت کے بعد تختِ شاہی پر کتنے ہی چہرے آئے اور گئے مگر ان کے آنے اور جانے کے پیچھے خفیہ اور مضبوط ہاتھ ہمیشہ ایک ہی گروہ کے رہے... اچھائی میں اتفاق ہو نہ ہو مگر برائی میں اتحاد ضروری ہوتا ہے... ورنہ اتنے منظم انداز میں یہ گروہ کام نہیں کرسکتا تھا... لیکن قلعہ چاہے کتنا ہی مضبوط ہو اکثر جذباتی تلاطم بنیادیں ہلا دیتا ہے... انہیں بھی اپنی طاقت پر بڑا گھمنڈ تھا جو خود کو بادشاہ گر کہتے تھے... مگر آخر کب تک ان کے اتفاق میں تفرق نہ پڑتا... بالآخر سلطنت کی ڈوریاں ہلانے والے ایک دن حالات کے اشاروں پر ناچنے کے لیے مجبور ہوگئے کیونکہ وقت اور مقدر سے بڑا بازی گر کوئی نہیں... جسے جب چاہے شاہ بنادے اور جب چاہے گدا۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

بادشاہ کو ترپولیے میں قید کردینے کے بعد شاہی محل میں مدقوق اور مسلول شہزادے رفیع الدرجات کی رسوم بادشاہی ادا کی جارہی تھیں۔ محل سرا میں خوف اور دہشت کی حکمرانی تھی۔ بیس سالہ دبلا پتلا شہزادہ جو اورنگ زیب کے بیٹے رفیع الشان کا بیٹا تھا جب قید خانے سے باہر لایا گیا اور اسے یہ معلوم ہوا کہ ہما اس کے سر پر سایہ فگن ہے تو اس کی خوشی کی

کوئی انتہا نہ رہی۔ نئے بادشاہ کا ایک بھائی اور تھا رفیع الدولہ اسے بھی نئے بادشاہ کے ساتھ ہی قید خانے سے باہر لایا گیا۔ قلعے کے باہر ایک ہنگامہ برپا تھا اور لوگ یہ جاننا چاہتے تھے کہ بادشاہ فرخ سیر اور سید زادوں کی جنگ میں جیت کس کی ہوئی۔ عبداللہ خاں شہزادے رفیع الدرجات کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔ دق اور سل نے شہزادے کے چہرے کو

WWW.PAKSOCIETY.COM

سوت کر رکھ دیا تھا، آنکھیں گڑھوں میں گھس گئی تھیں، چہرے پر تازگی، شگفتگی اور سرخی کی جگہ زردی، بے رونقی اور پھیکے پن نے لے لی تھی۔ شہزادے کا لباس بھی میلا اور بوسیدہ تھا۔

شہزادے نے کسلمندی سے کہا۔ ”میں غسل کرنا چاہتا ہوں، مجھے دوسرا لباس مہیا کیا جائے۔“

عبداللہ خاں نے ترشی سے جواب دیا۔ ”نہیں، یہ وقت ایسا نہیں ہے کہ تم غسل کرو یا لباس بدلو، کیا تمہارے کانوں میں لوگوں کے شور و غل کی آوازیں نہیں آرہی ہیں؟“

شہزادے نے لمحے بھر کے لیے سکوت اختیار کیا، پھر کہا۔ ”ہاں، آوازیں تو آرہی ہیں۔“

عبداللہ خاں نے جواب دیا۔ ”یہ آوازیں اس وقت تک آتی رہیں گی جب تک نقارۂ شاہی پر چوٹ نہیں پڑے گی۔“

عبداللہ خاں نے اپنے گلے سے مالائے مروارید اتارا اور شہزادے کے گلے میں ڈال دیا اور اس کے ساتھ ہی چاروں طرف سے مبارک سلامت کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ عبداللہ خاں نے حکم دیا کہ نئے بادشاہ کی تخت نشینی کی رسوم شان و شوکت سے ادا کی جائیں۔

میلے کچیلے لباس میں ملبوس شہزادہ رفیع الدرجات کو بادشاہ بنا دیا گیا۔ شاہی نوبت بجنے لگی اور لوگوں کو یہ یقین ہو گیا کہ کسی نہ کسی بادشاہ کی رسم تخت نشینی ادا کی جا چکی ہے۔ باہر گلی کوچوں اور بازاروں میں نئے بادشاہ کی طرف سے یہ اعلان ہو رہا تھا۔ ”جو لوگ گھروں سے باہر ہیں، اپنے اپنے گھروں میں واپس جائیں۔“

صابن کے جھاگ کی طرح سارے ہنگامے دب گئے، لوگ اپنے اپنے گھروں میں چلے گئے۔

دوسرے دن نئے بادشاہ نے رسم و رواج کے مطابق عام لوگوں سے خطاب کیا اور یہ حکم صادر ہوا کہ جو ملازمت کا خواہش مند ہے وہ عبداللہ خاں کے چھوٹے بھائی امیر الامرا حسین علی خاں سے رجوع کرے۔ اعتماد الدولہ محمد امین خاں بخشی گری دوم کے منصب پر بہ دستور فائز رہا۔ نظام الملک کو مالوے کی صوبیداری عطا ہوئی۔ اسی طرح دوسرے امرا کو بھی نوازا گیا۔

عبداللہ خاں قلعے کے اندر ہی رہا۔ اس نے قلعے اور محل کے تمام دروازوں پر اپنے آدمی تعینات کر دیے تھے۔ یہاں تک کہ خواجہ سرا، بہشتی، خانساماں اور پہرے داروں میں ایک بھی ایسا نہ تھا، جس سے عبداللہ خاں واقف نہ ہوتا۔ عبداللہ خاں کو فرخ سیر کی تلاش کے دوران حرم سرا کی چند عورتیں اور لڑکیاں بہت پسند آگئی تھیں، اس نے خواجہ سراؤں کے نگران کو بلا کر حکم دیا۔ ”معتمد خاں! میں نے شاہی حرم سرا کی چند عورتوں کو بہت پسند کیا ہے۔ تم اندر جاؤ اور بہ آواز بلند ان سے پوچھو کہ وہ کون سی عورتیں ہیں جنہیں قطب الملک نے اپنے لیے پسند کر لیا ہے؟“

خواجہ سرا معتمد خاں نے پوچھا۔ ”اگر وہ عورتیں میرے سامنے آجائیں تو مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

عبداللہ خاں نے رعونت سے جواب دیا۔ ”اب مغل تخت و تاج میرے اپنے اختیار میں ہیں، اس ملک پر وہی حکومت کرے گا جسے ہم دونوں بھائی پسند کریں گے۔ اب اصولاً شاہی حرم سرا بھی ہمارے اپنے تصرف میں ہونا چاہیے لیکن میں اس بات کو پسند نہیں کرتا اور اپنے مرتبے اور اختیارات کی نمائش یوں کرنا چاہتا ہوں کہ شاہی حرم سرا میں سے جو لڑکیاں یا خواتین مجھے پسند آئیں، انہیں میں اپنے پاس ہی رکھ لینا چاہتا ہوں۔ وہ قطب الملک عبداللہ خاں یارِ وفادار کے پاس، اس کی حرم سرا میں رہیں گی۔“

خواجہ سرا نے سہم کر عبداللہ خاں کی ہاں میں ہاں ملائی لیکن معاً اسے کچھ خیال آگیا۔ وہ اس سلسلے میں نئے بادشاہ کی ایما ضرور جاننا چاہتا تھا۔ وہ نئے بادشاہ کے پاس جا کر عبداللہ خاں کی درخواست پیش کرنا چاہتا تھا اور اسے جو کچھ کرنا تھا، نئے بادشاہ کی اجازت اور منظوری سے کرنا تھا لیکن اسے مشکل یہ پیش آئی کہ بادشاہ کو تخلیہ میسر ہی نہ تھا، اس کے آس پاس ہر وقت عبداللہ خاں کے آدمی موجود رہتے تھے۔ رات کو جب بادشاہ حرم سرا میں جانے لگا تو شاہی اطبا نے نہایت ادب و احترام سے منع کیا۔ ”چونکہ ظل اللہ کو مرض سل لاحق ہے اور منہ سے خون آتا ہے اس لیے ہم عاجزان و ملازمان شاہی اور بندگان قبلہ گاہی کا حضور کے لیے یہ مشورہ ہے کہ عورتوں سے پرہیز فرمائیں، کیونکہ اس ناہنجار مرض میں عورتیں دیمک کی حیثیت رکھتی ہیں جو کتاب زندگی کو فوراً چاٹ جاتی ہیں۔“

بیس سالہ منحنی اور مسلول بادشاہ نے ترسے ہوئے حریص کی طرح جواب دیا۔ ”میں نے بڑی مصیبتیں جھیلی ہیں، بڑے دکھ اٹھائے ہیں، عورت اور لڑکی تو بہت بڑی چیز تھیں، میں اچھے کھانے تک کو ترستا رہا ہوں اور اب جبکہ خدا نے اپنے انعام و اکرام کے خزانے میرے حوالے کر دیے ہیں تو تم لوگ اپنی حاسدانہ رائے اور مشورے سے مانع آنے کی کوشش کر رہے ہو، افسوس کہ میں تمہارا مشورہ نہیں مان سکتا۔“

اطبا خاموش ہو گئے اور واپس جانے لگے، ان کے ہٹتے ہی خواجہ سرا معتمد خاں آگے بڑھا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ نئے بادشاہ نے طنزاً پوچھا۔ ”معتمد خاں! تجھے کون سی نصیحت کرنا ہے؟“

معتمد خاں نے جواب دیا۔ ”حضور والا! اس ناچیز کو نصیحت نہیں اجازت درکار ہے، قطب الملک عبداللہ خاں کو حرم سرائے شاہی کی چند خواتین پسند آگئی ہیں اور وہ انہیں طلب کر رہا ہے تاکہ وہ ان سے اپنے کاشانۂ عیش کو فروزاں کرے۔“

لمحہ بھر کے لیے بادشاہ کا چہرہ متغیر ہو گیا، پھر حواس پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ”معتمد خاں! کیا تو یہ چاہتا ہے کہ میں ان نعمات اور لذات سے محروم رہوں جو مجھے ان دونوں سیدزادوں کے طفیل میسر آئی ہیں؟“

خواجہ سرا معتمد خاں نے جواب دیا۔ ”نہیں، میں یہ ہرگز نہیں چاہتا۔“

بادشاہ نے چڑچڑے لہجے میں کہا۔ ”پھر تو تجھے ان دونوں کا ہر حکم ماننا چاہیے، یہ دونوں سید بھی ہیں اور میرے محسن بھی۔“

خواجہ سرا ہکا بکا رہ گیا، اسے نہیں معلوم تھا کہ تیموری غیرت خون کے ساتھ جسم و روح سے خارج ہو چکی ہے۔

بادشاہ اندر چلا گیا، خواجہ سرا واپس ہوا اور اس نے شاہی محل سے ذرا دور ایک چھوٹے سے میدان میں ان اطبا کو ”اناللہ“ پڑھتے سنا۔ شاید وہ لوگ نئے بادشاہ کی زندگی ہی میں ”اناللہ“ پڑھے دے رہے تھے۔ خواجہ سرا ان کے پاس سے گزر کر شاہی محل کے جنوبی حصے میں پہنچ گیا۔ یہیں محل کا ایک حصہ عبداللہ خاں کے تصرف میں دے دیا گیا تھا۔ عبداللہ خاں اپنے عشرت کدے میں جا چکا تھا، اسے جیسے ہی کسی نے یہ بتایا کہ خواجہ سرا معتمد خاں حاضر ہے، وہ فوراً ہی باہر آگیا۔ اس نے بڑی بے مروتی اور خشک لہجے میں پوچھا۔ ”معتمد خاں! میری مطلوبہ چیزیں کہاں ہیں؟“

خواجہ سرا نے جواب دیا۔ ”جناب والا! میں شاہی حرم سرا میں انہیں کہاں تلاش کروں گا۔ ہاں اگر ان کے نام معلوم ہو جائیں تو انہیں فوراً حاضر کیا جا سکتا ہے، ورنہ یوں بڑی مشکل پیش آئے گی۔“

عبداللہ خاں ایک دم برہم ہو گیا۔ ”نمک حرام، عاقبت نااندیش، کور دیدہ! میں حکم کی تعمیل جانتا ہوں اور کچھ نہیں۔ تجھ کو اس لب گور بادشاہ کی اجازت کے بغیر ہی یہ کام انجام دینا تھا اور رہ گئے وہ شاہی اطبا جو یہ چاہتے ہیں کہ بادشاہ صحت مند اور زندہ رہے تو میں دیکھوں گا کہ بادشاہ کو ان کی اب بھی ضرورت رہتی ہے یا نہیں۔ میں تو تجھ سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ سلطنت مغلیہ کی موجودہ بساط پر تجھے ہم دونوں بھائی کہاں نظر آتے ہیں؟ اس بساط پر ہماری کیا حیثیت ہے؟“

عقلمند خواجہ سرا نے بے جھجک جواب دیا۔ ”سلطنت مغلیہ کی موجودہ بساط پر آپ کہیں بھی نظر نہیں آتے۔ میں تو آپ کو اس بساط سے الگ شاطر کی جگہ پر دیکھ رہا ہوں جس کے قبضہ و اختیار میں فرزیں بھی ہے اور بادشاہ بھی۔ آپ دونوں کا کسی اور سے کیا مقابلہ!“

عبداللہ خاں خوش ہو گیا، چھت سے لٹکے ہوئے جھاڑ فانوس کی روشنی میں عبداللہ خاں کا خوشی سے تمتمایا ہوا چہرہ بڑا خوفناک لگ رہا تھا، اس نے معتمد خاں سے اندر چلنے کے لیے کہا۔ معتمد خاں حکم کی تعمیل میں درونِ خانہ داخل ہو گیا، اس کے پیچھے پیچھے عبداللہ خاں بھی داخل ہوا۔ عبداللہ خاں نے بہ آواز بلند حکم دیا۔ ”شاہی محل سے آئی ہوئی خواتین حاضر کی جائیں۔“

چند خواتین جو چوڑی دار پاجامے پہنے شعلہ جوالا بنی ہوئی تھیں، عبداللہ خاں کے حضور میں حاضر کر دی گئیں۔ معتمد خاں نے دیکھا کہ چاروں طرف عبداللہ خاں کے عیش و عشرت کے معاون اور مددگار پھیلے ہوئے ہیں، وہ خوفزدہ ہو گیا۔ عبداللہ خاں نے شاہی خواتین کو اپنے سامنے کھڑے رکھ کر تکبر سے کہا۔ ”معتمد خاں! ان عورتوں کو دیکھ دیکھ کر مجھے جو خوشی حاصل ہو رہی ہے، وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جو تجھے میرے چہرے پر نظر آرہی ہوگی۔“

معتمد خاں ان میں سے کئی کو اس لیے بہ طور خاص پہچانتا تھا کہ وہ فرخ سیر کی پسندیدہ رہ چکی تھیں۔ اسے

کرم فرما

ایک نیا شادی شدہ جوڑا کسی تفریحی مقام پر ہنی مون منانے گیا۔ ہوٹل منیجر نے جب پوچھے بغیر ان کا نام رجسٹر میں لکھ لیا تو بیوی بہت حیران ہوئی، اس نے منیجر سے پوچھا۔ ”آپ کو میرے شوہر کا نام کیسے معلوم ہو گیا؟“

منیجر نے جواب دیا۔ ”یہ ہمارے پرانے ”کرم فرما“ ہیں ہر سال ہنی مون منانے کے لیے ہمارے ہی ہوٹل میں قیام کرتے ہیں۔“

مرسلہ: شبانہ، لاہور کینٹ

WWW.PAKSOCIETY.COM

افسوس اس بات کا تھا کہ جس حرم سرائے شاہی میں کسی غیر کا خیال تک نہیں پہنچ سکتا تھا، اس جگہ عبداللہ خاں کئی مرتبہ بے روک ٹوک داخل ہو چکا تھا اور وہاں سے اپنی پسند کی کئی حسین و جمیل بیگمات کو اپنے لیے نکال لایا تھا۔ عبداللہ خاں نے ایک نسبتاً کم سن خاتون کو مخاطب کیا۔ ''مہرن! آپ اسے پہچانتی ہیں؟''

یہ کہتے ہوئے اس نے معتمد خاں کی طرف اشارہ کیا۔

مہرن نے معتمد خاں کو سرسری نظر سے دیکھ کر جواب دیا۔ ''ایک اسے کیا، میں تو ہر اس شخص کو پہچانتی ہوں جس کے چہرے پر نمک حرامی کا داغ لگ چکا ہے۔''

عبداللہ خاں کی طبیعت مکدر ہوگئی اور وہاں جو بھی موجود تھا، پریشان اور حواس باختہ ہوگیا۔ عبداللہ خاں نے ترش لہجے میں کہا۔ ''مہرن! میں نے تجھے احتراماً 'آپ' سے مخاطب کیا تھا لیکن اندازہ یہ ہوا کہ تم لوگ فرخ سیر کی طرح کسی بھی ہمدردی اور احترام کے مستحق نہیں ہو۔'' پھر معتمد خاں کو حکم دیا۔ ''اب تم جاسکتے ہو اور دیکھو، آیندہ اس کا بہ طور خاص خیال رہے کہ میں اپنے احکام کی تعمیل اور بجا آوری میں چیں چناں اور چچر مچر کا بالکل قائل نہیں ہوں، تعمیل اور صرف تعمیل، کس طرح؟ میں نہیں جانتا اور نہ ہی جاننا چاہتا ہوں اور جو لوگ میرے اس معیار پر پورے نہیں اتریں گے، انہیں ان کی خدمات سے سبکدوش کردیا جائے گا۔''

معتمد خاں سر جھکا کر چلا گیا۔

عبداللہ خاں نے سب کی موجودگی میں مہرن کو دبوچ لیا، بولا۔ ''تیرے پندارِ شاہی اور احساس بڑائی کو میں اس طرح تیرے وجود سے نکال دوں گا جس طرح تیرے آقا اور ولی نعمت فرخ سیر کو تخت و تاج سے دور کردیا ہے۔''

مہرن نے ہاتھ پیر چلائے اور آزاد ہونے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی، اس رات اس نے شاہی خواتین کی موجودگی میں، ان کے سامنے ایک دوسرے کو بے آبرو کیا، ہنس ہنس کے داد عیش دیتا رہا اور بہ طور خاص مہرن کو زیادہ ہلکان کیا۔ وہ اپنے ایک ایک طرز عمل سے مہرن کو خوار کرنے کی کوشش کرتا رہا، کیونکہ وہ یہ سمجھتا تھا کہ مہرن اسی طرح اس کے سامنے ہتھیار ڈال سکتی تھی۔ عبداللہ خاں کو جھنجلاہٹ اس بات کی تھی کہ اس وقت وہ اور اس کا چھوٹا بھائی امیر الامرا حسین علی خاں، دونوں اس ملک کے سب سے بڑے اور سب سے زیادہ بااختیار شخص تھے اور ان کی اس برتری اور عظمت کو ہر ایک نے تسلیم بھی کرلیا تھا لیکن یہ حقیر سی عورت مہرن، جو نہ تو پوری طرح عورت ہی بنی تھی اور نہ ہی لڑکی رہی تھی، بلکہ ان دونوں کی سرحد پر کھڑی تھی، اپنے پندار شاہی اور خاندانی غرور میں اس کی بڑائی اور عظمت کو جھٹلانے اور ٹھکرانے کی کوشش کررہی تھی۔ عبداللہ خاں نے شاہی قلعے اور حرم سرا کو فتح کرلیا تھا لیکن یہ مہرن تھی جو اس کے لیے ناقابل تسخیر ثابت ہو رہی تھی۔

سرتا پا برہنہ مہرن کو تحقیر آمیز انداز میں دیکھتے ہوئے عبداللہ خاں نے مخاطب کیا۔ ''میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ جب اس ملک کی ہر چیز پر ہمیں اختیار اور حق تصرف حاصل ہے تو تو حقیر سی لڑکی مجھ جیسے پہاڑ سے ٹکرانے کی کیوں کوشش کررہی ہے؟''

مہرن نے حقارت سے جواب دیا۔ ''اس ملک اور حکومت میں تجھے ویسا ہی اختیار اور حق تصرف حاصل ہے، جیسا کسی ڈاکو کو کسی غیر کے گھر پر زبردستی قبضہ جما کر حاصل ہوجاتا ہے۔''

عبداللہ خاں مشتعل ہوگیا، غصے میں جواب دیا۔ ''جذباتی مگر بے وقوف لڑکی! میں تجھے قتل کرسکتا ہوں، لیکن یہ قتل اتنا معمولی اور غیر اہم ہوگا کہ کسی طرح میرے شایان شان نہ ہوگا۔ کیا کوئی بہادر انسان ایک چوہیا کو مارنا پسند کرے گا؟ ہرگز نہیں۔''

مہرن نے جواب دیا۔ ''میں تو چاہتی ہی یہی ہوں کہ تو مجھے قتل کردے۔''

عبداللہ خاں ہنس دیا لیکن اس ہنسی میں بھی اس کا غصہ اور اشتعال شامل تھا، بولا۔ ''نہیں، تجھے مرنے نہیں دیا جائے گا کیونکہ تیری موت تیری جیت اور میری ہار ہوگی اور تیری زندگی میری جیت اور تیری ہار۔ میں اپنی شکست تو برداشت ہی نہیں کرسکتا۔''

مہرن نے جواب دیا۔ ''کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ تو اپنے جبر اور نفرت سے مجھے جیت لے گا؟''

عبداللہ خاں ایک ایسی جھنجلاہٹ کا شکار ہوگیا تھا، جس کا کوئی علاج نہ تھا، ایک معمولی سی لڑکی اس کی انا کے لیے خوامخواہ دردسر بن گئی تھی۔

دوسرے دن عبداللہ خاں نے شاہی اطبا کو سختی سے منع کردیا کہ ان میں سے کوئی بھی عبداللہ خاں یا حسین علی خاں کی اجازت اور منظوری کے بغیر بادشاہ کے پاس نہیں جائے گا اور اگر جانے کی کوشش کرے گا تو اس کے برے نتائج کا وہ خود ذمے دار ہوگا۔ عبداللہ خاں دل سے یہی چاہتا تھا کہ نیا بادشاہ اپنا زیادہ وقت عورتوں میں بسر کرے۔ اس عمل کا بادشاہ کی صحت پر کیا اثر پڑے گا، عبداللہ خاں کو اس سے کوئی

دلچسپی نہ تھی۔ اسے شاہی اطبا اور معتمد خاں پر سخت غصہ آیا۔ اس نے اسی دن ہمت خاں نامی ایک شخص کو بادشاہ کا اتالیق مقرر کردیا اور اسے سختی سے ہدایت کردی کہ وہ بادشاہ کی نگرانی کرے اور کسی بھی شخص کو اس وقت تک بادشاہ سے نہ ملائے، جب تک کہ دونوں بھائیوں میں سے کسی ایک کا اس کے پاس اجازت نامہ نہ ہو۔ ہمت خاں کو عبداللہ خاں کی طرف سے اتنے اختیارات حاصل ہوگئے کہ بادشاہ اپنے اتالیق کی اجازت کے بغیر کھانا تک نہیں کھا سکتا تھا۔ ساتھ ہی ہمت خاں کو یہ حکم بھی دیا گیا کہ بادشاہ کو محل سرا سے باہر نہ نکلنے دے۔

معزول بادشاہ فرخ سیر دو ماہ تک ذلتیں اٹھا کر عبداللہ خاں کے ہاتھوں موت کی نیند سو چکا تھا۔ اس کی لاش چھتیس گھنٹے تک ترپولیہ میں بے گور و کفن پڑی رہی، اور کسی کی اتنی مجال نہ تھی کہ عبداللہ خاں کی اجازت کے بغیر مرحوم بادشاہ کی تجہیز و تکفین کرسکتا۔ چھتیس گھنٹے بعد مرحوم بادشاہ کے کفن دفن کا حکم دیا گیا۔ بادشاہ کو کس طرح قتل کیا گیا تھا۔ یہ خبر سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی ہوئی قلعے کے اندر اور باہر پھیل چکی تھی۔ محل سرا میں سسکیوں اور آہوں کی گھٹی گھٹی آوازیں صاف سنی جاسکتی تھیں۔ جب یہ خبر قلعے سے باہر گلی کوچوں میں پہنچی تو لوگوں نے اپنے گریبان چاک کرلیے اور اپنے چہروں اور بالوں پر خاک ڈال کر رونا شروع کردیا۔ یہ اس بادشاہ کا ماتم تھا، جسے وہ اپنے ملک کا حقیقی اور جائز حکمران سمجھتے تھے۔ بادشاہ کا تابوت مقبرۂ ہمایوں لے جانے کے لیے جیسے ہی باہر نکالا گیا، کئی ہزار عورتوں کا ایک جلوس بادشاہ کے ماتم کے لیے تیار ملا۔ عبداللہ خاں نے دلاور خاں اور سید علی خاں نامی دو آدمیوں کو تابوت کی نگرانی اور کفن دفن پر متعین کیا تھا اور انہیں یہ حکم بھی دیا تھا کہ وہ تابوت کے ساتھ روتے منہ بسورتے جائیں۔

وہ شاہی بیگمات جو عبداللہ خاں کے قبضے میں پہنچ چکی تھیں، اپنے مرحوم بادشاہ کا آخری دیدار کرنا چاہتی تھیں لیکن اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتی تھیں۔ سوگوار مہرن کو چپ چپ دیکھ کر عبداللہ خاں نے طنزاً پوچھا۔ ''کیا تو مرحوم بادشاہ کا آخری دیدار کرنا چاہتی ہے؟''

مہرن نے جواب دیا۔ ''نہیں، میں اس بے جان لاشے کو دیکھ کر کیا کروں گی۔''

عبداللہ خاں نے پوچھا۔ ''کیا تو فرخ سیر سے محبت نہیں کرتی تھی؟''

مہرن نے جواب دیا۔ ''نہیں، کسی ایسے شخص سے میری جیسی لڑکی محبت نہیں کرسکتی جو محبت کے مفہوم ہی سے ناآشنا ہو۔ فرخ سیر بادشاہ تھا اور بادشاہ محبت نہیں جنسی تعلقات کے قائل ہوتے ہیں اور فرخ سیر جیسا بادشاہ، جو نہ تو اپنی حکومت ہی کی حفاظت کرسکا اور نہ اپنے حرم کی۔''

عبداللہ خاں حیرت سے مہرن کی صورت دیکھنے لگا، پوچھا۔ ''تو فرخ سیر سے محبت بھی نہیں کرتی اور اس کی موت پر سوگوار بھی ہے، آخر یہ معاملہ کیا ہے؟ میں تجھے سمجھ ہی نہ سکا کہ آخر تو ہے کیا؟''

مہرن نے جواب دیا۔ ''میں بادشاہ کی موت پر نہیں، تیمور کے گھرانے پر رو رہی ہوں، جہاں سے ایک غیرت کے مرجانے سے بادشاہوں کے جنازے نکل رہے ہیں، اور نمک کی اس بے اثری پر رو رہی ہوں، جس نے تیموری پروردوں اور نمک خواروں کو غداری اور نمک حرامی پر مائل کردیا ہے۔''

عبداللہ خاں کا غصے سے بہت برا حال ہوگیا، بولا۔ ''مہرن! اگر یہ باتیں کسی مرد کی زبان سے نکلتیں تو میں اس کی زبان کھنچوا لیتا، لیکن افسوس کہ اگر میں تجھے کوئی سزا دیتا ہوں تو لوگ یہی کہیں گے کہ ایک مرد میدان اور سلطنت تیموریہ کے وزیر نے ایک کمزور لڑکی کو قتل کرا دیا۔ میں یہ شرمناک الزام اپنے سر نہیں لینا چاہتا اس لیے شرافت کا تقاضا یہی ہے کہ تو بھی اپنی حد میں رہ، اور مجھے ذلیل کرنے کی کوشش نہ کر۔''

مہرن نے ہنس کر طنزاً کہا۔ ''سبحان اللہ، ایک ایسا شخص مجھے اپنی حد میں رہنے کی تلقین کررہا ہے جو اخلاق، مروت اور شرافت کی ساری حدود پہلے ہی پھلانگ چکا ہے اور وہ شخص ذلیل نہ کرنے کی درخواست کررہا ہے جو اپنے اعمال اور کرتوت کے ہاتھوں تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ذلیل و خوار ہو چکا ہے۔ میں، مجھے ایک کمزور لڑکی کو خدا نے جو قوت گفتار اور نطق اعرابی عطا کی ہے، شاید اس کا منشا بھی یہی ہے کہ تیری ذلت اور رسوائی کا عمل تیری زندگی ہی سے شروع ہو چکا ہے۔''

عبداللہ خاں نے بڑی شدت سے اسے اپنی آغوش میں لے لیا اور بوسوں کی بارش کردی، بولا۔ ''لڑکی! میں تیری تلخ نوائی اور یاوہ گوئی کو اس لیے معاف کرتا ہوں کہ میں تجھے صحیح الدماغ نہیں سمجھتا۔ تجھے جذباتی صدمے یا دباؤ نے ہذیانی کیفیت میں مبتلا کردیا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ تو صحت یاب ہوجائے اور جب تجھے تیری ان باتوں اور حرکتوں کے متعلق بتایا جائے تو شرم اور ندامت محسوس کرے۔ تیری

WWW.PAKSOCIETY.COM

آواز، تیری شکل وصورت، تیرا مدھ بھرا جسم، نشیلی آنکھیں، گھنیرے بال، موہوم سی کمر، غرض کہ تجھ میں جو کچھ بھی ہے، خوب ہے۔ ایک زبان درازی کی وجہ سے میں اس مجموعۂ حسن وصفات کو کس طرح نظر انداز کرسکتا ہوں۔ پورے انار کو چند دانوں کی خرابی کی وجہ سے پھینکا تو نہیں جاسکتا۔"

مہرن ان تاویلوں کے شکار کو ناخوشی اور خفگی سے دیکھتی رہی۔

باہر بادشاہ کا تابوت ہمایوں کے مقبرے کی طرف روانہ ہوچکا تھا۔ ہزاروں سوگوار عورتوں کا جلوس بادشاہ کی میت کے ساتھ ساتھ ہولیا۔ وہ بادشاہ کا سوگ منا رہی تھیں اور بادشاہ کے دشمنوں کو گالیاں دے رہی تھیں۔ آگے جاکر اس جلوس میں شہری بھی شریک ہوگئے۔

سیدزادوں کے خلاف نفرتیں عام ہوگئی تھیں، لیکن ان کا ستارۂ اقبال متدی عروج پر تھا، اس لیے لوگوں کی نفرتوں سے انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچ رہا تھا۔ اسی دوران آگرے میں ایک نیا ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک ہندو قلعہ دار مترا سین نے بھی سیدزادوں کے انداز میں سوچتے ہوئے ایک قیدی مغل شہزادے کو بادشاہ بنا کے خود اس کا وزیر بن گیا۔ جب یہ خبر دہلی پہنچی تو عبداللہ خاں کا چھوٹا بھائی امیر الامرا حسین علی خاں اس فتنے کا سر کچلنے کے لیے آگرہ روانہ ہوگیا اور عبداللہ خاں کو یہ ہدایت کی گئی کہ وہ نئے بادشاہ کے ساتھ اس کے پیچھے پیچھے آگرہ چلا آئے۔

حسین علی خاں کو آگرے میں زیادہ زحمت نہیں پیش آئی۔ مترا سین اپنے مقصد میں ناکام رہا اور خودکشی کرلی۔ مغل شہزادہ اتنا احمق نکلا کہ اس نے حسین علی خاں کے مودب انداز کو سمجھے بغیر، اس کے آگے خود جھک گیا اور عورتوں کی طرح زاروقطار روتے ہوئے جاں بخشی کی درخواست کی۔ حسین علی خاں کو اس پر رحم آگیا اور اس نے مغل شہزادے کی جاں بخشی تو کردی لیکن قیدی ضرور بنالیا۔

حسین علی خاں نے آگرے میں شاہی خزانے اور نوادرات پر خوب ہاتھ صاف کیا۔ یہاں سے نقدی کے علاوہ ملکہ نور جہاں کی مرصع بجواہر شال، جہانگیر کی مرصع تلوار، شاہ جہاں کی موتیوں والی وہ چادر جسے اس نے اپنی چہیتی بیوی ممتاز محل کی قبر پر چڑھانے کے لیے خاص طور پر بنوایا تھا۔ ان چیزوں کی مجموعی مالیت تین کروڑ روپے کے لگ بھگ تھی۔ حسین علی خاں نے یہ ساری چیزیں اپنے قبضے میں کرلیں۔ اس کے آس پاس عبداللہ خاں کے آدمی بھی موجود تھے۔ ان میں سے کسی ایک نے یہ خبر نمک مرچ لگا کر عبداللہ خاں کو پہنچا دی۔ اس وقت عبداللہ خاں راستے میں تھا، اس خبر نے کہ چھوٹے بھائی نے شاہی خزانے اور گرانقدر مالیت کے نوادرات پر قبضہ کرلیا ہے، اسے پریشان کردیا۔ وہ دیوانہ وار آگرے میں داخل ہوا اور اپنے چھوٹے بھائی سے بجھے بجھے انداز میں ملاقات کی۔ دق زدہ مسلول بادشاہ عبداللہ خاں کے قبضے میں تھا۔ عبداللہ خاں نے دہلی سے آگرے تک کا مختصر سفر بھی عورتوں کے بغیر نہیں کیا تھا، وہ اس وقت بھی اس کے ساتھ تھیں۔

عبداللہ خاں نے اپنے ہندو دیوان رتن چند سے مشورہ کیا۔ "رتن چند! حسین علی خاں نے آگرے کے قلعے میں جو کچھ پایا ہے، کیا میں اس کا حقدار نہیں ہوں؟ کیا اس کا حصہ مجھے نہیں ہونا چاہیے؟"

رتن چند نے جواب دیا۔ "آپ اس کے نصف کے حقدار ہیں۔"

عبداللہ خاں نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ "حسین علی خاں کو میرے پاس بلالاؤ، اس سلسلے میں، میں سخت روش اختیار کروں گا۔ وہ یہ سب کچھ تنہا نہیں ہضم کرسکتا۔"

رتن چند نے نرم لہجے میں جواب دیا۔ "میری اتنی مجال نہیں ہے کہ میں امیر الامرا کو آپ کے پاس لے آؤں۔ میں آپ کا پیغام پہنچائے دیتا ہوں، آنا یا نہ آنا ان کی مرضی پر منحصر ہے۔" پھر عاجزی سے عرض کیا۔ "اس سلسلے میں، میں آپ دونوں سے ایک درخواست ضرور کروں گا۔"

عبداللہ خاں نے جواب دیا۔ "درخواست بیان کرو، غور کروں گا کہ اس پر کس حد تک عمل درآمد ہوسکتا ہے۔"

رتن چند نے عرض کیا۔ "حضور والا! اس ملک اور اس دور میں ہمیں جو اقتدار یا بالادستی حاصل ہوئی ہے، اس کا واحد سبب یہ تھا کہ آپ دونوں بھائیوں میں مثالی ایکا تھا لیکن اب ایسا نظر آتا ہے کہ مال وزر کی طمع اس اتحاد اور اس محبت کو ختم کردے گی اس لیے میری گزارش ہے کہ آپ دونوں اتحاد اور محبت سے کام لیں اور تو، تو میں، میں سے بچیں۔"

عبداللہ خاں نے جواب دیا۔ "رتن چند! شاید تم نہیں جانتے کہ میں جس خاندان کا ایک فرد ہوں، وہاں ہمیشہ سے حق اور باطل کی جنگ جاری ہے، میں اس سے نہیں ڈرتا۔"

رتن چند نے عرض کیا۔ "جناب والا! میں ڈرنے کی بات کہاں کررہا ہوں۔"

عبداللہ خاں نے اچانک یہ محسوس کیا جیسے کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آگیا ہو۔ ہلکا ہلکا شور، کبھی کبھی آوازیں، رتن چند نے سرگوشی میں کہا۔ "قبلہ و کعبہ! امیر الامرا تشریف لارہے ہیں۔"

عبداللہ خاں بھی سنبھل کر اپنے چھوٹے بھائی کا انتظار کرنے لگا۔ حسین علی خاں مسکراتا ہوا بڑی تمکنت سے حویلی میں داخل ہوا۔ عبداللہ خاں نے ترش لہجے میں پوچھا۔ "حسین علی خاں! آگرے میں فتنے کو کچلنے کے بعد تمہارے ہاتھ کیا کیا لگا؟"

حسین علی خاں نے سرد لہجے میں جواب دیا۔ "بھائی صاحب! جب آپ نے فرخ سیر کو شاہی محل میں گھس کر معزول کیا تھا تو میں نے آپ سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ محل کے اندر سے کیا کیا آپ کے ہاتھ لگا۔"

عبداللہ خاں نے خشک لہجے میں کہا۔ "میں نے شاہی خزانے یا نوادرات کے بارے میں کچھ سوچا بھی نہیں تھا۔"

حسین علی خاں نے جواب دیا۔ "میں یہ نہیں کہوں گا کہ آپ سچ نہیں بول رہے ہیں لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ آپ کا جواب واقعے کے خلاف ہے، آپ نے تو شاہی محل کی نادر ترین چیزیں اپنے قبضے میں کرلی تھیں اور میں سب کچھ دیکھنے اور جاننے کے باوجود خاموش رہا تھا۔"

عبداللہ خاں غصے میں کھڑا ہوگیا، بولا۔ "اپنی خرافات بند کرو، اور یہاں تمہیں جو کچھ بھی ملا ہے، اس میں کا نصف میرے حوالے کردو۔"

حسین علی خاں نے رتن چند سے کہا۔ "رتن چند! اپنے آقا کو سمجھاؤ میں بہت ٹھنڈے دل و دماغ کا آدمی ہوں اور ہم سب کو جو کچھ بھی حاصل ہوا ہے، اس میں میرے ٹھنڈے دل و دماغ کا بہت بڑا دخل ہے۔"

رتن چند نے خوشامدانہ لہجے میں سمجھایا۔ "یہ ناچیز تو یہی چاہتا ہے کہ آپ دونوں کا یہ اختلاف فوراً ختم ہوجائے، ورنہ یہ باتیں، جو مجھے معلوم ہوگئی ہیں، اگر باہر پھیل گئیں تو ہمارے مخالف اور حاسد امرا، ہمارے خلاف سازشیں شروع کردیں گے۔"

عبداللہ خاں نے کہا۔ "رتن چند! تم کچھ بھی کہو مگر میں اپنے حق سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہوں۔"

حسین علی خاں نے جواب دیا۔ "تب پھر میں بھی اپنا حق طلب کروں گا۔"

عبداللہ خاں نے اپنا سینہ تھپتھپایا۔ "میں تمہارا حق دینے کو تیار ہوں، جب کہو گے تمہارا حق تمہارے حوالے کردوں گا۔"

حسین علی خاں ایک دم سنجیدہ ہوگیا، پوچھا۔ "آپ نے شاہی بیگمات میں سے کتنی اپنے لیے پسند فرمالی تھیں؟"

عبداللہ خاں سناٹے میں آگیا، پوچھا۔ "اس سوال کا مطلب؟"

حسین علی خاں نے جواب دیا۔ "میرے سوال کا مطلب بالکل واضح ہے، میں اس مالِ غنیمت میں سے اپنا حق مانگ رہا ہوں۔"

عبداللہ خاں بہت زیادہ مشتعل ہوگیا، بولا۔ "کامیابیوں نے تمہارا دماغ خراب کردیا ہے حسین علی خاں! اگر میں نے شاہی محل اور شاہی خزانے سے مال وزر لیا ہوتا تو تم مالِ غنیمت کے نام پر اپنا حصہ طلب کرسکتے تھے لیکن شاہی بیگمات میں سے اپنا حصہ مانگنا کچھ عجیب بے معنی اور مہمل سی بات ہے۔"

حسین علی خاں نے جواب دیا۔ "یہ مہمل یا فضول بات ہرگز نہیں ہے، اصول اور سچائی کی بات ہے۔ آپ مجھ سے اپنا حق طلب کریں، میں آپ سے اپنا حق لے لوں گا۔"

عبداللہ خاں نے غصے اور جذبات میں اپنا سر پکڑ لیا، بولا۔ "حسین علی خاں! میں پھر یہی کہوں گا کہ کامیابیوں نے تمہارا دماغ خراب کردیا ہے۔ میں کہتا ہوں بلکہ متنبہ کرتا ہوں کہ ہوش میں آجاؤ ورنہ میں کنارہ کشی اختیار کرلوں گا اور تم تنہا رہ جاؤ گے۔"

رتن چند نے پھر مداخلت کی۔ "آپ لوگ کیسی فضول اور عامیانہ باتیں کررہے ہیں، میں آپ دونوں کو ہرگز لڑنے نہیں دوں گا۔"

حسین علی خاں نے کہا۔ "رتن چند! مجھے حکومت اور دولت کی ہوس ہے جبکہ بھائی صاحب کو عورت اور دولت کی، حصے اور حق کے نام پر اگر مجھے بھائی صاحب سے عورت مل جائے گی تو میں شکریے کے ساتھ قبول کرلوں گا۔"

عبداللہ خاں نے جواب دیا۔ "اچھا چلو، میں شاہی بیگمات میں سے چند تمہارے حوالے کردوں گا، تم آگرے کے مال میں سے نصف میرے حوالے کردو۔"

حسین علی خاں نے بڑے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "بھائی صاحب! اس ذرا سی دیر کی گفتگو اور تکرار نے ہم دونوں کو خاصا بے تکلف کردیا ہے، کیا خیال ہے، کیا میں کچھ صاف صاف، باتیں کرلوں؟"

عبداللہ خاں نے کہا۔ "ضرور کرلو، تمہیں روکا کس نے ہے؟"

حسین علی خاں نے جواب دیا۔ "ان ساری بیگمات کو میرے سامنے لے آیئے، جو فرخ سیر کی معزولی کے بعد سے آپ کے تصرف میں ہیں، میں ان میں سے اپنی پسند کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

لے لوں گا اور آپ سے یہ نہیں کہوں گا کہ میرا حصہ، مجھے اتنی تاخیر سے کیوں مل رہا ہے۔"

عبداللہ خاں سٹپٹایا کہ حسین علی خاں کے تیور اچھے نہیں ہیں، معلوم نہیں کیا کچھ کر گزرے۔ عبداللہ خاں اس وقت اپنے خیالوں میں ڈوبا نرم پڑ چکا تھا، رتن چند سے کہا۔ "میں ایک انصاف پسند انسان ہوں، آگرے سے جو کچھ ملا ہے اس میں ہمارے بادشاہ کا حصہ بھی شامل ہے۔"

رتن چند نے جواب دیا۔ "بے شک، بے شک۔"

حسین علی خاں نے آہستہ سے کہا۔ "بھائی صاحب! مجھے بیگمات کے پاس لے چلیے تاکہ یہ قضیہ ابھی طے پا جائے، اسی وقت۔"

اندر زنان خانے میں رنگ و نور اور شباب و جوانی کا ایک سیلاب سا آیا ہوا تھا۔ حسین علی خاں اندر چلا تو گیا لیکن یہاں کی دلکشی اور رعنائی نے اسے دہلا کر رکھ دیا۔ اس کے سامنے سے ان عورتوں کو باری باری گزارا جانے لگا۔ حسین علی خاں ان عورتوں کو کسی تاجر کی طرح آنکتا رہا۔ ان میں مہرن کو اس لیے شامل نہیں کیا گیا تھا کہ اس کی سرکشی اور صاف گوئی سے یہ خطرہ پیدا ہوتا تھا کہ حاکمانہ مزاج کا حامل حسین علی خاں اسے قتل نہ کر دے، اور اگر یہ سانحہ رونما ہوتا تو یہ عبداللہ خاں کے لیے بڑا افسوس ناک اور قلق آمیز سانحہ ہوتا، کیونکہ وہ اس گستاخ اور سرکش لڑکی سے محبت کرنے لگا تھا اور اس کوشش میں تھا کہ اس کی انا کو ختم کر کے اپنے آگے جھکا لے۔

حسین علی خاں نے ان میں سے دو عورتیں الگ کر لیں اور عبداللہ خاں کو مخاطب کیا۔ "بھائی صاحب! آپ نے ان میں ایک لڑکی مہرن کو کیوں نہیں شامل فرمایا؟"

عبداللہ خاں اپنے بھائی کی معلومات پر دنگ رہ گیا، بولا۔ "اس لیے کہ میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔"

حسین علی خاں نے جواب دیا۔ "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی، آپ مہرن کو میرے حوالے کر دیجیے کیونکہ وہ مجھے بھی بہت پسند ہے۔"

عبداللہ خاں نے پھر مشتعل ہو کر چھوٹے بھائی کو ڈانٹا۔ "حسین علی خاں! تم مجھ سے چھوٹے ہو اس لیے تمہیں میرا ادب کرنا چاہیے۔ میں مہرن کو نہیں دے سکتا۔"

حسین علی خاں نے کہا۔ "آپ اس کی ایک جھلک دکھا تو سکتے ہیں مجھے؟"

جواب دیا۔ "ہاں دکھا ضرور سکتا ہوں اس کی ایک جھلک۔"

اس کے بعد عبداللہ خاں اندر چلا گیا۔ مہرن بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی، عبداللہ خاں نے کہا۔ "مہرن! میرا چھوٹا بھائی امیر الامرا حسین علی خاں تم سے ملنا چاہتا ہے۔"

مہرن نے بے رخی سے پوچھا۔ "وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟"

عبداللہ خاں نے جواب دیا۔ "یہ میں اس سے نہیں پوچھ سکتا۔"

مہرن نے بڑی بے مروتی سے کہا۔ "تب پھر تم اس سے کہہ دو کہ میں اس سے نہیں ملنا چاہتی۔"

عبداللہ خاں نے ترش روی سے کہا۔ "مہرن وہ امیر الامرا ہے، بادشاہ تک کو خاطر میں نہیں لاتا۔ وہ تمہارے اس جواب کا متحمل نہیں ہو سکتا۔"

مہرن نے کہا۔ "مجھے اس کی کوئی پروا نہیں، اگر امیر الامرا مجھ سے ملنا ہی چاہتا ہے تو اسے میرے پاس آنا چاہیے، میں اس کے پاس کیوں جاؤں؟"

عبداللہ خاں نے بڑی کوشش کی کہ مہرن کو حسین علی خاں سے ملوا دے، لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہوا۔ بدرجہ مجبوری بھائی کے پاس واپس گیا اور کہا۔ "حسین علی خاں! مہرن کی طبیعت ناساز ہے اس لیے تمہیں اس کے پاس تک زحمت کرنا پڑے گی۔"

حسین علی خاں نے جواب دیا۔ "میں عام حالات میں شاید اس کے پاس نہ جاتا لیکن میں نے سنا ہے کہ یہ کوئی غیر معمولی لڑکی ہے، چنانچہ کسی غیر معمولی شخص کے لیے غیر معمولی قدم اٹھانا نامناسب نہیں ہے۔"

یہ کہہ کر وہ عبداللہ خاں کے ساتھ مہرن کے پاس روانہ ہو گیا۔ لیکن اب مہرن کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند ہو چکا تھا، عبداللہ خاں نے دروازے پر دستک دی، بولا۔ "مہرن! دروازہ کھولو، میرا بھائی تم سے ملنے آیا ہے۔"

مہرن نے جواب دیا۔ "یہ مجھ سے کیوں ملنے آیا ہے؟ میں اس سے نہیں ملنا چاہتی، کہہ دو، واپس جائے۔"

عبداللہ خاں نے ذرا گرم لہجے میں کہا۔ "مہرن! تمہارا یہ گستاخانہ لب و لہجہ تمہیں کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے۔"

مہرن نے جواب دیا۔ "شاہی محل سے نکال کر تو نے مجھ سے جو سلوک کیا ہے، کیا اس سے بڑا بھی کوئی نقصان ہو سکتا ہے اب؟"

حسین علی خاں نے پوچھا۔ "بھائی صاحب! یہ کس قسم کی باتیں کر رہی ہے، اس کا دماغی توازن تو درست ہے؟"

عبداللہ خاں نے افسوس سے کہا۔ "حسین علی خاں! اس کی یہی بات تو تھی کہ میں اس کو تم سے نہیں ملانا چاہتا تھا۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

حسین علی خاں نے ہدایت کی۔ ”بھائی صاحب! یہ لڑکی آپ کے حق میں خطرناک بھی ہو سکتی ہے، اس لیے میرے اپنے خیال میں اس کا باقاعدہ علاج ہونا چاہیے۔ اسے غالباً جنون کا عارضہ لاحق ہو گیا ہے اور یہ قابلِ معافی ہے۔ اگر مجھ سے نہیں ملنا چاہتی تو میں اصرار بھی نہیں کروں گا لیکن یہ ضروری ہے کہ اس کا باقاعدہ علاج ہونا چاہیے۔“

عبداللہ خاں نے جواب دیا۔ ”اس کے علاج کے لیے تمہی کو کوئی حکیم تلاش کرنا پڑے گا۔“

حسین علی خاں نے کہا۔ ”ہاں، میں ہی اس کا انتظام کردوں گا۔“

اس دن وہ بڑی دیر تک کمرے کا دروازہ بند کیے اندر بیٹھی رہی۔ عبداللہ خاں کی مزاجی حالت بہت برہم رہی۔ حسین علی خاں نے اس کے عشرت کدے کی دو عورتیں بھی لے لیں اور آگرے کے مال کا نصف حصہ بھی نہیں دیا۔ تین کروڑ میں سے اکیس لاکھ عبداللہ خاں کو دے کر جان چھڑائی۔ عبداللہ خاں نے از راہ چالاکی جہانگیر کی تلوار اور نور جہاں کی شال بادشاہ کو دلوا دی کیونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ بادشاہ کو جو کچھ بھی ملے گا، اسے ہتھیا لینا بہت آسان ہے۔

حسین علی خاں نے شرارتاً ایک نوجوان طبیب کو مہرن کے علاج کی خاطر عبداللہ خاں کے پاس بھیج دیا۔ طبیب شکل و صورت کا بھی بہت اچھا تھا، عبداللہ خاں نے اسے جو دیکھا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے مہرن کو دکھا تو دیا، لیکن طبیب کے سامنے کچھ ایسے رعب اور دبدبے کا اظہار کیا کہ وہ سہم گیا۔

مدقوق اور مرضِ سل کے شکار بادشاہ نے شب و روز کی عیاشی میں خود کو تباہ کر لیا۔ اب اس کا یہ حال ہو چکا تھا کہ بخار اور کمزوری نے اسے بستر سے لگا دیا تھا۔ اس نے اس عالم میں عبداللہ خاں سے درخواست کی کہ اسے بادشاہی سے ہٹا کر اس کے بھائی رفیع الدولہ کو بادشاہ بنا دیا جائے۔ ان دونوں کی عمروں میں اٹھارہ ماہ کا فرق تھا۔ عبداللہ خاں نے بادشاہ کی درخواست اپنے چھوٹے بھائی حسین علی خاں کو بھیج دی اور پوچھا کہ ”اب کیا کرنا چاہیے؟“

حسین علی خاں نے جواب دیا۔ ”بیمار بادشاہ کی خواہش کا احترام کیا جائے۔“ اور اس کے بھائی رفیع الدولہ کو بادشاہ بنا دیا گیا۔ رفیع الدولہ کو شاہجہاں ثانی کا لقب بھی دیا گیا۔ اس کا اتالیق بھی ہمت خاں ہی رہا جو سائے کی طرح بادشاہ کے ساتھ لگا رہتا۔ رفیع الدولہ کی تخت نشینی کے چند دن بعد رفیع الدرجات کا انتقال ہو گیا۔ نئے بادشاہ رفیع الدولہ شاہجہاں ثانی کی تخت نشینی نے دونوں بھائیوں کو قدرے مطمئن کر دیا۔ لیکن حسین علی خاں کی غلط اور غیر منصفانہ تقسیمِ مال نے عبداللہ خاں کو اس کی طرف سے برگشتہ اور دل برداشتہ ضرور کر دیا تھا۔ دوسری طرف حسین علی خاں نے اپنا نوجوان طبیب بھیج کر عبداللہ خاں کے پُرسکون تالاب میں ایک کنکری پھینک دی تھی اور اس کے نتائج کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ اس نے طبیب کو حکم دے دیا تھا کہ مہرن کو اپنی دلچسپ اور لچھے دار باتوں سے خود پر مائل کرنے کی کوشش کرے۔

یہ طبیب مہرن کے پاس اس وقت تک پہنچتا رہا جب تک کہ وہ دونوں آپس میں بے تکلف نہ ہو گئے۔ مہرن اس نوجوان کو یوں پسند کر رہی تھی کہ اس نے علاج معالجہ کے علاوہ کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جس میں شک و شبے کی بو پائی جاتی ہو۔ ایک دن مہرن بڑی خوشگوار کیفیت میں تھی اور عبداللہ خاں بادشاہ کے پاس گیا ہوا تھا۔ مہرن کے پاس ایک ایسی خادمہ موجود تھی جس کا کام خدمت سے زیادہ نگرانی کرنا تھا، مہرن نے اس کی موجودگی کی پروا کیے بغیر دریافت کیا۔ ”حکیم صاحب! آپ میرے کس مرض کا علاج کر رہے ہیں؟“

نوجوان طبیب نے جواب دیا۔ ”کیا یہ مرض کچھ کم ہے کہ آپ جوان ہیں، صورت شکل بھی بڑی اچھی ملی ہے، دلکشی بھی بلا کی پائی ہے، محبت کرنے والوں کی بھی کمی نہیں ہے، یہ ساری خوبیاں ہیں لیکن ان خوبیوں کے ساتھ ایک عیب بھی موجود ہے کہ آپ کے دل میں چاہے جانے کی خواہش نہیں پائی جاتی۔ دل نفرتوں کا ویرانہ بنا ہوا ہے۔ بس انہی مرضوں کا علاج کر رہا ہوں، دیکھیے، اچھا کر پاتا ہوں یا نہیں۔“

مہرن نے نوجوان طبیب کو شوخی سے دیکھا، اس شوخی میں محبت شامل تھی، بولی۔ ”ناسمجھ طبیب! تیری تشخیص غلط ہے، کون کہتا ہے کہ میرے دل میں چاہے جانے کی خواہش ہی نہیں اور کون ہے جو یہ بات کہہ سکتا ہے کہ میرا دل نفرتوں کا ویرانہ ہے، یہ تہمت ہے، ہاں، میں عبداللہ خاں سے محبت نہیں کر سکتی۔ میں اس کے چھوٹے بھائی حسین علی خاں کو منہ نہیں لگا سکتی، اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے لیکن میرا فیصلہ نہیں بدلا جا سکتا۔“

نوجوان طبیب نے دھڑکتے ہوئے دل سے سوال کیا۔ ”میں آپ کو کیسا لگتا ہوں؟“

مہرن نے پُرشوخ لہجے میں جواب دیا۔ ”میں آپ کو گاؤدی سمجھتی ہوں، سیدھا سادا احمق سا نوجوان، کہتے ہیں

جنت میں بھولے لوگ جائیں گے۔ اگر یہ بات درست ہے تو آپ ضرور جائیں گے۔“

نوجوان طبیب شرما گیا۔

مہرن نے خادمہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”جناب! اس کا خیال رہے، یہ میری خدمت سے زیادہ نگرانی اور جاسوسی کے لیے سائے کی طرح منڈلاتی رہتی ہے، عبداللہ خاں کے آ جانے پر ایک ایک کی سو سو لگائے گی۔“

خادمہ نے اپنے دونوں گال تھپتھپائے اور تقریباً روہانسی آواز میں بولی۔ ”میں آپ لوگوں کی جاسوسی کیوں کرنے لگی؟ اس سے مجھے کتنے رکعت کا ثواب ملے گا آخر؟“

مہرن نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”چغل خوری اچھی عادت تو ہے ہی نہیں چہ جائیکہ اس بری عادت کو برا کہنا یا برا سمجھنا، میں تو یہ کہتی ہوں کہ انسان کہیں بھی رہے، لیکن اسے ایسا ضرور ہونا چاہیے کہ اس کے بعد لوگ اسے یاد کریں۔“

نوجوان طبیب نے کہا۔ ”کسی کے بعد اگر اسے یاد کیا جائے تو اس سے اس کی ذات کو فائدہ پہنچے گا؟“

مہرن نے جواب دیا۔ ”ہاں، آپ بھی صحیح کہتے ہیں اس کے بعد تو اس کی ذات کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا لیکن اس کی موجودگی ہی میں اس کو جو سکون ملے گا یا جیسی طمانیت حاصل ہو گی، کیا اس کے لیے یہ کافی نہیں ہے؟“

طبیب نے چونک کر پوچھا۔ ”میرا نام؟ یعنی آپ میرا نام پوچھ رہی ہیں؟ میرا نام جاننا چاہتی ہیں؟“

مہرن نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں تمہارا ہی نام پوچھ رہی ہوں، تمہارا ہی نام جاننا چاہتی ہوں۔ کیوں، میرے اس سوال سے تمہیں حیرت کیوں ہوئی؟“

طبیب نے جواب دیا۔ ”تعجب اس لیے ہوا کہ آپ کی طبیعت میں، میرے خیال میں اس قسم کا تجسس ہے ہی نہیں۔“

مہرن نے آزردگی سے کہا۔ ”ہے کیوں نہیں، پھر تو تم مجھے سمجھے ہی نہیں۔“

طبیب نے جواب دیا۔ ”ممکن ہے میں آپ کو نہ سمجھ سکا ہوں کیونکہ آپ ہیں بھی ذرا پیچیدہ اور گمبھیر لیکن میں اس وقت تک آپ کو اپنا نام نہیں بتاؤں گا جب تک کہ آپ میرے ایک سوال کا جواب نہیں دے دیں گی۔“

مہرن نے پوچھا۔ ”تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“

طبیب نے جواب دیا۔ ”میں آپ کی بابت جاننا چاہتا ہوں، آپ کون ہیں؟ شاہی محل میں آپ کیا تھیں اور شاہی خاندان سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟“

مہرن نے ایک سرد آہ بھری، بولی۔ ”یہ اتنے بہت سارے سوال تم کیوں کر رہے ہو؟ اس طرح تم کیا جاننا چاہتے ہو؟“

طبیب نے جواب دیا۔ ”آپ کی تنک مزاجی اور تندی یہ بتاتی ہے کہ کچھ بھی ہو آپ اس خاندان سے تعلق نہیں رکھتیں جس کی غیرت مر چکی ہے اور اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ شاہی محل میں زیادہ دنوں سے نہیں رہ رہی ہیں کیونکہ اگر ان بزدلوں اور بے غیرتوں میں آپ زیادہ دنوں سے رہ رہی ہوتیں تو آپ کے مزاج کی گرمی اور غیر تمندی ختم ہو چکی ہوتی اور آپ بھی انہی جیسی ہو جاتیں۔“

مہرن نے طبیب کی طرف سے منہ پھیر لیا، بولی۔ ”تم نے بالکل صحیح اندازہ لگایا۔ میرے والدین کا تعلق نیشاپور سے رہا ہے لیکن میں یہیں اس ملک میں پیدا ہوئی ہوں۔ میرا باپ گھوڑوں کا تاجر تھا اور فرخ سیر کو اس زمانے سے گھوڑے فراہم کر رہا تھا جب یہ خاندان جہانگیر نگر (ڈھاکا) میں رہ رہا تھا۔ پھر، جب شاہی خاندان میں افراتفری پھیلی اور بھائی بھائی سے اور بھتیجا چچا سے متصادم ہونے لگا تو فرخ سیر بھی حکومت کا امیدوار ہو کر جہانگیر نگر سے عظیم آباد (پٹنہ) اور عظیم آباد سے الٰہ آباد پہنچا۔ میرے باپ کو یہ امید بندھی کہ اگر فرخ سیر بادشاہ ہو گیا تو اس کے وارے نیارے ہو جائیں گے۔ اس نے فرخ سیر سے بہت زیادہ راہ و رسم بڑھانا شروع کر دی۔ اس دوران میری ماں کا انتقال ہو گیا اور میرا باپ روتا پیٹتا فرخ سیر کے پاس پہنچا، فرخ سیر نے تسلی دلاسے دیے۔ میرے باپ نے کہا کہ میں نیشاپور واپس جانا چاہتا ہوں لیکن فرخ سیر نے اسے روکا اور امید دلائی کہ اگر وہ بادشاہ بن گیا تو اس کا خاص خیال رکھا جائے گا اور وہ امرا میں شامل کر لیا جائے گا لیکن میرے باپ کو نہ جانے کیوں واپس جانے کی بڑی جلدی تھی اور افسوس کی بات یہ تھی کہ وہ مجھے اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے فرخ سیر کے حوالے کر دیا اور جلد ہی واپس آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ اس نے فرخ سیر سے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ جب وہ واپس آئے گا تو فرخ سیر کے لیے اپنے ساتھ گھوڑے بھی لائے گا۔ فرخ سیر نے مجھے اپنے خاندان میں شامل کر لیا اور میں ان میں شب و روز گزارتی رہی۔ فرخ سیر بادشاہ بن گیا۔ شاہی خاندان کے وہ افراد جن کا تعلق فرخ سیر سے تھا، عزت اور آرام کی زندگی گزارنے لگے۔ میں جوان ہو گئی اور اپنے باپ کا انتظار کرتی رہی بادشاہ کو بھی میرے باپ کا انتظار رہا لیکن جب وہ نہیں آیا تو بادشاہ نے مجھے اپنے حرم میں ڈال لیا اور مجھے یہ یقین دلایا کہ جب میرا

WWW.PAKSOCIETY.COM

باپ واپس آئے گا تو وہ میرے عوض اسے کسی اعلیٰ منصب پر فائز کردے گا۔ مجھے بادشاہ کی یہ بات پسند نہیں آئی لیکن اسے اپنا مقدر سمجھ کر مجبوری سے قبول کرلیا۔ میں برابر یہ کوشش کرتی رہی کہ خود کو اس ماحول کا عادی بنالوں لیکن نہیں بنا سکی۔ فرخ سیر چھ سال چند ماہ بادشاہ رہ کر سیدزادوں کے ہاتھوں رخصت ہوا اور میں اس خبیث عبداللہ خاں کے ہاتھ لگ گئی۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ''اب میں اپنے باپ کو برا بھلا کہتی رہتی ہوں کہ اگر وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا ہوتا تو مجھے یہ ذلتیں نہ اٹھانا پڑتیں۔''

طبیب کی آنکھیں بھی چھلک پڑیں، بولا۔ ''مہرن! مجھے معاف کرنا کہ میں نے تمہیں غمزدہ کردیا۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے مگر میں تم سے اس بات میں اتفاق نہیں کروں گا کہ تم اپنے باپ کو برا بھلا کہو، ہوسکتا ہے اسے نیشاپور پہنچنا نصیب ہی نہ ہوا ہو اور راستے میں قزاقوں نے اس کا کام تمام کردیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ نیشاپور پہنچ کر بیمار پڑ کر رخصت ہوگیا ہو، ورنہ ایک باپ اتنا ظالم نہیں ہوسکتا۔''

مہرن نے روتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنے باپ کو بھی برا بھلا نہ کہوں، مرحوم بادشاہ کی برائی بھی نہ کروں، پھر کس کو برا کہوں؟ کس کو اپنی تباہی کا ذمے دار قرار دوں۔''

طبیب نے جواب دیا۔ ''کسی کو بھی نہیں، بس یہ سمجھ لو کہ یہ ساری نیرنگیاں قسمت کی ہیں، تقدیر میں جو کچھ بھی ہے وہ ہوکر رہے گا۔''

مہرن نے بڑے دکھ سے طبیب کی طرف دیکھا، بولی۔ ''کسی انسان کی اس سے بڑی بے بسی کیا ہوسکتی ہے کہ وہ اپنی بربادیوں اور تباہیوں کا ذمے دار کسی اور کو قرار دینے کے بجائے اپنی قسمت کا لکھا کہہ کر صبر کرنے پر مجبور ہوجائے۔''

طبیب نے بڑی نرمی سے کہا۔ ''مہرن! میرا نام مغیث الدین ہے لیکن تم مجھے مغیث کہہ سکتی ہو، کیونکہ ہر کوئی مجھے مغیث ہی کہتا ہے۔''

مہرن نے کوئی جواب نہیں دیا، چپ رہی، مغیث نے کہا۔ ''میں کوشش کروں گا کہ تمہیں اس جہنم سے نکال لے چلوں، لیکن اس سلسلے میں تمہیں بھی میرا ساتھ دینا پڑے گا۔''

مہرن نے پھیکی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ ''طبیب! تم شاید ظالم عبداللہ خاں اور اس کے بھائی امیر الامرا کی طاقت اور اقتدار سے اچھی طرح واقف نہیں ہو ورنہ مجھے ایسی تسلی نہ دیتے۔ میرے خیال میں اس وقت اس ملک میں کوئی بھی اتنا طاقتور نہیں ہے جو میری مدد کرسکے۔''

مغیث نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے لیکن میں جو کچھ کروں گا اس میں طاقت کا ذرا بھی ہاتھ نہ ہوگا، میں تو عقلمندی اور ہوشیاری سے کام لوں گا، بس تم اب اپنی اکڑفوں ختم کردو اور عام حالت اختیار کرو۔''

مہرن نے کوئی سوال کرنا چاہا مگر معلوم ہوا، عبداللہ خاں آچکا ہے، مغیث نے کہا۔ ''مہرن! تم کسی بات سے گھبرانا مت، بقیہ باتیں پھر کسی وقت ہوجائیں گی لیکن میرے حوالے سے تم عبداللہ خاں سے کوئی بات نہیں کرنا ورنہ یہیں سے خرابی پیدا ہوجائے گی۔''

عبداللہ خاں کو حویلی میں داخل ہوتے ہی معلوم ہوگیا کہ آج نوجوان طبیب نے مہرن سے بہت زیادہ باتیں کی ہیں اور ہنوز باتوں کا سلسلہ جاری ہے۔ عبداللہ خاں سرتاپا قہر بن کر ان دونوں کے پاس پہنچ گیا، اس نے طنزاً پوچھا۔ ''حکیم صاحب! آپ ابھی تک موجود ہیں؟''

مغیث نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں ابھی تک موجود ہوں اور اگر مجھے اس لڑکی کا علاج کرنا ہے تو ضروری ہوگا کہ میں اپنا زیادہ وقت اس کے پاس گزاروں۔''

عبداللہ خاں نے ان دونوں کو متجسسانہ نظروں سے دیکھا، مہرن نے نفرت سے منہ پھیرلیا، عبداللہ خاں نے مغیث سے کہا۔ ''آپ ذرا میرے ساتھ تو آیئے، چند ضروری باتیں کرنا ہیں۔''

مغیث، عبداللہ خاں کے ساتھ ایک دوسرے کمرے میں چلا گیا، عبداللہ خاں اپنی آبنوسی مسہری پر بیٹھ گیا اور مغیث کو مونڈھا پیش کیا جس پر سرخ ریشمی کپڑا چڑھا ہوا تھا۔ مغیث نے کمرے کا بہ غور جائزہ لیا تو وہاں تعیش کی بہت ساری چیزیں نظر آئیں اور اس کمرے میں بیٹھ کر انسان کی طبیعت میں خود بخود جنس اور شہوت کی تحریک پیدا ہونے لگتی تھی۔

عبداللہ خاں بڑی سوچ میں تھا لیکن اس کی نظریں بہ دستور مغیث کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ مغیث خوفزدہ تھا کہ معلوم نہیں کیا وقوع پذیر ہونے والا ہے۔

عبداللہ خاں نے کہا۔ ''حکیم صاحب! آج آپ بہت دیر تک مہرن کے پاس رہے، خیریت تو ہے؟''

مغیث نے جواب دیا۔ ''جناب والا! میں اپنے مریضوں کا دو طرح سے علاج کرتا ہوں، ایک تو دواؤں سے، دوسرے باتوں سے، نفسی کیفیات کو اچھی طرح سمجھ کر، طبیعت اور نفسی کیفیات کی اس کجی کو، جو حالات اور ناخوشگوار واقعات کے تواتر سے پیدا ہوجاتی ہے، میں نفسی

عمل سے اس کجی کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور میرے یہی علاج کے وہ دو طریقے ہیں جنہوں نے مجھے غیر معمولی شہرت بخشی ہے اور کامیاب یا حاذق طبیب کہلاتا ہوں۔''

عبداللہ خاں نے شریفانہ لب ولہجے میں پوچھا۔ ''پھر آپ نے کیا اندازہ لگایا؟''

مغیث نے جواب دیا۔ ''لڑکی کا ماضی بڑا کرب ناک ہے اور وہ جن حالات میں فرخ سیر کے پلے پڑی اور پھر اسے آپ لے آئے۔ وہ خود کو اس ماحول کے مطابق نہیں بنا پارہی ہے اس کشمکش اور تضاد نے اسے چڑچڑا اور بدمزاج بنا دیا ہے اور اس بدمزاجی یا ضد پر میں آپ کسی دوا یا سختی سے قابو نہیں پاسکتے، سختی یا تشدد سے اس لڑکی کے ذہنی اور نفسی مرض میں اضافہ تو کرسکتے ہیں لیکن کمی یا اصلاح نہیں کرسکتے۔''

عبداللہ خاں نے پوچھا۔ ''آج کی باتوں کا اس پر کیا اثر ہوا؟''

مغیث نے جواب دیا۔ ''آج میں نے اس کا ماضی تو معلوم کرلیا ہے، اب آئندہ اس کا علاج کروں گا۔''

عبداللہ خاں نے بڑے غیر جذباتی لہجے میں کہا۔ ''آپ کو میرے پاس میرے چھوٹے بھائی نے بھیجا ہے، اس لیے میں آپ پر اعتبار بھی کرسکتا ہوں لیکن پھر بھی آپ ہمیشہ یہ بات ذہن نشین رکھیں کہ آپ عبداللہ خاں کی حویلی میں آتے ہیں آپ میری اجازت سے میری حویلی میں داخل تو ہوگئے ہیں لیکن آپ ہر وقت خطرے میں ہیں، آپ کی ذرا سی بے احتیاطی یا لغزش آپ کو ہلاک کرسکتی ہے۔ آپ کو اگر اپنے آپ پر، غیر معمولی اعتماد ہے تو آپ یہاں آتے جاتے رہیے، لیکن، اگر یہ بات نہیں ہے تو کل سے تشریف نہ لائیں۔''

مغیث نے جواب دیا۔ ''یہ پابندی میں نے خود ہی اپنے آپ پر عائد کرلی ہے، آپ فکر نہ کریں۔''

عبداللہ خاں کھڑا ہوگیا، بولا۔ ''اب آپ جاسکتے ہیں اور جانے سے پہلے یہ بات بھی اپنے ذہن میں بٹھالیں کہ میں تمہیں 'آپ' کہہ کر غیر معمولی عزت وتکریم دے رہا ہوں، اس کا ہمیشہ خیال رہے۔''

مغیث نے جواب دیا۔ ''شکریہ، میں ہمیشہ اسے یاد رکھوں گا۔''

عبداللہ خاں نے مغیث کو رخصت کیا اور خود مہرن کے پاس چلا گیا۔ اس دن مہرن کے مزاج میں واقعی نرمی محسوس ہوئی، وہ تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ مہرن نے عبداللہ خاں پر یہ بات واضح کردی کہ اس کے حرم میں جس طرح عورتیں رہ رہی ہیں، وہ نہیں رہ سکتی، وہ بیوی بن کر بھی فی الحال اس کے ساتھ خوشی سے نہیں رہے گی، اس لیے عبداللہ خاں کو چاہیے کہ پہلے وہ ان زخموں کو مندمل کرنے کی کوشش کرے جو اب تک اس کی روح پر پڑتے رہے ہیں۔ عبداللہ خاں نے دباؤ تو کسی کا برداشت کیا ہی نہ تھا، جواب دیا۔ ''میں کسی لڑکی یا عورت کا کبھی فدوی بنا ہی نہیں، اس لیے تیرے آگے جھکنا میری فطرت کے خلاف ہے، میں اسی طرح پیش آتا رہوں گا جس طرح پیش آرہا ہوں، عورت میری بھوک، میری کمزوری ہے۔ کسی بھوکے کے آگے کھانا رکھ کر صبر وتحمل کی تلقین کی جائے اور کھانے کے ایسے آداب وقواعد کا پابند بنانے کی کوشش کی جائے، جس سے فوری کھانے میں رکاوٹیں پیدا ہورہی ہوں، بھوکے کو کھانے سے روکا نہیں جاسکتا۔''

مہرن خاموش ہوگئی اور عبداللہ خاں کو غصے اور خوف کے ملے جلے جذبات سے گھورنے لگی۔

درباری امرا سیدزادوں سے بہت ناراض تھے اور اس فکر میں تھے کہ کوئی ایسا موقع آئے جس سے ان دونوں بھائیوں کا زور توڑا جاسکے تو اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے لیکن کہیں دور دور ایسا کوئی موقع نہیں نظر آرہا تھا۔ خاص کر نظام الملک اور اعتمادالدولہ محمد امین خاں کو بہت زیادہ فکر تھی لیکن یہ دونوں اتنے عقلمند اور گہرے تھے کہ ان کے ارادوں کا کسی کو علم نہیں ہوسکتا تھا۔ اسی دوران رفیع الدولہ کو اسہال کا مرض لاحق ہوا اور مرض اتنی جلدی بگڑا کہ دوا کے ساتھ ساتھ حالت ابتر ہوتی چلی گئی۔ عبداللہ خاں نے خواب وخورش حرام کرلیا اور ہر ممکنہ کوشش سے بادشاہ کا علاج کرنے کی کوشش کی لیکن جب زندگی کی طرف سے مایوسی ہوگئی تو ان دونوں بھائیوں کو نئے بادشاہ کی جستجو ہوئی۔ قید خانوں میں مغل شہزادوں کی کھیپ کی کھیپ سڑ رہی تھی، لیکن ان دونوں کی نظر انتخاب خجستہ اختر کے بیٹے روشن اختر پر پڑی۔ اٹھارہ سالہ شہزادہ اپنی ماں کے ساتھ سلیم گڑھ کے محل میں قید تھا۔ عبداللہ خاں نے اپنے سب سے چھوٹے بھائی نجم الدین خاں کو سلیم گڑھ روانہ کردیا کہ وہ روشن اختر کو اس کی ماں قدسیہ کے ساتھ لے کر فوراً آگرے واپس آجائے لیکن روشن اختر کے آنے سے پہلے ہی رفیع الدولہ چل بسا اور سیدزادوں نے اس خبر کو اس وقت تک چھپائے رکھا جب تک کہ روشن اختر آنہیں گیا۔

ہفتہ کے دن، چار گھڑی دن گزر جانے کے بعد روشن اختر کی بادشاہی کا اعلان کردیا گیا اور ابوالفتح ناصرالدین محمد شاہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے لقب سے بادشاہ بن گیا۔ لیکن بعد میں لوگوں نے اسے محمد شاہ رنگیلا کے نام سے یاد رکھا۔ دونوں بھائیوں کا یہ خیال تھا کہ یہ اٹھارہ سالہ ناتجربہ کار نوجوان بادشاہ پوری طرح ان کی نگرانی میں رہے گا اور ملک کا انتظام بھی انہی دونوں بھائیوں کی تحویل میں رہے گا۔ یہ شہزادہ اتنا ڈرا سہا ہوا تھا کہ بادشاہ ہوجانے کے باوجود محکوموں جیسی حرکات کا ذمے دار قرار پا رہا تھا۔ دونوں سید زادے اپنی قوت پر نازاں تھے اور ان میں بڑی رعونت آگئی تھی۔ نئے بادشاہ نے پرانے عہدہ داروں کو ان کے منصب پر بحال رکھا۔ ہمت خاں پھر بادشاہ کا اتالیق مقرر ہوا۔ ملک میں ایک بار پھر انتشار پھیلا اور بغاوتیں ہونے لگیں لیکن ان سب پر جلد از جلد قابو پالیا گیا۔ ان ہنگاموں میں میر جملہ نے ایک بار پھر سر اٹھانے کی کوشش کی لیکن دونوں بھائیوں نے اس کے شر سے بچنے کے لیے اسے صدر الصدور بنادیا۔ وہ چپ ہوگیا۔

دوسری طرف اعتماد الدولہ محمد امین خاں، محمد شاہ سے ترکی زبان میں گفتگو کرنے لگا اور اسے سید زادوں کے خلاف ایسی ایسی باتیں بتانے لگا جن کا کسی کو علم نہ تھا اور یہ بھی یقین دلایا کہ اس طرح یہ دونوں بھائی مغلیہ سلطنت کو تباہ و برباد کرکے سادات بارہہ کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں اور جب تک ان دونوں کی بیخ کنی نہیں ہوگی، مغلیہ سلطنت ان کی طفیلی رہے گی۔ امین خاں نے دونوں بھائیوں کے سیاہ کارناموں کی تفصیلات بھی نئے بادشاہ کے گوش گزار کیں اور یہ بھی بتایا کہ عبداللہ خاں نے کس طرح فرخ سیر کو قتل کیا اور شاہی بیگمات میں سے چند پسندیدہ بیگمات کو اپنے تصرف میں لے لیا اور یہ بھی بتایا کہ ان میں ایک مہرن اب بھی اس کے ظلم اور جبر کا نشانہ بنی ہوئی ہے۔ ان ساری تفصیلات نے محمد شاہ کو الجھن میں ڈال دیا اور اس نے اپنے دل میں یہ طے کرلیا کہ خواہ کچھ بھی ہو، ان دونوں بھائیوں کی بیخ کنی ضرور ہونی چاہیے۔

عبداللہ خاں کو برابر یہ خبریں پہنچ رہی تھیں کہ محمد امین خاں ترکی زبان میں بادشاہ کو ورغلانے میں مصروف ہے اس لیے اگر اس فتنے کو ابھی سے نہ کچل دیا گیا تو مستقبل میں بڑی مصیبتیں اور پریشانیاں اٹھانا پڑیں گی۔

عبداللہ خاں نے بادشاہ کے اتالیق ہمت خاں سے جواب طلب کرلیا کہ اس کی موجودگی میں بادشاہ اور امین خاں آخر کس طرح سید زادوں کے خلاف جوڑ توڑ کررہے ہیں اور اس کی انہیں خبر کیوں نہیں دی گئی؟

ہمت خاں نے جواب دیا۔ ”جناب والا! وہ دونوں ترکی زبان میں باتیں کرتے ہیں اور ہم میں سے کوئی بھی ترکی زبان نہیں جانتا۔“

عبداللہ خاں نے اس وقت حسین علی خاں کو بھی بلالیا اور یہ مسئلہ اس کے سامنے رکھ کر مشورہ طلب کیا۔ حسین علی خاں نے کہا۔ ”امین خاں کو سختی سے منع کردیا جائے کہ وہ بادشاہ سے ترکی زبان میں گفتگو مت کیا کرے۔“

عبداللہ خاں نے کہا۔ ”حسین علی خاں! امین خاں کو منع کرنا اتنی آسان بات نہیں ہے۔“

حسین علی خاں نے دوسرا مشورہ دیا۔ ”تب پھر اسے قتل کرادیا جائے۔“

عبداللہ خاں ناک بھویں چڑھا کر بولا۔ ”عجیب مشکل ہے، تم ہمیشہ انتہا پسندی کے مشورے دیتے ہو۔ کیا تم نے اپنے اس مشورے کے نتائج پر بھی غور کیا کبھی؟“

حسین علی خاں نے اکڑ کر جواب دیا۔ ”میں ان نتائج کا مقابلہ بھی کروں گا، میں جانتا ہوں، امین خاں کے قتل کا کیا نتیجہ نکلے گا؟“

”تم کچھ نہیں جانتے، امین خاں کے ساتھ مغل فوج ہے اور مغل فوج ایک ہنگامہ کھڑا کردے گی۔ اس کے علاوہ مالوے کا نظام الملک، امین خاں کا رشتے دار ہے اور نظام الملک کی فراست اور سیاست سے کون واقف نہیں۔ ایک امین خاں کا قتل ہمارے بے شمار دشمن پیدا کردے گا۔“

حسین علی خاں نے بڑے استقلال سے کہنا شروع کیا۔ ”میں اپنے کام کا آغاز الٰہ آباد کے باغی گروہ سے کرتا ہوں۔ میں اس کا سر کچل کر مالوے اور دکن کا رخ کروں گا کیونکہ جب تک ان دشمنوں کو میدان جنگ میں مزہ نہیں چکھایا جائے گا، یہ قابو میں نہیں آئیں گے۔“

عبداللہ خاں نے چھوٹے بھائی کی پھر مخالفت کی۔ ”اگر تم الٰہ آباد جاؤ گے تو میری ایک شرط ضرور پوری کرنا ہوگی۔“

”کون سی شرط؟“

عبداللہ خاں نے ترشی سے وضاحت کی۔ ”تم نے آگرے کے خزانے اور نوادرات کا بیشتر حصہ خود ہڑپ کرلیا تھا، اب شاید الٰہ آباد بھی تم اسی لالچ میں جانا چاہتے ہو۔ میری طرف سے تمہیں جانے کی اجازت ہے لیکن الٰہ آباد سے تمہیں جو کچھ بھی ملے گا، میرا ہوگا، تنہا میرا حق ہوگا، اس میں سے ایک کوڑی بھی تم اپنے پاس نہیں رکھو گے۔“

حسین علی خاں نے بھی گرمی سے جواب دیا۔ ”بھائی صاحب! میں آپ کا احترام کرتا ہوں لیکن آپ ہمیشہ ایک نہ ایک ایسی بات کہہ دیتے ہیں جس سے دل میں ناسور پیدا

ہوجاتا ہے۔ میدان جنگ کی صعوبتیں میں جھیلتا ہوں، خطرات میں، میں کودتا ہوں۔ پھر اگر میں اپنا حصہ بھی زیادہ رکھتا ہوں تو اس میں آپ کو شکایت نہیں ہونا چاہیے۔“

عبداللہ خاں نے کہا۔ ”حسین علی خاں! بچوں جیسی باتیں نہ کرو، ان حالات میں جتنے تم ضروری ہو، اتنا ہی میں بھی ضروری ہوں۔“

”لیکن آپ میں اور مجھ میں یہ فرق ہے کہ میں مال وزر پر ہاتھ مارتا ہوں اور آپ عورتوں پر اکتفا کرلیتے ہیں اور مال وزر کے لیے بعد میں شور کرتے ہیں۔“

عبداللہ خاں ایک دم نرم پڑ گیا، بولا۔ ”خیر، اس وقت ہمیں ان فضول مباحث اور جھگڑوں میں اپنا وقت نہیں گنوانا چاہیے۔ اب تم یہ بتاؤ کہ اس امین خاں کا کیا علاج کیا جائے؟“

حسین علی خاں نے چھری کی طرح اپنی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔ ”قتل اور صرف قتل۔“

عبداللہ خاں نے منہ بنا کر سوال کیا۔ ”مگر امین خاں کا جرم؟ اسے کیوں قتل کیا جائے؟“

حسین علی خاں نے ذرا غور سے اپنے بڑے بھائی کو دیکھا، بولا۔ ”جرم؟ کیا یہ جرم معمولی ہے کہ وہ بادشاہ سے ترکی زبان میں ہمارے خلاف سازشیں کررہا ہے۔“

عبداللہ خاں نے جواب دیا۔ ”نہیں، ترکی میں بات کرنا کوئی جرم تو نہیں، اور جب کوئی ترکی زبان جانتا ہی نہ ہو تو ہمیں یہ کس طرح معلوم ہوگا کہ بادشاہ اور امین خاں ہمارے خلاف سازشیں کررہے ہیں۔ یہ محض شبہ ہے اور شبہ میں اتنا بڑا اور خطرناک قدم نہیں اٹھایا جاسکتا۔“

حسین علی خاں نے اچانک ایک غیر متعلق سا سوال کردیا۔ ”اور بھائی صاحب؟ وہ طبیب کیسا کام کررہا ہے؟ اس سرپھری، سرکش لڑکی کا علاج کیا یا بھاگ گیا؟“

عبداللہ خاں نے ہنس کر جواب دیا۔ ”حسین علی خاں! وہ تو بڑے غضب کا آدمی ہے، اس نے مہرن کا جس طرح علاج شروع کیا ہے، وہ اس کی حذاقت کی دلیل ہے۔ مہرن میں خاصی تبدیلی آچکی ہے۔“

حسین علی خاں نے کہا۔ ”بھائی صاحب! وہ پردیسی ہے، طبابت پڑھ سیکھ کر اس ملک میں آگیا۔ وہ ترکی زبان بھی جانتا ہے، کیا خیال ہے، کیا اسے بادشاہ کے پاس ملازم کرادیا جائے؟ وہ ہمت خاں سے اچھا اتالیق ثابت ہوگا کیونکہ وہ ترکی بھی جانتا ہے۔“

عبداللہ خاں نے جواب دیا۔ ”وہ تو ٹھیک ہے، لیکن اس طرح کہیں ہمت خاں خلاف نہ ہوجائے۔“

حسین علی خاں نے کہا۔ ”امین خاں نے ابھی تک کوئی ایسی بات نہیں کی ہے جس سے ہم یہ سمجھیں کہ وہ ہماری مخالفت کررہا ہے اور ہمیں نقصان پہنچادے گا۔“

عبداللہ خاں نے جواب دیا۔ ”بہرحال کچھ بھی ہو، قدم بہت سوچ سمجھ کر اٹھانا ہوگا۔“

حسین علی خاں نے کہا۔ ”میں آپ کے کہنے سے خاموش ہوجاؤں گا، ورنہ میں تو اس بات کا قائل ہوں کہ سانپ پر جیسے ہی نظر پڑے، اس کا پھن فوراً ہی کچل دیا جائے۔“

عبداللہ خاں نے کہا۔ ”تب پھر سردست تم یہ کرو کہ اس نوجوان طبیب کو بادشاہ کی خدمت میں پیش کردو اور وہاں بتایا یہ جائے کہ یہ نوجوان طبیب بادشاہ کی دیکھ بھال کے لیے خاص طور پر بھیجا جارہا ہے، اب حضور والا اس سے طبی اور حفظان صحت کے اصولوں سے گفتگو فرمایا کریں گے اور یہ نوجوان ہر وقت حضور کی خدمت میں حاضر رہا کرے گا۔“

حسین علی خاں نے جواب دیا۔ ”میں آپ کی اس تجویز سے صد فیصد متفق ہوں، لیکن آج ایک بات آپ کو میری بھی ماننا ہوگی۔“

عبداللہ خاں نے گم صم انداز میں پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟ اگر وہ ماننے والی ہوگی تو ضرور مانوں گا۔“

حسین علی خاں نے شرارت آمیز شوخی سے کہا۔ ”وہ بات ایسی نہیں ہے کہ آپ نہ مان سکیں لیکن اس کا ایک پہلو ایسا بھی ہے کہ آپ پر گراں گزرے اور آپ نہ مانیں۔“

عبداللہ خاں الجھن میں پڑ گیا، دیر تک سوچتا رہا، پھر عاجز آکر بولا۔ ”میں نہیں سمجھ سکوں گا، صاف صاف کرو بات۔“

حسین علی خاں نے جواب دیا۔ ”بات مہرن سے متعلق ہے اور آپ غالباً اس لڑکی کو بہت زیادہ پسند فرماتے ہیں۔“

عبداللہ خاں ہنسنے لگا، بولا۔ ”کمال ہے، اب سمجھا میں تمہارا مطلب۔“

حسین علی خاں نے پوچھا۔ ”آپ کیا سمجھے میرا مطلب؟“

عبداللہ خاں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”تم نے اپنے بھیجے ہوئے طبیب سے یہ خوش خبری سن لی ہوگی کہ مہرن اب سنبھل رہی ہے۔ میں نے تمہیں دو عورتیں پہلے ہی دے دی ہیں، اب اگر تم مہرن کو بھی ہتھیانا چاہتے ہو تو یہ ناممکن ہے، میں مہرن کو تمہارے حوالے نہیں کرسکتا۔“

حسین علی خاں ہنسنے لگا، طنز کرتے ہوئے بولا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"آپ اب بھی نہیں سمجھے میرا مطلب۔ مجھے عورتوں کا آپ جتنا شوق نہیں ہے بلکہ میں تو کچھ اور ہی کہنا چاہتا ہوں۔"

عبداللہ خاں نے وحشت زدہ انداز میں کہا۔ "تمہیں جو کچھ کہنا ہے، صاف صاف، واضح انداز میں کہو۔"

حسین علی خاں نے کہا۔ "بھائی صاحب! اس وقت جس قسم کے فتنے سر اٹھا رہے ہیں، ان کو دبانے یا کچل دینے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ ہم اپنی مقصد براری کے لیے اپنی قیمتی سے قیمتی چیز کو مقصد پر قربان کر دیں۔ آپ یہ تو جانتے ہی ہیں کہ جو حالات ہمیں درپیش ہیں، ان میں سادات کے علاوہ کسی پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ مغل ہمارے دوست نہیں، تورانی امرا سر اٹھا رہے ہیں، اس لیے یہ نوجوان طبیب جب میرے پاس آیا اور مجھ سے درخواست کی کہ اسے شاہی ملازمت دلا دوں تو میں نے اسے اپنے پاس رکھ لیا۔ مغیث، فرخ سیر کے پاس ملازمت کرنا چاہتا تھا لیکن فرخ سیر اب کہاں۔ میں نے اس خیال سے اس پر سہارا دینے کا احسان کیا ہے کہ زیر بار احسان ہو کر یہ کبھی نہ کبھی میرے کام بھی آ سکتا ہے۔ اب میں اسے سکھا پڑھا کر بادشاہ کے وابستگانِ خلوت میں پہنچا دوں گا۔ مغیث ترکی جانتا ہے اور بادشاہ کو یہ بتائے بغیر کہ مغیث کو ترکی آتی ہے، محمد امین خاں اور بادشاہ کی باتیں ہم تک پہنچا دیا کرے گا۔ لیکن ایسا کرنے سے پہلے ہمیں مغیث کو بہت زیادہ خوش کرنا پڑے گا۔ نوجوان آدمی ہے، زیر علاج مہرن بھی نوجوان اور خوب صورت ہے اور اس بات کا امکان پایا جاتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے میں دلچسپی لینے لگیں۔ آپ کا کام بس اتنا ہوگا کہ جب آپ یہ محسوس کرنے لگیں کہ دونوں ایک دوسرے پر مائل ہیں تو انہیں زیادہ شدت سے چاہنے کا موقع دیں، ایک آدھ بار انہیں قابل اعتراض حالت میں پکڑ بھی لیں اور برائے نام تنبیہ کر کے معاف کر دیں۔ میں کہتا ہوں اس طرح یہ نوجوان پوری طرح ہمارے قابو میں رہے گا اور ہمارا ہر کام شوق اور لگن سے کرے گا۔"

عبداللہ خاں کے دل پر سانپ لوٹنے لگا، بولا۔ "حسین علی خاں! تم یہ بھی تو سوچو کہ میں مہرن کو بہت زیادہ چاہتا ہوں، پھر میں یہ ساری باتیں کس طرح برداشت کروں گا؟"

حسین علی خاں نے افسوس سے کہا۔ "حکومت اور اقتدار کی برقراری اور بقا کے لیے ایک لڑکی کیا، اپنا سب کچھ قربان کیا جا سکتا ہے۔ آپ معلوم نہیں کس طرح سوچ رہے ہیں۔"

عبداللہ خاں نے سر جھکا لیا اور دیر تک کچھ سوچتا رہا۔

حسین علی خاں نے مزید کہا۔ "حالانکہ میں ذرا مختلف قسم کا انسان ہوں، آپ کی جگہ میں ہوتا تو معلوم نہیں کتنی مہرنیں اپنے اس عظیم مقصد پر قربان کر دیتا اور آپ کو اس قدر تامل ہے، کمال ہے۔"

عبداللہ خاں نے جواب دیا۔ "حسین علی خاں! میں تمہاری عقل اور تدبیروں پر بھروسا کرتا ہوں، تم نے جو کچھ کہا ہے شاید ویسا ہی ہو جائے، لیکن اس کے لیے مجھ کو تیار کرنا ہوگا، آمادہ کرنا پڑے گا۔ تمہاری تجویز کی افادیت سے مجھے انکار نہیں۔"

حسین علی خاں نے خوش ہو کر کہا۔ "جب تک ہم دونوں بھائی اسی طرح ہم خیال اور ہم رائے رہیں گے، کامیاب اور کامران رہیں گے لیکن جس دن بھی اختلاف رونما ہوگا، ہمیں شرمندگیاں اٹھانا پڑیں گی، ہمیں ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑے گا۔"

عبداللہ خاں پھر سوچ میں پڑ گیا۔ مہرن اس کی انا تھی، اس کا معیار تھی، اس کی پسند تھی، اس کا دل بار بار حسین علی خاں کے فیصلے کو رد کر رہا تھا۔ اسے اس تجویز کی افادیت کا احساس تھا لیکن تجویز کو عملی جامہ پہنانے میں اس کا دل دکھ رہا تھا۔ حسین علی خاں چلا گیا اور وہ فکر مند بیٹھا ہی رہ گیا۔ خاصی دیر بعد جب اسے اپنی تنہائی کا احساس ہوا تو گھبرا کر کھڑا ہو گیا، انگڑائی لی اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ دبے قدموں مہرن کی طرف چل دیا۔ راہ میں جو خواتین ملیں، انہوں نے عبداللہ خاں کو لعنت ملامت کی اور کہا۔ "ایسی بے غیرتی تو کہیں سننے میں بھی نہیں آئی کہ کوئی مرد اپنی محبوبہ یا عورت کو گھنٹوں کے لیے کسی غیر طبیب کے حوالے کر دے، اگر مہرن سے طبیعت بیزار ہی ہے تو اسے اسی مرد کو بخش دیا جائے، شاید دونوں ہی دعائیں دیں گے۔"

عبداللہ خاں نے پوچھا۔ "تم میں سے کسی نے کوئی بات دیکھی بھی ہے یا یوں ہی انکل سے باتیں بنائی جا رہی ہیں؟"

ایک ادھیڑ عمر خاتون نے جواب دیا۔ "خدا کو دیکھا نہیں عقل سے پہچانا جاتا ہے اور پھر ان دونوں کو اس طرح یا اس حالت میں دیکھنا، جس کا قیاس کیا جا رہا ہے، ناممکن ہے ناممکن، اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

عبداللہ خاں نے ڈانٹ دیا۔ "جب کچھ دیکھا نہیں تو خوامخواہ باتیں بھی نہ بناؤ تم لوگ، یا تو ان دونوں کو پکڑ کر

دکھاؤ، ورنہ اپنی زبانیں اپنے اپنے تالوؤں سے چپکائے رکھو، الزام تراشی بہت بری بات ہے۔"

ایک پچیس چھبیس سالہ خاتون نے بڑی ادا سے کہا۔ "تو جی، کوئی ان دونوں کو اس حالت میں کس طرح دیکھ سکتا ہے، جس کا شبہ کیا یقین کیا جا رہا ہے۔ جہاں تک اس کام کی حالت میں کسی کو دیکھنے یا پکڑنے کا معاملہ ہے تو میں تو یہ کہتی ہوں کہ یہ تو ناجائز کام ہے اور بہت چھپ چھپا کر کیا جاتا ہے۔"

عبداللہ خاں لاجواب ہو گیا۔ وہ سیدھا مہرن کے پاس پہنچ گیا، شاید اندر طبیب اس وقت بھی موجود تھا۔ عبداللہ خاں نے دروازے کے پیچھے سے ان دونوں کی باتیں سننے کی کوشش کی لیکن دونوں اتنی آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے کہ باہر سے کچھ سمجھ ہی میں نہ آتا تھا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے دروازے پر دستک دی، جواب میں مہرن کی آواز آئی۔ "کون ہے؟"

عبداللہ خاں نے پوچھا۔ "اندر اور کون ہے؟"

مہرن نے جواب دیا۔ "تمہارا بھیجا ہوا طبیب۔"

عبداللہ خاں نے کہا۔ "اچھا دروازہ تو کھولو...... میں اندر آ سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں، کیوں نہیں، یہ تو گھر ہی آپ کا ہے، پھر یہ اجازت لینا کیا معنی؟"

عبداللہ خاں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ارے بھائی! یہاں گھر کسی کا بھی نہیں، آج اگر ہمارا ہے تو کل تمہارا ہو جائے گا۔ ہم سب تو ان کے کرائے دار ہیں، اپنی اپنی مدتیں ان مکانوں میں گزار کر کہیں اور چلے جائیں گے۔"

مہرن نے دروازہ کھول دیا لیکن آج عبداللہ خاں کے سلجھے ہوئے رویے نے مہرن کو حیرت میں ڈال دیا تھا لیکن مغیث اس غلط فہمی کا شکار تھا کہ عبداللہ خاں شاید اس کے مشورے پر عمل کر رہا ہے۔ عبداللہ خاں اندر داخل ہوا اور ان دونوں کو کچھ عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا۔ ان نظروں سے دونوں ہی خوفزدہ تھے۔ عبداللہ خاں نے پوچھا۔ "یہاں کیا ہو رہا تھا؟"

مغیث نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔ "میں نے آپ سے اس بات کی اجازت لے لی تھی اس لیے......"

لیکن عبداللہ خاں نے بات کاٹ دی، بولا۔ "میں آپ سے نہیں، مہرن سے پوچھ رہا تھا کہ یہاں کیا ہو رہا تھا؟"

مہرن نے جواب دیا۔ "ابھی تو آپ بڑے ہنس مکھ انداز میں سوال جواب کر رہے تھے لیکن اندر داخل ہوتے ہی آپ کا مزاج ہی بدل گیا۔"

عبداللہ خاں چیخا۔ "زیادہ باتیں مت کر لڑکی! جتنا مختصر میرا سوال ہے میں اتنا ہی مختصر جواب بھی چاہتا ہوں۔"

مہرن نے جواب دیا۔ "یہاں باتیں ہو رہی تھیں، صرف باتیں۔ آپ جو کچھ سمجھ رہے ہیں، وہ نہیں ہو رہا تھا، میں اتنی ارزاں نہیں ہوں اور نہ ہی یہ نوجوان آپ جتنا سفلہ اور کمین ہے۔"

عبداللہ خاں نے غصے میں مہرن کو ایک طمانچہ رسید کر دیا۔ "میں اس اندازِ گفتگو کا عادی نہیں ہوں لڑکی! ذرا زبان سنبھال کر بات کیا کر مجھ سے، ورنہ میں تجھے زندہ دفن کر دوں گا، تیری زبان کو گدی سے کھنچوا سکتا ہوں، میرے عذاب سے ڈر، میری تادیب سے خوف کھا نادان اور زبان دراز لڑکی۔"

مہرن کے رخسار پر انگلیوں کے نشان ابھر آئے لیکن وہ روئی نہیں، آنکھیں ڈبڈبا آئیں، بھیگی جھلملاتی نظروں سے عبداللہ خاں کو دیکھتی رہ گئی۔ مغیث کا چہرہ مارے غصے کے سرخ ہو گیا۔ شاید اس کا بس چلتا تو عبداللہ خاں کو قتل کر دیتا لیکن ایسا کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ عبداللہ خاں، مغیث کی کیفیت کا جائزہ لیتا رہا مغیث نے بڑے افسوس سے کہا۔ "جناب! یہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔"

عبداللہ خاں نے طنزاً جواب دیا۔ "جو کچھ تو کہہ رہا ہے، اسے میں نے تیرے چہرے سے پڑھ لیا ہے۔ نوجوان طبیب! ذرا دیر پہلے تک میں تجھے آپ، جناب سے مخاطب کرتا رہا ہوں لیکن اب میں تو اور تجھ جیسے حقیر لفظوں سے مخاطب کر رہا ہوں، کچھ جانتا ہے کیوں؟"

مغیث نے جواب دیا۔ "جانتا ہوں، خوب جانتا ہوں۔"

عبداللہ خاں نے کہا۔ "تو کچھ نہیں جانتا، میرے دل کی بات تو جان بھی کس طرح سکتا ہے۔"

مغیث نے کہا۔ "میں آپ کو جس طرح کہیں، یہ یقین دلانے کے لیے تیار ہوں کہ میں بالکل پاک صاف ہوں، میں نے کوئی گناہ نہیں کیا، میں نے نہ مہرن نے، یہ آپ کی بدگمانی ہے جس نے آپ کو مشتعل کر دیا ہے۔"

عبداللہ خاں نے جواب دیا۔ "تیری باتوں پر میں یقین کر سکتا ہوں لیکن میری دوسری خواتین تو شک و شبے میں مبتلا ہو گئی ہیں، میں ان کی بدگمانیاں کس طرح دور کروں گا۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

مغیث نے بڑے افسوسناک لہجے میں جواب دیا۔ ''اگر یہ بات ہے تو میں اس حویلی کی آمدورفت بند کرتا ہوں۔''

عبداللہ خاں نے کہا۔ ''نہیں، آمدورفت بند کرنے کی ضرورت نہیں، جب میں تجھ پر اعتبار کرتا ہوں، جب مجھے تجھ پر اعتماد ہے تو تجھے اس حویلی کے کسی فرد کی پروا نہیں کرنا چاہیے۔ ہاں، احتیاط لازم ہے۔''

مہرن اور مغیث ایک دوسرے کی صورت دیکھتے رہ گئے۔ ان دونوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ عبداللہ خاں گرگٹ کی طرح رنگ کیوں بدل رہا ہے، آخر وہ چاہتا کیا ہے؟

عبداللہ خاں نے مہرن کو ہٹ جانے کا اشارہ کیا۔ جب وہ چلی گئی تو اس نے مغیث کو تسلی دی۔ ''تمہارا کیا نام ہے؟ شاید مغیث، حسین علی خاں یہی بتا رہا تھا، خیر کوئی بھی نام ہو، میں نام نہیں تمہارا کام دیکھنا چاہتا ہوں، ہاں تو یہ بتاؤ، مہرن میں اور تبدیلی آئی یا نہیں؟''

مغیث نے بے دلی سے جواب دیا۔ ''میں نے آپ کو پہلے ہی منع کردیا تھا کہ اس کے ساتھ کسی بھی قسم کی سختی اس کے ذہنی اور نفسی مرض میں شدت اور زیادتی کا باعث بن جائے گی، لیکن آپ نے اس کا کوئی خیال نہیں کیا اور میرے سامنے ایک طمانچہ رسید کردیا۔''

عبداللہ خاں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''تم گھنٹوں مروّت اور محبت سے پیش آتے ہو، ایک لمحے کے لیے اگر میں نے سختی کی تو اس کا اتنا برا اثر تو نہیں ہونا چاہیے۔''

مغیث نے جواب دیا۔ ''جناب والا! آپ نے یہ طمانچہ اگر بالکل تنہائی میں رسید کیا ہوتا تو شاید اس کا اتنا شدید اثر نہ ہوتا، میری موجودگی میں طمانچہ رسید کرنا بڑی بے عزتی کی بات ہے اور اس کا اثر دنوں بلکہ شاید ہمیشہ باقی رہے۔''

''پھر وہی بات۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ایک معمولی سی بات تمہاری محبت اور مروت کے بڑے عمل پر کس طرح غالب آسکتی ہے؟''

مغیث نے جواب دیا۔ ''جناب والا! آپ کے سوال کا میرے پاس نہایت آسان اور معمولی جواب یہ ہے کہ زندگی بھر مقوی اور توانائی بخش غذائیں کھاتے رہیے مگر ان سب پر چٹکی بھر سنکھیا غالب آجاتی ہے۔''

عبداللہ خاں نے چونک کر داد و تحسین کی نظروں سے مغیث کی طرف دیکھا، بولا۔ ''اچھا اب یہ بحث بند کرو، اس موضوع کو ختم کرو۔ اس وقت زیر بحث تو یہ مسئلہ ہونا چاہیے کہ کیا تم دونوں یہاں جب بیٹھتے ہو تو اس میں ایک معالج اور مریض ہی کا رشتہ قائم رہتا ہے یا کوئی اور رشتہ بھی قائم ہوجاتا ہے؟''

مغیث کے چہرے کا رنگ بدل گیا، بولا۔ ''جناب والا! اس سوال کا میں پہلے ہی جواب دے چکا ہوں، اور اگر میرے جواب سے آپ کی تشفی نہیں ہوئی ہے تو میں زیادہ سے زیادہ یہی کرسکتا ہوں کہ یہاں کی آمدورفت بند کردوں۔''

''اوہو۔'' عبداللہ خاں مسکرانے لگا۔ ''میری یہ منشا ہرگز نہیں ہے۔ تمہیں یہاں آنے سے کون روک سکتا ہے، تم آؤ گے اور اسی طرح آتے رہو گے جس طرح آج تک آتے رہے ہو، اور میں تو اتنا فراخ دل واقع ہوا ہوں کہ اگر دو نوجوان دلوں کی قربت سے کوئی ناگفتنی واقعہ بھی رونما ہوجائے تو میں اسے ایک لازمی فطری عمل سمجھ کر برداشت کرسکتا ہوں مگر میں تم دونوں سے امید یہی رکھوں گا کہ تم احتیاط اور ادب کا دامن نہیں چھوڑو گے اور مجھے شکایت کا موقع نہیں دو گے۔''

مغیث بہت پریشان تھا اور عبداللہ خاں کی میٹھی میٹھی باتیں اس کی فہم سے بالاتر تھیں۔ عبداللہ خاں نے اس تحیر کو ختم کردیا۔ ''اب تم جاسکتے ہو لیکن حسب معمول علاج جاری رکھو گے۔''

مغیث چلا گیا، اب مہرن کی باری تھی، عبداللہ خاں نے ایک خادمہ کو بلا کر حکم دیا۔ ''مہرن کو حاضر کیا جائے۔''

کچھ دیر بعد مہرن ڈری سہمی حاضر ہوئی، اس نے پہلی نظر اس جگہ ڈالی جہاں مغیث بیٹھا تھا۔ اس کے بعد عبداللہ خاں کی طرف دیکھا۔ عبداللہ خاں نے اسے زبردستی اپنے پہلو میں بٹھالیا اور ہنستے ہوئے بولا۔ ''وہ چلا گیا لیکن مجھ سے قسم لے لو جو میں نے اسے چلتا کیا ہو۔ وہ اپنی مرضی سے گیا ہے۔''

مہرن سکڑنے سمٹنے لگی، عبداللہ خاں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اپنے منہ کے سامنے کرلیا، مہرن کی تیز تیز سانسیں عبداللہ خاں کی ڈاڑھی کے بالوں کو ہلانے لگیں، اس کی آنکھوں میں نفرت اور بے بسی کا عجیب امتزاج پایا جاتا تھا۔ عبداللہ خاں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ ''مہرن! میں تیری آنکھوں میں تیرے دل کی نفرت اور احساس مجبوری کو محسوس کررہا ہوں لیکن جان من! میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ تو مجھ سے نفرت کیوں کرتی ہے، میں نے تجھے

شاہی محل سے حاصل کیا اور اپنے دل اور آنکھوں میں جگہ دی لیکن تو ہے کہ اس ہرن کا کردار ادا کررہی ہے جسے کسی شریف شکاری نے جنگل کے خطرناک ماحول سے نکال کر اپنے گھر کی محفوظ چہاردیواری میں پناہ دے رکھی ہو اور ہرن اس شریف شکاری سے بہ دستور وحشت اور نفرت کرتا ہے۔''

مہرن نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔ ''شکاری اور شریف، تو نے بڑی خوب صورت اصطلاح وضع کی ہے اپنے لیے سبحان اللہ، ماشاءاللہ، میں تجھے صرف شکاری سمجھتی ہوں وہ جو کچھ بھی ہو مگر شریف ہرگز نہیں ہوتا۔''

عبداللہ خاں مہرن کے طرز تخاطب پر پھر مشتعل ہوگیا، رخسار پر طمانچے کا نشان دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ابھی پہلا ہی نشان موجود ہے، آخر تو اپنے لب و لہجے کی اصلاح کیوں نہیں کرتی۔''

مہرن نے جواب دیا۔ ''تو نے تو بس رخسار ہی کا نشان دیکھا ہے، اگر تو میرے دل میں جھانک سکتا کہ وہاں کتنے بڑے بڑے گھاؤ پائے جاتے ہیں اور ان میں سے بیشتر تیرے ڈالے ہوئے ہیں۔''

عبداللہ خاں نے اس کی ٹھوڑی چوم لی۔ ''آج میں خوشگوار کیفیت میں ہوں، بول، مجھ سے کیا لینا پسند کرے گی؟''

مہرن نے جواب دیا۔ ''آزادی، اگر تیرے اختیار میں میری آزادی ہے تو ضرور دے دے۔''

عبداللہ خاں نے پوچھا۔ ''اگر میں تجھے آزادی دے بھی دوں تو جائے گی کہاں؟ تو یہ کیوں نہیں سوچتی کہ تیری مثال...... گوشت کے اس ٹکڑے جیسی ہے جسے بھوکوں کی بستی میں لاوارث لٹکا دیا گیا ہو۔ مہرن! تو میری حویلی کی چہاردیواری کو غنیمت جان یہاں تو بالکل محفوظ ہے۔''

مہرن نے بیزاری سے کہا۔ ''میں تجھ سے بحث نہیں کروں گی، تو اپنا مقصد حاصل کر اور میرا پیچھا چھوڑ، میں تیری فضول باتوں سے تنگ آچکی ہوں۔''

عبداللہ خاں نے اسے مسہری پر گرادیا اور اپنا چہرہ اس کے چہرے کے سامنے لاتے ہوئے پوچھا۔ ''مہرن! ایک بات تو مجھے سچ سچ بتادے۔''

''پوچھ، کیا پوچھنا چاہتا ہے؟''

عبداللہ خاں نے پوچھا۔ ''مغیث تجھے کیسا لگتا ہے؟''

''وہ واقعی شریف نوجوان ہے اس لیے اچھا لگتا ہے۔''

عبداللہ خاں نے کہا۔ ''نہیں تو اپنے جواب میں سے لفظ شریف نکال دے۔ اور یوں کہہ کہ مغیث ایک نوجوان ہے اس لیے اچھا لگتا ہے۔''

مہرن نے کہا۔ ''اچھا اگر میں یہی کہہ دوں جو تو کہہ رہا ہے تو، تو کیا کرے گا؟''

''میں کیا کروں گا...... کچھ بھی نہیں، ہاں اگر تجھ پر مہربان ہوگیا تو تجھے خوش بھی کرسکتا ہوں۔''

عبداللہ خاں کی باتیں مہرن کے لیے بالکل ناقابل فہم تھیں وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ عبداللہ خاں اس سے میٹھی میٹھی باتیں کرکے شاید یہ جاننا چاہتا ہے کہ وہ اور مغیث آپس میں ایک دوسرے کو چاہنے تو نہیں لگے ہیں۔ وہ عبداللہ خاں اور حسین علی خاں کو کسی حد تک سمجھ چکی تھی۔ وہ خوب جانتی تھی کہ فرخ سیر کا یار وفادار، جو ہمیشہ اس کے سامنے مودب کھڑا ہوا کرتا تھا۔ آخر اس یار وفادار نے فرخ سیر کا کام تمام کردیا تھا۔ اس دن عبداللہ خاں نے مہرن کو اس طرح برتا اور اس سے اتنی دیر تک سیر ہوتا رہا گویا اس کے بعد مہرن اس کے اختیار میں نہیں رہے گی اور وہ اس کے بغیر تر ستارہ جائے گا اور مہرن اس ذلت اور عذاب کو اپنی قسمت کا نوشتہ سمجھ کر برداشت کرتی رہی۔

مغیث نے مہرن کے پاس جانا آنا ایک دم بند کردیا، عبداللہ خاں سے زیادہ حسین علی خاں کو تشویش ہوئی کیونکہ مغیث کی ناراضی یا کھنچاؤ سے اس کے ایک بڑے مقصد کی حصولیابی دشوار ہوتی جارہی تھی، اس نے مغیث کو پکڑ لیا اور تخلیے میں اپنے سامنے بٹھا کر بڑی دیر تک سمجھاتا رہا اور مہرن کے پاس نہ جانے کا سبب پوچھتا رہا۔

مغیث کی آواز بھرا گئی، وفور جذبات میں بولا۔ ''جناب والا! میں اس لڑکی پر کتنی محنت کررہا تھا، آپ اس کا صحیح اندازہ نہیں کرسکتے، لیکن اس کا ہمیں صلہ کیا ملا، شک، بدگمانی، سوءظن، اور اس پر مزید ستم یہ ہوا کہ آپ کے بڑے بھائی نے مہرن کے رخسار پر میرے سامنے ہی ایک بھرپور طمانچہ رسید کردیا۔'' اتنا کہہ کر وہ واقعی چھلک پڑا۔ اس کی آواز گلے میں پھنسی جارہی تھی اور وہ بہ مشکل کہہ رہا تھا۔ ''آپ یقین کیجیے، وہ طمانچہ جو مہرن کے رخسار پر لگا تھا۔ میں نے اپنے دل پر محسوس کیا یہ منظر بار بار نہیں دیکھ سکتا اس لیے ادھر سے اپنا خیال ہی ہٹالیا۔''

حسین علی خاں نے کہا۔ ''مغیث! یہ تو نے بالکل غلط فیصلہ کیا، میں بھائی صاحب کو سمجھا دوں گا، میں نے تو اپنے دل میں یہاں تک فیصلہ کرلیا تھا کہ اگر تم دونوں ایک

WWW.PAKSOCIETY.COM

دوسرے کی طرف ملتفت ہو گئے تو میں مہرن کو تیرے حوالے کرا دوں گا، تو، تو بہت جلدی دل برداشتہ ہو گیا۔"

اس پیشکش نے مغیث کے دل میں سوئی ہوئی خواہش کو بیدار کر دیا، اس نے یہ سوچے بغیر کہ اس پیشکش میں کہیں حسین علی خاں کی کوئی چال نہ ہو۔ فوراً ہی سادہ لوحی سے سوال کیا۔ "لیکن جناب! جہاں تک میں جانتا ہوں آپ کے بھائی صاحب مہرن کو بے حد چاہتے ہیں۔ کیا وہ یہ پسند کریں گے کہ ان کی محبوبہ میرے حوالے کر دی جائے؟"

"بھائی صاحب کی پسند اور ناپسند کا میں زیادہ علم رکھتا ہوں، تو انہیں نہیں سمجھ سکتا، عورت ان کی کمزوری ہے وہ ہر عورت کو اسی طرح ٹوٹ کر چاہتے ہیں اور اس سے اچھی طرح سیر ہو جانے کے بعد اسے اسی طرح اپنے دل و دماغ سے نکال پھینکتے ہیں گویا کبھی اس سے ملے ہی نہ ہوں۔"

مغیث اپنے فیصلے پر نادم ہو گیا، بولا۔ "میں شرمندہ ہوں کہ آپ سے مشورہ کیے بغیر میں نے ایسا فیصلہ کیوں کیا؟"

حسین علی خاں نے کہا۔ "تو اس لڑکی کا علاج جاری رکھ، اگر تو اس میں کامیاب ہو گیا تو میں کوشش کروں گا کہ یہ لڑکی تیرے ہی حوالے کر دی جائے۔"

مغیث نے جواب دیا۔ "اسے میرے حوالے کیا جائے یا نہ کیا جائے لیکن میں اپنا علاج ضرور جاری رکھوں گا اور اسے صحت یاب کر کے رہوں گا۔"

حسین علی خاں نے کسی قدر پس و پیش سے کہا۔ "اور یہ تیری خوش قسمتی ہے کہ میں تجھے بادشاہ کی صحبت میں بھی رکھنا چاہتا ہوں، شہنشاہِ ہند کی مصاحبت! یہ کوئی معمولی اعزاز ہے کسی شخص کے لیے، لیکن تجھے میں یہ اعزاز بخشنا چاہتا ہوں۔"

مغیث کا مارے خوشی کے برا حال ہوا جا رہا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن وفورِ خوشی میں آواز اور الفاظ اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

حسین علی خاں نے اپنے ہونٹوں پر ہتھیلی رکھ لی، کہا۔ "لوگ اس طرح یہ دیکھ لیں گے کہ سید زادے جب کسی پر احسان کر دیتے ہیں تو پھر ایسا ویسا کوئی معمولی احسان نہیں کرتے۔"

مغیث نے کہا۔ "پھر مجھے بادشاہ کے پاس کب لے چلیے گا؟"

حسین علی خاں نے جواب دیا۔ "پہلے میں اس موضوع پر بھائی صاحب کی رائے معلوم کر لوں۔"

دونوں بھائی ایک بار پھر یکجا ہوئے اور ان میں ایک بار پھر بادشاہ، محمد امین خاں اور نظام الملک زیرِ بحث آئے، انہیں ان کے مخبر نے یہ خطرناک اطلاع دی تھی کہ نظام الملک نے مالوے کے ناگفتہ بہ حالات پر قابو پا لیا ہے اور وہ دن رات فوج میں اضافہ کیے چلا جا رہا ہے یہ خبر ایسی نہیں تھی جسے سن کر نظر انداز کر دیا جاتا، حسین علی خاں نے کہا۔

"جب تک یہ امین خاں بادشاہ کے پاس موجود رہے گا ہمارے لیے خطرات ہی خطرات ہیں، میں کہتا ہوں کہ اب ایک لمحہ ضائع کیے بغیر محمد امین خاں کو قتل کر دینا چاہیے ورنہ یہ شخص معلوم نہیں کیسی قیامت ڈھائے گا۔"

عبداللہ خاں نے عاجز آ کر کہا۔ "محمد امین خاں کے خلاف تمہارے پاس کوئی ثبوت بھی ہے؟"

حسین علی خاں نے جواب دیا۔ "ہاں ہے، اور وہ ثبوت یہ ہے کہ وہ بادشاہ کو ترکی زبان میں ورغلاتا ہے۔"

عبداللہ خاں ہنسا۔ "یہ عجیب دلیل ہے سازش کی یعنی اگر کوئی ترکی زبان میں بات کرتا ہے تو وہ گویا ہم دونوں کے خلاف سازش کرتا ہے۔"

حسین علی خاں نے جھنجلا کر جواب دیا۔ "بھائی صاحب! آپ اس وقت تو میرا مذاق اڑا لیں لیکن وہ وقت زیادہ دور نہیں ہے جب آپ پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ محمد امین خاں اور بادشاہ ترکی زبان میں ہمارے خلاف سازشیں کیا کرتے تھے۔"

عبداللہ خاں کچھ سوچنے لگا۔ آخر بولا۔ "اگر یہ بات ہے تو مغیث کو بادشاہ کے پاس پہنچا دیا جائے گا تاکہ وہ ترکی بات چیت کو اچھی طرح سمجھ کر، اصل بات ہمیں بتا سکے۔"

حسین علی خاں نے کہا۔ "لیکن آپ کو مہرن سے ہاتھ دھونا پڑے گا کیونکہ میں نے یہ بات اچھی طرح محسوس کر لی ہے کہ مغیث اس سے محبت کرنے لگا ہے، اگر اسے مہرن کا لالچ دے دیا جائے گا تو وہ ہمارے لیے سر دھڑ کی بازی لگا کر خدمت انجام دے گا۔"

عبداللہ خاں نے مری مری آواز میں جواب دیا۔ "تمہاری یہی مرضی ہے تو میں اس پہاڑ جتنے غم کو بھی جھیل لوں گا، لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ کام بھی نہ ہو اور اپنی گرہ سے مہرن بھی چلی جائے۔"

حسین علی خاں نے کہا۔ "ایسا نہیں ہو گا۔ میں بہت بڑا منصوبہ باز ہوں، دیکھیے گا میں مغیث کو کس طرح اپنے قابو میں لاتا ہوں۔"

حسین علی خان نے اسی دن مغیث کو اس پر آمادہ کر لیا کہ

وہ امین خاں اور بادشاہ کی ترکی زبان میں ہونے والی گفتگو کا مفہوم دونوں بھائیوں میں سے کسی ایک تک ضرور پہنچا دیا کرے گا، اس خدمت کے صلے میں حسین علی خاں نے مغیث کو یہ رعایت دی کہ وہ ہفتے میں دوبارہ مہرن کے پاس کئی کئی گھنٹے آزادی کے ساتھ اٹھ بیٹھ سکے گا۔

دوسری طرف حسین علی خاں نے محمد شاہ سے یہ بات کی چونکہ محمد شاہ سے پہلے دونوں بادشاہ معمولی مگر سنگین بیماریوں میں مبتلا رہ کر رخصت ہو چکے ہیں اس لیے محمد شاہ کی دیکھ بھال کے لیے ایک طبیب ہر وقت اس کے پاس رہنا چاہیے۔ بادشاہ حسین علی خاں یا عبداللہ خاں کی کوئی خواہش کس طرح رد کر سکتا تھا، مجبوراً راضی ہو گیا۔ محمد امین خاں نے ترکی زبان میں بادشاہ کو سمجھایا۔ "حضور والا! یہ تو کوئی نئی سازش معلوم ہوتی ہے حضور کے خلاف۔"

بادشاہ نے بھی ترکی ہی میں جواب دیا۔ "اگر یہ واقعی کوئی سازش ہے تو اس سازش کا مقابلہ بھی تمہی کو کرنا ہو گا کیونکہ مجھے ان دونوں بھائیوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔"

حسین علی خاں نے بادشاہ سے کہا۔ "قبلۂ عالم! یہ بات مروت اور آداب سے بعید ہے کہ حاضرینِ مجلس کی موجودگی میں دو شخص کسی ایسی زبان میں گفتگو کریں جس سے وہ ناواقف ہوں۔"

محمد امین خاں نے جواب دیا۔ "ترکی زبان، بادشاہ سلامت کی آبائی اور موروثی زبان ہے وہ اس زبان میں باتیں کر کے ایک قسم کی روحانی خوشی محسوس فرماتے ہیں۔ اس لیے میں نے جہاں پناہ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ حکماً اور جبراً ترکی زبان کو رائج اور نافذ کر دیں لیکن جہاں پناہ اپنی رعایا پر یہ چیز زبردستی نہیں ٹھونسنا چاہتے۔"

حسین علی خاں نے تیوریوں پر بل ڈال کر بکنا شروع کیا۔ "اعتماد الدولہ! جس سوال کا تم نے جواب دیا ہے، وہ میں نے تم سے نہیں قبلۂ عالم سے کیا تھا، تم اپنی زبان بند رکھو، میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتا۔"

اس وقت دربار میں دوسرے امرا بھی موجود تھے لیکن ان میں سے ایک کی بھی یہ ہمت نہ تھی کہ سید زادوں کے خلاف ایک بات بھی اپنی زبان سے نکال سکتا۔ حسین علی خاں کی بات کا امین خاں نے جواب دیا۔ "امیر الامرا، میں یہ بات نہیں سمجھ سکا کہ آپ ترکی زبان کی مخالفت کیوں فرما رہے ہیں؟"

حسین علی خاں نے جواب دیا۔ "میں ترکی زبان کی مخالفت نہیں کر رہا ہوں۔ میں تو اس سازش کی مخالفت کر رہا ہوں جو آپ دونوں ہمارے خلاف ترکی زبان کی مدد سے تیار کر رہے ہیں۔"

محمد شاہ نے کہا۔ "امیر الامرا! تم کو غلط فہمی ہوئی ہے، میں اس ملک کا بادشاہ ہوں اور یہ بادشاہت بھی کوئی ایسی ویسی معمولی بادشاہت نہیں، یہ تیمور کے جانشینوں کی بادشاہت ہے، ہمیں بادشاہ ہونے کی حیثیت میں جو وسیع اختیارات حاصل ہیں اس میں کسی امیر کی دخل اندازی نہ تو مناسب ہے اور نہ ہی جائز۔"

حسین علی خاں کا غصے سے چہرہ لال ہو گیا، بولا۔ "اور حضور والا کو اپنا وہ وقت نہیں بھولنا چاہیے جب وہ سلیم گڑھ کے قید خانے میں معمولی قیدی کی طرح دن گزار رہے تھے۔ یہ ہم سید برادر ہیں جنہوں نے آپ کو تاج و تخت عطا کیا۔"

اتنا کہہ کر حسین علی خاں اٹھا اور رعونت سے قدم اٹھاتا ہوا بادشاہ کے پاس جا بیٹھا، بادشاہ کا شانہ حسین علی خاں کے شانے سے مس ہونے لگا۔ دربار میں ایک سناٹا طاری ہو گیا، محمد شاہ کا خوف سے برا حال ہو گیا، سامنے عبداللہ خاں بھی موجود تھا اور وہ بار بار بادشاہ کے ان خدمت گاروں کی طرف دیکھ رہا تھا، جو خود اس کے مقرر کیے ہوئے تھے اور عبداللہ خاں کے ایک اشارے پر بادشاہ سمیت سب کا کام تمام کر سکتے تھے۔

حسین علی خاں نے اور زیادہ جسارت سے کام لیا، مغیث کو اپنے پاس بلایا اور بادشاہ سے حکماً کہا۔ "یہ نوجوان طبیب جتنی دیر چاہے گا آپ کے پاس موجود رہے گا اور آپ کو یہ حق نہیں حاصل ہو گا کہ کسی بھی وقت کسی مصلحت کی وجہ سے اسے اپنے پاس سے ہٹا دیں۔"

محمد امین خاں ضبط نہیں کر سکا، کہا۔ "امیر الامرا! یہ تم کس کے پاس بیٹھے ہو اور عامیانہ لب و لہجے میں تم کس سے بات کر رہے ہو؟"

حسین علی خاں نے جواب دیا۔ "اعتماد الدولہ! تم خاموش رہو کیونکہ یہ سارا زہر تمہارا ہی پھیلایا ہوا ہے۔ واللہ اگر بھائی صاحب تمہاری وکالت نہ کریں تو میں تمہیں ایسی سزا دوں کہ اسے تمہاری نسلیں یاد رکھیں۔"

محمد امین خاں نے بڑے تحمل سے کام لیا، کہا۔ "میں اپنی پروا نہیں کرتا امیر الامرا، میں ایک بار پھر تم سے یہی کہوں گا کہ بادشاہ کا احترام کرو، اس بادشاہ کا جو عالمگیر بادشاہ کا جانشین ہے۔"

حسین علی خاں نے بادشاہ کے قدموں میں تھوک دیا،

WWW.PAKSOCIETY.COM

کہا۔ ''عالمگیر بادشاہ کے جانشینوں کی آج کل عزت ہی کیا رہ گئی ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ جس کے سر پر ہم اپنی جوتی رکھ دیں گے وہ عالمگیر بادشاہ کا جانشین ہو جائے گا۔''

حسین علی خاں کے اس فقرے نے پورے دربار کو ساکت اور خوفزدہ کر دیا۔ اس نے مغیث کو تو دربار ہی میں چھوڑا اور اسے حکم دیا۔ ''نوجوان طبیب! اب تم یہیں اس دربار میں موجود رہو گے۔ ہم چلتے ہیں۔'' اس کے بعد عبداللہ خاں سے کہا۔ ''آیئے بھائی صاحب چلیے، اب یہاں مزید رکنا مناسب نہیں ہے۔''

وہ دونوں بھائی دربار سے چلے آئے، راستے میں عبداللہ خاں نے کہا۔ ''حسین علی خاں! تم نے جس لب ولہجے میں بادشاہ اور اہلِ دربار سے بات کی ہے اس نے ان سب کو تمہارے خلاف کر دیا ہے، اب بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔''

عبداللہ خاں نے مزید کہا۔ ''مجھے تمہارے سلسلے میں ہمیشہ یہ دھڑکا رہے گا کہ جہاں کوئی حکمران چوکا اور تم نے اس کی کھال اتارنا شروع کر دی۔ ارے بھائی! آخر صبر و تحمل بھی تو کوئی چیز ہے۔''

حسین علی خاں نے جواب دیا۔ ''بھائی صاحب! میں طاقت کا پرستار ہوں اور جو کام دھونس سے نکل سکتا ہو اس کے پیچھے زیادہ وقت گنوانا بے وقوفی ہے۔''

عبداللہ خاں نے کہا۔ ''بہرحال تم نے اس وقت جو تماشا کیا تھا اس سے میری طبیعت خوش ہو گئی اور دشمنوں پر اوس پڑ گئی۔''

حسین علی خاں نے کہا۔ ''بھائی صاحب بے فکر رہیں۔ محمد امین خاں اور بادشاہ کو میں ٹھیک کر دوں گا۔''

ان دونوں کے نکلتے ہی بادشاہ نے طبیعت کی افسردگی کی وجہ سے دربار برخاست کر دیا، لیکن محمد امین خاں اور مغیث اس وقت بھی بادشاہ کے پاس ہی موجود تھے۔ بادشاہ نے ترکی میں مغیث سے پوچھا۔ ''کیا تمہیں ترکی زبان آتی ہے؟''

مغیث نے سوال سمجھ لینے کے باوجود کوئی جواب نہیں دیا اور پریشانی سے بادشاہ اور محمد امین خاں کی شکل دیکھنے لگا۔ اب محمد امین خاں نے سوال کیا۔ ''نوجوان طبیب! کیا تمہیں ترکی آتی ہے؟ اگر آتی ہے تو بتاؤ کہ تم نے یہ زبان کہاں سے سیکھی؟''

مغیث نے اس بار بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ اس بار بادشاہ نے کہا۔ ''میرا خیال ہے یہ نوجوان ترکی زبان نہیں جانتا اور ہم دونوں اس کی موجودگی میں بھی اپنے مطلب اور کام کی باتیں آزادی سے کر سکتے ہیں۔''

محمد امین خاں نے افسردگی سے کہا۔ ''حضور والا! میں حضور کی رائے کے خلاف ہوں، اس نوجوان کی حضور کے پاس تعیناتی بڑی معنی خیز ہے، اس سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''جب یہ نوجوان ترکی زبان جانتا ہی نہیں تو ہمیں اس کی طرف سے ڈر کس بات کا؟''

محمد امین خاں نے جواب دیا۔ ''حضور والا! میں اس نوجوان پر اعتبار نہیں کر سکتا۔ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''اچھا اب ہم دونوں نہایت احتیاط سے باتیں کریں گے اور ایسی باتیں کریں گے جن سے ہماری گرفت ناممکن ہو، میرا خیال ہے یہ صورت بہتر رہے گی۔''

محمد امین خاں نے کہا۔ ''اچھا حضور والا! اب اجازت دیجیے پھر کسی وقت حاضر ہوں گے اور کام کی باتیں کریں گے۔''

مگر پھر اس نے اداس لہجے میں کہا۔ ''لیکن چند باتیں ایسی ہیں جن کو ہمیں اس وقت صاف ہو جانا چاہیے ورنہ وقت گزر جائے گا اور افسوس رہ جائے گا۔''

بادشاہ نے پوچھا۔ ''وہ کون سی باتیں ہیں تمہارے خیال میں؟''

محمد امین خاں نے جواب دیا۔ ''حضور کو ان دونوں کی مخالفت اور تباہی پر ہر وقت کمربستہ رہنا ہے، ان دونوں سے ڈرنا نہیں ہے۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''میری اپنی خواہش بھی یہی ہے لیکن ان دونوں کی طاقت توڑنا بھی کوئی معمولی بات نہیں ہے۔''

یہ دونوں ترکی میں باتیں کر رہے تھے۔ امین خاں اچانک مغیث سے مخاطب ہو گیا۔ ''نوجوان طبیب! اب تم اس ہنگامے میں کس کا ساتھ دو گے؟ ذرا سچ سچ بتانا، قبلۂ عالم کا یا ان دونوں بھائیوں کا۔''

مغیث نے جواب دیا۔ ''جناب والا! میں تو اس کا ساتھ دوں گا جس سے اس ناچیز کو فائدہ پہنچے گا۔''

بادشاہ نے ترکی میں امین خاں کو منع کیا۔ ''امین خاں ابھی اس سے کوئی بات نہ کرو، پہلے اسے سمجھنے کی کوشش کرو، کام کی باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔''

محمد امین خاں چپ ہو گیا۔ ہمت خاں، بادشاہ کا اتالیق منہ بنا کے کہنے لگا۔ ''قبلۂ عالم! اس خاکسار کو

امیر الامرا نے یہ حکم دیا ہے کہ میں دربار میں ترکی زبان میں گفتگو نہ ہونے دوں، اس لیے حضور خود ہی اپنے امرا کو یہ حکم دے دیں کہ کوئی امیر کسی سے بھی ترکی زبان میں بات نہ کرے اور حضور خود بھی اس پر عمل فرمائیں تاکہ دوسرے امرا بھی حضور کی تقلید میں ترکی زبان کا استعمال ترک کر دیں۔''

محمد امین خاں نے ہمت خاں کو ڈانٹ دیا۔ ''ہمت خاں! تم کو اس قسم کی بات کرنے کی ہمت ہی کیسے ہوئی؟ میں عبداللہ خاں کا ہمدرد اور دوست ہوں، کیا یہ ممکن ہے کہ دربار میں کوئی شخص بھی عبداللہ خاں کے خلاف کوئی بات کرے اور وہ مجھ سے بچ کر نکل جائے؟ جب تک میں یہاں موجود ہوں، دربار کا کوئی شخص بھی عبداللہ خاں کی مخالفت نہیں کر سکتا۔''

ہمت خاں چپ ہو گیا۔ بادشاہ نے ترکی زبان میں کہا۔ ''اس فہرست میں اس کا نام بھی شامل کر لو، جس میں میرے مخالفوں اور سیدزادوں کے حمایتیوں کے نام لکھے گئے ہیں۔''

امین خاں نے جواب دیا۔ ''حضور کے حکم کی پوری تعمیل کی جائے گی۔''

مغیث معلوم نہیں کیا کچھ سوچتا ہوا جب عبداللہ خاں کی حویلی میں داخل ہوا تو وہاں اس کے ساتھ غیر معمولی اچھا سلوک کیا گیا، اب اس کی حیثیت ہی کچھ اور تھی، عبداللہ خاں نے بڑے جوش و خروش سے مغیث کا استقبال کیا، پوچھا۔ ''آج ترکی میں ہم لوگوں کے خلاف کچھ باتیں ہوئیں؟''

مغیث نے جواب دیا۔ ''ہاں، بادشاہ کا یہ خیال تھا کہ آپ کے بھائی امیر الامرا نے درباری امرا کی موجودگی میں ان کی بڑی بے عزتی کی ہے، انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن امین خاں نے آپ کی بڑی تعریف کی اور کہا کہ امیر الامرا سے بحث نہیں لیکن قطب الملک سید عبداللہ خاں کا جواب نہیں اور اس کی وفاداری پر شاید کبھی شک بھی نہ کیا جا سکے۔''

عبداللہ خاں نے کہا۔ ''خیر، کچھ بھی ہو لیکن یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ امین خاں ہمارا ہمدرد ہے۔''

مغیث نے جواب دیا۔ ''آپ کا ہمدرد اور کوئی معمولی ہمدرد، بخدا، امین خاں تو دربار میں آپ کے حقوق کی نگرانی کرتا نظر آتا ہے۔''

عبداللہ خاں نے خوش ہوتے ہوئے جواب دیا۔ ''مغیث! تو کتنا شاندار اور کام کا نوجوان ہے یہ پہلے میں نہیں جانتا تھا۔''

جس کمرے میں وہ دونوں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ وہ آرائش کا ایک شاندار نمونہ تھا، دروازوں اور کھڑکیوں پر رنگین اور ریشمی کپڑے کے پردے لٹکے ہوئے تھے اور وہاں کی ہر چیز عطر کی خوشبو میں مہکی ہوئی تھی۔ عبداللہ خاں کچھ دیر تو ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ اس کے بعد کہا۔ ''اچھا مغیث میں جا رہا ہوں، مہرن کو بھیجے جا رہا ہوں۔ دیکھو کوشش کرو یہ کسی طرح جلد از جلد درست ہو جائے۔ میں اسے خوش و خرم دیکھنا چاہتا ہوں۔''

عبداللہ خاں چلا گیا اور مہرن آ گئی، دونوں ایک دوسرے کو مسکراتے ہوئے اشتیاق و محبت سے دیکھتے رہے، مہرن نے ایک دم وحشت میں ادھر ادھر گردن گھما کر دیکھا جیسے وہ یہ معلوم کرنا چاہتی ہو کہ کہیں کوئی آس پاس ان دونوں کی باتیں سننے والا تو موجود نہیں ہے۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی مہرن نے دروازہ اندر سے بند کر لیا، مغیث نے کہا۔ ''یہ کیا غضب کر رہی ہو مہرن، عبداللہ خاں دیکھتے ہی ہنگامہ کر دے گا۔ دروازہ کھول دو۔''

مہرن نے جواب دیا۔ ''یہ بات عبداللہ خاں ہی نے کہی تھی کہ میں کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لوں تاکہ کوئی اور ہماری باتوں میں دخل اندازی نہ کرے۔ میرا خیال ہے وہ ہم دونوں پر بہت زیادہ اعتماد کرنے لگا ہے۔''

مغیث نے جواب دیا۔ ''ہو سکتا ہے تمہارا خیال درست ہو، لیکن مجھے اس کا یقین نہیں آتا۔''

مہرن نے اس شریف جوان کو آج پہلی بار غور سے دیکھا تھا۔ مغیث کے چہرے پر غضب کی دلکش معصومیت پائی جاتی تھی۔ مغیث کی بڑی بڑی پلکوں والی بادام جیسی آنکھیں مہرن کے دل میں ہنگامہ و انقلاب برپا کرنے لگیں، مہرن نے شوخی سے پوچھا۔ ''مغیث! کیا میں ایک سوال تم سے کر سکتی ہوں؟''

مغیث نے جواب دیا۔ ''تم ایک نہیں دس سوال کرو۔''

مہرن نے مغیث کا ہاتھ پکڑ لیا، بولی۔ ''میں چاہتی تو یہی تھی کہ ان ہاتھوں کو مستقلاً پکڑ لوں لیکن شاید خدا کو یہ منظور نہیں ہے۔ میں اپنے ہاتھ بڑھا بڑھا کر کھینچ لیتی ہوں۔''

مغیث نے کہا۔ ''لیکن تم آخر اس طرح سوچتی ہی کیوں ہو؟''

WWW.PAKSOCIETY.COM

مہرن نے جواب دیا۔ ''خیالوں پر کوئی پہرا نہیں ہوتا، ورنہ میں اس پر پہرا ضرور بٹھا دیتی۔''

مغیث نے کہا۔ ''بہرحال! اب بٹھا دو پہرا، لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ پہرا عارضی ثابت ہوگا۔ تم کو وہی سوچنا چاہیے جو میں سوچتا ہوں اور جو میں چاہتا ہوں۔''

مہرن نے پوچھا۔ ''تم کیا چاہتے ہو؟''

مغیث نے جواب دیا۔ ''میں کیا چاہتا ہوں۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، یہ تو تم اپنے دل سے پوچھو کہ میں کیا چاہتا ہوں۔''

مہرن نے مایوسی سے کہنا شروع کیا۔ ''مغیث معاف کرنا میں تمہیں تمہارے نام سے مخاطب کر رہی ہوں، معلوم نہیں، میں کبھی ویسی زندگی گزار بھی سکوں گی یا نہیں، جیسی میں گزارنا چاہتی ہوں۔''

مغیث نے جواب دیا۔ ''بہرحال میری کوشش تو یہی ہے کہ میں تمہیں اس جہنم سے نکال لے جاؤں، اور اب تو کامیابی کا امکان بھی پیدا ہو گیا ہے۔''

مہرن نے پوچھا۔ ''سنتی ہوں تمہیں بادشاہ کی خدمت میں دے دیا گیا ہے۔ وہاں تمہارے سپرد کیا خدمت کی گئی ہے؟''

مغیث نے جواب دیا۔ ''یہ خدمت کہ میں بادشاہ کی نگرانی کروں اور وہاں جو باتیں ہوتی ہیں انہیں عبداللہ خاں کے گوش گزار کردوں لیکن بہ ظاہر یہ خدمت سونپی گئی ہے کہ میں بادشاہ کی صحت کا خیال رکھوں۔''

مہرن نے پوچھا۔ ''کیا تم یہ خدمت انجام دو گے؟''

مغیث نے جواب دیا۔ ''ظاہر ہے میں دربار میں امیر الامرا کا بھیجا ہوا ہوں اور میں دربار میں دونوں سیدزادوں کے حقوق کی نگرانی اور تحفظ کروں گا۔''

مہرن نے افسوس سے کہا۔ ''لیکن اس طرح تو یہ دونوں بھائی اور زیادہ مضبوط ہو جائیں گے، ان کے اقتدار کو ایک طاقتور سہارا مل جائے گا۔''

مغیث نے کہا۔ ''پھر میں کیا کروں مہرن، میں امیر الامرا کا نمک خوار ہوں، اس لیے اس کا حق نمک ادا کرنے پر مجبور ہوں۔''

مہرن نے طنزیہ جواب دیا۔ ''تم اس شخص کا حق نمک ادا کر رہے ہو جس کے ذہن میں نمک خواری یا نمک حرامی کا سرے سے کوئی تصور ہی نہیں۔ کیا یہ بات کہ انہوں نے مغل بادشاہ کو قیدی کی طرح رکھ چھوڑا ہے، ان کی نمک خواری یا نمک حلالی پر دلالت کرتی ہے، تم خود کو بادشاہ کا ملازم سمجھو اور اس کا حق نمک ادا کرنے کی کوشش کرو۔''

مغیث نے بے دلی سے کہا۔ ''مہرن! میں کہاں ان مصیبتوں میں پڑوں گا۔ میں کسی بات کی زیادہ گہرائی میں نہیں جانا چاہتا۔ میں مختصراً جانتا ہوں کہ میں امیر الامرا کا ملازم ہوں اور دربار میں اس کے حقوق کا تحفظ کروں گا۔''

مہرن نے مایوسی سے کہا۔ ''تب پھر ہم دونوں اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے۔''

مغیث نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیا تم امیر الامرا اور عبداللہ خاں پر یقین نہیں رکھتیں؟''

''کس قسم کا یقین؟ کیسا یقین؟''

''یہ کہ عبداللہ خاں اور امیر الامرا تمہیں میرے حوالے کر دیں گے۔''

''میں تو ان لوگوں کی نفسانفسی کیفیات سے اس حد تک واقف ہوں کہ یہ وقت پڑنے پر گدھے کو بھی باپ بنا لیتے ہیں اور جب کام نکل جاتا ہے تو یہ گدھے کو گھر کا رکھتے ہیں نہ گھاٹ کا۔ یہ دونوں بھائی اس پجاری کی طرح ہیں جو خود ہی بت تراشے، پھر اس کی پوجا کرلے اور جب پوجا پاٹ سے طبیعت سیر ہو جائے تو اس بت کو توڑ پھوڑ کر پھینک دے۔''

مغیث نے ہنس کر جواب دیا۔ ''یہ تمہاری اپنی رائے ہے اور ضروری نہیں کہ میں تمہاری اس رائے سے اتفاق ہی کروں، میں اپنی رائے پر عمل کروں گا، کسی اور کی رائے پر ہرگز نہیں۔''

مہرن کے دل پر مغیث کی باتیں تیز چھری کی طرح اثر کر رہی تھیں، وہ اس غلط فہمی یا خوش فہمی میں تھی کہ مغیث اس سے اگر محبت نہیں کرتا تو ہمدردی ضرور رکھتا ہے لیکن ان باتوں سے صاف صاف یہ معلوم ہو رہا تھا کہ اس کی ساری ہمدردیاں دونوں سیدزادوں کے حق میں ہیں۔

مہرن نے افسردگی سے سر جھکا لیا۔ ''تب پھر جو جی میں آئے کرتے رہو، تم نے میرا دل توڑ دیا ہے، تم بھی وہی نکلے جو دوسرے تھے۔''

مغیث ہنسنے لگا۔ اس نے مہرن کے سر پر ہاتھ پھیر کر اس کی پیشانی چوم لی، مہرن چونک کر ذرا پیچھے سرک گئی اور غصے سے مغیث کو گھورا۔ مغیث نے آنکھیں ملائے بغیر کہا۔

''مہرن! ہم دونوں کی عقلوں میں فرق ہے، تم انتہا پسند ہو اور جو کچھ سوچتی ہو اپنے حالات کے ردعمل کے زیر اثر سوچتی ہو جبکہ میں ذرا سرد مزاج واقع ہوا ہوں اور کسی بھی قسم کے جوش اور اشتعال کا اثر قبول کیے بغیر ٹھنڈے دل سے سوچتا

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوں، مجھے کیا کرنا ہے اور بادشاہ کے دربار میں کیا خدمت انجام دینی ہے، میں خوب جانتا ہوں لیکن اس کا اظہار نہیں کرسکتا، اس وقت میرے پیش نظر بس ایک ہی مقصد ہے اور وہ مقصد ہے تمہیں یہاں سے کسی بھی طرح نکال کرلے چلوں اور نیشاپور میں تمہارے باپ کے پاس پہنچا دوں، اپنے اس مقصد کی حصولیابی میں مجھے جو کچھ بھی کرنا پڑے گا، کروں گا۔"

مہرن کا غصہ کافور ہوگیا، خفگی دور ہوگئی۔ شوخی سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "بات صاف کرنی چاہیے، اب بات کی ہے ناں تم نے۔"

مغیث نے سرگوشی میں کہا۔ "مہرن! مصیبت تو یہ ہے کہ میں یہاں زیادہ تفصیل سے باتیں کربھی تو نہیں سکتا، ڈر لگتا ہے، میرے بارے میں ایک بات بتیا دی ہے اسے ہمیشہ یاد رکھنا وہ یہ کہ میں تمہارا دوست ہوں، اس دنیا میں تمہارا سب سے بڑا غمگسار، سب سے زیادہ چاہنے والا، میں جو کچھ بھی کروں گا، تمہارے مفاد کے خلاف نہیں کروں گا۔"

مہرن نے جواب دیا۔ "میں بھی یہی سمجھتی ہوں، مستقبل کی بات خدا جانے۔"

مغیث نے کہا۔ "امیر الامرا کی باتوں سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اگر میں نے اسے خوش کردیا تو وہ تمہیں میرے حوالے کرادے گا۔ عبداللہ خاں کا نرم رویہ بھی میرے اس خیال کی تائید کرتا ہے، اگر میں اس میں کامیاب ہوگیا تو ہندوستان کے سیاسی اور ملکی ہنگاموں سے پیچھا چھڑا کر تمہیں لے کر نیشاپور چلا جاؤں گا۔ میں مقصد براری کے بعد ایک دن بھی یہاں نہیں رکوں گا۔"

مہرن نے افسردگی سے کہا۔ "لیکن مغیث! مجھے معلوم نہیں کیوں، ان دونوں پر ذرا بھی اعتماد نہیں ہے۔ یہ لوگ طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ ان کے قول وقرار پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔"

مغیث نے کہا۔ "ایک ان پر ہی کیا موقوف ہے یہاں کسی پر بھی اعتماد نہیں کیا جاسکتا، یہاں تک کہ اگر کوئی مجھ سے یہ پوچھے کہ اس ملک کا سب سے زیادہ ناقابل اعتبار شخص کون ہے تو میں جواب دوں گا کہ بادشاہ...... مہرن! رسول اللہ کا قول ہے کہ عوام اپنے حکمرانوں کے دین پر ہوں گے۔ اگر بادشاہ برا ہے تو رعایا بھی بری ہوگی، اگر حکمران ناقابل اعتبار ہوگا تو اس کے لوگ بھی ناقابل اعتبار ہوں گے۔"

مہرن نے شکست مان لی، بولی۔ "جب تم خود ہی اتنے عقلمند ہو تو میں تمہیں کیا رائے دوں گی۔"

وہ بڑی دیر تک یوں ہی باتیں کرتے رہے، چڑچڑی اور مایوس مہرن اس دن بڑی اچھی اچھی باتیں کرتی رہی، مغیث بھی بہت بشاش تھا، بڑی دیر بعد مہرن نے کہا۔ "مغیث! تمہاری ملاقات سے پہلے میں زندگی سے بیزار ہوچکی تھی لیکن اب میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔"

مغیث نے جواب دیا۔ "میں خود بھی جب یہاں آیا تھا زیادہ خوش نہیں تھا لیکن جب سے تم ملی ہو، میں بہت زیادہ خوش رہنے لگا ہوں۔"

مہرن نے حسرت سے کہا۔ "اب بھی کبھی کبھی میں یہ سوچنے لگتی ہوں کہ معلوم نہیں ہم دونوں کبھی یکجا رہ بھی سکیں گے یا نہیں!"

مغیث نے جواب دیا۔ "اب امید تو پیدا ہوگئی ہے کہ ہم دونوں یکجا رہ سکیں گے لیکن افسوس کہ وہ یکجائی تمہاری خواہش کے مطابق نہ ہوگی، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہم دونوں یکجا نہ رہ سکیں۔"

مہرن خیالوں میں ڈوب گئی، اس کا سر چکرانے لگا اور دل ڈوبنے لگا، بولی۔ "آج تم معلوم نہیں کیسی باتیں کررہے ہو؟"

مغیث نے کہا۔ "میں جیسی بھی باتیں کررہا ہوں، وہ تمہیں عجیب تو ضرور معلوم ہوتی ہوں گی لیکن حقیقتاً وہ عجیب ہیں نہیں، پہلے میں تمہیں یہاں سے نکال لے چلوں گا اس کے بعد وہ باتیں کروں گا۔"

مہرن نے بے دلی سے جواب دیا۔ "اگر میں یہاں سے نکل کر تمہیں نہ پاسکی، تو میرا یہاں سے نکلنا ہی فضول ہوگا، میں کہیں اور جاکر کیا کروں گی۔"

مغیث نے کہا۔ "ایسی باتوں کا ابھی وقت نہیں آیا، تم خود کو میرے حوالے کردو، میں یقین دلاتا ہوں کہ میں تمہیں خوش رکھنے کی بھرپور کوشش کروں گا۔"

مہرن نے افسردگی سے جواب دیا۔ "اب تو مجھے بھی یہ سوچنا پڑے گا کہ میں تم پہ اعتبار کروں یا نہ کروں۔"

وہ دونوں کچھ دیر تک آپس میں الجھتے رہے اور آخر جب جدا ہوئے تو اس طرح کہ وہ دونوں ہی افسردہ اور مضمحل تھے۔

امیر الامرا بہت پریشان تھا، مالوے سے جو خبریں مل رہی تھیں ان کے مطابق نظام الملک کی فوجی قوت روز بروز بڑھتی جارہی تھی۔ دوسری طرف یہ خبر الگ تنگ کررہی تھی کہ

امین خاں ترکی زبان میں محمد شاہ کو برابر ورغلا رہا ہے۔ بادشاہ دونوں بھائیوں سے بہت زیادہ خوفزدہ تھا، مغیث کی موجودگی بادشاہ اور امین خاں کے لیے تشویش کا سبب بنی ہوئی تھی اور مغیث اس فکر میں تھا کہ وہ ان دونوں کا اعتماد کس طرح حاصل کرے۔ بادشاہ اور امین خاں کو ابھی تک یہی معلوم تھا کہ مغیث ترکی زبان نہیں جانتا۔

اس دن محمد امین خاں، محمد شاہ سے کچھ خاص باتیں کرنے آیا تھا، لیکن مغیث کو موجود دیکھ کر رک گیا۔ بادشاہ نے کن انکھیوں سے مغیث کی طرف دیکھتے ہوئے امین خاں سے پوچھا۔ "کیا بات ہے محمد امین خاں؟ کیا تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

محمد امین خاں نے ترکی زبان ہی میں جواب دیا۔ "حضور والا! سیدزادوں نے معلوم نہیں کیوں اس نوجوان طبیب کو ہمارے سر پر مسلط کردیا ہے میں تو اس شخص کی موجودگی میں بات کرتے ہوئے خوف کھاتا ہوں۔"

بادشاہ نے کہا۔ "تم آزادی اور بے فکری سے بات کرو کیونکہ یہ شخص ترکی زبان نہیں جانتا۔"

امین خاں نے جواب دیا۔ "وہ تو آپ بجا فرمارہے ہیں لیکن ہم یہ کس طرح یقین کرلیں کہ نوجوان طبیب ترکی نہیں جانتا۔"

مغیث ان دونوں کی باتیں بڑی بے پروائی سے سن رہا تھا اور بالکل یہی محسوس ہورہا تھا کہ وہ ترکی زبان سے ناواقف ہے۔

بادشاہ نے مغیث پر ایک اچٹتی نظر ڈالی اور امین خاں سے کہا۔ "اگر یہ ترکی زبان سے واقف ہوتا تو اس طرح یہ گونگوں کی طرح یہاں نہ بیٹھا ہوتا، اگر ہماری گفتگو میں یہ مخل نہ ہوتا تو کم از کم اس کے چہرے مہرے سے اس کا اظہار ضرور ہوجاتا کہ یہ ہماری باتیں سن اور سمجھ رہا ہے لیکن ہمیں ایسی کوئی بات بھی نہیں محسوس ہورہی ہے۔"

امین خاں نے کن انکھیوں سے مغیث کی طرف دیکھا، کہا۔ "گو کہ یہ نوجوان بہ ظاہر تو بھلا لگتا ہے لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اندر کی خباثت کو چہرے سے نہیں پڑھا جاسکتا۔"

بادشاہ نے پریشانی سے کہا۔ "پھر یہ کس طرح پتا چلایا جائے کہ اسے ترکی آتی ہے یا نہیں۔"

امین خاں نے جواب دیا۔ "اس کا بھی انتظام کرتا ہوں۔"

بادشاہ نے پوچھا۔ "وہ کس طرح؟"

امین خاں نے جواب دیا۔ "اس کی ایک آسان ترکیب ہے۔ آپ بادشاہ ہیں اور آپ کے اختیارات وسیع ہیں، میرے خیال میں، آپ اسے قید میں ڈال کر یہ مشہور کردیں کہ اسے قتل کرا دیا گیا۔ اس خبر سے ہمیں بہت جلد سیدزادوں کے ردعمل کا اندازہ ہوجائے گا، ظاہر ہے وہ ایک طبیب کی خاطر بادشاہ سلامت سے متصادم ہونے کی کوشش نہیں کریں گے اور اگر ایسا ہوا بھی تو اس صورت حال سے میں نمٹ لوں گا۔"

بادشاہ نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔ "لیکن میرے اپنے خیال میں اس نوجوان کو قید کردینا مناسب نہیں ہے کیونکہ اگر یہ بے گناہ ہوا تو اس کا عذاب ہم دونوں کی گردن پر ہوگا۔"

امین خاں نے کہا۔ "ملوکیت اور سیاست میں اس قسم کے معلوم نہیں کتنے گناہ کرنا پڑتے ہیں، میں تو اس نوجوان کو تہ خانے میں ڈال کر جب یہ مشہور کروں گا کہ اسے قتل کرادیا گیا ہے تو سیدزادوں کے ردعمل سے واقف ہوجانے کے بعد میں اسے واقعی قتل کرادوں گا۔"

مغیث کی جان نکلی جارہی تھی، اس نے اپنی پریشانی کو چھپائے رکھا اور چہرے پر اس کے آثار پیدا نہیں ہونے دیے۔ اس نے اس نازک وقت میں یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ یہ موقع ایسا نہیں ہے کہ ڈر کر بتادیا جائے کہ میں ترکی جانتا ہوں اور سیدزادوں کے لیے مخبری پر لگایا گیا ہوں۔ اس نے سوچا کہ جو کچھ ہونا ہے، ہوجانے دیا جائے، افتاد پڑنے پر دیکھ لیا جائے گا۔

بادشاہ اور محمد امین خاں مغیث کو کچھ عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ مغیث نے ہمت کرکے بڑی بے پروائی سے فارسی میں پوچھا۔ "آپ دونوں کا مجھ سے کوئی کام......؟"

امین خاں نے کہا۔ "تمہیں یہ کس طرح اندازہ ہوا کہ ہمارا موضوع سخن تم ہو؟"

مغیث نے جواب دیا۔ "آپ دونوں گفتگو کے دوران بار بار اس ناچیز کو دیکھ رہے ہیں، اس سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ شاید آپ دونوں میرے متعلق گفتگو کررہے ہیں۔"

امین خاں نے مغیث کو جواب دیا۔ "رات سے بادشاہ سلامت کی طبیعت قدرے ناساز ہے۔ اس وقت اسی پر بات ہورہی تھی کہ اس نوجوان طبیب سے رجوع ہوا جائے، لیکن بادشاہ سلامت یہ فرماتے ہیں کہ اب طبیعت

WWW.PAKSOCIETY.COM

ٹھیک ہے۔'' اس کے بعد امین خاں نے بادشاہ سے ترکی میں کہا۔ ''حضور والا! اگر یہ ترکی زبان سے واقف ہوتا تو اس وقت اپنے بارے میں یہ خطرناک گفتگو سن کر بدحواس ہوجاتا اور قید اور قتل کی ذلت سے بچنے کے لیے فوراً اقرار کرلیتا کہ ہاں میں ترکی زبان جانتا ہوں، مجھے معاف کیا جائے لیکن ہماری گفتگو نے اسے پریشان تک نہیں کیا۔''

بادشاہ نے ترکی زبان ہی میں جواب دیا۔ ''مجھے تو پہلے ہی سے یہ اندازہ تھا کہ اسے ترکی نہیں آتی۔''

امین خاں نے کہا۔ ''قبلۂ عالم! احتیاط ہر حال میں لازم ہے اور اس حال میں جبکہ میں حضور سے ان نمک حرام سیدزادوں کے بارے میں ایک خاص بات کرنے آیا ہوں۔''

بادشاہ نے جواب دیا۔ ''تم اب وہ بات کرسکتے ہو۔''

امین خاں نے عرض کیا۔ ''حضور والا! وقائع عالمگیری میں ان سادات بارہہ کے لیے حضرت عالمگیر علیہ الرحمۃ کی رائے نظر سے گزری تو اس عاجز نے یہ مناسب سمجھا کہ اسے حضور کے گوش گزار کردیا جائے۔''

بادشاہ نے پوچھا۔ ''وہ کیا؟ فوراً بیان کرو۔''

امین خاں نے جواب دیا۔ ''حضور والا کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ حضرت عالمگیر کے دور میں عبداللہ خاں کو ہشت صدی کا منصب حاصل تھا اور حسین علی خاں کو ہفت صدی کا۔ ایک بار ذوالفقار علی خاں نے ان دونوں کی حضرت عالمگیر سے سفارش کی کہ عبداللہ خاں کو ہشت صدی سے یک ہزاری اور حسین علی کو ہفت صدی سے ہشت صدی کا منصب عطا کیا جائے اور یہ دونوں سید ہونے کی سند رکھنے کی وجہ سے اس ترقی کے مستحق ٹھہرتے ہیں، آپ جانتے ہیں حضرت عالمگیر نے اس کا کیا جواب دیا تھا؟ انہوں نے فرمایا تھا کہ سادات کی محبت میرا اور ہر مسلمان کا جزو ایمان ہے مگر ان لوگوں کو ایسی ترقی دینا جس سے یہ فتنوں میں مبتلا ہوجائیں اپنی دنیا اور عاقبت دونوں خراب کرنا ہے، کیونکہ میں نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ بارہہ کے سید کو جب غیر معمولی ترقی دی جاتی ہے تو وہ انا ولاغیری (میرے سوا کچھ نہیں) کا دم بھرنے لگتے ہیں اور اپنے مقام کو بھول کر اونچے اونچے خواب دیکھنا اور فساد برپا کرنا شروع کردیتے ہیں۔''

بادشاہ سکتے میں رہ گیا اور امین خاں کی شکل دیکھتا رہا، کیونکہ عالمگیر کی پیش گوئی حرف بہ حرف درست نکلی تھی، بولا۔ ''لیکن یہ ہماری بدقسمتی کہ ہم نے انہیں قطب الملک، یار وفادار اور امیر الامرا تک بنا ڈالا اور آج اس کی سزا بھگت رہے ہیں۔''

یہ موقع بہت غنیمت تھا، مغیث نے فوراً ترکی زبان میں بات شروع کی۔ ''حضور والا! گستاخی معاف، میں ترکی زبان جانتا ہوں اور سیدزادوں نے مجھے یہاں آپ دونوں کی مخبری کے لیے تعینات کیا تھا، لیکن ابھی تک اس وقت کا منتظر تھا جب میں اپنی حیثیت کا سچ سچ اظہار کرکے اپنی اس وفاداری کا جو بادشاہ سے متعلق ہے، یقین دلا سکوں۔ میں بادشاہ کا وفادار ہوں اور ان سیدزادوں سے نفرت کرتا ہوں جو دن رات اس فکر میں غلطاں ہیں کہ کس طرح من مانی چلائی جائے اور اپنے مخالفوں کا کام تمام کردیا جائے۔''

بادشاہ اور امین خاں پر مغیث کی ترکی زبان کی واقف کاری کا جتنا خوفناک اثر ہوا، وہ ان کے چہروں سے ظاہر ہورہا تھا، امین خاں کا چہرہ خوف سے ست گیا تھا اور بادشاہ بڑی معصومیت اور رحم طلب نظروں سے امین خاں کو دیکھنے لگا۔

امین خاں نے بہت ہی ناخوشگوار لہجے میں مغیث کو دھمکی دی۔ ''نوجوان طبیب! تو نے بہت ہی خطرناک کھیل کھیلا ہے، تجھے اسی دن یہ بات بتادینا چاہیے تھی، جس دن تو اس دربار میں آیا تھا۔''

مغیث نے جواب دیا۔ ''میری خاموشی کے دو سبب تھے۔ اول تو یہ کہ آپ لوگوں کے گردوپیش ہر وقت سیدزادوں کے آدمی موجود رہتے ہیں۔ میں ان کی موجودگی میں اگر آپ لوگوں سے ترکی زبان میں بات کرتا تو اس کی اطلاع سیدزادوں کو ہوجاتی اور اس کے بعد میرا جو حشر ہوتا، آپ اندازہ لگا سکتے ہیں، اس کے علاوہ دوسری وجہ یہ تھی کہ میں بادشاہ کے کام آنا چاہتا تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ میں اپنا اعتماد قائم کروں اور یہ اعتماد کسی غیر معمولی واقعے کے بغیر میں نہیں قائم کرسکتا تھا۔ اگر میری ان معروضات کے باوجود آپ لوگ مجھ پر اعتبار نہیں کرتے تو آپ کی مرضی لیکن میری بات صحیح ہے اور میں اب بھی اپنی اس بات پر قائم ہوں کہ اپنی ذات سے بادشاہ سلامت کو فائدہ پہنچاؤں۔''

امین خاں نے پوچھا۔ ''تو ہمیں کس قسم کا فائدہ پہنچا سکتا ہے؟''

مغیث نے جواب دیا۔ ''وہ کام جس پر سیدزادوں نے مجھے متعین کیا تھا، اب میں بادشاہ کے لیے سیدزادوں کے خلاف انجام دے سکتا ہوں۔''

بادشاہ نے امین خاں کی طرف دیکھا، جیسے پوچھ رہا ہو۔ ''امین خاں! اس سلسلے میں تمہاری کیا رائے ہے؟''

امین خاں نے الٹا بادشاہ سے سوال کردیا۔ ''حضور کی کیا رائے ہے؟ کیا اس شخص پر اعتبار کرلیا جائے؟''

بادشاہ نے جواب دیا۔ ''لیکن اس کا کوئی ثبوت کہ یہ جو کچھ کہہ رہا ہے سچ ہے؟''

امین خاں نے کہا۔ ''ہمیں اس پر اعتبار کرلینا چاہیے، ایک موقع دینا چاہیے کیونکہ اس نوجوان کی باتوں سے خلوص کی بو آتی ہے۔''

بادشاہ نے مغیث سے کہا۔ ''نوجوان طبیب! میں تجھے موقع دیتا ہوں کہ تو نے جو کچھ کہا ہے اس کو سچ ثابت کردکھا، ورنہ یہ یاد رہے کہ اگر کوئی ایسا ویسا قدم اٹھایا تو اس کے نتائج کم از کم تیرے حق میں بڑے خطرناک نکلیں گے۔''

مغیث نے جواب دیا۔ ''میں نے بادشاہ کی وفاداری پر خود کو کسی لالچ یا حرص میں مائل نہیں پایا ہے بلکہ میں نے یہ سب کچھ اس یقین اور ایمان کے زیر اثر کیا ہے کہ سیدزادے حضور والا کے ساتھ جو کچھ کررہے ہیں، وہ غداری ہے، نمک حرامی ہے اور انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے، ان کے ارادے اور ان کی کارروائیاں خودغرضی پر مبنی ہیں۔''

مغیث کے چلے جانے کے بعد امین خاں نے بادشاہ سے پوچھا۔ ''حضور کی اس نوجوان طبیب کے بارے میں کیا رائے ہے۔''

بادشاہ نے جواب دیا۔ ''ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہاں اب میں سیدزادوں کے فتنوں سے خوفزدہ ضرور ہوں۔ اگر یہ شخص جھوٹا نکلا تو ہمیں معلوم نہیں کن مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑے۔''

امین خاں مسکرانے لگا، اس کے چہرے پر بلا کی طمانیت پائی جاتی تھی، بولا۔ ''قبلۂ عالم! یہ شخص سچا ہے، میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ مغیث ہمارے خلاف کوئی کام نہیں کرے گا۔''

بادشاہ نے پوچھا۔ ''اس کا تم نے کس طرح اندازہ لگایا؟''

امین خاں نے جواب دیا۔ ''اس طرح کہ اگر وہ جھوٹا ہوتا تو آخر تک یہ نہیں ظاہر ہونے دیتا کہ وہ ترکی زبان جانتا ہے۔''

بادشاہ کی سمجھ میں بھی یہ معمولی سی بات آگئی۔

سیدزادوں کو اپنی اس سیاست پر بڑا گھمنڈ تھا کہ مالوے کے نظام الملک کو انہوں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ دکن میں ان کا بھتیجا عالم علی خاں نائب صوبے دار تھا، دوسری طرف ان کے دوست مرہٹے تھے، تیسری طرف آگرے کا صوبہ تھا اور یہاں ان کا چچازاد بھائی صوبے دار تھا، چوتھی طرف گجرات میں ان کا سرگرم حامی اجیت سنگھ صوبیدار تھا، دونوں بھائیوں کا خیال ہی نہیں یقین تھا کہ یہ ساری قوتیں متحد اور متفق ہوکر جب چاہیں گی نظام الملک کو کچل کر رکھ دیں گی۔

حسین علی خاں نے مغیث سے پوچھا۔ ''کیا بادشاہ یا امین خاں کی نظام الملک سے کسی قسم کی خط وکتابت ہورہی ہے؟''

مغیث نے جواب دیا۔ ''سردست میں اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتا۔''

حسین علی خاں بہت ناراض تھا، اس نے کہا۔ ''مغیث! میں نے تمہیں جس مقصد سے بادشاہ تک پہنچایا تھا، وہ مجھے ابھی تک حاصل نہیں ہوا۔''

مغیث نے کہا۔ ''اگر جناب یہ چاہتے ہیں کہ میں آپ کی پسندیدہ اور خواہش کے مطابق خبریں پہنچاؤں تو ایسی خبریں مجھے گڑھنا پڑیں گی اور جہاں تک سچی خبروں کا تعلق ہے تو وہ یہ ہیں کہ بادشاہ اور امین خاں آپ کے خلاف کوئی سازش نہیں کررہے ہیں۔''

حسین علی خاں نے نہایت تند وتلخ لہجے میں کہا۔ ''مغیث! ہماری زندگی مردم شناسی اور سیاست میں گزر رہی ہے۔ میں نے امین خاں کو بلوایا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مالوے کے صوبیدار نظام الملک کے وکیل کو بھی، میں ان دونوں سے نہایت اہم بات چیت کرنے والا ہوں، تمہاری بابت امین خاں نے جو کچھ بتایا ہے اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تم مجھ سے زیادہ بادشاہ کے وفادار ہو۔''

مغیث کے چہرے کا رنگ ہی بدل گیا، اسے یقین ہوگیا کہ امین خاں بھی سیدزادوں ہی کا آدمی ہے اور اسے بھی بادشاہ کے خلاف مخبری پر لگا دیا گیا ہے، اسے اپنی نظروں تلے موت رقص کرتی دکھائی دی، اس نے پھر بھی ہمت سے کام لیا، بولا۔ ''مجھے بہت افسوس ہے اگر امین خاں نے میرے خلاف کوئی بات کی ہے، میں اس شخص کے سامنے بات کرنے کو تیار ہوں، میں اس جھوٹے کو حد تک پہنچا کر دم لوں گا۔''

یہیں عبداللہ خاں بھی آگیا اور اس کے کچھ ہی دیر

WWW.PAKSOCIETY.COM

بعد امین خاں اور نظام الملک کے وکیل کی سواریاں آ کر رکیں۔ حسین علی خاں نے مغیث سے کہا۔ ''مغیث! میری خواہش ہے کہ تم اندر چلے جاؤ اور چھپ کر ہماری باتیں سنو، ضرورت ہوئی تو میں خود ہی تمہیں طلب کروں گا۔''

مغیث پردے کے پیچھے چلا گیا۔ یہ پردہ اس دروازے پر پڑا تھا، جس میں بیٹھ کر اس کمرے میں ہونے والی بات چیت کو سنا جا سکتا تھا۔ امین خاں کا دونوں بھائیوں میں سے کسی ایک نے بھی استقبال نہیں کیا۔ امین خاں کے پیچھے پیچھے نظام الملک کا وکیل چلا آ رہا تھا۔ امین خاں اپنی مرضی سے بیٹھ گیا، نظام الملک کا وکیل کھڑا رہا، اس سے بیٹھنے کو بھی نہیں کہا گیا۔

حسین علی خاں نے برا سا منہ بنا کر نظام الملک کے وکیل کو مخاطب کیا۔ ''تو جانتا ہے میں نے تجھے کیوں بلایا ہے؟''

نظام الملک کے وکیل نے جواب دیا۔ ''میں یہی جاننے کے لیے حاضر ہوا ہوں کہ آپ نے مجھے کیوں یاد فرمایا ہے؟''

حسین علی خاں نے کہا۔ ''ہم نے نظام الملک کو لکھا تھا کہ وہ اپنی فوجی قوت میں کوئی اضافہ نہ کرے، لیکن اس نے ہمارے حکم کو مسترد کر دیا، ہم نے اسے لکھا تھا کہ مالوے کی صوبے داری ہم اپنی تحویل میں لینا چاہتے ہیں۔ نظام الملک مالوے کی جگہ، ملتان، مراد آباد یا کہیں اور کی صوبے داری پر فائز کیا جا سکتا ہے۔ اس نے ہماری اس تجویز کو بھی رد کر دیا۔ ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ تیرا آقا نظام الملک آخر چاہتا کیا ہے؟ ہم اسے جبراً معزول کر سکتے ہیں، اسے فوجی قوت سے کچل سکتے ہیں لیکن پھر پرانے مراسم اور تعلقات آڑے آتے ہیں، تو اپنے آقا کو لکھ دے کہ وہ کسی کے بہکانے میں نہ آئے، میں حسین علی خاں امیر الامرا ہوں اور اسے میرا حکم ماننا چاہیے۔''

وکیل نے جواب دیا۔ ''میں آپ کی ایما سے اپنے آقا کو مطلع کر دوں گا۔''

حسین علی خاں نے کہا۔ ''صرف مطلع کرنا کیا معنی، اسے مشورہ دے کہ حسین علی خاں کے حکم سے سرتابی کا بہت برا نتیجہ نکلے گا۔''

اب عبداللہ خاں بھی بولا۔ ''کیا تیرا آقا نظام الملک، جہاندار شاہ، فرخ سیر اور دوسرے چند روزہ بادشاہوں کے حشر سے واقف نہیں ہے۔ ملک پر تیموری بادشاہ کی حکومت ہے لیکن حکم ہم سید زادوں ہی کا چلتا ہے۔''

وکیل ان دونوں کی بات پر یہی کہتا رہا کہ ''میں اپنے آقا کو اس سے مطلع کر دوں گا۔''

آخر عاجز آ کر وکیل کو رخصت کر دیا گیا۔ اب امین خاں کی باری تھی، حسین خاں نے تیوریاں چڑھا کر کہا۔ ''اعتماد الدولہ! میں حکومت کے ایک ایک فرد سے واقف ہوں اور جب میں نے یہ سنا ہے کہ تم میرے بھیجے ہوئے طبیب مغیث کو بھی اپنی چکنی چپڑی باتوں میں لا کر ہمارے خلاف کرنا چاہتے ہو تو بڑی تکلیف پہنچی، تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔''

امین خاں نے جواب دیا۔ ''امیر الامرا! آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں، میں اس کا مطلب نہیں سمجھا، میں نے مغیث کو کس طرح اپنی چکنی چپڑی باتوں میں لینا چاہا، اس کا بھی مجھے کوئی علم نہیں۔ اگر مغیث یہاں موجود ہوتا تو میرے خیال میں ابھی صفائی ہو جاتی۔''

حسین علی خاں نے کہا۔ ''اور کیا یہ بات بھی غلط ہے کہ تم بادشاہ سے ترکی زبان میں بات چیت کرتے ہو؟''

امین خاں نے جواب دیا۔ ''ہاں یہ درست ہے۔''

''لیکن تم بادشاہ سے ترکی زبان میں کیوں باتیں کرتے ہو؟''

''میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔''

''اور کیا یہ بھی غلط ہے کہ تم لوگ نظام الملک سے رابطہ قائم کیے ہوئے ہو اور وہ جو کچھ بھی کر رہا ہے اس میں تم لوگوں کا مشورہ اور رائے شامل ہے۔''

امین خاں نے جواب دیا۔ ''ایسا نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ بدگمانی اچھی چیز نہیں ہے۔''

حسین علی خاں ایک دم مشتعل ہو کر کھڑا ہو گیا۔ خنجر ہاتھ میں لے لیا، بولا۔ ''اعتماد الدولہ! میں چاہوں تو تمہیں یہیں قتل کر دوں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس سلسلے میں میرا کوئی کچھ بھی نہیں کر سکے گا۔ جو تمہارے طرفدار ہیں، انہیں ساعتوں میں کچل کر رکھ دیا جائے گا اس لیے اعتماد الدولہ! میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم کسی کو بھی شک و شبے میں مت ڈالو اور ترکی زبان کو یکلخت ترک کر دو۔''

اعتماد الدولہ امین خاں نے جواب دیا۔ ''امیر الامرا! تم نے مجھے اس طرح حکم دیا ہے گویا میں تمہارا ماتحت ہوں لیکن میں تمہیں یہ یقین دلاتا ہوں کہ میں نظام الملک سے زیادہ تم دونوں کا دوست ہوں۔''

امین خاں نے جھنجلا کر مزید کہا۔ ''حسین علی خاں!

زیادہ چیخ و پکار کی ضرورت نہیں ہے، میں باتیں برداشت کرنے کا عادی نہیں ہوں۔''

حسین علی خاں خنجر لے کر امین خاں پر جھپٹا، بولا۔ ''میں خود ہی تیرا کام تمام کر دوں گا۔ تیرے فتنوں سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔''

مقابلے کے لیے امین خاں بھی تیار ہو گیا، عبداللہ خاں ان دونوں کے درمیان آ گیا۔ حسین علی خاں کو ڈانٹتے ہوئے بولا۔ ''حسین علی خاں! میں تمہاری یہ بے ہودگی نہیں برداشت کر سکتا۔ امین خاں ہمارا مہمان ہے۔ مہمانوں پر ہاتھ اٹھانا آئین شرافت کے خلاف ہے اگر تم امین خاں کو قتل کرانا چاہتے ہو تو پہلے مجھے قتل کر دو۔''

حسین علی خاں نے خنجر والا ہاتھ بہ دستور اٹھائے رکھا، بولا۔ ''بھائی صاحب! آپ ذرا سادہ لوح ہیں، آپ کو مردم شناسی نہیں آتی۔ میری بات یاد رکھیے اگر ہمیں کبھی برے دن دیکھنا پڑے تو ہم پر پہلا وار امین خاں کی طرف سے ہوگا۔''

امین خاں نے جواب دیا۔ ''حسین علی خاں! غصے نے تمہیں اپنے ہوشوں میں نہیں رکھا، بہتر ہے کہ پہلے غصے پر قابو پا لو اس کے بعد باتیں کرو۔''

عبداللہ خاں نے اعلان کیا۔ ''میں امین خاں کی زندگی کا ضامن ہوں۔ اس لیے حسین علی خاں تم اپنا خنجر اپنی کمر میں اڑس لو۔''

حسین علی خاں نے بڑی بے بسی سے کہا۔ ''بھائی صاحب! مجھے اس شخص کے پاس سے اپنے خون کی بو محسوس ہو رہی ہے۔ یہ نظام الملک کا رشتہ دار ہے اور مغل سلطنت میں ہمارے مخالفین کا سرپرست اور سردار ہے۔''

عبداللہ خاں نے جواب دیا۔ ''لیکن اس وقت یہ ہمارا مہمان ہے اس لیے ہمارے لیے لائق احترام۔''

امین خاں نے بڑے افسوس سے کہا۔ ''حسین علی خاں! افسوس کہ میں بادشاہ سے ہمیشہ تم دونوں کی تعریفیں کرتا رہتا ہوں اور اپنے رشتے دار کی مخالفت کرتا رہتا ہوں۔ میں نے تو بادشاہ سے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ نظام الملک کو مالوے کی صوبے داری سے بلوا لیا جائے کیونکہ اس کے آثار باغیانہ ہیں اور بادشاہ نے مجھے حکم دیا کہ میں امیر الامرا سے کہوں کہ وہ نظام الملک کو فوراً آگرے طلب کر لیں لیکن افسوس کہ میری دوستی، خلوص اور رواداری کا مجھے یہ صلہ مل رہا ہے کہ امیر الامرا مجھے مہمان بنا کر قتل کر دینا چاہتے ہیں۔''

لیکن امین خاں کی میٹھی میٹھی باتوں کا حسین علی خاں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ بہ دستور تیوریاں چڑھائے کھڑا رہا۔ عبداللہ خاں نے امین خاں کی پشت پر ہاتھ رکھ دیا اور باہر لے جانے کے لیے ہلکا سا دھکا دیا کہا۔ ''آؤ، امین خاں باہر چلیں اور اس ناخوشگوار واقعے کی کیفیت کو دھو ڈالیں، جس نے ہم دونوں کو یکساں متاثر کیا ہے۔''

امین خاں نے جواب دیا۔ ''نہیں میں اس وقت تک باہر نہیں جاؤں گا جب تک کہ اس نوجوان طبیب کو یہاں نہیں بلایا جائے گا جس نے امیر الامرا سے یہ شکایت کی ہے کہ میں چکنی چپڑی باتوں سے اسے ورغلانے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔''

اندر مغیث یوں پریشان ہو رہا تھا کہ اگر اسے واقعی امین خاں کے سامنے کھڑا کر دیا گیا اور اس کا یہ جھوٹا الزام دہرا دیا گیا تو وہ امین خاں کو مطمئن کس طرح کرے گا لیکن خیریت یہ گزری کہ اس کا سامنا نہیں کرایا گیا، عبداللہ خاں، امین خاں کو لے کر باہر نکل گیا۔ حسین علی خاں نے مغیث کو سامنے کھڑا کر کے درشت لہجے میں کہا۔ ''مغیث! میں کچھ نہیں جانتا، میں امین خاں پر اعتبار نہیں کر سکتا۔ اب تم اپنا زیادہ وقت بادشاہ اور امین خاں کی مصاحبت میں گزارو گے اور انہیں اندر سے باہر نکال لینے کی کامیاب کوشش کرو گے۔''

مغیث نے جواب دیا۔ ''کوشش کرنا میرا کام ہے اور کامیابی عطا فرمانا خدا کا کام۔''

حسین علی خاں نے کہا۔ ''نہیں، میں کچھ نہیں جانتا، میں تو بس ایک بات جانتا ہوں۔ وہ یہ کہ امین خاں اچھا آدمی نہیں ہے۔ اس کی اچھائی کے خول کو اتار کر برے امین خاں کو ننگا کر دینا تمہارا کام ہے۔ میں اس عظیم کام کا عظیم الشان صلہ دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔''

مغیث چلا گیا لیکن اب وہ بہت زیادہ پریشان تھا۔ اسے خوف پیدا ہو چکا تھا کہ اس کی شاندار منافقت کا جس روز بھی بھانڈا پھوٹا۔ حسین علی خاں اسی دن اسے اپنے ہاتھ سے قتل کر دے گا۔

وکیل نے اپنے آقا نظام الملک کو سید زادوں کی بات چیت سے آگاہ کر دیا۔ دوسری طرف حسین علی خاں نے نظام الملک کو مالوے کی صوبے داری سے معزول کر کے آگرے طلب کر لیا لیکن نظام الملک نے یہ حکم نہیں مانا اور بڑے اطمینان سے جنگی تیاری جاری رکھی۔ اس کی دور بین نظریں شاید اپنے اور سید زادوں کے مستقبل کو اچھی طرح دیکھ رہی تھیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس دوران دونوں سید زادوں کو یہ خبر ملی کہ نظام الملک اُجین سے دہلی کی طرف روانہ ہو چکا ہے اور خیال یہ پایا جاتا ہے کہ وہ اپنی غلطیوں پر نادم ہے اور تلافی کے لیے بادشاہ کے پاس آرہا ہے۔ اس خبر نے دونوں بھائیوں کو بہت خوش کردیا۔ اب انہیں یقین ہو چلا تھا کہ ان کا طاقتور اور سب سے زیادہ ذہین شکار ان کے قابو میں آچکا ہے لیکن چند دنوں بعد انہیں یہ تازہ خبر ملی کہ نظام الملک نے اجین دہلی کی سڑک سے اچانک اپنا راستہ بدل دیا اور دریائے نربدا عبور کرکے اچانک آسیر کے قلعے پر قبضہ کرلیا اور آسیر پر قبضے کے تیسرے دن خاندیس کے دارالحکومت برہان پور پر بھی قبضہ کرلیا۔ اب نظام الملک نے دونوں بھائیوں کے خلاف اعلان جنگ کردیا اور تخت شاہی کے تمام وفادار امرا کے نام دعوت نامہ جاری کردیا اور تمام مساجد میں فرمان بھیج دیے گئے۔ دعوت نامہ اور فرمان میں کہا گیا تھا۔

"محمد شاہ دین پناہ دشمنوں کی قید میں ہے اور جملہ مسلمانوں پر فرض ہے کہ اسے قید سے چھڑائیں۔"

مسجدوں میں امام خطبے اور دعا میں نظام الملک کے یہ الفاظ دہرائے گئے۔ اس کا فوری اثر یہ ظاہر ہوا کہ دونوں بھائیوں کے خلاف عوام اور خواص میں یکساں ہیجان پیدا ہوگیا۔ اس دعوت نامے اور فرمان نے دونوں بھائیوں کو بدحواس کردیا۔ انہوں نے فیصلہ کرلیا کہ وہ نظام الملک کا خود مقابلہ کریں گے لیکن بعض امرا کے مشورے پر حسین علی خاں نے اپنے بخشی فوج دلاور علی خاں کو فوج کے ساتھ نظام الملک کو سزا دینے کے لیے روانہ کردیا اور دوسری طرف دکن کے نائب صوبے دار عالم علی خاں کو لکھ دیا گیا کہ وہ جنوب سے شمال کی طرف بڑھ کر نظام الملک پر حملہ آور ہو جبکہ دلاور علی خاں شمال سے جنوب کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اگر ان دونوں نے نظام الملک پر ایک ساتھ حملہ کیا تو نظام الملک ان دو طاقتوں کے بیچ میں گھر کر بری طرح کچلا جائے گا۔

نظام الملک نے بیک وقت دونوں سے مقابلہ کرنے کے بجائے دلاور علی خاں سے فوراً نمٹنے کا فیصلہ کرلیا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ دکن سے علی عالم خاں کو آنے میں دیر لگے گی۔ اس لیے دلاور علی خاں سے پہلے ہی مقابلہ کرلیا جائے۔ نظام الملک نے برہان پور اور دریائے نربدا کے درمیان پندھر کے پہاڑی علاقے میں دلاور علی خاں کو روک لیا۔ نظام الملک کا یہ حملہ اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ دلاور علی خاں کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ ملا۔ ایک سخت معرکے میں دلاور علی خاں اپنے چار پانچ ہزار سپاہیوں کے ساتھ مارا گیا۔ ان مرنے والوں میں اکثر و بیشتر نامی سردار تھے۔ نظام الملک نے اپنے نقصان کا اندازہ لگایا تو معلوم ہوا سو آدمی زخمی اور تیس ہلاک ہوئے۔

دلاور علی خاں کی ہزیمت کی خبر آگرے پہنچی تو دونوں سید زادے خوفزدہ ہوگئے۔ حسین علی خاں کے بیوی بچے دکن میں تھے۔ اب ان کی واپسی کی راہ مسدود ہو چکی تھی اور اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے، اگر وہ ان کی مدد کو جاتا تھا تو درمیانی فاصلہ اتنا تھا کہ اس کے پہنچنے سے پہلے ہی حالات بگڑ سکتے تھے۔

آگرے میں نظام الملک کی فتح اور دلاور علی خاں کی ہزیمت کی خبر نے سید زادوں کے مخالفین کو خوش کردیا۔ امین خاں اور بادشاہ بہت خوش تھے۔ نوجوان طبیب مغیث بھی اندر سے خوش تھا اور اوپر سے افسردہ۔ حسین علی خاں نے عبداللہ خاں کو سمجھایا۔ "بھائی صاحب! اس وقت نظام الملک کے ہاتھوں ہمیں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے مشورہ دیجیے ہمیں کیا کرنا چاہیے۔"

عبداللہ خاں نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے ہمیں نظام الملک سے صلح کرلینی چاہیے کیونکہ وہ طاقتور ہے اور اسے میدان جنگ میں شکست دینا ناممکن ہے۔"

حسین علی خاں نے بگڑ کر کہا۔ "بھائی صاحب! آپ ہمیشہ کم ہمتی کی بات کرتے ہیں۔ میں نظام الملک کے مقابلے پر خود روانہ ہو رہا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ میں نظام الملک کو میدان جنگ ہی میں اس کی غداری اور نمک حرامی کا مزہ چکھاؤں گا۔"

عبداللہ خاں نے پوچھا۔ "اور بادشاہ کہاں رہے گا؟"

حسین علی خاں نے جواب دیا۔ "یہیں آگرے میں یا پھر اسے دہلی پہنچا دیا جائے۔"

عبداللہ خاں نے کہا۔ "تم افواج کے ساتھ نظام الملک کے مقابلے پر روانہ ہو جاؤ گے اور یہاں بادشاہ کو اس کے وہ امرا جنہیں بادشاہ اور نظام الملک سے ہمدردی ہے خوب خوب ورغلائیں گے۔ اس کا کیا علاج ہوگا؟"

حسین علی خاں نے جواب دیا۔ "میرے پاس اس کا بھی علاج ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ آپ اس کی مخالفت کرنے لگتے ہیں۔"

"کیا علاج ہے؟ میں بھی تو سنوں۔"

حسین علی خاں نے جواب دیا۔ "یہاں ہمارا سب سے بڑا دشمن اعتماد الدولہ امین خاں ہے اور اس کا یہ علاج ہے کہ اسے آگرہ چھوڑنے سے پہلے ہی قتل کردیا جائے۔"

عبداللہ خاں ہنسا، بولا۔ "تم بہت جذباتی ہو حسین علی خاں! تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ اگر امین خاں ہلاک کیا گیا تو یہیں آگرے اور دہلی میں بغاوت کے ایسے شعلے بھڑکیں گے جن پر کم از کم میں قابو نہیں پا سکتا۔"

حسین علی خاں نے سر پیٹ لیا، بولا۔ "بھائی صاحب! رونا تو یہی ہے کہ آپ کچھ کر نہیں سکتے۔ سوائے مال و دولت میں حساب کتاب کرنے کے۔"

عبداللہ خاں بپھر گیا۔ ڈانٹ کر بولا۔ "حسین علی خاں! اپنی بکواس بند کر، تو اس نازک وقت میں ایسی جلی کٹی باتیں کرکے آخر اپنے بھائی کی ہمدردی اور حمایت سے کیوں محروم ہونا چاہتا ہے؟"

حسین علی خاں نے جواب دیا۔ "اس وقت اگر آپ میری حمایت یا ہمدردی کرسکتے ہیں تو وہ یہ ہے کہ مجھے اس بات کی اجازت دے دیں کہ میں اعتماد الدولہ کو قتل کرادوں۔"

عبداللہ خاں نے کہا۔ "میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا، کیونکہ میں نے امین خاں کو زندگی کی ضمانت دے رکھی ہے۔"

حسین علی خاں نے چڑ کر کہا۔ "بھائی صاحب! آپ کو اس کھلے دوست اور چھپے دشمن کے زہر کا اندازہ نہیں ہے شاید آپ کو نہیں معلوم کہ نظام الملک اور بادشاہ میں جو خفیہ خط کتابت ہو رہی ہے وہ اسی امین خاں کے ذریعے ہو رہی ہے اور نظام الملک کا بغاوت نامہ امین خاں کے نام بھی آیا تھا۔"

عبداللہ خاں نے جواب دیا۔ "حسین علی خاں! تمہاری ساری دلیلیں ایک طرف اور میری یہ بات دوسری طرف کہ میری زندگی امین خاں کی زندگی سے وابستہ ہے، اگر تم اس کو ہلاک کرنے پر تلے ہوئے ہو تو مجھے بھی ہلاک کروا ڈالو یا پھر میں اپنا خاتمہ خود ہی کیے لیتا ہوں۔"

حسین علی خاں بے بس ہوگیا، بولا۔ "پھر مجھے کرنا کیا چاہیے؟"

عبداللہ خاں نے جواب دیا۔ "نظام الملک سے صلح۔ کیونکہ نظام الملک کی سیاست اور فراست کا مقابلہ کرنا بہت مشکل ہے اسے دوست بنا کر اس وقت کا انتظار کرو جب کسی موقع سے فائدہ اٹھا کر تم اس پر قابو پا جاؤ۔"

حسین علی خاں نے بہ دستور چڑچڑے انداز میں کہا۔ "بھائی صاحب اپنے سارے مہرے بیکار اور ناقابل اعتبار ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ یہ شریر امین خاں بادشاہ سے مل کر نظام الملک سے رابطہ قائم کیے ہوئے ہوگا لیکن مغیث اس کا پتا نہیں چلا رہا ہے۔"

عبداللہ خاں نے جواب دیا۔ "حسین علی خاں! کیا تم اعتماد الدولہ کو بچہ سمجھتے ہو؟ وہ مغیث کیا، کسی کے بھی سامنے کوئی ایسی بات نہیں کرے گا کہ تم یا ہم اس پر ہاتھ رکھ سکیں۔"

حسین علی خاں نے کہا۔ "پھر میں یہ کرتا ہوں کہ بادشاہ کے ذریعے نظام الملک کے نام دکن کی صوبے داری کا ایک فرمان جاری کرائے دیتا ہوں، اس طرح ممکن ہے وہ ہمارے قابو میں آجائے۔"

عبداللہ خاں نے مشورہ دیا۔ "شاہی فرمان کے ساتھ ہی ایک ذاتی خط اپنی طرف سے نظام الملک کو روانہ کردو تاکہ دلاور علی خاں کی محاذ آرائی سے جو رنجش پیدا ہوگئی ہے اگر دور نہ ہو تو کم ہی ہو جائے۔"

حسین علی خاں، عبداللہ خاں کو اپنے ساتھ لے کر بادشاہ کے پاس پہنچ گیا اور اس کی طرف سے دکن کی صوبے داری کا فرمان جاری کردیا۔ اس فرمان میں بادشاہ نے نظام الملک کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔ "ہمیں معلوم ہوا ہے کہ نواب نظام الملک نے سیر و شکار کے لیے آسیر اور برہان پور کا سفر اختیار کیا ہے۔ سیر و شکار کوئی بری بات نہیں ہے لیکن تعجب اس پر ہے کہ نواب نے مالوے کو بے اجازت شاہی کیسے چھوڑ دیا۔ نواب کو اگر دکن پسند ہے تو انہیں دکن کی صوبے داری دینے میں ہمیں کیا عذر ہو سکتا ہے، دکن کے فتنہ و فساد کے پیش نظر ہمارا پہلے ہی یہ ارادہ تھا کہ اس کی صوبے داری کسی لائق شخص کے نام کردی جائے، اب جبکہ نواب نے آسیر اور برہان پور کا نظم و نسق خود ہی سنبھال لیا ہے، تو پورے دکن کی صوبے داری کا باقاعدہ فرمان بھیجا جا رہا ہے۔ تم فوراً دکن پہنچو اور عالم علی خاں سے اختیارات لے کر اس کا نظم و نسق سنبھال لو۔ امیر الامرا حسین علی خاں کے اہل و عیال دکن ہی میں ہیں، انہیں عالم علی خاں کے ہمراہ آگرے روانہ کردو۔"

اس شاہی فرمان کے ساتھ ہی حسین علی خاں نے ایک خط اپنی طرف سے نظام الملک کو لکھا۔

"نواب نظام الملک کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں نے دلاور علی خاں کو اس لیے بھیجا تھا کہ وہ میرے اہل و عیال کو لے آئے، لیکن معلوم ہوا کہ وہ میری منشا کے خلاف آپ سے جنگ آزما ہوا اور اپنے کیفر کردار کو پہنچا، یہ بھی سنا گیا

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہے کہ کچھ مفسدوں نے بعض معاملات میں آپ کو ایسی باتیں لکھ دی ہیں جن سے ہمارے اور آپ کے درمیان نااتفاقی پیدا ہو سکتی ہے لیکن خدا نہ کرے کہ پرانے دوستوں کے درمیان اس قسم کی نوبت آئے یہاں بعض لوگوں نے آپ کی نسبت جہاں پناہ سے ایسی باتیں بیان کی تھیں جن سے شاہی عتاب کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا، مگر میں نے آپ کی وفاداری کا یقین دلا کر خاطر مبارک کو صاف کر دیا ہے اور اب جہاں پناہ نے آپ کو دکن کی صوبے داری پر مقرر کیا ہے۔ میری طرف سے اس تقرری پر مبارک باد قبول کیجیے اور میرے بیٹے عالم علی خاں اور اہل وعیال کو بہ حفاظت روانہ کر دیجیے۔"

لیکن خط اور فرمان کے پہنچنے سے پہلے ہی نظام الملک اور عالم علی خاں ایک دوسرے سے جنگ کرنے کے لیے اپنی اپنی جگہوں سے حرکت کر چکے تھے۔ عالم علی خاں اجنٹہ گھاٹ کے شمال میں فردا پور تک پہنچا تھا کہ اسے دلاور علی کی شکست کی خبر ملی۔ ساتھیوں نے پیش قدمی سے منع کیا لیکن نوجوان عالم علی خاں جوش میں بڑھتا چلا گیا۔ نظام الملک اکولہ سے سولہ میل مغرب میں، پورنا ندی سے تقریباً سترہ میل جانب جنوب بالا پور پہنچ چکا تھا، یہیں نظام الملک کو شاہی فرمان اور حسین علی خاں کا خط ملا۔ نظام الملک نے ان دونوں چیزوں کا دھوم دھام سے استقبال کیا اور بہ آواز بلند فوج کو سنایا۔ یہیں ان کے مقابل عالم علی خاں بھی نمودار ہو چکا تھا۔ نظام الملک نے دونوں چیزوں کی نقلیں عالم علی خاں کو بھجوا دیں اور اپنی طرف سے لکھ دیا کہ اب میں دکن کا صوبے دار مقرر کر دیا گیا ہوں، اس لیے تمہارا لڑنا فضول ہے اپنی فوج کو واپس کر دو اور میں تمہیں امیر الامرا کے اہل وعیال کے ساتھ بہ حفاظت آگرے بھیجنے کی ذمے داری قبول کرتا ہوں۔"

عالم علی خاں نے اسے سیاست اور فریب کاری تصور کیا اور اعلان کیا۔ "میں جنگ کرنے آیا ہوں اور شاہی فرمان اور امیر الامرا کے خط کی نقول کو جعلی تصور کرتا ہوں، کیونکہ اگر ان میں صداقت ہوتی تو اسی نوعیت کا شاہی فرمان اور امیر الامرا کا خط میرے نام بھی آتا لیکن میرے پاس کچھ بھی نہیں آیا۔"

لیکن شاہی فرمان اور امیر الامرا کے مضمون کی تشہیر سے سیاسی فائدہ حاصل ہو چکا تھا۔ عالم علی خاں کے وہ سردار اور فوجدار جن کا تعلق دکن سے تھا وہ نظام الملک سے جنگ نہیں کرنا چاہتے تھے کیونکہ معزول نائب صوبے دار پر نئے صوبے دار نظام الملک کو نظر انداز کرنا اور اس سے جنگ کرنا بہت ہی خطرناک بات تھی، جس کے نتائج وہ بعد میں بھگتنے پر مجبور ہوں گے، ان لوگوں نے عالم علی خاں سے علیحدگی اختیار کر لی۔ گویا اب نظام الملک شاہی نمائندہ تھا اور عالم علی خاں باغی، جو شاہی فرمان کے خلاف دکن کے جائز صوبے دار سے جنگ کرنے پر اڑا ہوا تھا۔

اعلان جنگ ہوا، توپوں کی باڑ سے زلزلہ سا آ گیا آناً فاناً دھوئیں نے سورج کو انسانی نظروں سے چھپا دیا۔ چھروں کی بوچھار نے خون کا مینہ برسا دیا۔ نظام الملک کا ایک فوجی سردار اختصاص خاں مارتا کاٹتا عالم علی خاں کے پاس پہنچ گیا اور تلوار کا ایک بھرپور ہاتھ رسید کیا، عالم علی خاں کا ایک ہاتھ کٹ کر زمین پر گر گیا، اختصاص خاں کے ساتھی بھی عالم علی خاں اور اس کے انیس فیل سوار اور باقی گھڑسوار اور پیادوں پر ٹوٹ پڑے اور انہیں فصل کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔ اس جنگ میں عالم علی خاں نے اپنا سب کچھ گنوا دیا اور نظام الملک کے چند سپاہی زخمی ہوئے جو چند دن میں صحت یاب ہو گئے۔ نظام الملک نے حسین علی خاں کے اہل وعیال کو عزت آبرو کے ساتھ آگرے روانہ کر دیا۔

مغیث نے امین خاں کو حسین علی خاں کے ارادوں سے مطلع کر دیا تھا اور وثوق سے کہہ دیا تھا کہ اگر عبداللہ بیچ میں نہ پڑتا تو حسین علی خاں اسے قتل کرا دیتا۔ امین خاں نے احتیاطاً اپنے مکان کے گرد خندقیں کھدوا دیں اور مغل دستہ حفاظت کے لیے تعینات کر دیا۔ محمد شاہ اپنے بارے میں فکرمند تھا کہ کہیں یہ دونوں سید زادے اس کے خلاف کوئی اور گل نہ کھلا بیٹھیں۔

عالم علی خاں کی شکست نے دونوں بھائیوں کے رہے سہے ہوش بھی اڑا دیے۔ انہوں نے فوج کو تیاری کا حکم دیا، حسین علی کی رائے میں امین خاں کو قتل کر دینا اب بہت ضروری ہو گیا تھا، لیکن عبداللہ خاں نے ایک بار پھر مداخلت کی اور حسین علی خاں کو ایسا کرنے سے روک دیا لیکن ایک بات پر دونوں بھائی متفق تھے۔ آگرے سے دہلی روانگی اور حسین علی خاں کا بادشاہ کے ساتھ دکن روانہ ہو جانا، جہاں نظام الملک کو اس کے کیے کی سزا دینا بہت ضروری ہو گیا تھا۔ عبداللہ خاں بہت اداس تھا، اس نے دہلی روانگی سے ایک رات پہلے غم غلط کرنے کے لیے مہوشوں کی آغوش کا سہارا لیا۔ شاید اپنی زندگی میں پہلی بار اس نے اس فراخ دلی کا مظاہرہ کیا کہ مغیث کو خوش کرنے کی خاطر مہرن کو اس کے حوالے کر دیا مگر ایک رات کے لیے، بولا۔ "مغیث! تو

بھی کیا یاد کرے گا۔ میں جانتا ہوں کہ مہرن اور تم، دونوں ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے ہو، میں نہیں جانتا کہ ہمارا اقتدار ابھی کتنے دن اور ہے، اب میں کوشش کروں گا کہ کسی کو ناراض نہ کروں اور اپنی اس کوشش کا آغاز تجھ سے کر رہا ہوں ایک رات کے لیے مہرن تیرے حوالے ہے، جا عیش کر، تو بھی کیا یاد کرے گا۔"

مغیث نے جواب دیا۔ "جناب میں آپ کا شکرگزار ہوں اور دعاگو ہوں کہ خدا آپ کی پریشانیاں دور کرے۔"

عبداللہ خاں نے کہا۔ "مغیث! ہم نے بڑے عیش کیے ہیں، مہرن بھی عرصے سے اپنے تصرف میں ہے، میں نے اس کے جسم کو جب چاہا مسخر کر لیا لیکن اس کی روح اور اس کا دل ہمیشہ ناقابل تسخیر رہے۔ اب جو میں نے یہ محسوس کیا کہ تو نے اس کا دل اور روح کو بھی مسخر کر لیا ہے تو رشک وحسد سے میرا برا حال ہو گیا، تو آج کی رات مہرن کے ساتھ عیش کر، بہت ممکن ہے کہ میں اسے ہمیشہ کے لیے تیرے ہی حوالے کر دوں۔"

مغیث فرط جوش میں باؤلا سا ہو گیا، اس کی آنکھیں بھیگ گئیں، بولا۔ "میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔"

عبداللہ خاں نے کہا۔ "شکریہ ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

حویلی کے دربان نے عبداللہ خاں کو مطلع کیا۔ "امیر الامرا ملاقات کو حاضر ہوئے ہیں۔"

عبداللہ خاں ان مہوشوں اور چاند کے ٹکڑوں میں اپنے چھوٹے بھائی کو نہیں بلوانا چاہتا تھا، خود ہی حسین علی خاں کے پاس پہنچ گیا، پوچھا۔ "حسین علی خاں! خیریت تو ہے؟"

حسین علی خاں نے جواب دیا۔ "بھائی صاحب! میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ بادشاہ کو اپنے ساتھ لے کر اجمیر کے راستے دکن روانہ ہو جاؤں۔ آپ دہلی چلیں اور بادشاہ کی نیابت کے فرائض انجام دیں۔"

عبداللہ خاں نے کہا۔ "بہتر ہے میں فوراً دہلی چلا جاؤں گا لیکن تم بہت محتاط رہنا۔"

حسین علی خاں نے کہا۔ "بھائی صاحب! مجھے دو آدمیوں نے بہت پریشان کیا ہے اور ستم ظریفی تو ملاحظہ فرمائیں کہ دونوں ہی آپس میں رشتہ دار ہیں۔ نظام الملک اور محمد امین خاں اعتماد الدولہ۔ نظام الدولہ پر تو کوئی اختیار نہیں ہے لیکن محمد امین خاں ہمارے قبضے میں ہے جب چاہیں اسے قتل کر سکتے ہیں۔"

عبداللہ خاں نے بگڑ کر جواب دیا۔ "تم معلوم نہیں کیوں امین خاں کو قتل کرنا چاہتے ہو حالانکہ اگر تم ایسا کرو گے تو یاد رکھو مغلوں کی حمایت سے محروم ہو جاؤ گے اور امین خاں اتنا حلوا نہیں ہے جسے تم آسانی سے چٹ کر جاؤ۔"

حسین علی خاں نے پوچھا۔ "پھر مجھے اس شخص کے ساتھ کیسا سلوک کرنا چاہیے؟ اگر میں بادشاہ کو اپنے ساتھ لے جاتا ہوں اور امین خاں کو دہلی میں چھوڑے جاتا ہوں تو دکن تک یہی دھڑکا لگا رہے گا کہ میرے پیچھے امین خاں معلوم نہیں کیسی گڑبڑ کرتا رہے۔"

عبداللہ خاں نے کہا۔ "دہلی میں امین خاں کے لیے میں کافی نہیں ہوں؟"

حسین علی خاں نے جواب دیا۔ "بھائی صاحب! آپ ذرا رحم دل ہیں، بالخصوص امین خاں کے معاملے میں۔ اس لیے میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ بادشاہ کے ساتھ امین خاں کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤں گا، امین خاں میری نظروں میں رہے گا تو ہمارے خلاف کوئی سازش نہیں کر سکے گا۔"

عبداللہ خاں نے کہا۔ "جیسی آپ کی مرضی؟"

حسین علی خاں چلا گیا اور عبداللہ خاں عورتوں کے جھرمٹ میں بیٹھ کر غم غلط کرنے لگا۔

مغیث مہرن کو لے کر ایک دوسری خلوت گاہ میں چلا گیا۔ وہ بہت خوش تھا، بولا۔ "آج رات بھر تم میرے اختیار میں رہو گی اور اس میں سب سے زیادہ خوشی کی یہ بات ہے کہ عبداللہ خاں نے خود ہی تمہیں میرے حوالے کر دیا ہے۔"

مہرن کے لیے بھی یہ خبر بڑی اہم اور عجیب تھی۔ وہ بہت خوش تھی، وہ واقعی مغیث سے محبت کرنے لگی تھی، کمرے میں دو مسہریاں بچھی ہوئی تھیں۔ مہرن اس کے ساتھ ہی ایک مسہری پر بیٹھ گئی، بولی۔ "مغیث! یہ تم کھوئے کھوئے کیوں نظر آ رہے ہو؟ کیا تم عبداللہ خاں کے خوف سے چپ ہو یا کوئی اور بات؟"

مغیث نے جواب دیا۔ "مہرن! آؤ ہم دونوں پوری رات دنیا بھر کی باتوں میں گزار دیں اور جب نیند تنگ کرے تو ہم دونوں الگ الگ اپنی اپنی مسہریوں پر سو جائیں۔"

مہرن کے دل پر چوٹ سی لگی، بولی۔ "مغیث! یہ احتیاط کیوں؟ کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتے؟"

WWW.PAKSOCIETY.COM

مغیث نے جواب دیا۔ ''محبت کیوں نہیں کرتا، میں تجھ سے محبت کرتا ہوں مہرن، لیکن اس محبت کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ تیرے ساتھ میں بھی وہی کروں جو عبداللہ خاں کرتا چلا آیا ہے۔''

مہرن اداس ہوگئی، آہستہ سے کہا۔ ''پھر تم کیا چاہتے ہو مجھ سے؟''

مغیث نے جواب دیا۔ ''باتیں، میں تم سے اچھی اچھی باتیں کرنا چاہتا ہوں، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔''

مہرن نے کہا۔ ''پھر تم...... مگر صرف باتیں، میں تو یہ پوچھتی ہوں کہ کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتے؟''

مغیث نے کہا۔ ''پھر وہی سوال، پھر وہی بات۔ آخر تم یہ سوال کیوں کر رہی ہو مجھ سے بار بار؟''

مہرن نے جواب دیا۔ ''مغیث! میں نے جس غیر یقینی ماحول میں آنکھ کھولی ہے اس میں سب کچھ تمہاری آج ہے، کل، آنے والا کل نہیں ہے، میں نے بڑی مشکل سے یہ رات پائی ہے اور تم اس رات کو یوں ہی صرف باتوں میں گزار دینا چاہتے ہو، آخر کیوں؟''

مغیث نے بڑے کرب سے مہرن کی طرف دیکھا، بولا۔ ''مہرن! افسوس کہ جب میں یہ سوچتا ہوں کہ اپنے باپ کے چلے جانے کے بعد تو فرخ سیر کے قبضہ واختیار میں چلی گئی اور پھر فرخ سیر سے تو عبداللہ خاں کے حرم میں داخل ہوئی، تو میرا مارے غصے اور شرم کے برا حال ہوجاتا ہے اور میں سب کچھ بھلا کر صرف یہ سوچنے لگتا ہوں کہ آخر اتنا بڑا گناہ ہوا کیوں؟ اتنی بڑی زیادتی کیوں ہوئی؟''

مہرن نے خود کو مسہری پر گرا دیا، بولی۔ ''بس تم فضول باتیں سوچے جاؤ، لیکن میں یہ نہیں سمجھ سکی کہ ان فضول باتوں کو سوچنے سے تمہیں یا مجھے ملے گا کیا؟''

مغیث نے جواب دیا۔ ''مجھے یا تمہیں ملے گا کیا؟ کچھ بھی نہیں۔''

مہرن چپ سادھ کر پڑ رہی، ذرا دیر بعد مغیث نے محسوس کیا کہ مہرن پر نیند غلبہ پاتی جارہی ہے۔ مغیث نے نیند اڑانے کے لیے موضوع بدل دیا، بولا۔ ''اب سید زادوں کے اقبال کا سورج غروب ہوا ہی چاہتا ہے چند ہفتوں یا چند مہینوں کی بات اور ہے۔''

مہرن کی واقعی نیند اڑ گئی۔ اٹھ کر بیٹھ گئی، خوشی میں پوچھا۔ ''سچ؟ واقعی؟''

مغیث نے جواب دیا۔ ''بالکل سچ کہہ رہا ہوں، دکن میں نظام الملک نے سید زادوں کے سارے غرور کو خاک میں ملا دیا ہے۔''

مہرن نے پوچھا۔ ''اگر عبداللہ خاں اور امیر الامرا کو زوال آگیا تو میں کہاں جاؤں گی؟''

مغیث نے جواب دیا۔ ''میں تمہیں نیشاپور لے جاؤں گا اور تمہارے والد کو تلاش کرکے، تمہیں ان کے حوالے کردوں گا۔''

مہرن اداس ہوگئی۔ ''لیکن اب میں اپنے باپ کے پاس کیا منہ لے کر جاؤں گی۔''

مغیث نے جواب دیا۔ ''یہ جو کچھ بھی تمہارے ساتھ ہوا ہے، اس میں تمہارے باپ کی کوتاہیوں کا بڑا دخل ہے، تم مجبور اور بے بس تھیں۔''

مہرن نے بیزاری سے کہا۔ ''لیکن میں پھر بھی اپنے باپ کے پاس نہیں جاؤں گی۔''

مغیث نے کہا۔ ''باپ کے پاس جانے میں ہرج ہی کیا ہے؟''

مہرن نے جواب دیا۔ ''میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں، تمہارے پاس، لیکن شاید تم مجھے اپنے ساتھ رکھنے میں عار محسوس کرتے ہو، میں بھی تم سے رحم یا ہمدردی کی درخواست نہیں کروں گی۔''

مغیث نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ ''مہرن! تم زیادہ جذباتی مت بنا کرو، میں تمہیں اپنے ساتھ رکھنے میں عار کیوں محسوس کروں گا۔''

مہرن نے کوئی جواب نہ دیا۔ مغیث نے مزید کہا۔ ''اگر مجھے تم سے نفرت ہوتی تو میں تم میں اتنی دلچسپی ہرگز نہ لیتا اور اپنا قیمتی وقت تم پر ہرگز ضائع نہ کرتا۔''

مہرن نے پھر کوئی جواب نہ دیا۔ مغیث نے اس کو بہ غور دیکھا تو پتا چلا، وہ رو رہی ہے۔ آہستہ آہستہ، آواز نکالے بغیر۔ مغیث کو مہرن پر بڑا رحم آیا، اس نے مہرن کو سینے سے لگا لیا اور پشت تھپتھپانے لگا۔ ''مہرن! میری موجودگی، میری زندگی میں تو کیوں رو رہی ہے، چپ ہوجا میری لاڈلی۔ میری مہرن، میری عزیز از جان چپ ہوجا۔ صبر کر، جو کچھ ہوچکا اس پر آنسو بہانے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

لیکن اس تسلی اور تشفی نے گویا سیلاب کا بند ہی توڑ دیا۔

3 ستمبر 1720ء کی صبح پچاس ہزار کا ایک لشکر آگرے سے اجمیر کی طرف روانہ ہوگیا، عبداللہ خاں بھی لشکر کے ساتھ تھا، لیکن ایک منزل تک ساتھ دے کر عبداللہ

خاں نے اپنے دیوان رتن چند کو بادشاہ کے پاس چھوڑا اور خود دہلی روانہ ہوگیا، عبداللہ خاں کے واپس ہوتے ہی حالات کروٹیں بدلنے لگے۔ امین خاں نے پہلی بار حسین علی خاں کے اس اقدام کی مخالفت کی، بولا۔ ''حسین علی خاں! نظام الملک کے خلاف تمہاری لشکر کشی کو میں اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔''

حسین علی خاں نے امین خاں کو شک وشبے کی نظر سے دیکھا، پوچھا۔ ''وہ کیوں؟ کیا حکومت کے سب سے بڑے اور سب سے خطرناک باغی کو یوں ہی اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور وہ جو کچھ کر رہا ہے اسے کرنے دیا جائے۔''

امین خاں نے جواب دیا۔ ''نظام الملک کو حکومت کا باغی مت کہو، حسین علی خاں۔ ان حالات میں تم بھی وہی کرتے جو نظام الملک نے کیا۔''

حسین علی خاں کے پیروں تلے سے زمین کھسکنے لگی۔ امین خاں کے تیور صحیح نہیں تھے۔ حسین علی خاں نے اپنے اہل وعیال کا سہارا لیا۔ ''امین خاں! میرے اہل وعیال ابھی تک میرے پاس نہیں پہنچے، حالانکہ معلوم یہ ہوا ہے کہ انہیں نظام الملک نے بہ حفاظت روانہ کردیا ہے۔''

امین خاں نے جواب دیا۔ ''حسین علی خاں! اگر تم چاہو تو میں اپنے بیٹے قمرالدین خاں کو تمہارے اہل وعیال کی خاطر نظام الملک کے پاس روانہ کردوں۔''

حسین علی خاں نے کہا۔ ''لیکن اس کی کوئی ضرورت نہیں، میں دکن پہنچ کر نظام الملک سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتا ہوں۔''

امین خاں نے تیوری بدل کر جواب دیا۔ ''حسین علی خاں! تمہیں شاید نہیں معلوم کہ اس فوج میں اور خاص کر میری فوج کے مغل، نظام الملک سے جنگ نہیں کرنا چاہتے اس لیے مجھے اس فوج کے ساتھ پیچھے رکھا جائے۔''

حسین علی خاں خوشامد پر اتر آیا۔ ''امین خاں آپ اور آپ کے سپاہی جنگ میں نہ شریک ہوں، میں آپ لوگوں کو جنگ پر مجبور بھی نہیں کروں گا لیکن آپ مجھے مشورے تو ضرور دے سکتے ہیں۔ میں آپ کو اپنا چچا سمجھتا ہوں۔''

امین خاں نے جواب دیا۔ ''لیکن تم میرا مشورہ مانتے کب ہو، جو میں تمہیں مشورہ دوں گا۔''

حسین علی خاں نے تالی بجا کر ایک خدمت گار کو طلب کیا، جب وہ آگیا تو حکم دیا۔ ''چچا امین خاں میرے خیمے میں تشریف لائے ہیں، ان کی خدمت میں اشرفیوں کا نذرانہ پیش کیا جائے۔''

ذرا دیر بعد ایک کشتی میں دو سو اشرفیوں کا نذرانہ امین خاں کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ جسے مسکرا کر قبول کرلیا گیا، امین خاں کی خوشگوار مزاجی کیفیت کو دیکھ کر حسین علی خاں کی جان میں جان آئی، بولا۔ ''چچا! اگر آپ ہمارے ساتھ صرف موجود رہیں اور ہماری ہمت افزائی کرتے رہیں تو یہی ہمارے لیے کافی ہوگا۔''

امین خاں نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ''اگر تم اپنے قریب میری موجودگی کو ضروری سمجھتے ہو تو میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔''

حسین علی خاں نے فرط جوش میں امین خاں کا ہاتھ پکڑ کے آنکھوں سے لگا لیا اور پھر بوسہ دے کر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ ''چچا جان! میں آپ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔''

امین خاں کچھ دیر رک کر اپنے خیمے میں واپس چلا گیا۔

حسین علی خاں کے بھتیجے نے پوچھا۔ ''چچا جان! ایک زمانہ جانتا ہے کہ آپ نے امین خاں کو کبھی اچھا نہیں سمجھا، پھر یہ آج اس سے خوشامدانہ گفتگو کرنے اور چچا جان چچا جان کہنے کا مطلب؟''

حسین علی خاں نے جواب دیا۔ ''بھتیجے! وقت پڑنے پر لوگ گدھے کو باپ بنا لیتے ہیں، میں نے تو ایک معزز اور صاحب وقار تورانی امیر کو محض چچا بنایا ہے، اللہ نے چاہا تو میں چچا ہی بنا کر چھوڑوں گا اسے۔''

امین خاں کی تیز نظروں نے حسین علی خاں میں شکست خوردگی اور ہزیمت کے آثار دیکھ لیے تھے، اسے صاف معلوم ہوگیا تھا کہ حسین علی خاں عدم خود اعتمادی کا شکار ہوچکا ہے، اب اسے زیر کرلینا زیادہ مشکل نہیں رہا۔ امین خاں کا ذہن حسین علی خاں کے خلاف سازش تیار کرنے میں مشغول ہوگیا۔ اس سلسلے میں اس کے ذہن میں کئی نام آئے، اس میں سعادت خاں میر محمد امین (بانی ریاست اودھ) کا نام سرفہرست تھا۔ امین خاں نے اپنی چرب زبانی سے سعادت خاں کو اس کام پر آمادہ کرلیا کہ وہ حسین علی خاں کے قتل کی سازش کرے۔ سعادت خاں کو حسین علی خاں سے ایک موقع پر تکلیف پہنچ چکی تھی، اس لیے وہ فوراً ہی ساتھ دینے پر آمادہ ہوگیا۔ سعادت خاں کی نظر انتخاب ایک مغل سردار میر حیدر کاشغری پر پڑی۔ میر حیدر کاشغری کو

WWW.PAKSOCIETY.COM

حسین علی خاں سے شدید نفرت تھی اور وہ حسین علی خاں کی اس مہم کو ناجائز اور غلط سمجھتا تھا، وہ نظام الملک سے عقیدت رکھتا تھا اور بذات خود طبعاً بہت جذباتی مغل تھا۔ سعادت خاں اسے امین خاں کے پاس لے آیا اور رازداری سے کہا۔ ”اعتماد الدولہ! امیر حیدر کاشغری حاضر ہے، اب اسے آپ خود سمجھا دیں کہ اسے کیا کرنا ہے۔“

امین خاں نے کاشغری مغل سے پوچھا۔ ”میر حیدر! جس مہم پر ہم لوگ جا رہے ہیں، اس میں حق پر کون ہے؟ حسین علی خاں یا نظام الملک؟“

کاشغری نے جواب دیا۔ ”جناب والا! مغلوں کو معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے کہ وہ حسین علی خاں کی حمایت میں اپنے ہی بھائیوں سے جنگ کرنے نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ نظام الملک تورانی ہے، ہماری طرح، ہمیں اس سے نہیں لڑنا چاہیے۔ ہمیں حسین علی خاں کا ساتھ نہیں دینا چاہیے کیونکہ اس نے مغل سلطنت کو اپنی خواہش اور مرضی پر چلانا شروع کر دیا ہے۔“

امین خاں نے کہا۔ ”کاشغری مغل! میں بوڑھا مغل اس لائق نہیں ہوں کہ امیر الامرا سے الجھ سکوں۔ یہ تو تم جوانوں کا کام ہے کہ اپنے مغل بھائیوں کی گردن میں سے ایک غیر مغل کی حکومت کا زنار غلامی اتار پھینکو، میں تمہارا ہم خیال ہو سکتا ہوں، تمہاری تائید کر سکتا ہوں، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتا۔ اس نازک وقت میں کسی مغل جوان کو اپنی غیرت کا امتحان دینا ہے۔“

سعادت خاں نے کاشغری مغل کو چڑھانے کے لیے کہا۔ ”اعتماد الدولہ! جہاں تک میں جانتا ہوں، مغلوں میں ایک بھی میر حیدر کاشغری سے زیادہ غیرت مند بہادر نہیں ملے گا اور خدا نے کاشغری کو ذہانت بھی دی ہے۔ اگر چاہے تو حسین علی خاں کے لیے تنہا کافی ہے۔“

امین خاں نے کہا۔ ”ذہانت، غیرت اور بہادری کاشغری مغل کے چہرے بشرے سے عیاں ہے، میں میر حیدر سے یہ وعدہ کر سکتا ہوں کہ اگر اس نے بادشاہ، نظام الملک ہمیں اور دوسرے مغلوں کو امیر الامرا سے نجات دلا دی تو میں بادشاہ سے سفارش کر کے کوئی اعلیٰ منصب دلوا دوں گا۔“

میر حیدر سوچ میں پڑ گیا، پھر بڑے جوش و خروش سے بولا۔ ”میں تنہا امیر الامرا کا کام تمام کر سکتا ہوں لیکن اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ جب میں امیر الامرا کا کام تمام کر چکوں تو میرے آس پاس مغل فوج موجود رہے جو مجھے فرار ہونے میں مدد دے۔ اگر مجھے یہ ضمانت مل جائے تو میں امیر الامرا تو کیا، عبداللہ خاں تک کا صفایا کر دوں۔“

امین خاں نے جواب دیا۔ ”میں یہ ضمانت دینے کو تیار ہوں۔“

میر حیدر نے جواب دیا۔ ”تب پھر میں تیار ہوں۔“

امین خاں نے اسی وقت میر آتش و توپ خانہ حیدر قلی خاں کو بلوایا اور اس کے سامنے اپنا منصوبہ رکھ دیا، کہا۔ ”حیدر قلی خاں! میں جانتا ہوں کہ حسین علی خاں نے تم پر کئی بڑے بڑے احسان کیے ہیں لیکن اس نے جتنے بڑے احسان کیے ہیں اس سے بڑے شاہی خاندان اور ہم سب پر مظالم ڈھائے ہیں اور ہم ان مظالم کا انتقام لینا چاہتے ہیں۔ حیدر قلی خاں! کل میں تم سے ایک کام لینا چاہتا ہوں۔“

حیدر قلی خاں نے جواب دیا۔ ”آپ مجھ سے کس قسم کا کام لینا چاہتے ہیں اور کل مجھے کیا کرنا پڑے گا؟“

سعادت خاں نے کہا۔ ”حیدر قلی خاں! کل تم اپنے فوجی دستے کے ساتھ میر حیدر کاشغری کے آس پاس موجود رہو گے اور کوشش کرو گے کہ کاشغری مغل کو کوئی گزند نہ پہنچے۔“

حیدر قلی خاں نے پوچھا۔ ”لیکن کل یہ کاشغری ہو گا کہاں، جہاں اس کی حفاظت کی جائے گی؟“

امین خاں نے کان میں کہا۔ ”میر حیدر کاشغری کل کسی وقت بھی حسین علی خاں کو قتل کر دینے کی کوشش کرے گا، وہاں تمہارا کام یہ ہو گا کہ میر حیدر کاشغری کو گزند نہ پہنچنے دو اور یہ کہ تورانیوں پر کسی طرف سے بھی تم حملہ یا چھیڑ چھاڑ نہ ہونے دو۔“

حیدر قلی خاں نے پرجوش لہجے میں کہا۔ ”میں تو ایک عرصے سے اس دن کے انتظار میں تھا، بخدا میں نہ صرف یہ کہ اپنے آدمیوں کے ساتھ وہاں موجود رہوں گا بلکہ اگر ضرورت پیش آئی تو میں حسین علی خاں کا خود ہی کام تمام کر دوں گا، اب امیر الامرا بوجھ بن گیا ہے۔“

امین خاں نے جواب دیا۔ ”اگر تم نے یہ کام انجام دے دیا تو میں بھی تمہیں بادشاہ کی طرف سے نواز دوں گا۔“

میر حیدر کاشغری اپنے گھر گیا، وہاں گم صم انداز میں اکھڑی اکھڑی بے ربط باتیں کرتا رہا اور پھر واپس آ گیا۔ اب اس کا ذہن حسین علی خاں کے خلاف سازش تیار کرنے میں مشغول تھا۔

☆☆☆

عبداللہ خاں دہلی جا چکا تھا، وہاں اس نے بادشاہ کی

نیابت کے فرائض انجام دینے شروع کر دیے۔ مغیث اور مہرن، عبداللہ خاں کے اس غیر معمولی اختیار و اقتدار پر پریشان تھے۔ ان دونوں کا خیال تھا کہ سید زادوں کا اثر و اختیار صبح کے اس چراغ کی طرح باقی ہے جس کا تیل ختم ہو چکا ہو اور بجھنے کے لیے جھلملا رہا ہو۔

بادشاہ اپنی فوج کے ساتھ فتح پور سیکری سے پچاس میل دور خیمہ زن تھا۔ بادشاہ کا خیمہ جہاں نصب کیا گیا تھا، اس سے دو میل دور حسین علی خاں کا خیمہ تھا۔ بادشاہ کے خاص خیمے کے گرد و پیش شاہی خاندان کے افراد خیمہ زن تھے۔ امین خاں اور حیدر قلی خاں کے خیمے ذرا فاصلے پر تھے۔ جب تک یہ خیمے نصب کیے جاتے رہے، بادشاہ امیر الامرا، امین خاں اور بعض دوسرے امرا سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔

میر حیدر کاشغری اپنے خیمے میں بیٹھا اعتماد الدولہ امین خاں کے خلاف، امیر الامرا حسین علی خاں کے نام ایک درخواست لکھ رہا تھا۔ حیدر قلی خان، ایک فوجی دستہ لیے میر حیدر کاشغری کا منتظر تھا۔ شاہی خیمے کے در پر بادشاہ نے رکاب پر زور ڈال کر گھوڑے سے چھلانگ لگا دی، بادشاہ کے احترام میں دوسرے امرا بھی اپنے اپنے گھوڑوں سے نیچے اتر پڑے۔ ان میں حسین علی خاں سب سے آگے تھا۔ اس نے بادشاہ کو شاہی خیمے کے در تک پہنچا کر واپسی اختیار کی اور گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے خیمے کی طرف چل دیا۔

امین خاں نے ہاتھ کے اشارے سے بادشاہ کو خیمے میں داخل ہونے سے روکا اور خود بادشاہ کے قریب پہنچ کر زمیں بوس ہو گیا۔

محمد شاہ نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے امین خاں! تم پریشان کیوں ہو؟“

امین خاں نے ترکی زبان میں جواب دیا۔ ”قبلۂ عالم بہت جلد ایک خوش خبری سننے والے ہیں لیکن اس خوشخبری میں خوف اور دہشت کا عنصر بھی شامل ہو گا اس لیے اس ناچیز کی یہ درخواست ہے کہ جب تک میں نہ کہوں حضور باہر نہ نکلیں، ویسے میں نے آپ کی حفاظت کا بندوبست کر دیا ہے۔“

بادشاہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”امین خاں! یہ تم کس واقعے کی طرف اشارہ کر رہے ہو؟“

امین خاں نے جواب دیا۔ ”یہ میں قبل از وقت ہرگز نہ بتاؤں گا۔“

بادشاہ خیمے کے اندر چلا گیا۔ امین خاں جیسے ہی مڑا اس نے میر حیدر کاشغری کو ایک آدمی کے ساتھ حسین علی خاں کے تعاقب میں جاتے دیکھا، اس کے چلے جانے کے چند منٹ بعد اس نے حیدر قلی خاں کو ایک دستے کے ساتھ کاشغری مغل کے پیچھے جاتے ہوئے دیکھ لیا۔ امین خاں، حیدر قلی خاں کے خیمے میں چلا گیا۔

کاشغری مغل جب امیر الامرا کی پالکی کے قریب جانے کے لیے لپکا تو اسے روک لینے کی کوشش کی گئی۔ کاشغری نے چیخ چیخ کر کہنا شروع کیا۔ ”میں ایک فریادی ہوں اور مجھے یہ خوف لگا رہتا ہے کہ اعتماد الدولہ امین خاں مجھے قتل کرا دے گا، اب امیر الامرا ہی مجھے بچا سکتے ہیں۔“

حسین علی خاں نے کاشغری مغل کو اپنے پاس نہیں آنے دیا۔ چوبداروں نے بھی اس کا راستہ روک لیا۔ میر کاشغری نے دور ہی سے اپنی درخواست دکھائی اور مزید کہا۔ ”اگر امیر الامرا نے بھی میری درخواست کے مطابق انصاف نہ کیا تو میں خودکشی کر لوں گا۔“

امیر الامرا نے چوبداروں کو حکم دیا۔ ”میر حیدر کو میرے قریب لایا جائے۔“

امیر الامرا یہ سفر پالکی میں طے کر رہا تھا، پالکی روک دی گئی اور چوبداروں نے میر حیدر کاشغری کو اشاروں سے، امیر الامرا کے پاس جانے کی اجازت دے دی۔ کاشغری مغل نے درخواست حسین علی خاں کے ہاتھ میں تھما دی۔

حسین علی خاں نے پوچھا۔ ”کیا تو مغل ہے؟“

کاشغری نے جواب دیا۔ ”جی بندہ پرور۔“

حسین علی خاں نے دوسرا سوال کیا۔ ”یہ درخواست کس کے خلاف ہے؟“

کاشغری نے جواب دیا۔ ”اعتماد الدولہ امین خاں کے خلاف۔“

حسین علی خاں نے کہا۔ ”تعجب ہے کہ ایک مغل افسر، دوسرے مغل سردار کے خلاف مجھے درخواست دے رہا ہے۔“

کاشغری نے جواب دیا۔ ”حضور والا! اس میں مغل یا سید کی کیا بات ہے، اپنے اپنوں کے ہاتھوں ہمیشہ ہی ستائے گئے ہیں۔“

حسین علی خاں نے درخواست کو الٹا پلٹا اور دریافت کیا۔ ”اس درخواست میں کیا لکھا ہے؟“

کاشغری نے جواب دیا۔ ”حضور والا خود ہی پڑھ لیں، زبانی کیا عرض کروں؟“

حسین علی خاں درخواست پڑھنے لگا اور ساتھ ہی پالکی اٹھانے والوں کو حکم دیا۔ ”سفر جاری رہے۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

پالکی ہچکولے کھاتی آگے بڑھی اور حسین علی خاں درخواست پڑھنے میں محو ہوگیا۔ میر حیدر کاشغری پالکی کے ساتھ ساتھ پیدل سفر کرنے لگا۔ جب اسے اچھی طرح یہ یقین ہوگیا کہ حسین علی خاں درخواست پڑھنے میں پوری طرح منہمک ہے تو اس نے اپنی کمر سے پیش قبض نکال کر پوری قوت سے پہلو میں اتار دیا۔ خنجر جگر کے پار ہوگیا، حسین علی خاں کی چیخ تک نہ نکلی۔ اس نے گرتے گرتے کاشغری مغل کی چھاتی پر ایک زوردار لات رسید کردی۔ پالکی ایک طرف لڑھک گئی اور حسین علی خاں پالکی سے باہر زمین پر گرگیا۔ پالکی کے ساتھ چلنے والا محافظ نور اللہ خاں، میر حیدر کاشغری پر جھپٹا اور اپنا خنجر اس کے پیٹ میں اتار دیا۔ میر کاشغری کا مغل ساتھی، نور اللہ خاں پر جھپٹا اور اسے ہلاک کردیا۔ اس مغل پر امیر الامرا کا دوسرا محافظ میر مشرف حملہ آور ہوا اور اس کا کام تمام کردیا۔ میر مشرف پر دوسرے مغل حملہ آور ہوگئے اور دیکھتے ہی دیکھتے پالکی کے اردگرد کشت وخون کا بازار گرم ہوگیا۔ حیدر قلی خاں کے مغل شہسوار بھی یہاں پہنچ گئے اور انہوں نے امیر الامرا اور نور اللہ کی لاشوں کو اپنے قبضے میں لے لیا اور انہیں بادشاہ کے خیمے میں پہنچادیا۔

بادشاہ کے خیمے کے خدمت گار حسین علی خاں کے آدمی تھے۔ چنانچہ شاہی خیمے کے خواجہ سرا مقبول نے امیر الامرا کی لاش دیکھتے ہی مغلوں پر حملہ کردیا اور مغلوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ سقے اور خاکروب بھی برہنہ تلواریں لیے ہوئے بادشاہ کو تلاش کرنے لگے۔ انہوں نے شاہی خیمے میں بادشاہ کے تسبیح خانے تک محمد شاہ کو تلاش کیا لیکن یہاں سعادت خاں موجود تھا اور اس نے ان کے ٹکڑے کردیے۔

امیر الامرا کے قتل کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی چلی گئی۔ حسین علی خاں کا چچازاد بھائی غیرت خاں تین چار ہزار آدمیوں کے ساتھ انتقام لینے بادشاہ کے خیمے کی طرف روانہ ہوگیا۔ محمد شاہ اپنی جان کے خوف سے شاہی خواتین کے خیمے میں گھس گیا۔ وہاں اس نے اپنی ماں کو دونوں ہاتھوں سے یوں پکڑلیا گویا وہ بادشاہ کی سپر تھی۔ امین خاں، سعادت خاں اور حیدر قلی خاں حرم سرا کے دروازے پر جا کھڑے ہوئے اور امین خاں نے بادشاہ کو آواز دی۔ ”قبلۂ عالم باہر تشریف لے آئیں تاکہ آپ کے جاں نثاروں میں مقابلے کی ہمت پیدا ہو۔“

لیکن بادشاہ اپنی جگہ سے ذرا بھی نہ ہلا۔ اسے محل سرا کی عورتوں نے اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ سعادت خاں نے تھوڑی دیر بادشاہ کا انتظار کیا جب وہ نہیں نکلا تو اس نے آداب شاہی کو بالائے طاق رکھ دیا اور حرم سرا میں گھس گیا۔ اس نے عورتوں کو ادھر ادھر ہٹا کر بادشاہ کا ہاتھ پکڑ لیا، کہا۔ ”حضور والا! یہ بڑی بہادری کا وقت ہے، میرے ساتھ باہر چلیے، آپ لوگوں کو اپنی صورت دکھا دیجیے، لڑنے کا کام آپ کے جاں نثار انجام دے لیں گے۔“

اس کے بعد سعادت خاں نے شاہی خواتین سے کہا۔ ”آپ لوگ بادشاہ کو چھوڑ دیں، میں انہیں باہر لیے جارہا ہوں۔“

بادشاہ بچوں کی طرح مچلنے لگا۔ وہ حسین علی خاں اور اس کے آدمیوں سے بہت زیادہ خوفزدہ تھا۔ سعادت خاں نے بادشاہ کو گود میں اٹھا کر باہر کا رخ کیا۔ باہر امین خاں بادشاہ کا انتظار کررہا تھا۔ سعادت خاں نے بادشاہ کو امین خاں کے سامنے لے جا کر کھڑا کردیا۔ امین خاں نے حسین علی خاں کا سر کٹوا کر ایک بانس میں لٹکا دیا اور اسے پرچم کی طرح بلند کردیا۔ بادشاہ کو اپنے بیٹے قمر الدین خاں کے ہاتھی پر بٹھایا۔ اور خود بادشاہ کی تشفی اور حفاظت کی خاطر اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ شاہی فوج نے بادشاہ کو دیکھتے ہی خوشی کا نعرہ لگایا۔

اب حیدر قلی خاں اور غیرت خاں کے مقابلے کی باری تھی، دونوں نے اپنی اپنی فوجوں کو آگے بڑھایا اور انسانی جانوں کا حساب کتاب ہونے لگا۔ حیدر قلی خاں کی گولہ باری مشہور تھی، آناً فاناً امیر الامرا کے حمایتیوں کے چھکے چھڑا دیے۔ ایک شخص نے خاص غیرت خاں کے سر کا نشانہ لیا کہ غیرت خاں فوراً ہی زمین پر آگیا۔

ادھر یہ جنگ ہورہی تھی اور دوسری طرف مقتول حسین علی خاں کا خیمہ بری طرح لٹ رہا تھا۔ جو کچھ لٹنے سے بچا، اسے بادشاہ کی طرف سے شاہی خزانے میں داخل کرنے کا حکم دے دیا گیا۔

جنگ ختم ہوئی۔ امین خاں کو حسین علی خاں کے چند آدمیوں کی تلاش تھی، ان میں عبداللہ خاں کا دیوان رتن چند بھی شامل تھا۔ رتن چند نے، جو کچھ گزرا تھا، لکھ کر عبداللہ خاں کو روانہ کردیا اور خود فرار ہونے لگا لیکن مغلوں نے اسے راستے ہی میں پکڑ لیا۔ اسے پالکی سے کھینچ کر پہلے تو خوب مارا پیٹا، اس کے بعد اسے ننگا کردیا اور گھسیٹتے ہوئے امین خاں کے پاس لے گئے، امین خاں نے فوراً ستر پوشی کرائی اور قید خانے میں بھجوادیا۔

بادشاہ نے جنگ کے ختم ہوتے ہی حسین علی خاں کا سر نظام الملک کے پاس روانہ کردیا۔

امین خاں نے حالات کے پرسکون ہوتے ہی حسین علی خاں، نور الدین علی خاں اور غیرت خاں کے جنازوں کو زرباف میں لپیٹ کر نماز جنازہ پڑھوائی اس کے بعد امین خاں ان جنازوں پر خود آیا اور رقت زدہ آواز میں کہا۔ ”دوستو! یہ تین جیالے شیر محو خواب ہیں، انہیں سلامی دو اور عقیدت واحترام کے پھول چڑھاؤ۔“

جنازوں کے مہتمم نے پوچھا۔ ”ان کی تدفین کہاں ہوگی؟“

امین خاں نے جواب دیا۔ ”سادات بارہہ کا جدِ اعلیٰ اجمیر میں آسودۂ خاک ہے، اس لیے ان تینوں کو بھی اجمیر میں ہی دفن کیا جائے۔“

مہتمم نے عذر پیش کیا۔ ”اگر ان تینوں کے جنازے اجمیر لے جائے گئے تو اندیشہ ہے کہ لوگ ان جنازوں کی راستے ہی میں بے حرمتی نہ شروع کردیں۔“

لیکن امین خاں اپنے فیصلے پر قائم رہا، اس نے ان تینوں کی لاشیں اجمیر روانہ کرادیں لیکن جنازے لے جانے والوں نے ان لاشوں کو راستے ہی میں پھینک کر راہ فرار اختیار کی، کئی دن تک یہ لاشیں پڑی سڑتی رہیں، آخر وہاں کے فوجدار نے ان تینوں کو اجمیر پہنچا کر دفن کرادیا۔

☆☆☆

عبداللہ خاں اپنے بھائی حسین علی خاں کی موت کی خبر سے اتنا پریشان ہوگیا کہ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آنے لگا۔ وہ ابھی دہلی میں داخل نہیں ہوا تھا، اس نے اپنے ایک دوسرے بھائی، دہلی کے صوبے دار نجم الدین علی خاں کو خط لکھا کہ ”میں محمد شاہ کو معزول کرتا ہوں، تم کسی قیدی شہزادے کو بادشاہی کے لیے آمادہ کرلو۔ میں وہاں آتے ہی اس کی فرمانروائی کا اعلان کردوں گا۔“

لیکن کوئی بھی قیدی شہزادہ یہ کانٹوں کا تاج پہننے پر آمادہ نہ ہوا۔ بہ مشکل تمام بہادر شاہ اول کے پوتے اور رفیع القدر کے بیٹے ابراہیم کو اس پر آمادہ کرلیا گیا۔ دو دن بعد عبداللہ خاں بھی دہلی میں داخل ہوگیا اور شہزادے ابراہیم کو ابوالفتح ظہیر الدین محمد ابراہیم کا لقب دے کر تخت نشین کردیا۔ عبداللہ خاں اس کے سامنے کورنش بجالایا۔ اس موقع پر ان امرا کو اعزازات اور مراتب عطا کیے گئے جنہیں محمد شاہ نے نظر انداز کررکھا تھا۔ نظام الملک کے چچا حامد خاں کو بھی نئی جاگیریں عطا کی گئیں، کیونکہ عبداللہ خاں کا خیال تھا کہ اس طرح وہ چچا بھتیجے میں چپقلش اور رنجش پیدا کرسکے گا۔

عبداللہ خاں اپنا سب کچھ امرا کو ورغلانے اور نئی فوج کی بھرتی میں صرف کیے دے رہا تھا۔ پہلے اس کا یہ خیال تھا کہ بادشاہ شاہجہان آباد کی طرف آرہا ہے اس لیے اس نے شاہجہان آباد کی طرف، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار کے پاس قیام کیا، لیکن پھر اطلاع ملی کہ بادشاہ اکبرآباد کی سمت سے آرہا ہے، اس لیے وہ آگرے کی طرف بڑھا اور فرید پور میں خیمہ زن ہوگیا۔

اب تو حالات ہی بدل چکے تھے اور ناامیدی نے دل ودماغ میں اندھیرا پھیلا رکھا تھا، نوجوان طبیب مغیث نے ایسا محسوس کیا جیسے عبداللہ خاں اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا ہے، وہ باتوں کے دوران کہنا کچھ چاہتا تھا اور نکل کچھ جاتا تھا۔ مغیث کو یقین تھا کہ اگر اقتدار محمد شاہ کے پاس ہی رہا تو اس کا مستقبل محفوظ رہے گا لیکن اگر عبداللہ خاں کامیاب ہوا تو جوشِ انتقام میں معلوم نہیں، کس کس کا حشر خراب کردے اور ان خراب حشر والوں میں مغیث بھی ہوسکتا تھا، اس لیے اس نے اسی میں بہتری محسوس کی کہ دونوں فریقوں کے تصادم کا نتیجہ نکلنے سے پہلے ہی وہ عبداللہ خاں سے دوری اختیار کرلے۔ لیکن وہ مہرن کے بغیر دور بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے کوشش کی کہ عبداللہ خاں کو اپنی چرب زبانی سے قائل کرلے اور مہرن کو اپنے ساتھ لے کر فرار ہوجائے۔ یہ سوچ کر وہ عبداللہ خاں کے پاس پہنچ گیا۔ عبداللہ خاں کمر کے پیچھے دونوں ہاتھ رکھے فکرمند ٹہل رہا تھا، حسین علی خاں کے قتل نے عبداللہ خاں کے دل سے ہر شخص کا اعتماد اٹھا دیا تھا اور محافظوں کو حکم دے دیا تھا کہ کسی بھی شخص کو تلاشی لیے بغیر اس کے پاس نہ بھیجا جائے۔ چنانچہ جب مغیث نے ملنا چاہا تو محافظوں نے عبداللہ خاں کو اس کی آمد کی خبر اندر پہنچائی اور عبداللہ خاں نے حکم دیا۔ ”اسے نہتا کرکے ہمارے پاس بھیج دیا جائے۔“

محافظوں نے مغیث کی تلاشی لی تو اس کے پاس سے ہتھیار یا اسلحہ نام کی کوئی چیز برآمد نہ ہوئی۔ وہ اندر پہنچا دیا گیا۔

عبداللہ خاں نے مڑ کر مغیث کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”کہو، کیسے آنا ہوا؟“

مغیث نے رک رک کر عرض کیا۔ ”جناب والا کو یہ تو معلوم ہی ہے کہ میں مظلوم اور مرحوم امیر الامرا کا ملازم تھا۔“

عبداللہ خاں نے جواب دیا۔ ”نہیں، تم میرے بھی ملازم تھے اور اب بھی ہو، تم مایوس کیوں ہو؟ کیا تم یہ تو نہیں سوچ رہے ہو کہ اب سادات بارہہ کے اقبال کا سورج

WWW.PAKSOCIETY.COM

ڈوب رہا ہے اس لیے ان کا ساتھ چھوڑ کر چڑھتے سورج کی پرستش شروع کردی جائے۔''

مغیث نے کہا۔ ''میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں، میں تو امیر الامرا کی موثر تعزیت کرنا چاہتا ہوں لیکن جذبات اور الفاظ میرا ساتھ نہیں دے پا رہے تھے اور دل اسے نہیں مانتا کہ امیر الامرا جیسے عقلمند اور بہادر انسان کو بھی کوئی دھوکے سے شہید کرسکتا ہے۔''

عبداللہ خاں نے جواب دیا۔ ''لیکن نوجوان طبیب! میرا بھائی حسین علی خاں قتل کیا جاچکا۔ تم اس حقیقت کو تسلیم کرلو، کیونکہ یہ افواہ نہیں بلکہ ایک جاں گداز واقعہ ہے۔''

مغیث نے سر جھکالیا اور ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ ''میں نے بھی اس تلخ حقیقت کا گھونٹ حلق کے نیچے اتار لیا ہے، اب میں اس لیے پریشان ہوں کہ اس نازک وقت میں، میں آپ کے کس طرح کام آسکتا ہوں۔''

عبداللہ خاں نے جواب دیا۔ ''تو میرے کیا کام آئے گا، تجھے جو درباری خدمت سونپی گئی تھی، وہی انجام دینے سے قاصر رہا۔''

مغیث نے کہا۔ ''جناب والا! امین خاں غیر معمولی چالاک مغل ہے، اس نے مجھے ناکام کردیا۔''

عبداللہ خاں نے کہا۔ ''یہ بھی تو صحیح کہہ رہا ہے۔'' یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ ''حسین علی خاں نے کئی بار ضد کی کہ امین خاں کو قتل کردیا جائے، لیکن میں ہمیشہ اپنے مقتول اور مظلوم بھائی کو اس سے روکتا رہا لیکن اب میں یہ سوچتا ہوں کہ شاید حسین علی خاں نے کشف سے یہ معلوم کرلیا تھا کہ امین خاں اس کا قاتل ہے، افسوس کہ اگر میں حسین علی خاں کو نہ روکتا تو شاید مجھے یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔''

مغیث نے آہستہ سے کہا۔ ''لیکن قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔''

عبداللہ خاں نے ایک سرد آہ کھینچی، پوچھا۔ ''ہاں تو، یہ بتا کہ میرے پاس کیوں آنا ہوا؟''

مغیث نے جواب دیا۔ ''میں آپ کے پاس آنا چاہتا ہوں، حکم دیجیے کہ میں آپ پر اپنی جان نچھاور کردوں۔''

عبداللہ خاں نے بڑے غور سے مغیث کی طرف دیکھا، پوچھا۔ ''مغیث کیا یہ تیرے حقیقی جذبات ہیں؟''

مغیث نے جواب دیا۔ ''اگر یہ میرے حقیقی جذبات نہ ہوتے تو میں اس وقت آپ کی خدمت میں حاضری نہ دیتا اور بہ دستور کسی گوشے میں منہ چھپائے بیٹھا رہتا۔''

عبداللہ خاں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوکر غائب ہوگئی، بولا۔ ''دوست دشمن کی انہی حالات میں، یوں ہی پہچان ہوتی ہے، میں تیری طرف سے کسی حد تک بدگمانی کا شکار تھا لیکن اس وقت کی باتوں نے اسے کسی حد تک کم کردیا ہے۔''

مغیث نے کہا۔ ''لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ اس بدگمانی کو اپنے دل سے بالکل دور کردیں۔''

عبداللہ خاں نے جواب دیا۔ ''بالکل تو اس وقت دور ہوگی جب تو میرا ایک اہم کام کردے گا۔''

مغیث نے کہا۔ ''میں حاضر ہوں، حکم دیجیے۔''

عبداللہ خاں نے جواب دیا۔ ''میرا حکم یہ ہے کہ تو اپنے وطن واپس چلا جا، حالات معلوم نہیں کیا رخ اختیار کریں، اگر میں کامیاب رہا تو مجھے تیرے جیسے سست اور درباری معیار کے کم چالاک آدمی کی دوبارہ ضرورت نہیں پیش آئے گی اور اگر ناکام رہا تو میرے اپنے اندازے کے مطابق امین خاں وغیرہ تجھے معاف نہیں کریں گے۔''

مغیث اس حکم سے خاصا پریشان ہوا، گھبرا کر بولا۔ ''یعنی میں اسی وقت یوں ہی، انہی حالات میں چلا جاؤں؟''

عبداللہ خاں نے جواب دیا۔ ''میں تیرے لیے زادِ راہ کا انتظام کیے دیتا ہوں، لیکن تجھے اس وقت چلے جانا چاہیے کیونکہ اب وقت نہیں ہے۔''

مغیث عجیب الجھن میں پھنس گیا تھا، اپنے دل کی بات تو کہہ بھی نہ سکا تھا کہ یہ غیر متوقع حکم مل گیا۔

عبداللہ خاں نے تالی بجائی، ایک خدمت گار حاضر ہوگیا، عبداللہ خاں نے حکم دیا۔ ''مہتمم خزانہ سے کہو، دس ہزار اشرفیاں لے آئے، ابھی، اسی وقت، میں اس کا انتظار کررہا ہوں۔''

تقریباً نصف ساعت بعد دس ہزار اشرفیوں کی تھیلیاں آگئیں۔ عبداللہ خاں نے کہا۔ ''تو انہیں لے کر، نہایت ہوشیاری سے اپنے وطن چلا جا اور آیندہ قسمت آزمائی کے لیے ہندوستان کے بجائے کسی اور ملک کا رخ کرنا، کیونکہ یہاں مغلوں کی حکومت کا سورج بس غروب ہی ہونے والا ہے، اب معلوم نہیں کب تک اس ملک میں انتشار، بدامنی اور طوائف الملوکی کی حکومت رہے۔''

مغیث اپنا مطلب کہتے شرما رہا تھا، وہ کچھ دیر بیٹھے کا بیٹھا ہی رہ گیا۔ عبداللہ خاں نے کہا۔ ''اب تو اپنا وقت نہ ضائع کر اور فوراً چلا جا۔''

مغیث نے ہچکچاتے ہوئے عرض کیا۔ ''لیکن میں جانے سے پہلے ایک اور درخواست پیش کرنا چاہتا ہوں۔''

عبداللہ خاں نے چڑچڑے لہجے میں کہا۔ ''نہیں، اب کچھ نہیں، میں اب کوئی درخواست سننے کو تیار نہیں، خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دے۔'' یہ کہتے ہوئے عبداللہ خاں خیمے کے دوسرے حصے میں چلا گیا۔ مغیث کھڑا سوچتا رہا کہ بات بگڑ چکی ہے، اب شاید وہ کبھی بھی مہرن کو حاصل نہ کرسکے گا۔ نہ صرف یہ کہ حاصل نہ کرسکے گا، آخری ملاقات بھی نہ کرسکے گا۔

اچانک خیمے کا اندرونی پردہ اٹھا اور ایک خواجہ سرا اس کے خیمے میں داخل ہوا، بولا۔ جناب! قطب الملک فرما رہے ہیں کہ چند لمحے ان کا انتظار کیا جائے۔''

اور واقعی چند لمحوں بعد ہی عبداللہ خاں دوبارہ آگیا، لیکن اب وہ تنہا نہیں تھا، مہرن کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا، آتے ہی مہرن کو مغیث کی طرف دھکا دیا، بولا۔ ''میں جانتا ہوں، تو کیا درخواست کرے گا۔ اسے لے اور فوراً یہاں سے چلا جا۔''

مہرن اپنے سامنے مغیث کو دیکھ کر حیران بھی ہوئی اور خوش بھی، عبداللہ خاں نے کہا۔ ''مغیث! میں بہت عیش کرچکا، اب اس سے طبیعت سیر ہوچکی ہے، میں نے تجھے بھی خاصا برت لیا، اور اب تجھ سے بھی دل بھر چکا۔ چلو یہ بہت اچھا ہوا کہ تم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے ہو، میرا خیال ہے اب مہرن زیادہ خوش رہے گی۔'' اس کے بعد مہرن کو مخاطب کیا۔ ''مہرن! مجھے تو تیری تلخ مزاجی کا بڑا تجربہ ہے اور تیری بڑی باتیں برداشت کی ہیں لیکن اس طبیب کے ساتھ ایسا نہ کرنا کیونکہ یہ میرے جتنا بہادر نہیں ہے۔'' پھر مغیث سے کہا۔ ''اور تو، میرے سادہ لوح طبیب! خود میں قوت برداشت پیدا کر، سب کے لیے نہیں، صرف اپنی مہرن کے لیے، کیونکہ جو جس کی عادت ہوتی ہے وہ جاتی نہیں ہے۔ یہ ممکن ہے تیری محبت مہرن کے مزاج کی گرمی کسی حد تک کم کردے لیکن یہ ناممکن ہے کہ مہرن بالکل بدل جائے۔'' یہ کہتے کہتے عبداللہ خاں چپ ہوگیا۔ لیکن ایک بار پھر اس کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگی، مغیث سے کہنے لگا۔ ''اور ہاں تجھ سے ایک اور بات کہنا ہے، تو میری طرح مہرن کی تلخ نوائی اور گرم مزاجی کے لیے کوئی معالج نہیں مقرر کرے گا، اگر ایسی غلطی کرے گا اور مہرن اس پر ملتفت ہوگئی تو اس کی ساری ذمے داری تجھ پر عائد ہوگی اور میری طرح تجھے بھی اپنی حماقت کی سزا بھگتنی پڑے گی۔''

مہرن شرم سے پانی پانی ہوئی جارہی تھی، عبداللہ خاں اچانک سنجیدہ ہوگیا، کسی کو مخاطب کیے بغیر بولا۔ ''یہ ساری باتیں تو غم غلط کرنے کے لیے تھیں ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ میں نے مہرن کو تیرے حوالے اپنے مظلوم، مرحوم اور شہید بھائی کی وصیت اور خواہش پر کیا ہے، حسین علی خاں نے اپنی زندگی ہی میں مجھ سے یہ کہا تھا کہ میں مہرن کو تیرے حوالے کردوں۔ میں اسے دے کر اپنے پاس سے تجھے کیا دے رہا ہوں، جس طرح اسے پایا تھا، اسی طرح فراخدلی سے تجھے دیے دے رہا ہوں۔ جا، اسے اپنے وطن لے جا اور عیش کر۔''

عبداللہ خاں کی باتوں سے مغیث کو تکلیف پہنچ رہی تھی اور وہ شرم سے دوسری طرف منہ پھیر کر کھڑا ہوگیا۔

کچھ دیر بعد مغیث اشرفیوں کی تھیلیاں اور مہرن کو ساتھ لے کر باہر نکلا، پڑاؤ پر ایک قافلہ پشاور جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ یہ قافلہ اپنے سفر پر روانہ ہوگیا۔

عبداللہ خاں اور محمد شاہ اپنے اپنے لشکر کے ساتھ شاہ

SOLE DISTRIBUTOR
of U.A.E
WELCOME BOOK SHOP
JASOOSI SUSPENSE PAKEEZA SARGUZASHT
P.O.Box 27869 Karama, Dubai Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961015 Mobile: 050-6245817
E-mail: welbooks@emirates.net.ae
Best Export From, Pakistan
WELCOME BOOK PORT
Publisher, Exporter, Distributor
All kinds of Magazines, General Books and Educational Books
Main Urdu Bazar, Karachi Pakistan
Tel: (92-21) 32633151, 32639581 Fax: (92-21) 32638086
Email: welbooks@hotmail.com
Website: www.welbooks.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

پور میں آمنے سامنے ڈٹے ہوئے تھے۔ عبداللہ خاں کے پاس بھی ایک بادشاہ تھا۔ عبداللہ خاں کا خیمہ محمد شاہ سے تقریباً تین کوس دور تھا۔ ادھر مشرق سے سورج نے اپنا چہرہ نکالا، ادھر ڈھول پر ضرب پڑی اور تین بار اعلان ہوا، الجرۃ خیر من الجبین (بہادر بزدل سے بہتر ہے) تیر اندازی سے جنگ کا آغاز ہوا۔ نقارہ وکوس کی مہیب آوازوں نے دہشت پھیلادی اور دھویں نے دھوپ کا مزہ کرکرا کردیا۔ بادشاہ کی طرف سے حیدر قلی خاں نے اس منظم طریقے سے گولہ باری کی کہ عبداللہ خاں کے لشکر کے ہوش وحواس اڑا کر رکھ دیے۔ عبداللہ خاں نے توپ خانے کی طرف توجہ ہی نہ تھی۔ بادشاہ کا توپ خانہ بہت مضبوط تھا۔ اس کی لگاتار گولہ باری نے عبداللہ خاں کو بہت زیادہ جانی نقصان پہنچایا۔ لاشوں کا ڈھیر لگ گیا تھا۔ دن بھر کی مارکاٹ کے بعد شام کو عبداللہ خاں نے اپنے نقصان کا اندازہ لگایا تو اس کے رہے سہے حواس بھی رخصت ہوگئے اور وہ سسکیاں بھر بھر کر رونے لگا۔ اب دنیا اندھیر ہوچکی تھی۔

بہ ظاہر جنگ بندی ہوچکی تھی لیکن حیدر قلی خاں نے بادشاہ سے اجازت طلب کی، بولا۔ ”قبلۂ عالم! میں جنگ جاری رکھنا چاہتا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں غدار عبداللہ خاں کے لشکر میں خوف وہراس پھیلا ہوا ہے۔ میں اس خوف وہراس کی فضا کو برقرار رکھنا چاہتا ہوں کیونکہ اس فضا میں عبداللہ خاں کی ہزیمت چھپی ہوئی ہے۔“

بادشاہ نے پوچھا۔ ”کیا تم رات بھر گولہ باری کرنا چاہتے ہو؟“

حیدر قلی خاں نے جواب دیا۔ ”جی بندہ پرور۔“

امین خاں پاس ہی موجود تھا، بولا۔ ”جہاں پناہ کی طرف سے میں تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ تم اپنی گولہ باری جاری رکھو اور عبداللہ خاں کو جس طرح چاہو شکست دے دو۔“

حیدر قلی خاں نے فوراً گولہ باری شروع کردی۔ اس غیر متوقع گولہ باری نے عبداللہ خاں کے لشکر میں کھلبلی مچادی اور بڑے بڑے جیالے اور سورما عبداللہ خاں کا ساتھ چھوڑ کر راہ فرار اختیار کرنے لگے۔ یہ گولہ باری رات بھر جاری رہی۔ صبح دونوں لشکر پھر آمنے سامنے آکھڑے ہوئے۔ بادشاہ اپنے شاہ پسند نامی ہاتھی پر سوار ہوکر اپنے سپاہیوں کی ہمت افزائی کرتا رہا۔ سعادت خاں بار بار اپنے گھوڑے کو بھگا کر ان حصوں میں پہنچ جاتا جہاں سپاہی نسبتاً کمزور پڑ رہے تھے۔ عبداللہ خاں نے جب یہ دیکھا کہ شاہی فوج حاوی آتی چلی جارہی ہے تو وہ اپنے ہاتھی سے پھاند پڑا اور یہ سوچ کر آگے بڑھا کہ وہ یا تو میدانِ جنگ میں قتل ہوجائے گا یا پھر فاتح بن کر لوٹے گا لیکن جب قسمت برگشتہ ہوتی ہے تو تدبیر الٹی ہوجاتی ہے اور نسیم سحری باد سموم میں بدل جاتی ہے۔ عبداللہ خاں کے ہاتھی کی پشت کو خالی دیکھ کر اس کی فوج کو یقین ہوگیا کہ عبداللہ خاں قتل ہوچکا ہے۔ اس باطل یقین نے ان کے قدم اکھاڑ دیے اور وہ تیزی سے راہ فرار اختیار کرنے لگے۔ اس جنگ کی اور خاص کر عبداللہ کی بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ سادات بارہہ کے وہ خونی رشتے دار جو ہمیشہ عبداللہ خاں کے زیر بار احسان رہے تھے لوگ عبداللہ خاں کے ہاتھی کے آس پاس پروانہ وار نثار ہونے کے لیے جمع ہوئے تھے لیکن عبداللہ خاں جیسے ہی ہاتھی سے نیچے آیا وہ اسے تنہا چھوڑ کر فرار ہوگئے لیکن عبداللہ خاں اس کے باوجود ڈٹا رہا اور شاہی فوج پر حملہ آور ہونے کے لیے آگے بڑھا لیکن اب وہ شاہی فوج کے نرغے میں آچکا تھا اچانک کسی طرف سے ایک تیر آیا اور پیشانی کی ہڈی میں پیوست ہوگیا۔ آنکھوں تلے اندھیرا پھیل گیا اور اس کے ساتھ ہی اس کی گردن اور ہاتھ پر بھی وار ہوئے جس سے وہ غیر معمولی زخمی ہوگیا۔ عبداللہ خاں کا ایک اور بھائی نجم الدین علی خاں بھائی کی مدد کو آگے بڑھا لیکن اب وقت گزر چکا تھا۔ عبداللہ خاں کے ساتھ ہی وہ بھی قید کرلیا گیا۔ قید کرنے والے دستے نے ان دونوں کو فوراً ہی قتل کردینا چاہا لیکن اس وقت حیدر قلی خاں وہاں پہنچ گیا۔ اس نے ان دونوں کو ایک ہی ہاتھی پر بٹھا کر محمد شاہ کے پاس پہنچا دیا۔ بادشاہ نے عبداللہ خاں کو ہمدردانہ نظروں سے دیکھا اور پوچھا۔ ”عبداللہ خان! تم نے جو کچھ کیا اگر یہ نہ کرتے اور میری اطاعت اختیار کرتے تو شاید تمہیں یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔“

عبداللہ خاں نے جواب دیا۔ ”قبلۂ عالم! میں نے وہی کیا جو میرے دل میں تھا۔ میرا چھوٹا بھائی حسین علی خاں شہید ہوا۔ اس کی جدائی کے غم میں، میں اپنے دشمنوں سے انتقام ہی لے سکتا تھا۔“ اس کے بعد اس نے امین خاں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اور میرے سارے دشمن حضور کے آس پاس موجود تھے۔ میری جنگ ان سے تھی آپ سے نہیں لیکن اب میں شاہی مجرم ہوں۔“

امین خاں نے عبداللہ خاں کو تسلی دی۔ ”عبداللہ خاں! میں تمہارا شکر گزار ہوں لیکن شاید تم اس حقیقت سے بھی انکار نہ کرو کہ اگر تم مجھے قتل ہوجانے دیتے تب بھی تمہیں کچھ ایسا ہی دن دیکھنا نصیب ہوتا اور کوئی دوسرا امین خاں میرے کردار کی نمائندگی کرتا۔“

عبداللہ خاں نے امین خاں کو کوئی جواب نہیں دیا، بادشاہ سے کہا۔ ”حضور میرے بارے میں جلد از جلد فیصلہ فرمادیں تو شکر گزار رہوں گا۔ اب بھی بادشاہ کے کام آسکتا ہوں۔ حضور مجھے اپنے لیے نہیں تو اپنے دشمنوں کے لیے زندہ رکھیں۔“

بادشاہ نے امین خاں سے ترکی میں پوچھا۔ ”امین خاں! تمہارے خیال میں یہ کس سزا کا مستحق ہے؟“

امین خاں نے جواب دیا۔ ”جہاں پناہ! عبداللہ خاں نے مجھ پر یہ احسان کیا ہے کہ حسین علی خاں کے ہاتھوں قتل نہیں ہونے دیا اس لیے میں بھی اسے قتل نہیں ہونے دوں گا۔ اگر حضور اس کو زندہ رکھیں گے تو میں شکر گزار رہوں گا۔“

بادشاہ اور امین خاں کی ترکی زبان میں گفتگو نے عبداللہ خاں کو وحشت زدہ سا کردیا، اس نے کہا۔ ”افسوس کہ میرے ہمدرد ترکی نہیں جانتے تھے ورنہ شاید مجھے یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔“

امین خاں نے جواب دیا۔ ”عبداللہ خاں! تیرا یہ خیال غلط ہے۔ نوجوان طبیب مغیث تو ترکی جانتا تھا۔ اس نے تیرا ساتھ کیوں نہیں دیا؟ بات دراصل اتنی سی تھی کہ تم لوگوں نے اپنی حدود سے تجاوز کیا تھا اور اسے بڑی نفرت کی نگاہ سے دیکھا جارہا تھا چنانچہ جس طبیب کو تو نے اپنا آدمی سمجھا تھا، وہ جہاں پناہ کا آدمی بن گیا تھا اور تم دونوں کی خبریں بادشاہ تک پہنچاتا رہتا تھا۔“

اس انکشاف نے عبداللہ خاں کو بہت زیادہ نڈھال کردیا۔ اس نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”حالانکہ میں نے اسے فائدہ ہی پہنچایا اور دس ہزار اشرفیاں اور اپنی پسندیدہ کنیز تک اسے دے دی۔“

امین خاں نے کہا۔ ”ایک مغیث پر ہی کیا موقوف، تو نے جس شخص کو نئے بادشاہ ابراہیم کا بخشی اوّل بنایا تھا اور جو اس جنگ میں تیرے پہلو میں کھڑا ہمارا مقابلہ کررہا تھا۔ مجھے ابھی ابھی یہ اطلاع ملی ہے کہ اس غازی الدین خاں بخشی اوّل نے تیرے خیمے کا سارا قیمتی مال اپنے قبضے میں کیا اور راہ فرار اختیار کی۔“

بادشاہ نے حیدر قلی خاں کو حکم دیا۔ ”میرے دوسرے حکم تک تو عبداللہ خاں کو اپنی قید میں رکھ اور ہاں اس کے ساتھ ہی اس کے بھائی نجم الدین علی خاں کو بھی۔“

حیدر قلی خاں نے ان دونوں کو پابند سلاسل کیا اور اسی وقت محمد شاہ کے حکم سے فتح ونصرت کے شادیانے بجنے لگے۔ عبداللہ خاں کی بساط شطرنج کا بادشاہ ابراہیم فرار ہوتا ہوا گرفتار ہوا اور قید میں ڈال دیا گیا۔

جمعہ کے دن 14 محرم کو عبداللہ خاں کی شکست کی خبر دارالخلافہ میں پہنچی۔ یہ شام کا وقت تھا۔ بادشاہ کے خیر خواہوں نے خوشیاں منائیں اور خوشی کے شادیانے بجنے لگے لیکن سادات میں یوم ماتم منایا گیا لیکن اس ماتم کدے میں عبداللہ خاں کی کنیزیں اور دوسرے ملازمین قیمتی اشیا چرانے اور نقاب اوڑھ اوڑھ کر بھاگنے میں مشغول تھے۔ حرم سرا کا نگہبان جس پر عبداللہ خاں نے ہمیشہ بے حد اعتبار کیا تھا، اس نے عبداللہ خاں کی بیگمات اور مستورات کی عزت وتوقیر کا خیال کیے بغیر حرم سرا کا رخ کیا اور اندر گھس کر لوٹ مار شروع کردی جو اس کے ہاتھ لگا لے بھاگا۔

بادشاہ نے امین خاں کو وزارت عطا کی اور حیدر قلی خاں کو ہفت ہزاری اور ہشت ہزار سوار کا مرتبہ ملا۔ سعادت خاں کو بہادر جنگ کا خطاب اور خواصیوں کی داروغگی ملی۔ ابھی عبداللہ خاں کو کوئی سزا نہیں دی گئی تھی کیونکہ امین خاں اسے قتل نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔

مغیث اور مہرن کا قافلہ ابھی پہلی منزل پر ہی پہنچا تھا اور پڑاؤ کیے پڑا تھا کہ عبداللہ خاں کے بھگوڑے سپاہی بھی اس میں شامل ہوگئے اور انہی سے اہل قافلہ کو عبداللہ خاں کی شکست اور قید ہونے کا حال معلوم ہوا۔ مہرن نے مغیث سے کہا۔ ”میرا خیال ہے اب اگر ہم دونوں دہلی واپس چلیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ وہیں شادی کرکے خوشگوار زندگی کا آغاز کریں۔“

مغیث نے جواب دیا۔ ”نہیں مہرن، میں دہلی نہیں جاؤں گا۔ نیشاپور میں میری ماں اور بوڑھا باپ دونوں میرا انتظار کررہے ہوں گے۔ دوسرے یہ کہ دہلی میں انقلابات آئے دن برپا ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں نہ تو کسی کی عزت محفوظ ہے نہ زندگی۔“

مہرن نے کہا۔ ”بہر حال تم ہندوستان میں رہو یا نیشا پور لے چلو۔ تم پاس ہوگے تو میرے لیے ہر جگہ جنت ہوگی۔“

مغیث نے مہرن کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا اور نہ ہی چہرے سے کوئی خوشی ظاہر ہوئی بلکہ کچھ اداس ہوگیا۔ مہرن نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے مغیث۔ تم میں وہ پہلی جیسی گرم جوشی نہیں رہی۔ تم کچھ اداس اداس سے رہنے لگے ہو۔ بات کیا ہے تم خاموش خاموش سے کیوں ہو؟“

مغیث نے پھیکی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ ”مہرن! کچھ ایسی باتیں ہیں جن کا دوران مسافت ذکر کرنا مناسب

WWW.PAKSOCIETY.COM

نہیں۔ بس یہ سمجھ لو کہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔"

مہرن کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور شبہات اور اندیشے دل میں گھر کرنے لگے، بولی۔ "مغیث میں نے بڑے دکھ جھیلے ہیں۔ میں نے تم پر آنکھ بند کر کے اعتماد کیا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ تم نیشا پور پہنچ کر مجھے دھوکا دے دو۔"

مغیث نے زبردستی ہنسنے کی کوشش کی، بولا۔ "مہرن! تم مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہو۔ میں تمہیں دہلی سے نیشا پور لیے جا رہا ہوں پھر تمہیں دھوکا کیوں دوں گا؟"

مہرن نے شک و شبہے سے کہا۔ "مغیث! معلوم نہیں کیوں میرا دل بے یقینی کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔"

مغیث نے کوئی جواب نہیں دیا اور ان دونوں کا بقیہ سفر بھی اسی طرح بے یقینی میں جاری رہا۔ مغیث نے اسے ہنسانے اور بہلانے کی کوشش کی لیکن مہرن بجھتی چلی گئی۔ جب یہ دونوں ایران کے اس پہاڑی سلسلے کو عبور کر رہے تھے جو کوہستان زاگروس کا ایک قابل عبور حصہ ہے تو مہرن کا دل گھبرانے لگا، بولی۔ "مغیث! اب کتنا اور سفر باقی ہے؟"

مغیث نے جواب دیا۔ "بس چند دن اور اس کے بعد ہم لوگ نیشا پور میں داخل ہو جائیں گے۔"

مہرن نے سختی سے کہا۔ "لیکن مغیث اگر تم نے وہاں مجھے دھوکا دیا تو اس کے دو نتیجے نکلیں گے۔ ایک تمہاری موت دوسری میری خودکشی۔"

مغیث نے پھیکے لہجے میں جواب دیا۔ "مہرن! یہ میں تمہیں ایک بار پھر یقین دلا رہا ہوں کہ میں دھوکا نہیں دوں گا لیکن ایک بات ایسی ہے کہ میں کئی دن سے اسے کہنے نہ کہنے کے شش و پنج میں مبتلا ہوں اور کہہ نہیں پا رہا ہوں۔"

مہرن کے کان کھڑے ہوئے، بولی۔ "مغیث! تمہیں رسولؐ پاک کا واسطہ، مجھ سے کچھ چھپاؤ نہیں سب کچھ بتا دو۔"

مغیث نے جواب دیا۔ "مہرن! وہ بات یہ ہے کہ میں تم سے شادی نہیں کروں گا۔ ہاں یہ میرا وعدہ ہے کہ تمہاری شادی کسی بہت ہی اچھے شخص سے کروا دوں گا اور میں خود اس وقت تک شادی نہیں کروں گا جب تک تمہاری شادی نہ ہو جائے۔"

مہرن پر غم کا پہاڑ گر پڑا۔ نیم بے ہوش سی ہو گئی۔ بہت ہی بے بسی سے بولی۔ "لیکن تم نے یہ فیصلہ اب دورانِ سفر کیوں کیا؟ وہیں دہلی میں بتا دیتے اور مجھ سے شادی کیوں نہیں کرو گے؟"

مغیث نے بھی بڑے افسوس سے جواب دیا۔ "افسوس مہرن میں یہ بات دورانِ سفر نہیں کہنا چاہتا تھا مگر تم نے مجبور کیا تو کہہ دیا اور رہی یہ بات کہ میں نے یہ بات وہاں ہی میں کیوں نہ بتا دی تھی تو اگر میں یہ بات دہلی میں کہہ دیتا تو تم میرے ساتھ نیشا پور ہرگز نہ آتیں اور میں تمہارے بغیر نیشا پور ہرگز نہ جاتا۔"

مہرن نے جوش و جذبات میں مغیث پر حملہ کر دیا اور اس کی پٹائی کر دی۔ بال نوچ ڈالے، بولی۔ "ذلیل طبیب! تو نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ میں تجھے قتل کر دوں گی۔"

مغیث نے بچاؤ کی ذرا بھی کوشش نہ کی، پٹتا رہا اور سر کے بال نچوا تا رہا، بولا۔ "میں نے تمہیں دھوکا نہیں دیا مہرن۔"

مہرن دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی، بولی۔ "کیا تم شادی سے اس لیے انکار کر رہے ہو کہ میں بادشاہ فرخ سیر کی کنیز رہ چکی ہوں اور پھر کچھ عرصہ تک عبداللہ خاں مستفیض رہا اور تم مجھے چچوڑی ہڈی سمجھ کر ٹھکرا رہے ہو۔"

مغیث نے جواب دیا۔ "یہ بات نہیں ہے مہرن، اگر میرا بس چلتا تو میں تم سے شادی کر لیتا لیکن افسوس کہ میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔ کیوں نہیں کر سکتا یہ بات میں نیشا پور پہنچ کر بتاؤں گا۔" پھر ماضی کو یاد دلاتے ہوئے بولا۔ "تم کو میری ملاقات کا قصہ اگر اچھی طرح یاد ہے تو یہ بات بھی اچھی طرح یاد ہونی چاہیے کہ میں نے تم سے ایک بار بھی شادی کا وعدہ نہیں کیا۔"

مہرن فرخ سیر اور عبداللہ خاں کو برا بھلا کہنے لگی۔ "خدا جہنم رسید کرے فرخ سیر اور عبداللہ خاں کو جنہوں نے میری زندگی تباہ و برباد کر کے رکھ دی۔ مغیث تم کچھ بھی کہو لیکن میں خوب جانتی ہوں کہ تم نے شادی سے کیوں انکار کیا ہے؟ تم میرے گھناؤنے ماضی کو مجھ سے الگ رکھ کر مجھے نہیں قبول کر سکتے، یہ بڑے ظرف اور ہمت کی بات تھی جو تم میں نہیں ہے۔"

نیشا پور میں مغیث کا گھر عبداللہ خاں کی حویلی سے بھی بڑا تھا۔ اس کی چہار دیواری پہاڑی پتھروں سے کھڑی کی گئی تھی اور اندر داخل ہوتے ہی ایک بہت بڑا اصطبل تھا جس میں کئی سو گھوڑے ہنہنا رہے تھے مہرن کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی صوبے دار کے اصطبل میں پہنچ گئی ہو۔

مغیث کی آمد کی خوشی سے حویلی میں زندگی دوڑ گئی اور نوکر چاکر اِدھر اُدھر بھاگنے دوڑنے لگے۔ مغیث نے ایک خدمت گار سے پوچھا۔ "باوا جان کہاں ہیں؟"

خدمت گار نے جواب دیا۔ "وہ سخت بیمار ہیں اور آپ ہی کا انتظار کر رہے ہیں۔"

مغیث نے پوچھا۔ "اور ماں، ماں کہاں ہیں؟"

خدمت گار نے جواب دیا۔ "وہ بھی ان کے پاس بیٹھی ہیں اور آپ کی منتظر ہیں۔"

مغیث مہرن کا ہاتھ پکڑ کر اس کمرے میں لے گیا جس کی دیواروں پر رنگین بیل بوٹے بنے ہوئے تھے اور دروازوں اور کھڑکیوں پر رنگین اور دبیز پردے پڑے تھے۔ یہاں کا ساز و سامان بھی بڑا قیمتی تھا۔ قیمتی قالینوں کے فرش پر مسہریاں اور کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں ایک لمبی چوڑی میز پڑی تھی جو آبنوس کی تھی اور اس کے حاشیوں پر بڑا خوب صورت کام کیا ہوا تھا۔ میز پر پانی کا جار اور کئی گلاس رکھے تھے اور شاید کچھ دوائیں بھی۔ میز کے پاس والی مسہری پر کوئی شخص لیٹا ہوا تھا اور مسہری کے پاس سرہانے ایک کرسی پر کوئی سوگوار عورت بیمار مرد پر جھکی ہوئی تھی۔ مغیث مہرن کو لے کر بیمار بوڑھے کے پاس جا کھڑا ہوا۔ عورت نے کہا۔ "میرے بیٹے مغیث۔" یہ کہہ کر اسے سینے سے لگا لیا۔ مغیث نے ماں کے سینے میں دبے ہوئے منہ سے گھٹی گھٹی آواز نکالی۔

"باوا جان! میں مہرن کو لے آیا۔"

بیمار بوڑھے نے سر اٹھا کر مہرن کی طرف دیکھا اور فرطِ مسرت سے کراہا۔ "سچ؟ میری مہرن، میری بیٹی آ گئی؟ ادھر...... ادھر میرے قریب، میرے سے لگ جا میری بیٹی۔"

مہرن حیران اور ششدر کمرے کی دھندلی روشنی میں بوڑھے کو دیکھ رہی تھی اور پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔

مغیث کی ماں نے نفرت اور غصے سے مہرن کی طرف دیکھا اور بیمار بوڑھے سے کہا۔ "تم نے اس لڑکی کے لیے میرے بیٹے کو جہنم کے سفر پر روانہ کیا تھا۔ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو میں کیا کرتی؟ کہاں سے لاتی اپنے مغیث کو۔"

یہ کہتی ہوئی مغیث کو لے کر نکل گئی۔ مغیث نے رکنے کی کوشش کی لیکن ماں نہیں مانی اور زبردستی دھکیلتی ہوئی کمرے سے نکال لے گئی۔ اس کے جاتے ہی بیمار بوڑھے نے مہرن کا ہاتھ پکڑ کر اپنی مسہری پر بٹھا لیا۔ اس کی آنکھیں ساون بھادوں بن گئی تھیں۔ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ "بیٹی مہرن! تو نے اپنے دھوکے باز باپ کو ابھی تک نہیں پہچانا۔ میں تیرا باپ ہوں بیٹی۔ وہ باپ جو تجھے فرخ سیر کے سپرد کر کے نیشا پور چلا آیا۔ بیٹی! میں نے ایک ایسی غلطی کر رکھی تھی جس کا تیری ماں کو آخر تک علم نہ ہو سکا۔ وہ غلطی یہ تھی کہ میں نے تیری ماں کی زندگی ہی میں اس بدمزاج ترک خاتون سے شادی کر لی تھی اور اسے نیشا پور میں رکھا تھا۔ مغیث نے ترکی زبان اسی سے سیکھی ہے۔ ہاں تو جب میں تجھے فرخ سیر کے حوالے کر کے نیشا پور آیا تو اس بدمزاج، چڑچڑی خاتون نے مجھے یہیں روک لیا کیونکہ اسے تیری ماں کی موت کی اطلاع مل چکی تھی اور اسے یہ بات بھی معلوم ہو گئی تھی کہ میں نے تجھے ہندوستان کے بادشاہ کے سپرد کر دیا ہے۔ اس نے مجھے یہیں روک لیا۔ میں تیرے لیے تڑپتا رہا پھر میری صحت بھی خراب رہنے لگی اور اس لائق نہیں رہا کہ ہندوستان کا سفر کر سکوں۔"

اتنا کہہ کر بوڑھا زار و قطار رونے لگا۔ اس کی آواز حلق میں پھنسنے لگی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ اب کچھ بھی نہ کہہ سکے گا۔ مہرن باپ کے سینے پر گر گئی اور سسکیاں لے کر رونے لگی۔ بوڑھے نے اس کی پشت کو سہلانا شروع کیا اور بھرائی ہوئی آواز میں دوبارہ بولا۔ "چپ ہو جا میری بیٹی چپ ہو جا۔"

مہرن نے سسکیاں لیتے ہوئے رندھی رندھی، گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ "باوا جان! میری بدنصیبی کی پوری داستان سنا دیجیے۔ رکیے مت کہتے رہیے۔"

باپ نے پھر کہنا شروع کر دیا۔ "یہ بات نہیں تھی کہ میں نے تجھے بھلا دیا تھا۔ تو مجھے ہر ہر لمحے یاد آتی رہی۔ بڑے غور و فکر کے بعد میں نے مغیث کے اصرار پر اپنا دکھ اس پر ظاہر کر دیا۔ اس شریف بیٹے نے میری ہمت بندھائی اور وعدہ کیا کہ وہ میری خاطر ہندوستان کا سفر طے کرے گا اور جس طرح بھی بن پڑا تجھے اپنے ساتھ لے آئے گا۔ میں اس پُرخطر مہم پر مغیث کو بھیجنا نہیں چاہتا تھا لیکن تیری محبت میں، میں نے مغیث کو بھی داؤ پر لگا دیا۔ مغیث کے سفر کا علم اس کی ماں کو بھی نہیں ہوا ورنہ وہ مزاحم ہوتی۔"

مہرن نے روتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ ساری باتیں مجھے مغیث نے کیوں نہیں بتائیں؟"

باپ نے جواب دیا۔ "میں نے اسے منع کر دیا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اگر تجھے یہ بات معلوم ہو گئی کہ میں تیری سوتیلی ماں اور سوتیلے بھائی کی وجہ سے تیرے پاس نہیں آ سکا تو، تو مجھ سے نفرت کرنے لگے گی اور پھر کبھی نیشا پور نہیں آئے گی اور میں تجھے دیکھے بغیر ہی اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا۔"

مہرن نے بڑے پُردرد لہجے میں کہا۔ "باوا جان!

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں تو کہیں کی بھی نہیں رہ گئی۔ مجھ پر آپ کے بعد جو کچھ بیتی، میں تو اسے سنا بھی نہیں سکتی۔ اگر آپ میں اتنی قوت برداشت ہے کہ میری ساری افتاد سن کر بھی زندہ رہیں تو کسی وقت مغیث سے سن لیجیے گا۔"

باپ نے مہرن کو بھینچ لیا، بولا۔ "نہ رو میری بیٹی نہ رو۔ مہرن صبر کر۔ اب تو، تو اپنے بدنصیب باپ کے سینے سے لگی ہوئی ہے۔ نہ رو چپ ہوجا۔ دیکھ میں بھی تو غمزدہ ہوں لیکن میں صبر وضبط سے کام لے رہا ہوں۔"

اور بیمار بوڑھے کے صبر وضبط کا یہ حال تھا کہ حلق سے صحیح طرح آواز بھی نہیں نکل رہی تھی اور آنسوؤں کے سیلاب نے آنکھوں کو بند کر رکھا تھا۔

نیشاپور سے دور دہلی میں عبداللہ خاں قید خانے میں اپنی زندگی کے دن پورے کرتا رہا۔ یہاں تک کہ دہلی کی سیاست نے ایک بار پھر کچھ ایسا رخ اختیار کیا کہ بادشاہ کو اپنے سازشی امرا کا مقابلہ کرنے کے لیے عبداللہ خاں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ بادشاہ کا لائق اور ہمدرد وزیراعظم اعتمادالدولہ امین خاں تین ماہ وزارت پر فائز رہ کر درد قولنج میں رخصت ہوچکا تھا۔ بادشاہ نے قیدی عبداللہ خاں سے پچھوایا۔ "کیا وہ بادشاہ کے لیے بڑے سے بڑا کام انجام دے سکتا ہے؟"

عبداللہ خاں نے جواباً کہلوایا۔ "اگر حضور خادم کو معاف فرمادیں اور اس پر رحم کھائیں تو میں حضور کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھے پانچ ہزار سوار مہیا کردیے جائیں اور مجھے اعتماد میں لے کر جس مہم پر بھی روانہ کیا جائے گا انشاءاللہ کامیاب وبامراد لوٹوں گا۔"

بادشاہ اور عبداللہ خاں کے پیام اور جواب کا ان امرا کو بھی پتا چل گیا جو عبداللہ خاں کے دوست تھے اور بادشاہ سے نفرت کرتے تھے۔ وہ عبداللہ خاں کی رہائی کا انتظار کرنے لگے تاکہ وہ ایک بار پھر عبداللہ خاں کی سرپرستی میں مغلیہ بساط سیاست کے مہروں کو ادھر اُدھر کرکے انقلاب برپا کریں۔ جب بادشاہ کے مخبروں نے یہ خبر بادشاہ کو پہنچائی تو وہ کانپنے لگا اور خفیہ حکم جاری کیا کہ عبداللہ خاں کو زہر دے کر ہلاک کردیا جائے۔

عبداللہ خاں کے نگران خدمت گار نے شاہی حکم کی تعمیل میں زہر پیس کر اسے چٹا دیا لیکن چٹاتے ہی عبداللہ خاں نے قے کردی جس سے اس کا اثر کسی حد تک زائل ہوگیا۔

دوسرے دن شاہی خواجہ سرا زہر ہلاہل کی گولی لیے حاضر ہوا اور عبداللہ خاں کو بادشاہ کا حکم سنایا۔ "بادشاہ سلامت آپ کو کسی ہتھیار سے نہیں ہلاک کرنا چاہتے۔ انہوں نے یہ گولی بھیجی ہے جسے تم میرے سامنے ہی کھا لو تاکہ میں بادشاہ کو تمہارے چشم دید انجام سے مطلع کرسکوں۔"

عبداللہ خاں نے حالات اور قسمت سے مزید جنگ کرنے کا فیصلہ ترک کردیا۔ خاموشی سے اٹھا، وضو کیا اور قبلہ رو بیٹھ کر خواجہ سرا سے زہر ہلاہل کی گولی لے لی پھر اسے حلق سے نیچے اتار کر کہنے لگا۔ "خدایا! تو جانتا ہے کہ اس حرام شے (زہر) کو میں اپنے اختیار سے نہیں کھا رہا ہوں۔" زہر نے حلق سے اترتے ہی اپنا اثر دکھایا اور کچھ ہی دیر بعد عبداللہ خاں اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔

مغیث، مہرن اور اس کے بوڑھے باپ کو کچھ پتا نہ تھا کہ عبداللہ خاں کا کیا حشر ہوا؟ مہرن کچھ اتنی دل برداشتہ ہوئی کہ شادی کا خیال ہی اپنے ذہن سے نکال دیا پھر باپ بھی چل بسا۔ مغیث اسے شادی پر مجبور نہیں کرسکا تھا۔ مغیث کی ماں نے مغیث کی شادی کردی۔ مغیث اپنی بیوی کے ساتھ خوش وخرم زندگی گزارنے لگا لیکن ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتا کہ ازدواجی زندگی کی مسرتوں کا اظہار مہرن کے سامنے نہ کیا جائے، اسے جب بھی موقع ملتا مہرن کو شادی پر مجبور کرتا لیکن جب مہرن کے سیاہ بالوں پر برف گرنے لگی اور تنی ہوئی کھال پر چنٹیں پڑنے لگیں تو اس نے خاموشی اختیار کرلی۔ ہاں کبھی کبھی جب مہرن کو بادشاہ فرخ سیر اور عبداللہ خاں یاد آتے تو وہ فرخ سیر کو کم مگر عبداللہ خاں کو بڑی دل سوزی سے کوسنے لگتی اور شاید یہ اس بددعا کا اثر ہے کہ شاہجہاں آباد میں فتح پوری مسجد کے سامنے کا وہ محل جس میں اپنے دور وزارت میں عبداللہ خاں رہا کرتا تھا اور جس کے ایک حصے میں مہرن کو اس کی مرضی اور خواہش کے خلاف بے حرمت کیا گیا تھا آج بھی اس محل کو نمک حرام وزیر کی حویلی کہا جاتا ہے۔

ماخذات

مآثرالامرا... صمصام الدولہ شاہ نواز خان، سیرالمتاخرین... غلام حسین طباطبائی، آثارالصنادید... سرسید احمد خان، مسلمانان پاکستان و بھارت دوم... سید ہاشمی فرید آبادی، دکن کی سیاسی تاریخ... مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، منتخب اللباب... خافی خان

سوچ کی نسل

کاشف زبیر

کہتے ہیں کہ حرکت میں برکت ہے مگر... کبھی کبھی حرکت میں زحمت بھی ہوجاتی ہے۔ ان کا بھی یہ سفر کئی سنسنی خیز واقعات کا سبب بن گیا تھا۔ جب محبت کئی روپ میں ڈھل کر سامنے آئی تو دلوں کی دھڑکن گویا ٹھہر ٹھہر گئی... آنکھوں میں یقین حیرت بن کر سمٹ آیا... نسلوں کے درمیان کئی صدیوں کے اس فاصلے نے ماضی کے بہت سے اوراق کھول دیئے جن پر رقم ہر سطر ایک نئی داستان سنا رہی تھی۔

مختلف تہذیبوں اور روایات کی دلچسپ معلوماتی تحریر

گائیڈ سیاحوں کے گروپ کو اس قلعے کی تاریخ سے آگاہ کر رہا تھا۔ اسپین کے شہر ٹولیڈو میں بے شمار تاریخی مقامات ہیں۔ یہ قلعہ ان میں سے ایک تھا۔ کسی زمانے میں یہ قلعہ چرچ کی تحویل میں تھا۔ میرا نام جیمز مارسن ہے اور میں اپنی گرل فرینڈ کے ہمراہ سیاحوں کے اس گروپ کے ساتھ تھا اور موقع بہ موقع تصویریں بھی لے رہا تھا۔ فوٹوگرافی میرا شوق بھی ہے اور میرے پیشے میں معاون بھی۔ میں مصنف ہوں اور ایک ہسٹری میگزین کے لیے کام کرتا ہوں۔ میرا

WWW.PAKSOCIETY.COM

تعلق جنوبی انگلینڈ سے ہے لیکن میری تعلیم اور ملازمت لندن میں رہی۔ رسالے کا ہیڈ آفس لندن میں ہے اور یہ یورپ کی سات زبانوں میں چھپتا ہے۔ اسکول کے زمانے سے مجھے تاریخ میں دلچسپی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ آکسفورڈ میں داخلے کے وقت میں نے تاریخ کو بہ طور مضمون لیا اور بعد میں اسے ہی بہ طور پیشہ منتخب کیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد میگزین سے بہ طور مصنف منسلک ہو گیا۔ میرے لکھے تحقیقی مضامین قارئین میں پسندیدگی کی سند حاصل کر چکے تھے۔ پچیس برس کی عمر میں شادی کا تجربہ کیا جو سال بھر بعد ہی ناکام رہا۔

شادی کی ناکامی نے میرے کیریئر پر بھی اثر ڈالا اور میں پہلے جیسی دل جمعی سے کام نہیں کر پا رہا تھا۔ یہ بات میرے باس رچرڈ اوزبرگ نے بھی محسوس کر لی اور اس نے مجھے اسپین جانے کا مشورہ دیا۔ اس نے کہا۔ ”اسپین میں ہمارے دفتر میں ایک جگہ خالی ہے۔ پھر ماحول بدلے گا تو تم یقیناً بہتر محسوس کرو گے۔ جنوبی اسپین تاریخ کا خزانہ ہے۔ خاص طور سے مسلم دور کی یادگاریں اور تعمیرات دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔“

رچرڈ ٹھیک کہہ رہا تھا پندرھویں صدی کے آخر میں جب مسلمان یہاں سے رخصت ہوئے تو اسپین ایک ترقی یافتہ ملک تھا مگر چند سالوں کے اندر جاہل اسپینیوں نے ترقی کی ان تمام نشانیوں کو مٹا دیا اور ملک کو اس دور میں لے گئے جب اسپین رومن سلطنت کا ایک غلام صوبہ تھا۔ میری عرصے سے خواہش تھی کہ اسپین جاؤں مگر موقع نہیں مل رہا تھا اب رچرڈ نے پیش کش کی اور میں بھی تبدیلی چاہتا تھا۔ مالی لحاظ سے بھی یہ پیشکش اچھی تھی مجھے تنخواہ بھی ملتی اور لکھنے کا معاوضہ بھی۔ میگزین کا دفتر میڈرڈ میں تھا۔ یہ خوب صورت شہر ہے اور اسپین کا دارالخلافہ بھی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ میری پسندیدہ ترین فٹ بال ٹیم ریئل میڈرڈ کا ہوم ٹاؤن بھی ہے۔ اتفاق کی بات ہے آمد کے دوسرے مہینے مجھے ریئل میڈرڈ کا میچ دیکھنے کا موقع بھی مل گیا اور اس میچ کے دوران میری ملاقات سرخ بالوں اور سانولی رنگت والی ماریا سے ہوئی۔ ہماری نشستیں ساتھ ساتھ تھیں اور جب دوران میچ بارش شروع ہوئی تو اس نے مجھے اپنی چھتری تلے آنے کی پیشکش کی۔

جب میچ ختم ہوا تو ہمارے درمیان ایک ہلکا پھلکا تعلق قائم ہو چکا تھا، میں نے اسے اس کے گھر ڈراپ کیا اور اگلی ملاقات کا وعدہ بھی لے لیا۔ چند ملاقاتوں کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ مجھے ماریا جیسی لڑکی کی ہی ضرورت ہے جو میری ویران زندگی کو اپنی محبت سے آباد کر دے۔ لیکن اس بار میں عجلت میں کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ماریا بھی ہچکچا رہی تھی۔ اس لیے طے ہوا کہ ہم کچھ عرصے ساتھ رہ کر دیکھیں گے کہ شادی ہمارے لیے کس حد تک سود مند ہو سکتی ہے۔ اسپین آنے کے کچھ عرصے تک تو مجھے بوریت رہی، اسپینش زبان مجھے آتی تھی۔ یہاں آ کر اس میں روانی آ گئی پھر ماریا سے ملاقات ہوئی تو بوریت ختم ہو گئی اور ایک مختصر سا حلقہ احباب بھی بن گیا۔ گرمیاں آئیں تو ماریا نے اسپین گھومنے کی تجویز پیش کی۔ ماریا یونیورسٹی میں پڑھ رہی تھی اور گرمیوں کی چھٹیوں میں کہیں جا سکتی تھی۔ مجھے دفتر سے زیادہ دن کی چھٹی نہیں مل رہی تھی، صرف ایک ہفتے کی چھٹی منظور ہوئی تھی اس لیے ہم نے ٹولیڈو جانے کا سوچا۔ یہ مقام تاریخی بھی ہے اور میڈرڈ سے زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ ہم اپنی کار میں چند گھنٹے سفر کر کے ٹولیڈو پہنچ گئے۔

”میرا تعلق ٹولیڈو سے ہے۔“ ماریا نے راستے میں بتایا۔ ”میرے آبا و اجداد مور (مسلم) تھے۔ پھر سترھویں صدی میں جب میڈرڈ آباد ہونا شروع ہوا تو ہمارے خاندان کے اکثر لوگ یہاں آ گئے۔ لیکن اب بھی قلیوس خاندان کے لوگ وہاں آباد ہیں۔“

”تم پہلے بھی ٹولیڈو آتی رہی ہو؟“

”نہیں اتفاق کی بات ہے یہ میرا بھی پہلا سفر ہو گا۔“

ہم ایک ہوٹل میں رکے۔ یہیں سے ٹولیڈو کے قابل دید مقامات کے بارے میں معلوم کیا۔ جنوب میں موسم گرم ہوتا ہے لیکن ٹولیڈو بلندی پر تھا اس لیے جولائی میں بھی یہاں کا موسم شاندار تھا۔ مسلسل بارشوں سے سبزے کی بہتات تھی۔ جگہ جگہ نارنگی اور سیب کے باغات تھے۔ زیتون بھی تھا لیکن اتنا نہیں تھا۔ ٹولیڈو خاموش اور پرسکون شہر ہے، جب اس کی گلیوں میں بہت سے لوگ چل پھر رہے ہوں تب بھی یہاں عجیب سا سناٹا اور ست روی نظر آتی ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ ٹولیڈو کی سب سے پرکشش جگہ اس کا قلعہ ہے۔ یہ کسی قدر بلند پہاڑی پر تھا، اس کے ایک طرف ڈھلان تھی اور دوسری طرف قلعے سے ذرا نیچے ٹولیڈو کی آبادی شروع ہو جاتی تھی۔ قلعہ جنگی نوعیت کا تھا۔ یہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ مشکل سے سو گز لمبا اور تقریباً اتنا ہی چوڑا تھا مگر چوکور نہیں تھا بلکہ پہاڑی کے سائز کے لحاظ سے اس کی دیواریں ترتیب دی گئی تھیں۔ قلعے کے آغاز پر ایک تختی لگی تھی جس پر قلعے کی مختصر تاریخ اسپینی اور انگریزی زبان میں

لکھی ہوئی تھی۔ یہ قلعہ سب سے پہلے طارق بن زیاد کی آمد کے بعد مسلمانوں نے بنوایا تھا یہاں سے وہ آس پاس کی عیسائی آبادیوں پر نظر رکھتے تھے۔ ٹولیڈو جنوبی اسپین میں مرکزی مقام رکھتا ہے مگر یہ کبھی بھی اہم شہر یا کوئی حکومتی مرکز نہیں رہا۔

ہم آمد کے دوسرے دن قلعے کی سیر کے لیے گئے۔ قلعے میں داخلے پر ٹکٹ تھا اور خاصا مہنگا تھا۔ ان لوگوں نے قلعے کو کمائی کا ذریعہ بنایا ہوا تھا۔ سیر کا وقت صبح دس سے شام چار بجے تک تھا اس کے علاوہ قلعے میں داخلے کی اجازت نہیں تھی۔ ایک سرکاری گائیڈ سیاحوں کو قلعے کی تاریخ اور منفرد قصوں سے آگاہ کرتا تھا۔ میری توجہ اس کی باتوں سے زیادہ قلعے پر تھی۔ یہ پتھر کی بڑی سلوں سے بنا ہوا تھا۔ دیواریں، چھت، حتیٰ کہ فرش تک پتھروں سے بنا ہوا تھا اسی وجہ سے یہ قلعہ اتنے عرصے سے جوں کا توں قائم تھا۔ پھر اس نے زیادہ جنگیں بھی نہیں دیکھی تھیں اس لیے اسے نقصان نہیں ہوا تھا۔ بیرونی کھلے حصوں پر مسلسل ہونے والی بارش کی وجہ سے کائی جمی ہوئی تھی۔ کہیں کہیں کائی اتنی زیادہ تھی کہ اس پر پودے اُگ آئے تھے، یہی حال صحن کے فرش کا تھا۔ فصیلوں کے ساتھ بڑے اور گھنے درخت تھے۔ سیاحوں کی سہولت کے لیے جگہ جگہ بینچز کا انتظام تھا تاکہ سیاح دوسری جگہوں پر لیٹنے بیٹھنے سے گریز کریں۔ یہاں کھانے پینے اور کوئی بھی کچرا پھینکنے کی ممانعت تھی۔ حد یہ کہ پانی کی بوتلیں لانے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ پینے کے لیے پانی قلعے میں موجود تھا۔ بیرونی حصے میں ٹوائلٹ کی سہولت دی گئی تھی۔

سیاح زیادہ نہیں تھے، مشکل سے ایک درجن افراد تھے۔ ان میں نصف سے زیادہ خواتین تھیں اور وہ بڑے ذوق و شوق سے گائیڈ کی باتیں سن رہی تھیں۔ ان میں ماریا بھی شامل تھی۔ وہ اسپینی حسن کا شاہکار تھی۔ شہد رنگ بال، سونے جیسی سنہری رنگت، سیاہی مائل سرمئی آنکھیں اور تیکھے نقوش تھے۔ گھٹنوں سے ذرا اوپر ختم ہو جانے والی سرخ رنگ کی فراک میں اس کا نازک بدن نمایاں تھا۔ پیروں میں نازک سے سینڈل تھے۔ وہ بلاشبہ اس گروپ کی سب سے خوب صورت لڑکی تھی۔ جب میں اسے دیکھتا تو کچھ دیر دیکھتا رہ جاتا۔ جب میں ماریا کو اس طرح دیکھتا تو وہ شرما جاتی۔ حالانکہ میں اسے بہت نزدیک سے دیکھ چکا تھا، اسے برت چکا تھا اس کے باوجود میرا دل چاہ رہا تھا کہ اسے دیکھتا رہوں۔ ایک بار اس نے آہستہ سے کہا۔

”جمی، کیا ہو گیا ہے، ہم قلعہ دیکھنے آئے ہیں یا تم مجھے دیکھنے؟“

”اب مجھے خیال آ رہا ہے، میں نے حماقت کی ہے، میں ایک ہفتے کے لیے تمہارے ساتھ اپنے اپارٹمنٹ میں بند ہو جاتا۔“

”ہشت۔“ ماریا نے گائیڈ کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ وہ اب ہمیں قلعے کے اندرونی حصوں کی طرف لے جا رہا تھا، اس نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ”خواتین و حضرات! اب میں آپ کو ایسی جگہ لے جا رہا ہوں جہاں ماضی میں بے گناہوں کو ان جرائم کی سزا دی جاتی تھی جو انہوں نے کیے ہی نہیں ہوتے تھے اور یہ سزائیں ایسی ہوتی تھیں کہ آج کی مہذب دنیا میں ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔“

وہ ہمیں قلعے کے تہ خانے میں لے آیا۔ اس دوران میں وہ بتا رہا تھا کہ جب یہاں مسلمانوں کی حکومت ختم ہوئی تو جنونی راہبوں نے قلعے کو محتسب چرچ میں بدل دیا۔ پہلے یہاں پکڑے جانے والے مسلمانوں اور یہودیوں کو اذیتیں دے کر انہیں مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا اور جب مسلمان اور یہودی ختم ہو گئے تو ایذا رسانیوں کا رخ عام افراد کی طرف موڑ دیا گیا۔ چرچ لوگوں پر کڑی نظر رکھتا تھا۔ سوائے بائبل کے کوئی کتاب پڑھنا جرم تھا۔ معمولی سی باتوں پر لوگوں کو پکڑ کر اس قلعے میں لایا جاتا اور ان کو شدید اذیتیں دے کر ان کے جرموں کا اقرار کرایا جاتا تھا۔ ماریا ڈر گئی۔

”کیا یہ رومن کیتھولک تھے؟“

”وہ براہ راست چرچ سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔“ گائیڈ نے وضاحت کی۔ ”مسلمانوں سے لڑائی کے دوران بہت سے راہب بھی میدان جنگ میں آ گئے تھے اور انہوں نے محتسب چرچ قائم کر لیے تھے۔ پہلے پہل انہیں پوپ کی حمایت حاصل تھی لیکن جب انہوں نے عام لوگوں کو سزائیں دینا شروع کیں تو پوپ نے اپنی حمایت واپس لے لی تھی۔ مقامی حکومت ان کے معاملے میں قطعی دخل نہیں دے سکتی تھی۔ محتسب چرچ کا حاکم اپنے علاقے کا اصل حکمران ہوتا تھا۔“

تہ خانے میں ایک میز تھی جس پر لٹا کر مبینہ مجرم کے ہاتھ ایک چرخی سے جکڑ دیے جاتے تھے اور پاؤں دوسری طرف باندھ دیے جاتے تھے۔ جب چرخی گھمائی جاتی تو آدمی کا جسم کھنچتا تھا اور اس کی ہڈیاں اور پٹھے کھنچنے لگتے تھے۔ زیادہ کھینچنے پر اس کے جوڑ نکل جاتے اور وہ ہمیشہ کے لیے معذور ہو جاتا۔ آگ سے جلانے، ٹکٹکی سے باندھ کر

WWW.PAKSOCIETY.COM

کوڑے مارنے کے آلات دیواروں پر سجے ہوئے تھے۔ ایک کرسی تھی جس پر آدمی کو بٹھا کر اس کے نیچے آگ جلائی جاتی تھی۔ ایک قد آدم فولادی خول تھا جس میں اندر کی طرف کیلیں لگی تھیں۔ جب اس میں آدمی کو بند کیا جاتا تو یہ کیلیں اس کے جسم میں اتر جاتیں اور وہ رفتہ رفتہ خون بہنے سے مر جاتا۔ ایک چکی تھی جس پر آدمی کو لٹا کر گھمایا جاتا تو اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جاتی تھی۔ ایسی اور بھی کئی مشینیں اور آلات تھے جن سے انسانوں کو بے پناہ اذیتیں دی جاتی تھیں۔ میں حیران تھا کہ اس دور کے انجینئر کیا صرف اسی قسم کے کام کرتے تھے۔

یہاں آکر سارے سیاح بکھر گئے تھے اور مختلف آلات کو پاس سے دیکھ رہے تھے۔ گائیڈ نے واضح کیا کہ کسی چیز کو چھونا منع ہے۔ ایسا کرنے والے کو جرمانہ ہوگا۔ میں اس کرسی کو غور سے دیکھ رہا تھا جس کے نیچے آگ جلائی جاتی تھی اور اس پر بیٹھا آدمی زندہ روسٹ ہو جاتا ہوگا۔ اچانک میرے پاس سے آواز آئی۔ ”خوفناک ہے نا؟“

وہ ادھیڑ عمر آدمی پاس کھڑا تھا۔ اس کا سر گنجا اور اس کی آنکھوں میں انوکھی چمک تھی۔ میں نے اقرار کیا۔ ”ہاں خوفناک تو ہے۔“

”تم انگریز ہو؟“

”جیمز مارٹن۔“ میں نے کہا۔

”انٹونیو۔“ اس نے میری طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ میں نے کہا۔ ”مجھے معلوم نہیں تھا اس قلعے میں عقوبت خانہ تھا۔“

”میں پہلے بھی کئی بار دیکھ چکا ہوں۔“ اس نے آلات تشدد کی طرف دیکھا۔ ”میرے لیے کچھ بھی نیا نہیں ہے۔ اسپین کا ماضی خوفناک ہے۔“

”صرف تمہارا نہیں پورے یورپ کا یہی حال تھا۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”یہاں یہ کام چرچ کر رہا تھا ہمارے ہاں حکومت نے سنبھال رکھا تھا، اٹھارویں صدی تک انگلینڈ میں عورتوں اور مردوں کو جادوگری کے الزام میں موت کے گھاٹ اتارا جاتا رہا ہے۔“

انٹونیو نے کوٹ نما قمیص اور سادہ پتلون پہن رکھی تھی جیسی کہ عام طور سے پادری بھی پہنتے ہیں لیکن وہ پادری نہیں تھا۔ اس کی بات نے مجھے دلچسپی لینے پر مجبور کر دیا۔ ”اگر تم یہاں کئی بار آچکے ہو تو یہاں کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو گے۔“

”ہاں۔“ اس نے سرسری انداز میں کہا اور پلٹ کر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ماریا گھبرائی ہوئی میرے پاس آئی۔ اس نے کہا۔

”باہر چلو میرا یہاں دم گھٹ رہا ہے۔“

ماریا کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ گائیڈ کی تقریر جاری تھی اور دوسرے سیاح بھرپور دلچسپی لے رہے تھے۔ میں ماریا کی خاطر باہر نکل آیا۔ ہم قلعے کے عقبی صحن میں نکلے۔ یہ پہاڑی کی ترچھی ڈھلان کے ساتھ تھا۔ ڈھلان پر اونچے اور سیدھے تنوں والے درخت لگے تھے اور بعض اتنے اونچے تھے کہ ان کے سرے قلعے کی دیوار تک آگئے تھے۔ ماریا گہرے سانس لے رہی تھی اور اس کا رنگ ہلکا پڑ گیا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”اب بہتر ہے ورنہ اندر تو لگ رہا تھا میرا دم گھٹ جائے گا اور میں مر جاؤں گی۔“

”لیکن تم خاصی دیر سے اندر تھیں، کیا شروع سے ایسا لگ رہا تھا؟“

”نہیں بس کچھ دیر پہلے ایسا لگا کہ کوئی مجھے دیکھ رہا ہے پھر ایسا لگا جیسے کسی نے میرا سانس روک دیا ہو۔ مجھے لگا کہ اگر میں باہر نہیں آئی تو دم گھٹنے سے مر جاؤں گی۔“

شاید تہ خانے کے ماحول اور اس کے خوفناک ماضی کے بارے میں سن کر ماریا کے اعصاب پر بوجھ پڑا تھا۔ کھلی فضا میں آنے اور سانس لینے سے اس کی طبیعت بحال ہوگئی تھی۔ وہ نارمل ہوئی تو میں نے اس سے کہا۔ ”کیا خیال ہے اندر چلیں؟“

اس نے جھرجھری لی۔ ”ہرگز نہیں، مجھے اس جگہ کے خیال سے وحشت ہو رہی ہے۔ جمی، عجیب بات ہے مجھے وہ جگہ اجنبی نہیں لگ رہی ہے، ایسا لگ رہا ہے میں پہلے بھی یہاں آچکی ہوں۔“

”ممکن ہے تمہارے آباؤاجداد میں سے کوئی آیا ہو اور یہ تعلق نسل در نسل جینز سے منتقل ہوتا....“

”تم مذاق اڑا رہے ہو میرا؟“ اس نے کہا اور ایک طرف چل پڑی، میں اس کے پیچھے لپکا۔ کچھ دیر بعد اس کا موڈ بہتر ہو گیا۔ میں نے لنچ کے بارے میں پوچھا تو اس نے انکار کر دیا۔

”ابھی موڈ نہیں ہے۔“

”آؤ پھر اس دماغ کھانے والے گائیڈ کے بغیر قلعہ دیکھتے ہیں۔“

میں نے کہا اور ہم وہیں ٹہلنے لگے۔ ہم قلعے کے جنوبی حصے میں آئے تو وہاں ایک چبوترا دکھائی دیا۔ یہ ایک کسی قدر اونچا پتھر سے بنا چبوترا تھا۔ جب ہم اس کے پاس آئے تو اس پر تین قبریں نظر آئی تھیں۔ کتبوں پر مٹی جمی تھی، میں نے آس پاس دیکھا اور پھر ایک شاخ اٹھا کر اس سے کتبوں کی مٹی صاف کی۔ نام واضح ہونے لگے۔ یہ اسپینش زبان میں تھے۔ میں اسپینی زبان بول لیتا تھا لیکن پڑھ نہیں سکتا تھا۔ میں نے ماریا کو آواز دی۔ ”ذرا ادھر آؤ اور دیکھو یہ کیا نام لکھے ہیں؟“

ماریا پاس آئی اس نے جھک کر دیکھا اور پہلی قبر کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ کسی مارکس زافر کی ہے۔ یہ میریا زافر اور یہ راہب جیکوئیس ڈیمرس کی قبر ہے۔“

”ناموں سے یہ دونوں میاں بیوی لگ رہے ہیں۔“ میں نے پہلی دو قبروں کی طرف اشارہ کیا۔ میریا کی قبر درمیان میں تھی۔

ماریا نے تصدیق کی۔ ”ہاں یہ میاں بیوی ہیں۔ مرتے وقت ان کی عمر بھی زیادہ نہیں تھی۔“

تاریخیں رومن میں تھیں۔ مارکس صرف پچیس برس کا تھا جب کہ میریا بائیس برس کی تھی۔ البتہ راہب جیکوئیس کی عمر پچپن برس تھی۔ ان کے ساتھ لکھے سارے سن پندرھویں صدی کے تھے۔ ماریا کو تجسس ہو رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”راہب کی قبر تو سمجھ میں آتی ہے، یہاں محتسب چرچ تھا اور القابات سے ظاہر ہے کہ راہب اس کا سربراہ تھا لیکن ان دونوں میاں بیوی کی قبروں کا کیا جواز ہے یہاں۔“

قبریں نہ صرف راہب جیکوئیس کے برابر تھیں بلکہ اسی معیار کی تھیں، راہب کی قبر الگ سے نمایاں کرنے کے انداز میں نہیں بنائی تھی، اس میں بھی وہی سادہ پتھر استعمال ہوا تھا جو باقی قبروں میں تھا۔ کتبے بھی بہت سادہ تھے اور لگ رہا تھا کہ کسی معمولی کاریگر نے بنائے ہیں۔ میں نے ماریا کی طرف دیکھا۔ ”ایسا لگ رہا ہے کہ راہب اور یہ دونوں چرچ والوں کے نزدیک زیادہ اہمیت کے حامل نہیں تھے۔“

ماریا نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ایسا ممکن نہیں ہے۔ یہ ایک محتسب چرچ تھا اور اس کا سربراہ بہت زیادہ اختیارات رکھتا تھا۔ حد یہ کہ مقامی حاکم بھی اس کا ماتحت تصور کیا جاتا تھا۔ سولہویں صدی کے آخر تک اسپین میں اس قسم کے محتسب چرچ عام تھے۔ رفتہ رفتہ یہ ویٹی کن کی مداخلت سے ختم ہوتے چلے گئے۔“

”لگتا ہے تم اس بارے میں بہت جانتی ہو؟“

”ہاں، اسکول میں ہسٹری میرا مضمون تھا۔“ وہ سادگی سے بولی۔ ”بہت تفصیل سے تو نہیں لیکن جنرل ہسٹری پڑھی ہے۔ جیسے میں ٹولیڈو کے اس قلعے اور محتسب چرچ کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔“

”ایک شخص ہے جو ان قبروں کے بارے میں بتا سکتا ہے۔“

”گائیڈ۔“ وہ مسکرائی۔ ”مجھے تو وہ باتوں سے جھوٹا لگتا ہے۔“

”سارے گائیڈ تھوڑے بہت جھوٹے تو ہوتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ اسی لمحے گائیڈ دوسرے لوگوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا اور اس سے کچھ پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی کیونکہ اس نے آتے ہی لوگوں کو ان قبروں کے بارے میں بتانا شروع کر دیا تھا۔ اس نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

”آپ یہ جو قبریں دیکھ رہے ہیں ان میں ایک شوہر، ایک بیوی اور ایک عاشق دفن ہے۔“

ایک بوڑھا جرمن آگے آیا اور اس نے جھک کر قبروں کا معائنہ کیا اور بولا۔ ”لیکن تیسری قبر تو راہب کی ہے وہ کیسے عاشق ہو سکتا ہے۔“

”کیوں نہیں ہو سکتا، راہب بھی انسان ہوتا ہے۔“ گائیڈ نے اصرار کیا۔ ”جیکوئیس ایک محتسب تھا اور اس چرچ کا سربراہ تھا اس نے بیشمار عورتوں کو چڑیل قرار دیا اور ان کو سزا کے طور پر زندہ جلا دیا۔ اس نے بے شمار مردوں کو جادوگری اور لادینیت کا مرتکب قرار دیا اور ان کو خوفناک اذیتیں دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ کہتے ہیں مارے جانے والوں کی تعداد ہزاروں میں تھی۔“

عورتیں کانپ اٹھیں۔ ”اتنا خوفناک اور سنگ دل آدمی تھا وہ۔“

”آپ کی سوچ سے بھی زیادہ۔“ گائیڈ نے کہا۔ ”اس نے لوگوں کو سزا دینے کے اپنے پیمانے بنا رکھے تھے۔ جب اس کے ظلم کی کہانیاں عام ہوئیں اور بات پوپ تک پہنچی تو اسے ویٹی کن سے حکم آیا کہ وہ لوگوں پر الزام لگانا اور سزا دینا بند کرے مگر اس نے پوپ کا حکم ماننے سے انکار کر دیا اور چرچ کو بھی پوپ سے الگ کر دیا۔ اس کے ساتھی اس پر راضی نہیں تھے مگر وہ اس کی طاقت کے آگے مجبور تھے۔ ریاست اور حاکم وقت جیکوئیس کے ساتھ تھا۔ ایک فوجی دستہ اس قلعے میں اس کے ہر حکم کی تعمیل کے لیے موجود رہا کرتا تھا، کسی میں مجال نہیں تھی کہ اس کے حکم کے آگے چوں بھی کر سکے۔“

”میریا شادی شدہ تھی۔“ ماریا نے کہا۔ ”پھر راہب

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس پر کیسے عاشق ہوگیا؟"

گائڈ مسکرایا۔ "بے شمار شادی شدہ عورتیں دوسرے مردوں سے محبت کرنے لگتی ہیں۔ لیکن اس معاملے میں ایسا نہیں تھا۔ میریا دل وجان سے مارکس سے محبت کرتی تھی۔ وہ خود کو مارکس کی امانت سمجھتی تھی۔"

"پھر یہ سب کیسے ہوا؟" ایک لڑکی نے سوال کیا۔

"جیکوئیس نے کہیں میریا کو دیکھ لیا اور وہ اس پر عاشق ہوگیا۔ جب میریا نے اس کی بات ماننے سے انکار کیا تو اس نے میریا پر چڑیل ہونے کا الزام لگایا اور اسے بہ طور سزا موت کے گھاٹ اتار دیا۔"

"مارکس کیسے مرا؟" میں نے پوچھا۔

"اسے اپنی بیوی کے چڑیل ہونے کی پردہ پوشی کے الزام میں موت کی سزا دی گئی۔"

"اور راہب جیکوئیس کا انتقال کیسے ہوا؟" ماریا نے کتبے پر تاریخ وفات دیکھی جو تینوں کی ایک ہی تھی۔ یعنی تینوں ایک ہی دن دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔

گائڈ نے گہری سانس لی۔ "جیکوئیس نے میریا کے انکار پر اسے موت کی سزا تو دیدی تھی لیکن جب اسے احساس ہوا کہ اس نے اپنی محبت کو خود فنا کردیا ہے تو اس نے خودکشی کرلی۔"

گائڈ نے اس داستان کا آغاز جتنے ڈرامائی انداز میں کیا تھا اس کا انجام اس نے اتنا ہی سادہ سا بیان کیا تھا۔ اکثر سیاحوں کی تسلی نہیں ہوئی تھی اور وہ اس سے سوالات کر رہے تھے۔ ماریا نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ "مجھے لگ رہا ہے اس نے جان چھڑائی ہے ورنہ یہ بہت دلچسپ قصہ ہوگا۔"

"شاید... اگر یہ اتنا ہی مشہور ہے تو یقیناً مقامی لوگ اس قصے سے واقف ہوں گے۔" کہتے ہوئے مقامی انتونیو کا خیال آیا۔ "بلکہ شاید ایک شخص ہے جو جانتا ہو۔ وہ مجھ سے تہ خانے میں ملا تھا اور اس کا کہنا ہے وہ یہاں بہت بار آچکا ہے اور یہاں کے بارے میں سب جانتا ہے۔"

"وہ کہاں ہے؟" ماریا پرجوش ہوگئی۔ "ہمیں اس سے ملنا چاہیے، ممکن ہے وہ ہمیں اصل کہانی سنائے۔"

لیکن جب میں نے سیاحوں میں دیکھا تو انتونیو کہیں نظر نہیں آیا۔ شاید وہ جاچکا تھا۔ لنچ کا وقت قریب تھا اور ممکنہ طور پر گائڈ نے اسی لیے قصے کو زیادہ طول نہیں دیا اور جلدی سے نمٹا دیا۔ کچھ ہی دیر میں سیاح لنچ کے لیے باہر جانے لگے۔ کیونکہ ٹکٹ پورے دن کے لیے تھا اس لیے جنہوں نے قلعے کو مزید دیکھنا تھا وہ اسی ٹکٹ پر دوبارہ اندر آسکتے تھے۔ کچھ دیر بعد وہاں میں اور ماریا رہ گئے تھے۔ میں خوش تھا کہ وہ نہیں گئی، میں کچھ دیر اس کے ساتھ یہاں اکیلا رہنا چاہتا تھا۔ ہم قبروں کے پاس ایک بینچ پر بیٹھ گئے تھے۔ ماریا نے کہا۔ "ہوسکتا ہے وہ شخص یہیں کا رہنے والا ہو۔"

"ہاں ایسی داستانیں تو نسل در نسل منتقل ہوتی ہیں۔"

"کاش وہ آجائے۔" ماریا نے کہا۔ "مجھے بہت زیادہ تجسس ہو رہا ہے۔" کہتے ہوئے اچانک اس کے چہرے پر گھبراہٹ آئی تھی۔ "جمی، ایسا لگ رہا ہے جیسے مجھے کوئی دیکھ رہا ہو۔"

"یہاں تو میں ہوں اور تمہیں دیکھ رہا ہوں۔" میں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ "ویسے وہ گائڈ بھی جانتا ہوگا اس قصے کے بارے میں۔"

"وہ کچھ نہیں جانتا۔" اچانک ہی پاس سے انتونیو کی آواز آئی تو ہم دونوں ہی اچھل پڑے تھے۔ وہ ہم سے کچھ فاصلے پر عقب میں کھڑا تھا۔ میں نے سنبھل کر کہا۔

"کیا کیا... تم نے کچھ کہا ہے؟"

"میں کہہ رہا ہوں گائڈ بکواس کر رہا ہے۔" انتونیو ہمارے سامنے آیا۔ وہ ماریا کو دیکھ رہا تھا اور میں نے محسوس کیا کہ ماریا کچھ سہمی ہوئی تھی۔ میں نے ماریا سے اس کا تعارف کرایا۔

"یہ انتونیو ہے اور انتونیو، یہ میری گرل فرینڈ ماریا فلیوس ہے۔"

"ماریا فلیوس۔" انتونیو نے کہا اور اس کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی۔ "تمہارا تعلق ٹولیڈو کے فلیوس خاندان سے ہے؟"

ماریا نے سر ہلایا۔ "ہاں میں اسی فلیوس خاندان سے تعلق رکھتی ہوں۔ لیکن تم یہ بات کیسے کہہ سکتے ہو کہ گائڈ بکواس کر رہا ہے؟"

"میں اس قلعے اور اس کی تاریخ سے اچھی طرح واقف ہوں۔" انتونیو نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"کیا تمہارا تعلق ٹولیڈو سے ہے؟"

اس نے سر ہلایا۔ "یہی نہیں بلکہ میرا تعلق جیکوئیس ڈیمرس کے خاندان سے ہے۔ اس لیے میں جیکوئیس اور قلعے کے بارے میں اس نام نہاد گائڈ سے زیادہ جانتا ہوں۔"

میں اور ماریا چونک گئے۔ ماریا نے کسی قدر جوش سے کہا۔ "تم جانتے ہو... ان قبروں کے پیچھے کیا کہانی ہے؟"

انتونیو بینچ کے سامنے باغ کے ایک پتھر پر ٹک گیا۔ "ہاں اچھی طرح جانتا ہوں۔" اس نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ "ان قبروں میں کوئی نہیں ہے، یہ خالی ہیں۔"

"لیکن وہ گائڈ..." ماریا نے کہنا چاہا۔

"میں نے کہا نا وہ کچھ نہیں جانتا... اسے تو معمولی سی بات کا بھی علم نہیں ہے، میں یہاں کے بارے میں سب جانتا ہوں خاص طور سے ان قبروں کے بارے میں کہ یہ کیسے وجود میں آئیں اور یہ خالی کیوں ہیں؟"

"تم ہمیں بتاؤ گے... پلیز سینور۔" ماریا نے ملتجی لہجے میں کہا۔

"ضرور بتاؤں گا۔" اس نے سر ہلایا۔ "تم دونوں مجھے اچھے لگے ہو اس لیے ضرور بتاؤں گا۔" یہ کہتے ہوئے اس کی نظر ماریا پر مرکوز ہوگئی تھی۔

ماریا کے ساتھ میں بھی جاننا چاہتا تھا کہ یہ تین قبریں کیسے وجود میں آئیں، یہ خالی کیوں تھیں اور جن کے ناموں کے کتبے لگے تھے ان لوگوں کے ساتھ کیا ہوا تھا۔

☆☆☆

میریا اور مارکس نانبائی تھے۔ ان کا گھر ٹولیڈو کی آبادی سے باہر ایک جنگل کے پاس تھا۔ یہاں سے انہیں روٹی بنانے والی بھٹی میں جلانے کے لیے لکڑی مل جاتی تھی۔ دونوں میاں بیوی صبح سے شام تک روٹی تیار کرتے تھے اور پھر اسے ٹولیڈو کے گھروں میں فروخت کرتے تھے۔ مارکس محنتی آدمی تھا مگر شادی کے بعد اس پر قرض آگیا تھا۔ وہ پہلے سپاہی تھا اور اس نے جنگوں میں بھی حصہ لیا تھا مگر شادی کے بعد اس نے یہ پیشہ ترک کیا تو اس پر جرمانہ لگ گیا تھا، اسے اتارنے کے لیے اسے قرض لینا پڑا تھا۔ پھر حکومت نے روٹی پر ٹیکس لگا دیا تھا اس لیے گزارا کرنا مشکل ہوگیا تھا۔ وہ دن بھر محنت مشقت کرتے اس کے باوجود بہ مشکل قرض کی رقم ادا کر پاتے تھے۔ ان کا مکان ایک کمرے کا تھا اس کے عقب میں روٹی بنانے والی کوٹھری تھی جس میں ایک طرف بھٹی لگی تھی اور باقی کوٹھری میں جابجا آٹے کے تھیلے پڑے تھے۔ ایک بڑی لکڑی کی میز تھی جس پر میریا آٹا گوندھتی تھی۔ پھر مارکس اس کے پیڑے بنا کر اور پھیلا کر انہیں بھٹی میں لگاتا تھا۔

وہ صبح سویرے اٹھ کر سب سے پہلے بھٹی دہکاتا تھا۔ جب تک وہ یہ کام کرتا میریا اپنے اور اس کے لیے ناشتا بناتی تھی۔ پھر وہ اپنی ڈیوٹی پر آجاتی اور سارے دن کی روٹی کے لحاظ سے آٹا گوندھ کر دیتی تھی۔ یہ آسان کام نہیں تھا۔ میریا کو ایک وقت میں پانچ چھ کلو آٹا گوندھنا پڑتا تھا، بعض اوقات اسے سارے دن میں ایک من آٹا گوندھنا پڑتا تھا۔ یہاں سے فارغ ہو کر وہ گھر کے دوسرے کام نمٹاتی، صفائی ستھرائی کرتی اور کپڑے دھوتی تھی۔ جب مارکس شام کو اپنے گھوڑے پر تیار روٹی فروخت کرنے اور مزید آٹا لینے قصبے جاتا تو میریا رات کا کھانا تیار کرتی تھی۔ غربت کی وجہ سے وہ صرف دو وقت کھاتے تھے۔ مگر اس عالم میں بھی وہ ایک دوسرے کے ساتھ خوش تھے۔ میریا بڑی حسین اور نازک اندام سی عورت تھی۔ اسی طرح مارکس خوش رو اور مضبوط جسامت کا جوان تھا دونوں کی جوڑی جچتی تھی اور وہ حقیقت میں ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ انہیں غربت کی پروا بھی نہیں تھی بس وہ قرض ادا کرنے کے لیے پریشان تھے۔

محبت اپنی جگہ لیکن ان کے مالی حالات ٹھیک ہونے میں نہیں آرہے تھے۔ وہ جتنی روٹی تیار کرتے وہ ساری نہیں بکتی تھی اور اگلے دن باسی روٹی انہیں نصف قیمت پر فروخت کرنا پڑتی تھی اور اس میں نقصان ہوتا تھا۔ ٹولیڈو میں اور بھی کئی نانبائی تھے، اس لیے مقابلہ سخت تھا۔ مارکس بنائی جانے والی روٹی کی مقدار کم کر رہا تھا مگر ساتھ ہی فروخت بھی کم ہو رہی تھی۔ دوسرے نانبائی دن میں کئی بار روٹی سپلائی کرتے تھے اس لیے لوگ اور دکاندار انہیں ترجیح دیتے تھے۔ مارکس کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ دن میں کئی بار روٹی سپلائی نہیں کرسکتا تھا۔ اس لیے اب اس نے فیصلہ کیا کہ سارے ہفتے بہت کم روٹی بنائے گا بس اتنی جو آسانی سے بک جائے، صرف ہفتے والے دن کے لیے وہ ڈھیر ساری روٹی تیار کرے گا کیونکہ اس دن قلعے میں عوام کے سامنے محتسب چرچ کے مجرموں کو سزا دی جاتی تھی۔ اسے دیکھنے کے لیے ٹولیڈو کی آبادی کے ہر فرد کی وہاں موجودگی لازمی تھی۔

مارکس کے خیال میں یہ اچھا موقع ہوتا تھا روٹی فروخت کرنے کا کیونکہ سب لوگ وہاں ہوتے تھے اور اس دن ٹولیڈو میں ہر کام بند ہوتا تھا۔ اکثر نانبائی بھی چھٹی کرتے تھے کیونکہ وہ ٹولیڈو میں رہتے تھے۔ ہفتے والے دن ٹولیڈو کے کسی بھی فرد کے لیے کام کرنا منع تھا۔ مارکس اور میریا کیونکہ ٹولیڈو سے باہر رہتے تھے اس لیے ان پر پابندی نہیں تھی۔ وہ ہفتے کے دن کام کرسکتے تھے اور اپنی بنائی روٹی بھی فروخت کرسکتے تھے۔ اس قانون سے فائدہ اٹھا کر ارد گرد رہنے والے ہفتے کے دن اپنی چیزیں فروخت کرنے ٹولیڈو آتے تھے۔ مارکس نے میریا سے کہا کہ وہ سزا والے دن روٹی فروخت کرنا چاہتا ہے تو اس نے انکار کردیا۔ "یہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

بالکل مناسب نہیں ہے۔ خدا انسانوں سے محبت کرتا ہے انہیں سزا نہیں دینا چاہتا۔ میں یہ منظر نہیں دیکھ سکوں گی۔"

"سزا محتسب چرچ دیتا ہے۔" مارکس نے کہا۔ "میں تم سے متفق ہوں لیکن ڈیئر ہمارے اوپر قرض ہے اور اسے ادا کرنا ہے ورنہ دوسری صورت میں مجھے واپس فوج میں بھرتی کرلیا جائے گا اور میں تم سے دور ہوجاؤں گا۔"

یہ بات میریا بھی جانتی تھی اور وہ کسی صورت مارکس سے دوری برداشت نہیں کرسکتی تھی، اس کی زندگی میں اس کی واحد خوشی اس کا شوہر تھا۔ مجبوراً وہ مارکس سے متفق ہوگئی۔ لیکن انہوں نے طے کیا کہ وہ قلعے کے دروازے پر روٹی فروخت کریں گے اندر نہیں جائیں گے۔ تماش بین بھی اسی دروازے سے گزر کر اندر جاتے تھے۔ جمعے کی شام سے انہوں نے روٹی کی تیاری شروع کردی اور انہیں رات میں مشکل سے آرام کا موقع ملا تھا لیکن صبح تک انہوں نے اتنی روٹی بنالی تھی جو بک جاتی تو انہیں اچھی خاصی رقم مل جاتی۔ مارکس کا اندازہ تھا کہ اگر وہ ہفتے میں ایک دن اس طرح روٹی فروخت کرتا رہا تو چند مہینوں میں اس کا قرض اتر سکتا تھا پھر وہ اپنا کاروبار بڑھا سکتا تھا۔ بھٹی کی مرمت کرسکتا تھا اور زیادہ مقدار میں آٹا لے سکتا تھا جو اسے سستا پڑتا۔ ایک ملازم رکھ سکتا تھا جو سارا دن روٹی سپلائی کرتا۔ کیونکہ اسے بھٹی میں جلانے والی لکڑی آسانی سے مل جاتی تھی اور شہر کے نانبائیوں کو یہ مہنگی اور مشکل سے ملتی تھی اس لیے وہ روٹی سستی بیچ کر اپنی فروخت بڑھا سکتا تھا۔ وہ صبح سویرے روٹی کی ٹوکریاں گھوڑے پر لاد کر ٹولیڈو روانہ ہوئے۔ میریا گھوڑے پر سوار تھی، آج اس نے اپنا بہترین لباس پہن رکھا تھا اور دلکش لگ رہی تھی۔ مارکس نے شرارت سے کہا۔

"لوگ روٹی خریدنے کے بجائے تمہیں دیکھتے رہیں گے۔"

"دیکھنے دو کیا فرق پڑتا ہے۔" میریا مسکرائی۔ "میں ہوں تو تمہاری اور ہمیشہ تمہاری رہوں گی۔"

مارکس میریا کی محبت سے سرشار ہوگیا۔ "میں جانتا ہوں میری زندگی۔"

وہ قلعے کے پاس پہنچے تو لوگوں کی آمد شروع ہوگئی تھی۔ مارکس نے دروازے کے پاس ایک مناسب جگہ چنی اور وہاں کھڑا ہوکر روٹی فروخت کرنے کے لیے آواز لگانے لگا۔ اس کا اندازہ درست نکلا جب آنے والوں نے اس سے روٹی خریدنا شروع کردی اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک پوری ٹوکری فروخت ہوگئی۔ اسی اثنا میں گرینڈ ماسٹر آف ٹولیڈو کی آمد کا غلغلہ اٹھا اور اس کے سپاہیوں نے اس کی آمد سے پہلے راستہ صاف کرنا شروع کردیا۔ ایک سپاہی نے مارکس سے بھی کہا کہ وہ گھوڑا یہاں سے ہٹالے۔ مارکس نے گھوڑا کچھ دور ایک اسٹینڈ پر باندھ دیا اور ٹوکری اپنی پشت پر باندھ لی۔ وہ دونوں ہاتھوں میں روٹی پکڑ کر آواز لگا رہا تھا اور میریا اسے روٹی نکال کر دے رہی تھی۔ اسی اثنا میں اندر سے گھنٹا بجنے کی آواز آئی جو اس بات کا اعلان تھی کہ اب سزا کی کارروائی شروع ہونے والی ہے۔ میریا نے کہا۔

"آج پھر کسی بے گناہ کو سزا ملنے والی ہے۔"

"آہستہ۔" مارکس نے گھبرا کر آس پاس دیکھا۔ "اگر کسی نے سن لیا تو ہم بھی پکڑے جائیں گے۔ تم جانتی ہو محتسب چرچ کے مجرم کو بے گناہ کہنا بھی جرم ہے۔"

میریا اور مارکس باتوں میں مصروف تھے ان کو پتا ہی نہیں چلا کہ کچھ شریر بچے خاموشی سے ٹوکری سے روٹی نکال رہے تھے۔ اچانک میریا کی نظر پڑی اور وہ چلائی۔ "اے مارکس، دیکھو یہ روٹی نکال رہے ہیں۔"

مارکس نے مڑ کر دیکھا تو بچے روٹی کے چھ سات ٹکڑے نکال چکے تھے، اس کے متوجہ ہوتے ہی وہ بھاگے۔ مارکس ان کے پیچھے لپکا۔ یہ چھ سات ٹکڑے اچھی مالیت کے تھے۔ میریا اس کے پیچھے بھاگی۔ تنگ گلیوں میں اور لوگوں کے ہجوم کے درمیان ٹوکری سمیت بھاگنا آسان نہیں تھا۔ مارکس لوگوں سے ٹکرا رہا تھا اور دھکے دے رہا تھا۔ بچے اپنی چھوٹی جسامت اور پھرتی کی وجہ سے آگے نکل گئے تھے۔ وہ اتنے پراعتماد تھے کہ بھاگتے ہوئے ہنس رہے تھے۔ پھر ایک بچے نے اچانک نیچے بیٹھ کر ٹانگ اڑائی اور تیز رفتاری میں مارکس اس سے ٹھوکر کھا کر گرا تو ٹوکری کی بچی ہوئی روٹیاں زمین پر بکھر گئیں۔ بچوں نے ان میں سے بھی اٹھائیں اور بھاگ نکلے۔

مارکس طیش میں اٹھا تھا کہ اسے میریا کی چیخ سنائی دی۔ وہ بچوں کو بھول کر میریا کی طرف لپکا تو اس نے دیکھا کہ میریا راہبوں اور عام لوگوں کے ایک ریلے میں پھنس کر اوپر قلعے کی طرف جارہی تھی۔ مارکس اس کے پیچھے بھاگا مگر یہاں ہجوم بے پناہ تھا، جب تک وہ قلعے کے سامنے والے صحن میں پہنچتا میریا نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی۔ وہاں لوگوں کا بے پناہ ہجوم تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ٹولیڈو کی ساری آبادی وہاں آگئی ہے اور یہ غلط بھی نہیں تھا۔ عام لوگوں کے ہجوم کو قابو میں رکھنے کے لیے ریاستی

سپاہی موجود تھے اور وہ کوڑے مار مار کر لوگوں کو ایک حد سے آگے جانے سے روک رہے تھے۔ مارکس لوگوں کو دھکیلتے اور میریا کو آواز دیتے ہوئے اسے تلاش کرنے لگا مگر وہ کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔

"مارکس۔" میریا کی آواز ایک طرف سے آئی تو وہ اس کی طرف لپکا۔ وہ عورتوں کے ایک ہجوم کے پاس موجود تھی۔ مارکس اس کے پاس آیا اور اسے سینے سے لگالیا۔ "تم ٹھیک ہونا؟"

"ہاں۔" میریا خوف زدہ لگ رہی تھی۔ "مجھے یہاں سے لے چلو، مجھے وحشت ہورہی ہے۔"

"ہم چلتے ہیں۔" مارکس نے کہا۔ "افسوس کہ آج کا نفع ضائع ہوگیا لیکن کوئی بات نہیں اگلے ہفتے ہم پھر آئیں گے۔" مارکس میریا کو بازو میں سمیٹے وہاں سے نکلنے لگا تھا کہ ایک ہنٹر بردار ریاستی سپاہی نے ان کا راستہ روک لیا۔

"کہاں جارہے ہو؟" وہ درشت لہجے میں بولا۔ "ابھی یہاں سے کسی کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔ سب کو سزا دیکھنا ہوگی۔"

"میرا گھوڑا... ٹوکریاں...۔" مارکس نے کہنا چاہا تو اس نے کوڑا جھٹکا اور خوفناک سی آواز پیدا ہوئی۔ وہ دونوں ڈر کر پیچھے ہوئے اور ہجوم کے ساتھ جا کھڑے ہوئے۔ صحن میں ایک طرف لکڑی سے چبوترا بنایا تھا جس کے ساتھ خشک لکڑی لگی تھی۔ اس سے کچھ دور قلعے کی گیلری تھی جہاں راہب جیکوئیس اور اس کے ساتھی موجود تھے۔ جیکوئیس کے اشارے پر اس کے نائب ریان سی نے بلند آواز سے اس عورت کے جرائم پڑھ کر سنانے شروع کیے جسے آج جادوگری کے الزام میں سزا دی جارہی تھی۔ پھر ایک پنجرے میں قید اس ادھیڑ عمر عورت کو وہاں لایا گیا اور اسے نکال کر چبوترے پر لگی بلی سے باندھ دیا گیا۔

"یہ اسے زندہ جلادیں گے۔" میریا نے سہمے انداز میں کہا۔

"ہاں، اس پر الزام ثابت ہوگیا ہے۔"

"پھر بھی یہ ظلم ہے۔" میریا بولی۔

"ششش آہستہ۔" مارکس نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

عورت کو باندھ کر ایک دس گیارہ سال کے لڑکے کو لایا گیا جس کے دونوں بازو دو سپاہیوں نے پکڑے ہوئے تھے۔ پھر کوڑے والا سپاہی آگے آیا اور بچے کی پشت پر کوڑے مارنے لگا۔ بندھی عورت جس طرح چلائی اور رونے لگی اس سے ظاہر تھا وہ اسی کا بیٹا تھا۔ میریا لرزنے لگی۔ "یہ ظلم کی انتہا ہے۔"

"ہاں، لیکن ہم کیا کرسکتے ہیں۔"

مارکس خود کو بے بس محسوس کررہا تھا لیکن میریا نے کچھ اور سوچا ہوا تھا وہ اچانک بھاگی اور جاکر بچے کی پشت سے چمٹ گئی۔ ساتھ ہی وہ التجا کررہی تھی کہ بچے کو نہ مارا جائے۔ کوڑے والے نے ہاتھ روک لیا۔ میریا کے لیے نہیں بلکہ گرینڈ ماسٹر آف ٹولیڈو کے لیے جو گھوڑے پر سوار تمکنت سے وہاں آیا تھا اور وہ عین میریا کے سامنے رکا، اسے دیکھتے ہی تمام سپاہی گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے تھے۔ میریا اچانک بچے کو چھوڑ کر کھڑی ہوئی تو نہ جانے کیوں گرینڈ ماسٹر کا گھوڑا بدک کر دونوں پیروں پر کھڑا ہوگیا۔ وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے سنبھل نہ سکا اور پشت کے بل گرا اس کی مرصع ٹوپی سر سے گرگئی۔ جب وہ اٹھا تو اس کا چہرہ غصے سے سیاہ پڑ گیا تھا۔ اپنی رعایا کے سامنے اس طرح گرنے سے اس کی بے عزتی ہوئی تھی اور اس کی ذمے دار اس کے خیال میں میریا تھی۔ وہ تلوار نکالتا ہوا میریا کی طرف بڑھا تھا۔ اس نے میریا کے بال پکڑ کر اس کی گردن اوپر کی اور تلوار کا وار کرنے والا تھا کہ اچانک ایک آواز گونجی۔

"رک جاؤ۔"

یہ راہب جیکوئیس تھا جس نے چوغہ پہن رکھا تھا۔ سوائے اس کے چہرے کے اور کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی گرینڈ ماسٹر سمیت سب گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے۔ جیکوئیس میریا کے پاس آیا، اس نے جھک کر اسے غور سے دیکھا۔ خوف و دہشت کے عالم میں بھی میریا کے حسن کی سحر انگیزی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ میریا نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اس کا چوغہ تھام لیا۔ "پلیز فادر...۔"

"میں فادر نہیں ہوں۔" جیکوئیس نے چوغہ واپس کھینچ لیا، وہ درشت لہجے میں بولا۔ "میں محتسب ہوں۔"

"آپ جو بھی ہوں اس عورت اور بچے کو معاف کردیں۔"

جیکوئیس اچانک جھکا اور اس نے لباس سے خنجر نکالتے ہوئے میریا کے ماتھے پر اس سے خراش ڈال دی۔ اس نے چیخ ماری تو جیکوئیس نے مڑتے ہوئے سپاہیوں کو حکم دیا۔ "یہ چڑیل ہے اسے گرفتار کرلو۔"

"نہیں۔" میریا چلائی مگر دو سپاہیوں نے اسے بازوؤں سے پکڑ لیا تھا۔ یہ دیکھ کر مارکس اس کی طرف بھاگا

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور میریا کو سپاہیوں سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ دیکھ کر اور سپاہی بھی آگئے تھے۔ مارکس چلا چلا کر کہہ رہا تھا کہ اس کی بیوی کو چھوڑ دیا جائے وہ چڑیل نہیں ہے، اس کی آواز اس وقت بند ہوئی جب ایک سپاہی نے تلوار کے دستے سے اس کے سر پر ضرب لگائی اور وہ تیورا کر نیچے گرا اور بے ہوش ہوگیا۔ سپاہی میریا کو گھسیٹ کر وہاں سے لے گئے تھے۔ اسی اثنا میں چبوترے کے اردگرد رکھی لکڑیوں کو آگ دکھا دی گئی۔ شعلوں کے ساتھ عورت کی چیخیں بھی بلند ہونے لگی تھیں۔ وہاں موجود لوگ شور مچا رہے تھے اور نعرے لگا رہے تھے، ان سب سے بے نیاز جیکوئیس اور اس کے ساتھی میریا سمیت وہاں سے جا چکے تھے۔ کچھ دیر بعد گرینڈ ماسٹر بھی اپنے سپاہیوں سمیت رخصت ہوگیا اور عوام بھی چلے گئے۔ صرف بے ہوش مارکس وہاں پڑا رہ گیا۔ عورت جل کر خاک ہوگئی تھی۔ مارکس کو ہوش آیا تو ایک بوڑھا شرابی اس کے پاؤں سے جوتا اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مارکس نے اٹھتے ہوئے اس کی گردن پکڑی تو وہ گھگیایا۔

''سینور... سینور میں سمجھا تم مر چکے ہو۔''

مارکس نے اس کا گریبان پکڑ کر جھٹکا دیا۔ ''میں زندہ ہوں اور میری بیوی کہاں ہے؟''

بوڑھے شرابی نے سارا تماشا دیکھا تھا۔ اس نے سر ہلایا اور قلعے کی عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہ اسے وہاں لے گئے ہیں۔''

مارکس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہاں کن لوگوں کو لے جایا جاتا تھا۔ وہ عمارت کی طرف بڑھا۔ وہاں سپاہی موجود تھے اسے روکا گیا تو اس نے بہت لجاجت سے سپاہیوں کو بتایا کہ اس کی بیوی کو الزام لگا کر قلعے میں قید کر دیا گیا ہے، وہ اس سلسلے میں کسی سے ملنا چاہتا ہے۔ سپاہیوں کو اس پر ترس آگیا اور انہوں نے اسے جیکوئیس کے نائب ریان سی کے دفتر پہنچا دیا۔ وہ چاروں طرف سے ایک جیسے کٹے بالوں والا جوان آدمی تھا۔ وہ واحد پڑھا لکھا فرد بھی تھا اور اس کے ذمے کسی بھی عدالتی کارروائی کو تحریر میں لانا بھی تھا۔ چرچ میں بھی وہ نائب تھا۔ اس نے اپنی عینک کے اوپر سے مارکس کو دیکھا اور ساتھ لانے والے سپاہی سے پوچھا۔ ''کون ہے، اسے کیوں لائے ہو؟''

مارکس آگے آیا اور لجاجت سے بولا۔ ''فادر، میریا بے قصور ہے۔''

''کون میریا؟''

''میری بیوی جناب... جسے ابھی گرفتار کیا گیا ہے۔'' اس نے کہا پھر اسے خیال آیا۔ ''فادر میرا نام مارکس زافر ہے۔ میریا زافر میری بیوی ہے، میں روٹی بنا کر ٹولیڈو میں فروخت کرتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے... اس کے بے قصور ہونے کا فیصلہ چرچ کی عدالت کرے گی۔''

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' مارکس آگے آنے لگا تو ایک سپاہی نے اسے روک لیا۔ ریان سی نے سرد لہجے میں کہا۔

''تمہیں بتا دیا ہے، جب اس کے بارے میں فیصلہ ہوگا تب تمہیں بھی بتا دیا جائے گا۔ اب تم جا سکتے ہو۔''

مارکس نے احتجاج کیا۔ ''فادر وہ بے قصور ہے، میں اسے جانتا ہوں وہ میری بیوی ہے۔''

''اسے لے جاؤ۔'' ریان سی نے سپاہی کو حکم دیا۔ اس نے مارکس کو پکڑ کر کھینچا۔ وہ چیختا چلاتا رہ گیا اور سپاہی اسے کھینچ کر باہر لے گیا۔

☆☆☆

میریا کو چرچ کی پہلی منزل پر بنے قید خانے تک لایا گیا، اس دوران میں وہ تہ خانے میں موجود عقوبت خانے سے گزری تھی جہاں قیدی مرد اور عورتوں کو طرح طرح کی سزائیں دی جا رہی تھیں۔ فولادی خول میں ایک شخص قید تھا اور وہ بھیانک آواز میں چلا رہا تھا۔ ایک شخص کو پتھر کی سل پر لٹا کر اسے دہکتی سلاخ سے داغا جا رہا تھا۔ ایک عورت کو سپاہی کھینچ کر ہال میں لا رہا تھا۔ اس کے ساتھ پتا نہیں کیا ہونے والا تھا۔ میریا یہ سب دیکھتے ہوئے لرزنے لگی تھی۔ اسے سیڑھیوں سے اوپر بنے قید خانے میں لایا گیا اور پھر اسے ایک کوٹھری کا دروازہ کھول کر اندر دھکیل دیا گیا تھا۔ وہاں ایک بوڑھی عورت پہلے سے موجود تھی۔ اس نے میریا کو دیکھا اور اس کے ماتھے کا زخم دیکھ کر مسکرائی۔ ''تو تمہیں بھی اس الزام میں پکڑا ہے جس میں، میں یہاں قید ہوں۔''

''کس الزام میں؟''

''چڑیل ہونے کے۔'' بوڑھی عورت نے کہا۔ ''یہ کٹ اسی کے ماتھے پر لگایا جاتا ہے جس پر چڑیل ہونے کا الزام لگے، یہ دیکھو۔'' اس نے اپنے سفید بکھرے بال ماتھے سے ہٹا کر دکھایا۔ اس کے ماتھے پر بھی مندمل ہو جانے والا زخم کا نشان تھا۔

''تم چڑیل ہو؟'' میریا نے سہمے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں، تو کیا تم نہیں ہو؟'' بوڑھی عورت حیرت سے بولی۔

میریا ڈر کر پیچھے ہٹی اور جلدی سے سینے پر کراس کا نشان بنایا۔ ''میں چڑیل نہیں ہوں۔''

بوڑھی عورت قہقہہ مار کر ہنسی۔ ''میں بھی نہیں ہوں لیکن ان لوگوں نے بنا دیا ہے۔''

میریا روہانسی ہونے لگی۔ ''ان لوگوں نے مارکس کو بھی مارا وہ نیچے گر گیا تھا۔ پتا نہیں اس کا کیا حال ہوگا؟''

''مارکس کون ہے؟''

''میرا شوہر... وہ روٹیاں بناتا ہے ہم یہاں روٹیاں بیچنے آئے تھے۔''

''خدا کرے وہ زندہ ہو۔'' بوڑھی عورت نے مایوسی سے کہا۔ ''لیکن اس کی زندگی کی زیادہ امید مت رکھنا اور اپنے بارے میں تو بھول جاؤ کہ تم اب زندہ یہاں سے جا سکو گی۔ جس پر ایک بار الزام لگ جاتا ہے اسے کوئی نہیں بچا سکتا۔''

میریا رونے لگی۔ ''میں چڑیل نہیں ہوں میں نے کبھی کوئی غلط کام نہیں کیا۔ میں خدا کو مانتی ہوں، یسوع کو مانتی ہوں۔''

''یہ لوگ نہیں مانتے۔'' بوڑھی عورت تلخ لہجے میں بولی۔ ''تمہارے سر سے خون بہہ رہا ہے ایک منٹ...'' وہ اٹھ کر دیوار تک گئی اور وہاں سے مکڑی کا جالا نکال کر لائی، وہ میریا کے زخم پر رکھنے لگی تو وہ پیچھے ہٹ گئی۔

''نہیں، میں یہ نہیں لگانے دوں گی۔''

''اس سے خون رک جائے گا۔''

بوڑھی عورت نے اصرار کیا مگر میریا نہیں مانی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور سپاہی نے میریا کو باہر آنے کا اشارہ کیا، وہ لرزتے قدموں سے باہر آئی، اس نے سپاہی سے پوچھا۔ ''میرا شوہر میرے ساتھ تھا وہ اب کہاں ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' سپاہی نے درشت لہجے میں کہا۔ ''چلو تمہیں راہب جیکوئیس نے طلب کیا ہے۔''

جیکوئیس اور اس کے ساتھی ایک ہال میں میریا کے منتظر تھے۔ عدالت کا منظر تھا۔ ریان سی ایک طرف بڑی سی کتاب لیے لکھنے کو تیار تھا۔ اس نے میریا سے کہا۔ ''تم پر الزام ہے تم نے جادوگری سے گرینڈ ماسٹر کے گھوڑے کو خوفزدہ کر کے اسے گرنے پر مجبور کیا۔''

''میں نے ایسا کچھ نہیں کیا، مجھے نہیں معلوم کہ گھوڑا کیوں بدکا تھا؟''

''تم نے ایک جادوگرنی کے بچے کو بچانے کی کوشش کی کیونکہ تم خود جادوگرنی ہو اور تمہیں اس سے ہمدردی تھی۔'' ریان سی نے اس کی تردید ان سنی کر کے دوسرا الزام لگایا۔

''مجھے اس پر ترس آگیا تھا، وہ معصوم بچہ تھا۔''

''جھوٹ، وہ جادوگرنی کا بچہ تھا۔'' جیکوئیس کے ساتھ بیٹھے بروڈی فالس نے گرج کر کہا۔ وہ اذیت خانے کا انچارج تھا اور بذات خود ملزموں کو اذیت دے کر اعتراف جرم کراتا تھا۔ وہ میریا کو خوفناک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''اسے میرے حوالے کریں میں دو منٹ میں اس سے اقرار کرا لوں گا۔''

''نہیں۔'' جیکوئیس نے انکار کیا۔ ''ابھی یہ پہلے درجے میں ہے، اسے سوچنے کی مہلت دی جائے گی۔''

دوسرے درجے میں قیدی کو ڈرا دھمکا کر اور دوسروں کو دی جانے والی ایذا کا منظر دکھا کر اقرار جرم پر مجبور کیا جاتا تھا اور تیسرے درجے میں اسے خود اذیت دی جاتی تھی اور اس وقت تک دی جاتی تھی جب تک وہ اقرار جرم نہ کر لے یا مر جائے۔ پہلی صورت میں بھی موت اس کا مقدر ہوتی تھی کیونکہ اقرار جرم کے بعد سرعام آگ میں جلانے کی سزا دی جاتی تھی۔ جیکوئیس پرخیال نظروں سے میریا کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے میریا سے سوال جواب کے بعد اسے واپس بھیجنے کا حکم دیا۔ بروڈی کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے اس حکم سے مایوسی ہوئی تھی۔ سپاہی میریا کو واپس قید خانے لے گیا۔

☆☆☆

مارکس قلعے کی عقبی سمت سے اوپر چڑھ رہا تھا۔ اس طرف ڈھلان تھی اگر درخت اور جھاڑیاں نہ لگے ہوتے تو وہ آسانی سے اوپر نہیں آسکتا تھا۔ پھر بھی یہ آسان کام نہیں تھا، اگر میریا کی محبت نہ ہوتی تو وہ کبھی قلعے میں داخل ہونے کی کوشش نہ کرتا مقامی لوگوں میں یہ قلعہ خوف و دہشت کا نشان تھا۔ وہ فصیل تک پہنچا تو ڈوبتے سورج کی کرنوں میں قلعے کی دیواریں نمایاں تھیں۔ وہ اوپر آیا تھا کہ قلعے کی عمارت کا مرکزی دروازہ کھلنے لگا۔ مارکس لپک کر ایک آڑ میں ہوگیا۔ دروازہ کھلا اور ایک خادم کچرے کی ٹرالی لیے نمودار ہوا لیکن اس پر کچرا نہیں تھا بلکہ ایک آدمی کی لاش پڑی تھی۔ اس کی حالت بتا رہی تھی کہ اسے تشدد کر کے ہلاک کیا گیا ہے۔ خادم نے لاش فصیل سے نیچے دھکیل دی اور واپس جانے لگا تھا کہ مارکس اس کے سامنے آگیا۔ خادم بدکا۔ ''کون ہو تم... کیا چاہتے ہو؟''

''سنو، میں اندر جانا چاہتا ہوں۔'' مارکس نے التجا

WWW.PAKSOCIETY.COM

کی۔ ''میری بیوی اندر قید ہے میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''بغیر اجازت کوئی اندر نہیں جا سکتا۔''

''تم چاہو تو مجھے لے جا سکتے ہو۔'' مارکس نے روٹی کی فروخت سے ملنے والے سکوں کی تھیلی نکالی اور دو سکے اسے دیے۔ خادم نے حریص نظروں سے تھیلی کی طرف دیکھا۔

''اگر یہ سب دیدو تو میں تمہیں اندر لے جاؤں گا۔''

اس وقت وہ مارکس سے اس کی جان بھی مانگتا تو وہ انکار نہ کرتا، اس نے تھیلی خادم کے حوالے کر دی۔ وہ خوش ہو گیا۔ ''گاڑی کے نیچے لٹک جاؤ اور نظر مت آنا ورنہ پکڑے جاؤ گے۔''

مارکس کسی طرح گاڑی کے نیچے لٹک گیا اور خادم اسے چلاتا ہوا اندر لے گیا۔ اس نے ایک ہال میں پہنچ کر مارکس کو آواز دی۔ ''باہر آ جاؤ، اگر پکڑے گئے تو میرا نام مت لینا۔''

''میں تمہارا شکر گزار ہوں بس یہ بتا دو کہ قیدی کہاں رکھے جاتے ہیں؟''

''اسی راستے پر آگے تہ خانہ ہے اس کے آخر میں سیڑھیاں اوپر جا رہی ہیں، قیدی وہیں رکھے جاتے ہیں۔'' خادم کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ اس کے جاتے ہی مارکس اسی راہداری میں آگے بڑھ گیا۔ یہاں پہرا تھا لیکن پہریدار مستقل حرکت میں تھے۔ جب وہ اپنی جگہ سے ہٹتے تو مارکس جلدی سے آگے بڑھ جاتا تھا۔ تعزیب خانہ اس وقت خالی تھا۔ اس کے آخر میں سیڑھی اوپر جا رہی تھی۔ قیدیوں کو سب سے الگ تھلگ اور انتہائی تنگ و تاریک جگہ رکھا جاتا تھا۔ وہ مختلف کوٹھریوں میں جھانکنے لگا، کسی میں مرد تھے اور کسی میں عورتیں تھیں۔ ایک عورت نے اچانک اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کربناک لہجے میں بولی۔

''خدا کے لیے مجھے یہاں سے نکالو۔''

''شی شی۔'' مارکس نے گھبرا کر اس سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔ وہ دبی آواز میں میریا کو پکار رہا تھا۔ اچانک اسے میریا کی آواز سنائی دی۔

''مارکس... میرے مارکس...''

مارکس لپک کر اس کوٹھری تک پہنچا۔ فولادی دروازے کے اوپر چھوٹی سی کھڑکی تھی۔ میریا اس کے پیچھے تھی۔ مارکس کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ناقابل یقین خوشی نمودار ہوئی۔ ''میریا تم ٹھیک ہو نا؟''

''ہاں مارکس لیکن تم یہاں کیسے آئے؟''

''چھپ کر۔'' مارکس نے کہا اور دروازے کی کنڈی کھول دی۔ میریا آزاد ہوتے ہی اس کے گلے لگ گئی۔

''مجھے یہاں سے لے چلو۔''

''یہ کیا ہوا؟'' مارکس نے اس کے ماتھے کا نشان دیکھ لیا۔

''کچھ نہیں، معمولی سا زخم...... بس چلو یہاں سے۔'' میریا جلدی سے بولی۔ بوڑھی عورت بھی دروازے تک آ گئی تھی۔ مارکس نے میریا کا ہاتھ پکڑا لیکن اس سے پہلے کہ وہ حرکت کرتے بروڈی سپاہیوں کے ساتھ اندر آ گیا۔ اس کے ساتھ وہی خادم تھا جس نے مارکس سے رشوت لے کر اسے اندر پہنچایا تھا۔ وہی ان لوگوں کو یہاں لایا تھا اور سپاہیوں کے پیچھے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ مارکس شدید غیظ سے اس کی طرف بڑھا لیکن سپاہیوں نے اسے قابو کر لیا تھا۔ میریا چلائی۔

''اسے چھوڑ دو... اسے جانے دو۔''

لیکن سپاہیوں نے مارکس کو گرا کر اس کی مشکیں کس لیں۔ بروڈی میریا کی طرف بڑھا اور اس کے بال مٹھی میں جکڑ لیے۔ وہ میریا کی تکلیف کی پروا کیے بغیر اسے کھینچتا ہوا اذیت خانے میں لایا۔ سپاہی مارکس کو ایک کوٹھری میں ڈال چکے تھے۔ میریا رو رہی تھی اور آنے والے وقت کے خوف سے کانپ رہی تھی۔ بروڈی نے اسے دھکا دے کر اس سل پر لٹایا جس کے اوپر چرخی لگی تھی۔ اس نے پہلے میریا کے دونوں ہاتھ اوپر چرخی کی رسی سے باندھے پھر اس کے پاؤں سل کے دوسری طرف موجود رسی سے باندھ دیے۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس نے چرخی گھمائی تو میریا کا نازک جسم کھنچ گیا۔ وہ چلائی تھی کہ ریان سی ایک کتاب سنبھالے وہاں آ گیا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے، یہ ابھی پہلے درجے سے گزر رہی ہے۔''

بروڈی نے مزید چرخی گھمائی اور دانت نکال کر بولا۔

''اسے بالآخر یہیں آنا ہے۔''

''لیکن درجہ بہ درجہ...'' ریان سی مضطرب لہجے میں بولا۔ ''اسے کچھ ہوا تو کون جواب دے گا؟''

''اس سے پہلے یہاں لوگوں کے ساتھ جو ہوا ہے اس کا کسی نے جواب طلب کیا ہے؟'' بروڈی نے چرخی گھمانا جاری رکھا اور اب میریا کا جسم انتہائی حد تک کھنچ گیا تھا۔ اس کی چیخیں ہال میں گونج رہی تھیں اور اچانک ہی وہ بے ہوش ہو گئی۔ اسی لمحے جیکوئیس کی گرجدار آواز آئی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟''

سب اسے دیکھتے ہی جھک گئے تھے۔ بروڈی بد حواس ہو گیا تھا، وہ جلدی جلدی بتانے لگا کہ ملزمہ نے فرار کی کوشش کی تھی اور اسے سزا دی جا رہی تھی۔ جیکوئیس خاموشی سے سنتا اور انہیں گھورتا رہا۔ پھر وہ میریا تک آیا اور جھک کر اسے دیکھا۔ اس نے خود اس کے ہاتھ اور پاؤں کھولے اور پھر اسے گود میں اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''اب یہ میری تحویل میں رہے گی، میں خود اس کا فیصلہ کروں گا۔''

جیکوئس میریا کو اٹھائے وہاں سے چلا گیا اور وہ سب ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

☆☆☆

میریا کو ہوش آیا تو خلاف توقع وہ اذیت میں نہیں تھی بلکہ ایک آرام دے بستر پر لیٹی تھی اور اس پر ایک ہلکی چادر پڑی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی تھی کہ سامنے جیکوئیس کو دیکھ کر چونک گئی۔ وہ دونوں ہاتھ آپس میں باندھے اسے ہی دیکھ رہا تھا، چوغہ کا سرپوش ذرا پیچھے سرک گیا تھا اور میریا نے دیکھا کہ وہ گنجا تھا البتہ اس کے کانوں کے اوپر بالوں کی ایک لکیر بنی تھی جو رخسار تک آ رہی تھی۔ میریا بستر پر سمٹ کر بیٹھ گئی، اس نے ملتجی لہجے میں کہا۔ ''فادر میں بے گناہ ہوں اور میرا شوہر بے قصور ہے، وہ میری محبت میں یہاں چلا آیا خدا کے لیے اسے جانے دیں۔''

''اسے کچھ نہیں ہوگا۔'' جیکوئیس نے مضطرب انداز میں کہا۔ ''لیکن اس کے لیے تمہیں میری بات ماننا ہوگی۔''

''کیسی بات؟''

''آؤ میرے ساتھ۔'' جیکوئیس نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے اٹھایا اور اپنے ساتھ لے کر سیڑھیاں اترتا ہوا ایک جگہ پہنچا۔ یہاں دیوار میں رنگین شیشہ لگا تھا اور اس کے وسط میں ایک شفاف شیشہ تھا جس سے دوسری طرف دیکھا جا سکتا تھا۔ جیکوئیس نے جھانک کر دوسری طرف دیکھا اور پھر میریا کو اشارہ کیا۔ اس نے جھانک کر دیکھا تو اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی تھی۔ مارکس فولادی کرسی پر بندھا بیٹھا تھا اور اس کے نیچے لکڑیاں رکھی جا رہی تھیں۔ جیکوئیس نے میریا کو پیچھے کھینچ لیا اور آہستہ سے بولا۔ ''تم نے دیکھ لیا، میرے ایک اشارے پر کرسی کے نیچے آگ جلا دی جائے گی اور مارکس زندہ جل جائے گا۔''

''نہیں، خدا کے لیے نہیں۔'' میریا رونے لگی۔ ''میں تمہاری ہر بات مانوں گی اسے چھوڑ دو، اسے جانے دو۔''

جیکوئیس اسے واپس اپنے کمرے میں لے آیا، اس نے میریا کے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور پھر انہیں سونگھ کر دیکھا۔ ''میریا تم بہت خوب صورت ہو، میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔''

گھر۔ اُداس۔ ویران
جو اولاد نہیں

آج بھی ہزاروں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ اولاد نہ ہونے سے دوسری شادی یا طلاق جیسے گھریلو جھگڑے، اُداسیاں اور جدائیاں جنم لے رہی ہیں۔ آپ خدا تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں کیونکہ مایوسی تو گناہ ہے۔ ہم نے صرف دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں پر ریسرچ کر کے ایک ایسا خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کر لیا ہے جس کے استعمال سے ان شاء اللہ آپ کے ہاں بھی خوبصورت اولاد پیدا ہو سکتی ہے۔ آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھل سکتے ہیں۔ آج ہی فون پر اپنی تمام علامات سے آگاہ کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوالیں۔ خدا کے لئے ہمارا بے اولادی کورس ایک دفعہ تو آزمالیں اور خدارا اپنے گھر کے ماحول کو توجنت بنالیں۔

المُسلم دارالحکمت رجسٹرڈ
ضلع حافظ آباد۔ پاکستان
0301-6690383
0300-6526061
فون اوقات
صبح 10 بجے سے عصر 4 بجے تک

WWW.PAKSOCIETY.COM

میریا نے وحشت سے اسے دیکھا۔ ''لیکن آپ فادر ہیں۔''
''میں فادر نہیں ہوں، میں کیتھولک چرچ کا ملازم نہیں ہوں۔'' جیکوئیس نے غصے سے کہا۔ ''تم میری بات مان رہی ہو یا نہیں۔''
میریا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ مارکس پر آنچ آتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اسے اپنی عزت بھی عزیز تھی۔ اگر مارکس کا مسئلہ نہ ہوتا تو وہ جان کے بدلے بھی جیکوئیس کی بات نہ مانتی۔ لیکن مارکس کی محبت نے اسے کمزور کر دیا تھا۔ اس کے آنسوؤں نے جیکوئیس کو بتا دیا کہ وہ ہار مان گئی ہے۔ وہ اس کے قریب آیا۔ میریا دل ہی دل میں خدا سے دعا کر رہی تھی کہ وہ اسے بچائے اور اس وقت جب اسے لگ رہا تھا کہ وہ بچ نہیں سکے گی۔ اچانک جیکوئیس پیچھے ہٹ گیا، اس کا چہرہ متغیر ہو رہا تھا اس نے اچانک میریا کو بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور غرا کر بولا۔ ''چڑیل، تو نے میری مردانہ صلاحیت ختم کر دی ہے تو نے جادو کیا ہے۔ تو زیر لب کیا کہہ رہی تھی؟''
''میں نے جادو نہیں کیا ہے۔'' میریا اندر سے خوش ہوگئی۔ ''میں تو خدا سے دعا مانگ رہی تھی۔''
''جھوٹ، تو جادو کر رہی تھی۔'' جیکوئیس بولا۔ ''تو اگر زندہ رہی تو میرے بارے میں سب کو بتا دے گی۔'' اس نے کہتے ہوئے میریا کا گلا دبوچ لیا۔ ''تجھے مر جانا چاہیے۔''
میریا اس کے ہاتھوں میں کسی بے بس چڑیا کی طرح پھڑپھڑانے لگی، اس کا منہ کھل گیا تھا اور زبان باہر نکل آئی تھی۔ جیکوئیس نے اس کی زبان دیکھی اور اچانک اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اس نے میریا کو چھوڑا تو وہ بے ہوش ہو کر نیچے گر گئی۔ جیکوئیس کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے اپنا خنجر نکالا اور میریا کا منہ کھول کر اس کی زبان باہر کھینچی۔ اگلے لمحے وہ میریا کی زبان کا اگلا حصہ کاٹ چکا تھا۔ میریا کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ تڑپنے لگی۔ تکلیف اسے ہوش میں لے آئی تھی۔ اس کے منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ پھر بے ہوش ہوگئی۔ جیکوئیس نے اپنا سر تھام لیا تھا، اس نے زیر لب کہا۔ ''میریا مجھے معاف کر دینا میں مجبور ہوں۔''
وہ اس کا خون روکنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے میریا کو منہ نیچا کر کے لٹایا تاکہ خون اندر نہ جائے اور پھر کپڑے کی گدی بنا کر اس کی زبان پر رکھی۔ اس کے پاس خون روکنے والا سفوف تھا جسے وہ وقفے وقفے سے میریا کی زبان پر چھڑک رہا تھا بالآخر اس کی کوشش رنگ لائی اور خون رک گیا مگر میریا کو ہوش نہیں آرہا تھا۔ جیکوئیس تھوڑی دیر بعد ٹھنڈا دودھ اس کے منہ میں ٹپکا رہا تھا اس کا بھی اثر نہیں ہوا تھا۔ وقت گزرتا رہا اور جیکوئیس کی وحشت بھی بڑھتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ ہوش میں کیوں نہیں آ رہی ہے۔ وہ دعا کرتا رہا، اس کا بھی اثر نہیں ہوا پھر اسے ایک خیال آیا اس نے بروڈی کو طلب کیا اور اس سے کہا۔
''میریا جس کوٹھری میں قید تھی اس کی ساتھی عورت کو یہاں لاؤ۔''
بروڈی چونکا لیکن اس میں اعتراض یا سوال کی مجال نہیں تھی اس نے حکم کی تعمیل کی اور بوڑھی عورت کو وہاں لے آیا۔ پھر جیکوئیس کے حکم پر سب وہاں سے چلے گئے۔ جیکوئیس بوڑھی عورت کو میریا کے پاس لایا اور بولا۔ ''یہ بے ہوش ہے اسے ہوش میں لاؤ۔''
''اسے کیا ہوا ہے، میں کیسے ہوش میں لاؤں؟''
''اس نے میری شان میں گستاخی کی تھی قدرت نے اس کی زبان کاٹ کر اسے سزا دی۔'' جیکوئیس نے صفائی سے جھوٹ بولا۔ ''لیکن اس کے بعد یہ ہوش میں نہیں آرہی ہے۔''
بوڑھی عورت نے طنزیہ نظروں سے جیکوئیس کی طرف دیکھا۔ ''تم اتنے ہی برگزیدہ ہو تو اسے ہوش میں بھی لے آؤ، مجھ سے کیوں کہہ رہے ہو؟''
''میں اسے ہوش میں لا سکتا ہوں لیکن یہ چڑیل ہے اس لیے مجھے اجازت نہیں ہے۔'' جیکوئیس ڈھٹائی سے بولا۔ ''میں کسی چڑیل پر اپنی روحانی صلاحیتیں استعمال نہیں کر سکتا۔ اسے کوئی چڑیل ہی ہوش میں لا سکتی ہے اور تم چڑیل ہو۔''
بوڑھی عورت کچھ دیر اسے دیکھتی رہی۔ ''اگر میں اسے ہوش میں لے آئی تو مجھے اس سے کیا فائدہ ہوگا؟''
''میں تجھے معاف کر دوں گا اور آزاد کر دوں گا۔''
''مجھے تمہاری بات کا اعتبار نہیں ہے۔'' بوڑھی عورت نے صاف گوئی سے کہا۔ ''دوسرے یہ ہوش میں آگئی تو تم زندہ نہیں رہو گے، تم صرف ایک صورت میں زندہ رہ سکتے ہو کہ یہ مر جائے۔''
جیکوئیس کا چہرہ متغیر ہوگیا۔ ''یہ مر جائے...؟''
''ہاں، یا تو یہ مرے گی یا تم... فیصلہ تم پر ہے اب تم سوچ لو۔'' بوڑھی عورت نے معنی خیز انداز میں کہا۔
جیکوئیس کے لیے یہ بہت مشکل مرحلہ تھا، وہ میریا سے محبت کرنے لگا تھا حالانکہ وہ محبت نام کی چیز سے ناواقف تھا۔ اس کے حکم پر بے شمار انسانوں کو بہت زیادہ اذیت دے کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا، ان میں مرد عورت ا

WWW.PAKSOCIETY.COM

بوڑھے بچے سب شامل تھے۔ اسے کبھی کسی کے مرنے سے دکھ نہیں ہوا بلکہ جب کوئی اس کے حکم پر موت کے گھاٹ اتارا جاتا تو اسے عجیب سی خوشی ہوتی تھی۔ مگر میریا کی موت کا فیصلہ کرنا اس کے لیے آسان نہیں تھا، اس نے بوڑھی عورت کو گھورا۔ ”تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ یہ بچ گئی تو میں مرجاؤں گا۔“

”میں چڑیل ہوں، میں سب جانتی ہوں۔“ وہ سکون سے بولی۔ ”وقت کم ہے جلدی فیصلہ کرو اسے ہوش آگیا تو پھر میں بھی کچھ نہیں کرسکوں گی۔“

بالآخر جیکوئیس نے فیصلہ کرلیا۔ بے شک اسے میریا سے محبت تھی لیکن وہ ابھی مرنا نہیں چاہتا تھا، اس نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے اسے ختم کردو۔“

”میں اسے ختم کردوں گی لیکن اس کے لیے مجھے تنہائی چاہیے، مجھے عمل کرنا ہوگا تاکہ اس کے عمل کا توڑ ہو سکے۔ یہی عمل تمہاری جان لینے والا تھا تمہاری خوش قسمتی کہ تم نے مجھے بلالیا۔“

”تم کیا کروگی؟“

”میں تمہیں نہیں بتاسکتی اور مجھے مکمل تنہائی چاہیے اگر کسی نے دیکھ لیا تو نہ صرف میری بلکہ اس کی جان بھی خطرے میں پڑجائے گی اور ہاں تمہیں ایک کام اور کرنا ہوگا۔“

”کیسا کام؟“

”جب میریا مرجائے تو تم اس کی لاش اس کے شوہر کے حوالے کردو گے اور انہیں یہاں سے نکال دینا۔ اس کے شوہر سے کہنا کہ اسے ٹولیڈو کی حد سے باہر لے جاکر دفن کرے۔“

”وہ کس لیے؟“

”تاکہ اس کے اثرات تم پر نہ پڑیں۔“

جیکوئیس بادل ناخواستہ راضی ہوا اور بوڑھی عورت کو میریا کے ساتھ چھوڑ کر وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی بوڑھی عورت نے دروازہ اندر سے بند کیا اور میریا کے پاس آئی۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”میریا، تم ایک اچھی لڑکی ہو اور میری خواہش ہے کہ تم بہت دن زندہ رہو لیکن...“

تقریباً ایک گھنٹے بعد بوڑھی عورت نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ جیکوئیس باہر سپاہیوں سمیت موجود تھا۔ وہ اندر آیا اور سپاہیوں کو باہر رکنے کا اشارہ کیا۔ بوڑھی عورت اسے میریا کے پاس لائی جو اب بالکل ساکت تھی۔ پہلے اس کا سینہ معمولی سی حرکت کررہا تھا اب وہ بھی چپ ہوگیا تھا۔ بوڑھی عورت نے اشارہ کیا۔ ”دیکھ لو، یہ زندہ نہیں ہے۔“

جیکوئیس نے جھک کر میریا کے سینے سے کان لگایا۔ اس کا دل ساکت تھا پھر اس نے میریا کی ناک کے سامنے آئینہ رکھا اس پر ذرا بھی بھاپ نہیں آئی تھی۔ جیکوئیس نے مطمئن ہوکر سر ہلایا۔ اس نے دروازہ کھولا اور سپاہیوں کو اندر بلاکر بوڑھی عورت کی طرف انگلی اٹھائی۔ ”اسے لے جاؤ۔“

سپاہی بوڑھی عورت کی طرف بڑھے تھے کہ اس نے اطمینان سے کہا۔ ”مجھے معلوم ہے تم مجھے معاف نہیں کرو گے۔ میں زندہ جلادی جاؤں گی، مجھے اس کی پروا بھی نہیں ہے۔ لیکن میں تمہیں خبردار کررہی ہوں، میریا اور اس کے شوہر کے بارے میں جو کہا ہے اگر اس سے ذرا بھی ہٹے تو نتیجے کے خود ذمے دار ہوگے۔“

”میں ایسا ہی کروں گا۔“ جیکوئیس نے آہستہ سے کہا اور سپاہی بوڑھی عورت کو پکڑ کر وہاں سے لے گئے۔

☆☆☆

مارکس بہت دیر سے اس کرسی پر بندھا ہوا تھا، پہلے اس کا خیال تھا کہ اسے بٹھاتے ہی نیچے آگ لگادی جائے گی۔ بروڈی اور اس کے ساتھی اسے دہشت زدہ کرنے کے لیے بتارہے تھے کہ مرنے سے پہلے وہ اپنے جلتے گوشت کی بوسونگھے گا مگر اسے باندھ کر وہ وہاں سے چلے گئے۔ نہ جانے کتنی دیر گزر گئی تھی۔ اس کا جسم بندھے بندھے سن ہو گیا تھا۔ پھر ایک سپاہی آیا اور اس نے مارکس کو کھولا۔ ”چلو تمہیں بلایا گیا ہے۔“

مارکس بڑی مشکل سے اٹھا اور پھر گر گیا۔ سپاہی کھڑا اسے دیکھتا رہا اور اسے خود ہی اٹھنا پڑا۔ وہ اس کے ساتھ تہہ خانے سے باہر آیا تو صحن میں ایک تابوت دیکھ کر اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ وہ وحشت زدہ ہوکر چلایا۔ ”کس کا ہے... یہ تابوت کس کا ہے؟“

”خاموش۔“ بروڈی نے سختی سے کہا۔ ”تمہاری بیوی مرگئی ہے یہ اس کا تابوت ہے۔“

”مرگئی۔“ مارکس پاگل ہونے لگا۔ ”تم لوگوں نے اسے ماردیا چڑیل قرار دے کر۔“

”وہ چڑیل نہیں تھی۔“ جیکوئیس نے کہا۔

”پھر... پھر اسے کیوں مارا؟“

”اسے مارا نہیں، شیطان نے اس کے جسم پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی اس لیے خدا نے اسے اپنی امان میں لے لیا۔ تم اسے لے جاؤ اور ٹولیڈو کی حدود سے باہر کہیں دفن کرنا۔“

مارکس تابوت سے لپٹ گیا اور دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ ایک گھوڑا گاڑی تابوت اور مارکس کو لے جانے کے

لیے تیار تھی۔ تابوت اس پر بار کیا گیا۔ مارکس نے خود پر قابو پالیا تھا۔ قلعے سے باہر نکل کر اس نے اپنا گھوڑا لیا اور اس پر سوار ہوکر اپنے گھر کا رخ کیا۔ گھوڑا گاڑی والا تابوت اتروا کر واپس چلا گیا۔ مارکس تابوت سے لپٹ کر رونے لگا تھا۔ وہ میریا کو پکار رہا تھا جو اس کی پکار سے دور جاچکی تھی۔ پھر اسے خیال آیا کہ وہ میریا کو دیکھے۔ اس نے چاقو کی مدد سے تابوت کا اوپری تختہ الگ کیا۔ اندر میریا نئے اور زرق برق لباس میں یوں لیٹی تھی جیسے سورہی ہو۔ مارکس کو لگا وہ زندہ ہے، اس نے بے تابی سے اسے تابوت سے نکالا اور اندر لے آیا۔ بستر پر لٹاکر اس نے میریا کے دل کی دھڑکن اور نبض دیکھی۔ دونوں ساکت تھیں۔ مارکس کا دل ڈوبنے لگا۔ ایسا کیسے ہوسکتا تھا۔ اس کی رنگت ذرا بھی تبدیل نہیں ہوئی تھی۔ ویسی ہی گلابی تھی۔ جلد نرم تھی۔ مارکس نے لاشیں دیکھی تھیں، وہ جانتا تھا کہ انسان مرنے کے بعد کیسے بدل جاتا ہے۔ لیکن میریا بالکل نہیں بدلی تھی حتیٰ کہ اس کا جسمانی درجۂ حرارت بھی لاش جیسا نہیں تھا، وہ گرم نہیں تھی لیکن بالکل سرد بھی نہیں ہوئی تھی۔ مارکس اس کے ہاتھ پاؤں سہلانے لگا، اسے محبت سے پکارنے لگا۔

مارکس یہ سب بے اختیار کررہا تھا اندر سے وہ سمجھ رہا تھا کہ میریا اب زندہ نہیں ہے اس لیے جب اچانک ہی میریا کراہی اور ہلی تو وہ اچھل پڑا پھر اس نے بے تابی سے میریا کی نبض اور دل کی دھڑکن چیک کی۔ وہ چل پڑی تھی۔ میریا کراہ رہی تھی اور سر ہلارہی تھی۔ مارکس جلدی سے پانی لے آیا اور اس نے پانی ڈالنے کے لیے میریا کا منہ کھولا تو اس کی کٹی زبان دیکھ کر اس کا دل جیسے شدت غم سے رکنے لگا تھا۔ اس کی بیوی پر اتنا بڑا ظلم ہوا تھا۔ اس کی زبان کاٹ دی گئی تھی اور اب وہ ساری عمر نہیں بول سکتی تھی۔ لیکن یہ خوشی بھی کم نہیں تھی کہ میریا زندہ تھی۔ اس کی کوششوں سے وہ ہوش میں آگئی مگر وہ بولنے سے قاصر تھی۔ اس نے اشاروں میں مارکس کو سمجھانے کی کوشش کی اور مارکس بس اتنا سمجھا کہ کسی بوڑھی عورت نے میریا کے منہ میں کچھ ڈالا اور وہ سو گئی۔ اس نے یہ کہا تھا کہ وہ اپنے شوہر کو لے کر یہاں سے دور چلی جائے ورنہ جیکوئیس انہیں مار ڈالے گا۔ مارکس پریشان ہوگیا۔ اس نے میریا سے کہا۔

”ہم یہاں سے کہاں جائیں یہ ہمارا گھر ہے۔“

میریا بول نہیں سکتی تھی لیکن اس کی آنکھیں التجا کررہی تھیں کہ وہ اسے لے کر یہاں سے چلا جائے۔ اس سے پہلے کہ جیکوئیس کو حقیقت کا پتا چلے اور وہ انہیں دوبارہ پکڑ کر قید خانے میں پہنچادے۔ مارکس نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے میری زندگی، ہم یہاں سے جارہے ہیں۔“

مارکس نے اپنا اور میریا کا سامان لیا۔ اپنی جمع پونجی لی اور میریا کو گھوڑے پر بٹھا کر وہاں سے روانہ ہوگیا۔ اسے معلوم تھا اس کے قرض خواہ اس کا گھر قبضے میں کرلیں گے مگر اسے اب واپس نہیں آنا تھا اس لیے اسے گھر کی پروا نہیں تھی۔

☆☆☆

ٹولیڈو کے لوگ حیران تھے کیونکہ خلاف معمول ہفتے کے علاوہ بھی کسی کو سزا دی جانے والی تھی، اوپر قلعے میں مخصوص گھنٹیاں بج رہی تھیں اور لوگوں کو ہانک کر اوپر لے جایا جارہا تھا۔ سزا کے لیے لکڑی کا چبوترا تیار تھا اور اس کے آس پاس لکڑی بھی چن دی گئی تھی بس اسے آگ دکھانے کی دیر تھی۔ جب لوگ جمع ہوگئے تو گیلری میں جیکوئیس اور اس کے ساتھی نمودار ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد پنجرے میں بوڑھی عورت کو وہاں لایا گیا اور ریان سی اس کی فرد جرم پڑھ کر سنانے لگا۔ بوڑھی عورت مسکرا رہی تھی وہ ذرا بھی ہراساں نہیں تھی۔ فرد جرم سنانے کے بعد اسے پنجرے سے نکالا گیا تو لوگ نعرے لگانے لگے، وہ اسے گالیاں دے رہے تھے اور بعض چیزیں پھینک کر ماررہے تھے۔ سپاہی اسے چبوترے پر لائے اور اسے بلی سے باندھ دیا۔ جیکوئیس سامنے موجود تھا۔ اس کے اشارے پر بروڈی نے لکڑیوں کو آگ لگادی۔ بوڑھی عورت نے جیکوئیس کی طرف دیکھا اور بلند آواز سے بولی۔

”جیکوئیس... تو دھوکا کھا گیا ہے، تو مجھے سزا دے سکتا ہے لیکن ان لوگوں کو نہیں۔“

یہ سن کر جیکوئیس مضطرب ہوگیا۔ شعلے اب بوڑھی عورت تک پہنچ گئے تھے اور اس کی چیخیں بلند ہورہی تھیں۔ جیکوئیس پلٹ کر اندر چلا گیا۔ اس کے کچھ دیر بعد سپاہیوں کا ایک گھڑسوار دستہ قلعے سے نکلا اور مارکس و میریا کے گھر کی طرف روانہ ہوگیا جب وہ وہاں پہنچا تو مکان خالی تھا۔ تابوت بھی خالی تھا۔ مارکس اور میریا دونوں غائب تھے۔ ایک گھنٹے بعد سپاہیوں نے جیکوئیس کو رپورٹ کی تو اس کا چہرہ ستا گیا تھا، اس نے خود سے کہا۔ ”وہ ٹھیک کہہ رہی تھی میں دھوکا کھا گیا۔“

اگلی صبح جیکوئیس کی لاش اس کے بستر پر پائی گئی، اس کا خنجر اس کے سینے میں اترا ہوا تھا اور اس کے سرہانے ایک وصیت تھی جس میں اس نے میریا سے محبت کا اعتراف کیا تھا اور اس نے وصیت کی تھی کہ اسے قلعے کے صحن میں دفن کیا جائے

WWW.PAKSOCIETY.COM

لیکن اسے اکیلے دفن نہ کیا جائے بلکہ میریا اور مارکس کو تلاش کر کے لایا جائے اور ان تینوں کو ایک ساتھ دفنایا جائے۔ تب تک اس کی لاش اس کے حجرے میں رکھی جائے۔

☆☆☆

میں اور ماریا دم بہ خود سے انتونیو سے یہ کہانی سن رہے تھے۔ یہ تو گائڈ کی بتائی ہوئی کہانی سے بالکل ہی مختلف تھی۔ جب وہ چپ ہوا تو میں نے کہا۔ ”کیا راہب جیکویمس کی لاش ابھی تک اس کے حجرے میں ہے؟“

”بالکل، کیونکہ اس کی وصیت پوری نہیں ہو سکی تھی۔“ انتونیو نے سر ہلایا۔ ”اس واقعے کے بعد محتسب چرچ ختم کر دیا گیا تھا بلکہ سرے سے چرچ ہی ختم کر دیا تھا۔ اوپری حصہ جہاں جیکویمس کی رہائش تھی اسے بند کر دیا گیا۔“

ماریا کے چہرے پر ناپسندیدگی تھی۔ ”وہ شخص اسی انجام کا مستحق تھا؟“

انتونیو کا چہرہ ایک لمحے کو متغیر ہوا تھا لیکن فوراً ہی سپاٹ ہو گیا۔ ”شاید ایسا ہی ہے۔“

”اس کا مطلب ہے میریا اور مارکس بچ نکلنے میں کامیاب رہے تھے؟“

”ہاں کیونکہ جیکویمس کے مرنے کے بعد کسی نے ان کی تلاش میں دلچسپی نہیں لی تھی۔“ انتونیو نے آہستہ سے کہا۔

”اچھا ہی ہوا۔“ ماریا نے کہا اور کھڑی ہو گئی۔ ”جمی اب ہمیں چلنا چاہیے۔“

انتونیو نے ہماری طرف دیکھا۔ ”کیا تم لوگ جیکویمس کا حجرہ دیکھنا نہیں چاہو گے؟“

”تم نے کہا تھا کہ وہ جگہ بند کر دی ہے۔“

”ہاں، عام لوگوں کے لیے بند ہے لیکن میں عام نہیں ہوں میں جیکویمس کے خاندان سے ہوں، میں وہاں جا سکتا ہوں کہ وہ میرے اجداد میں سے تھا۔ میرے پاس اس حصے کی چابی ہے۔“

میں سوچ رہا تھا کہ یہ خاصی پرکشش اسٹوری ہو گی اور اگر میں تصویریں بھی شامل کر لوں تو یقیناً یہ آنے والے شمارے کی ٹاپ اسٹوری بن سکتی تھی۔ میں نے ماریا کی طرف دیکھا۔ ”میرا خیال ہے ہمیں چل کر دیکھنا چاہیے۔“

”میں نہیں جاؤں گی۔“

”پچھلے پانچ سو سال میں سوائے خاندان کے لوگوں کے کوئی فرد اس حجرے میں نہیں گیا ہے۔“ انتونیو نے انکشاف کیا۔

”میں نے کہا نا میں نہیں جاؤں گی۔“ ماریا برہم ہو گئی۔

”تب تم یہیں انتظار کرو۔“ میں نے کہا۔ ”میں مسٹر انتونیو کے ساتھ ہو کر آتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے میں یہیں ہوں۔“ ماریا واپس بیٹھ گئی میں نے محسوس کیا اس پر کہانی کا گہرا اثر ہوا تھا۔ وہ جیکویمس سے نفرت کرنے لگی تھی اور کیونکہ انتونیو اس کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا اس لیے وہ اسے بھی ناپسند کر رہی تھی۔ وہ اس جگہ نہیں جانا چاہتی تھی جہاں اس کی ہم جنس پر ظلم ہوا اور ظلم کرنے والا وہاں موجود تھا بے شک وہ ایک لاش ہی تھی گر تھی تو جیکویمس کی لاش۔ ماریا کو وہیں چھوڑ کر ہم اندر آئے۔ اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ طویل راہداری سے گزر کر ہم اس جگہ پہنچے جہاں سیڑھیاں تہ خانے میں اتر رہی تھیں وہیں ایک سیڑھی اوپر کی طرف جا رہی تھی۔ ہم اس سے چڑھ کر اوپر آئے۔ ایک بڑا لکڑی کا دروازہ تھا یہ بہت پرانا تھا لیکن اس میں لگا تالا نیا تھا۔ انتونیو نے چابی نکالی اور تالا کھول دیا۔ ہم اندر آئے۔ اندر سے یہ حصہ خاصا بڑا تھا۔ کم سے کم تین بڑے کمرے تھے جن میں سے ایک جیکویمس کی خواب گاہ تھی اور پانچ صدی پہلے کے حساب سے یہ خاصا سجا ہوا تھا، وہاں لکڑی کا بہترین فرنیچر تھا اور فرش پر دبیز قالین بچھے ہوئے تھے اگرچہ ان پر ڈھیروں مٹی جم گئی تھی۔ میں نے کیمرا سنبھال لیا۔

”جیکویمس کی لاش اس کمرے میں ہے۔“ انتونیو نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے خود آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تھا۔ یہاں ایسا سسٹم تھا کہ دن کی روشنی ہر جگہ آ رہی تھی اور مصنوعی روشنی کی ضرورت نہیں تھی۔ میں اندر آیا۔ ایک چھپر کھٹ پر ہلکی چادر سے ڈھکی لاش پڑی تھی۔ چادر تلے اس کے ڈھانچا ہو جانے والے نقوش نمایاں تھے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ کیا گائڈ اور دوسرے لوگ اس حقیقت سے واقف نہیں تھے۔ میں یہ سوال کرنے کے لیے انتونیو کی طرف مڑ رہا تھا کہ کوئی چیز میرے سر سے ٹکرائی۔ وار میں بہت قوت تھی، میں نیچے گرا اور ساکت ہو گیا۔ میرا ذہن ڈوب رہا تھا اور میں کوشش کے باوجود ہوش میں نہ رہ سکا۔ مگر میں زیادہ دیر بے ہوش نہیں رہا تھا۔ ایک تو وار صحیح جگہ نہیں لگا تھا، میرا سر گھومنے سے بچت ہوئی تھی دوسرے مجھے خطرے کے احساس نے جھنجوڑ دیا۔ مجھے لگا ماریا کے ساتھ کچھ غلط ہونے والا ہے۔ وہ قلعے میں اکیلی تھی اور انتونیو مجھ پر وار کر کے جا چکا تھا۔

میں بڑی مشکل سے کھڑا ہوا۔ میرا کیمرا غائب تھا صرف کیمرا نہیں میرا پرس اور موبائل بھی غائب تھا۔ یقیناً یہ سب انتونیو لے گیا تھا۔ میں لڑکھڑاتے قدموں سے باہر نکلا اور پھر بہت مشکل سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا۔ مجھے رہ رہ کر چکر آ رہے تھے۔ مگر کھلی فضا میں آنے کے بعد حالت بہتر ہوئی تھی۔ ماریا صحن میں نہیں تھی جہاں میں اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ میرا دل ڈوب گیا۔ ماریا یہاں سے خود نہیں جا سکتی تھی اسے لے جایا گیا تھا۔ لیکن کہاں لے جایا گیا تھا؟ قلعے سے باہر لے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ گیٹ پر گارڈ تھا۔ ماریا قلعے میں تھی۔ ایسی کون سی جگہ تھی جہاں ماریا کو لے جایا جا سکتا تھا۔ واٹر کولر سے پانی لے کر میں نے پیا اور سر پر ڈالا تو میری حالت بہتر ہوئی تھی۔ سوچتے ہوئے اچانک مجھے تہ خانے کے اوپر قید خانے کا خیال آیا جہاں کسی زمانے میں قیدی رکھے جاتے تھے۔ وہاں کوٹھریاں تھیں۔ میں جلدی سے تہ خانے میں آیا۔ سیڑھیاں اس کے کونے میں تھیں۔ اس طرف جاتے ہوئے میں نے وہ سلاخ اٹھا لی جسے آگ میں دہکا کر کبھی قیدیوں کو داغا جاتا تھا۔ میں سیڑھیوں تک آیا تھا کہ مجھے ماریا کے چلانے کی آواز آئی۔

”دور رہو مجھ سے۔“

اس کے ساتھ ہی انتونیو کی وحشیانہ ہنسی سنائی دی۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی تھی۔ میں تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا۔ ماریا کی چیخیں تیز ہو رہی تھیں۔ پھر وہ مجھے نظر آ گئی۔ انتونیو اسے ایک کوٹھری میں لے آیا تھا اور اسے نیچے گھاس پر گرا کر دبوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ماریا مزاحمت کر رہی تھی۔ میں دبے قدموں کوٹھری کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہوا اور سلاخ گھما کر انتونیو کے سر پر ماری۔ اس وار کے پیچھے میری ساری قوت تھی۔ سلاخ لگتے ہی انتونیو نیچے گرا اور ساکت ہو گیا۔ ماریا جو آنکھیں بند کیے ہوئے تھی چونک کر اٹھی اور پھر مجھے دیکھ کر دیوانہ وار لپٹ گئی۔ وہ سسکیاں لے رہی تھی۔ بڑی مشکل سے وہ خاموش ہوئی اور اس کی حالت بہتر ہوئی تھی۔ پھر اس نے بتایا کہ اچانک انتونیو وہاں آیا اور اس نے کہا۔ ”مسٹر جیمز اچانک بے ہوش ہو گئے ہیں۔“

”میں پریشان ہو گئی اور سوچے سمجھے بغیر اس کے ساتھ یہاں آ گئی۔ یہاں آتے ہی اس نے مجھے کوٹھری میں دھکا دیا اور مجھے قابو کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ اس وقت بالکل وحشی اور دیوانہ لگ رہا تھا۔ وہ مجھ سے کھیل رہا تھا، کبھی پکڑ لیتا اور کبھی چھوڑ دیتا تھا۔“

میں نے جھک کر انتونیو کو دیکھا وہ بے ہوش تھا لیکن اس کی نبض ٹھیک چل رہی تھی۔ اس کے کھلے منہ سے رال بہہ رہی تھی۔ اگر وہ دیوانہ تھا تو بہت ہوشیار تھا، اس نے کیسے چالاکی سے مجھے ماریا سے الگ کیا اور پھر ماریا کو دھوکے سے اندر لے گیا جہاں اس کی فریاد سننے والا بھی کوئی نہ ہوتا، اگر مجھے بروقت ہوش نہ آتا تو نہ جانے اس پر کیا گزر جاتی۔ میں اور ماریا باہر گیٹ تک آئے۔ ایک گھنٹے کے اندر وہاں پولیس اور طبی عملہ آ گیا تھا۔ ابتدائی طبی امداد کے بعد انتونیو کو اسپتال منتقل کر دیا گیا تھا۔ میرا کیمرا، پرس اور موبائل ضروری نشانات لینے کے بعد واپس مل گئے تھے اور ہم ہوٹل واپس آ گئے۔ ماریا اتنی خوفزدہ تھی کہ اسی وقت یہاں سے جانا چاہتی تھی۔ مگر پولیس نے ہمیں روک دیا کہ ہم اس وقت تک نہیں جا سکتے جب تک انتونیو پر فرد جرم نہ عائد ہو جائے۔

اگلی صبح مقامی پولیس چیف ہوٹل آیا اور اس نے بتایا کہ انتونیو ایک نفسیاتی مریض ہے۔ اس کا تعلق جیکویمس کے خاندان سے نہیں ہے۔ بلکہ وہ جیکویمس سے بہت متاثر تھا، اسے پہلے بھی کئی بار یہاں آنے والے سیاحوں کو ہراساں کرنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا مگر اس کی ذہنی حالت کی وجہ سے اسے سزا نہیں ہو سکی تھی۔ البتہ اس بار امکان تھا کہ اسے جیل نہ سہی لیکن طویل عرصے کے لیے کسی نفسیاتی اسپتال ضرور بھیج دیا جائے گا۔ پولیس چیف نے ہمیں جانے کی اجازت بھی دے دی تھی۔ ماریا نے سکون کا سانس لیا۔ ”شکر ہے، اب ہم یہاں سے جا سکتے ہیں۔“

”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جیکویمس کی سوچ آج بھی زندہ ہو گی۔“ میں نے کہا۔ ”انتونیو نے ہمیں جھوٹی کہانی سنائی تھی۔ یہ قبریں درحقیقت جیکویمس، میریا اور مارکس کی ہیں۔ میریا اور مارکس فرار ہوتے ہوئے پکڑے گئے تھے اور جیکویمس کی وصیت کے مطابق انہیں قتل کر کے اس کے ساتھ ہی دفنا دیا گیا تھا۔“

اس حقیقت نے ہمیں دکھی کر دیا تھا۔ ہم تو خوش تھے کہ میریا اور مارکس بچ نکلنے میں کامیاب رہے تھے۔ مگر پھر اس خیال نے دکھ کم کر دیا کہ ہم زندہ تھے۔ جیکویمس کامیاب رہا تھا لیکن انتونیو ناکام ہو گیا تھا۔ وہ ہمیں جدا نہیں کر سکا تھا اور نہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوا، ماریا بچ گئی تھی۔ جب ہم ٹولیڈو سے واپس روانہ ہوئے تو راستے میں میں نے کہا۔ ”ماریا میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

”میں بھی جمی۔“ اس نے میرے شانے سے سر ٹکا لیا۔

”بس تو ہم واپس جاتے ہی ایک ہو جائیں گے۔“ میں نے کہا تو وہ بے ساختہ ہنس دی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

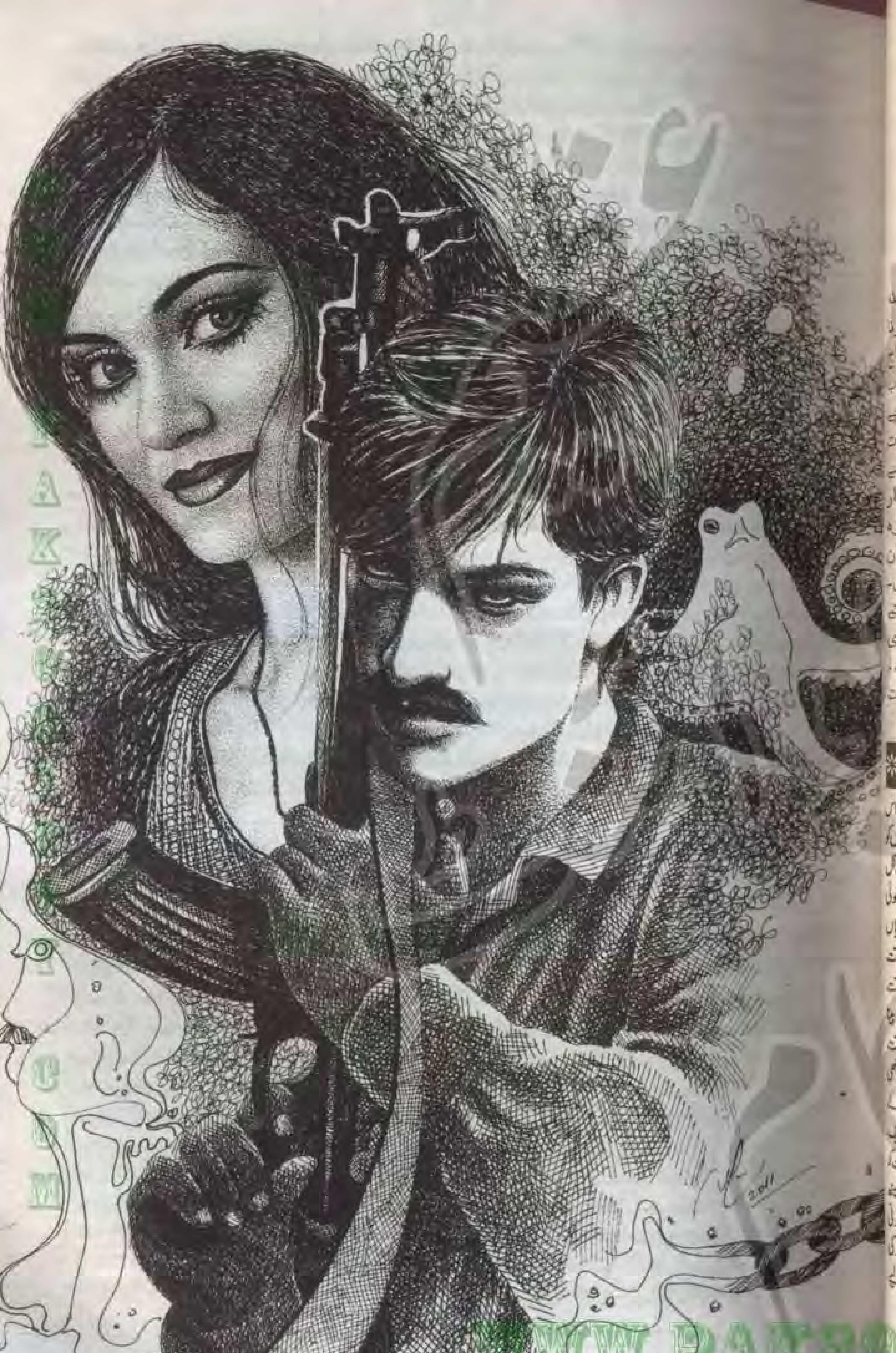

قسط نمبر : 28

اسرار اور تحیر کے پردے میں لپٹا ایک منفرد طویل سلسلہ

کشکول

انوار صدیقی

زندگی کی داستان بھی کتنی عجیب ہے... جو کہیں احساسات کا آئینہ ہے تو کہیں حادثات کا مجموعہ... کسی کو سنوارنا کسی کو بکھیرنا اس زندگی کا مشغلہ... یوں کہیں گلشن کہیں ویرانہ اس کا مزاج ٹھہرا... زندگی کو برتنے والا یہ انسان... زندگی سے کہیں زیادہ عجیب فطرت کا مالک نکلا جو کہیں ہوش ربا حسن کے طلسم کدوں میں قید ہے تو کہیں بیابانوں کی سرگوشیوں میں گم... انہی تجربات، احساسات اور حادثات کے زیر اثر اس کی شخصیت تعمیر، تخریب کے مراحل سے گزرتے ہوئے سنورتی یا بکھرتی رہتی ہے۔ کبھی محبت کی شبنمی پھوار اس کے دل میں گل و گلزار کھلاتی ہے تو کبھی نفرت کی زہریلی آگ میں وہ خود بھسم ہو کے بھی پشیمان نہیں ہوتا ایسے میں مخالف ہوائیں انسان کو بے وزن پتوں کی طرح اپنی مرضی کی سمت میں اڑا لے جاتی ہیں۔ جہاں جرائم کے بے تاج بادشاہ بے بسی کو پیروں تلے روند کر خوش ہوتے ہیں، جہاں روپ بہروپ کی اس دنیا میں بھکاری بھی ہیں اور کھلاڑی بھی... محیر العقول واقعات اور ذہنی کرشمہ سازیوں سے مزین... ایک منفرد اور جداگانہ اسلوب کی صورت سسپنس کے صفحات پر... صرف آپ کے لیے۔

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

کشکول کی داستان لیاقت حسین کے گرد گھومتی ہے جس کا تعلق نوشہرہ کے شہر جہانگیرہ سے تھا، اس کے باپ سردار سرفراز خان نے اپنی پگ کبھی جھکنے نہیں دی تھی، اس نے لیاقت حسین کا رشتہ اس لڑکی سے کرنا چاہا جہاں اس نے زبان دے رکھی تھی جبکہ لیاقت حسین نے فرحین نامی لڑکی کو زبان دے رکھی تھی۔ لیاقت حسین کی ماں کو بھی فرحین کا رکھ رکھاؤ پسند تھا چنانچہ لیاقت حسین نے باپ کی مخالفت کی اور ماں کی دعائیں لے کر فرحین سے شادی کے بعد شہر آ گیا جہاں اس نے اپنے دوست گل خان کی کچی بستی میں رہنا پسند کیا جو قدیم قبرستان سے متصل تھی۔ فرحین نے ایک رات قبرستان میں ایک سیاہ فام دراز قد شخص پرتاب بھوشن کو برہنہ حالت میں کوئی پراسرار عمل کرتے دیکھا تو وہ خوفزدہ ہو گئی۔ دوسرے دن لیاقت حسین کو فرحین کی نشاندہی والی قبر سے ایک لیموں ملا جس میں سفلی کے گندے عمل والی جان لیوا سوئیاں پیوست تھیں۔ لیاقت حسین نے گل خان کے منع کرنے کے باوجود خدا کا نام لے کر لیموں سے سوئیاں نکال کر پھینک دیں اور پریشانیوں میں گھر گیا۔ گل خان لیاقت حسین کو ایک بزرگ کے پاس لے جاتا ہے لیکن وہاں تک ان کی رسائی نہیں ہوتی۔ گل خان واپسی کے لیے رکشا لینے جاتا ہے تو پیچھے ایک نابینا شخص سے لیاقت حسین کی ملاقات ہوتی ہے۔ نابینا کے اصرار پر لیاقت حسین جب دوبارہ بزرگ کی چھولداری کی سمت جاتا ہے تو نہ کوئی ان دونوں کو دیکھتا ہے نہ روکتا ہے۔ نابینا خود چھولداری کے باہر رک کر لیاقت حسین کو اندر جانے کو کہتا ہے جہاں ایک بزرگ ہستی آنکھیں بند کیے استغراق میں محو تھی۔ بزرگ ہاتھ کے اشارے سے لیاقت حسین کو بلاتا ہے۔ ایک چٹکی خاک اٹھا کر لیاقت حسین کے منہ میں ڈال دیتا ہے۔ بعد میں نابینا لیاقت حسین کو سخت تاکید کرتا ہے کہ وہ خاک کی اس چٹکی کا ذکر کبھی زبان پر نہ لائے یہ ہدایت دے کر نابینا نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ خاک کی وہ چٹکی خداوند کریم کا کرشمہ ثابت ہوتی ہے۔ لیاقت حسین کو ہر آنے والے خطرے کا احساس لاشعوری طور پر ہو جاتا ہے۔ اور اسکی وجہ سے وہ محفوظ رہتا ہے اسی دوران ایک دو منزلہ مکان میں آگ کے شعلے بھڑکتے ہیں۔ جہاں ایک ضعیف عورت موجود تھی۔ اس کے قریبی عزیز دار بھی مایوسی کے عالم سے دوچار تھے جب لیاقت حسین اس موقع پر اللہ کا نام لے کر اندر جاتا ہے اور بوڑھی عورت کو زندہ و سلامت نکال لاتا ہے۔ اسی عورت کے بیٹے کے ذریعے لیاقت حسین کی رسائی سیٹھ عثمان تک ہوتی ہے جہاں اسے بطور ڈرائیور ملازم رکھ لیا جاتا ہے۔ سیٹھ عثمان اور ان کی اہلیہ راحیلہ بیگم سلجھے ہوئے ہمدرد لوگ تھے۔ سیٹھ عثمان کاروباری شخص تھا۔ کاروباری میدان میں شیخ حامد بہ ظاہر سب کا دوست تھا لیکن وہ اندرونی طور پر مافیا کا مقامی سرغنہ اور انڈر ورلڈ کا ایک خطرناک فرد تھا جو پولیس کو مطلوب تھا۔ شیخ حامد کا خاص آدمی "بلیک ٹائیگر" تھا۔ لیکن براہ راست وہ بھی شیخ حامد کی اصلیت سے ناواقف تھا۔ شیخ حامد کے مخالفین میں سرفہرست میڈم روبی تھی جو اس سے اپنے شوہر خالد ریاض کی موت کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ اس مقصد کے لیے

WWW.PAKSOCIETY.COM

میڈم روبی نے بھی انڈر ورلڈ کی تنظیم سے تین خطرناک افراد ڈوما، لوچن اور سیاہ فام ہاشم کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ ان افراد کو سیون اسٹار کے پاس ورڈ سے احکامات دیے جاتے تھے۔ افضل خان شیخ حامد کا ملازم اور خاص آدمی تھا۔ وہ اپنے دفتر کی ایک ساتھی شبنم کو پسند کرتا ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ شبنم بھی اندرونی طور میڈم روبی سے گٹھ جوڑ کر چکی ہے۔ وہ بھی شیخ حامد سے اپنی مرحوم ماں کا قرض چکانے کی خاطر موقع کی تلاش میں تھی۔ شیخ حامد اپنے کارندوں کے ذریعے میڈم کو اغوا کرا کے اس کی مخرب اخلاق تصویریں حاصل کرنے کی پلاننگ کرتا ہے۔ لیاقت حسین کی بیوی فرحین کو بھی اغوا کراتا ہے مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوتیں موقع پر اس کے آڑے آجاتی ہیں۔ ان ہی ریشہ دوانیوں میں افضل خان بھی زیرِ عتاب آجاتا ہے۔ شبنم اسے شیخ حامد کے اشارے پر اپنے فلیٹ پر لے آتی ہے۔ بعد میں وہ شبنم کے کہنے پر ایک اور بڑے تاجر رستم علی آغا خانی اور اس کی بیوی کی قابلِ اعتراض تصاویر ریوالور کی نوک پر حاصل کر لیتا ہے۔ ایماندار آئی جی علیم کے ریٹائر ہونے کے بعد اس کی جگہ آغا منظور احمد نیا آئی جی مقرر ہوتا ہے۔ وہ بھی شیخ حامد کے اوپر تک تعلقات ہونے کے سبب اس کا راستہ کاٹنے کی جرأت نہیں کرتا۔ ایک ڈی ایس پی سراج بھی بہ ظاہر شیخ حامد کا دوست بن کر اسے خوش فہمی میں مبتلا کر دیتا ہے لیکن اسے فوراً ہی آئی جی علیم احمد کے علم میں لے آتا اور کر دیتا ہے۔ سراج ایماندار اور فرض شناس آفیسر ہے۔ ایک نئے ایس پی اورنگ زیب کے آجانے کے بعد اس کے ہاتھ اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔ چونکہ اورنگ زیب کے بھی کچھ تعلقات مرکز سے تھے اس لیے وہ کسی کے دباؤ میں نہیں آتا۔ اسی بنا پر اس کی اور شیخ حامد کی ٹھن جاتی ہے۔ اسی دوران شیخ حامد کی بیوی صبا بیگم شوہر کی عیاشیوں سے تنگ آچکی تھی خودکشی کر لیتی ہے۔ وہ شیخ حامد کے بارے میں بہت ساری اہم باتوں کو تحریری شکل دے کر سراج کو آخری بار فون کرتی ہے تاکہ وہ اس کی تحریر کو لے جائے۔ سراج وہ تحریر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن شیخ حامد کو مرنے والی کے موبائل سے اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ اس نے مرنے سے پیشتر آخری کال سراج کو کی تھی۔ سراج کو قابو کرنے کی خاطر وہ اس کی بیوی الماس کو اغوا کرا لیتا ہے مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوت بروقت سراج کے ذریعے الماس کو رسوائی سے بچا لیتی ہے۔ ایس پی اورنگ زیب صبا بیگم کی خودکشی کی تفتیش شروع کرتا ہے۔ انسپکٹر دانش جس کے پاس صبا بیگم کی اہم فائل تھی سراج کو بھی اس سے آگاہ کر دیتا ہے۔ مگر شیخ حامد اس پورے تھانے کو دانش سمیت آگ لگوا دیتا ہے۔ سیٹھ عثمان حالات سے دور اور محفوظ رہنے کی خاطر اپنی رہائش کے قریب دوسری کوٹھی خرید کر اپنا ہیڈ آفس بنا لیتا ہے۔ اسی کوٹھی کی انیکسی میں لیاقت حسین اور فرحین بھی رہائش اختیار کرتے ہیں۔ شیخ حامد ایک موقع پر لیاقت حسین کو بھی اغوا کرا لیتا ہے۔ اس موقع پر لیاقت حسین کا ہم شکل (ہمزاد) لیاقت حسین کو نکل جانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ پرتاب بھوشن جو سفلی کا ماہر تھا، اپنے والے عمل کی ناکامی کے بعد لیاقت حسین کو مار ڈالنے کی خاطر برابر اپنی شیطانی قوتوں سے کام لیتا ہے مگر رحمانی قوتیں اسے کامیاب نہیں ہونے دیتیں۔ دریں اثنا میڈم روبی سیون اسٹار کے پاس ورڈ سے سیاہ فام ہاشم اور جہانگیر بٹ عرف جگا کو شیخ حامد کی رہائش گاہ پر حملہ کرنے کا حکم دیتی ہے جس سے شیخ حامد اور جہانگیر ہو جاتا ہے۔ اسی دوران وہ اپنی ذاتی سیکریٹری کنول سے شادی کر کے اس کو پوش علاقے کے ایک بنگلے میں رکھتا ہے۔ بعد میں شیخ حامد کو پے در پے دو جھٹکے لگتے ہیں۔ ایک طرف ایس پی اورنگ زیب تھانے میں آگ لگنے کی واردات میں ملوث پا کر لودھی کو معطل کرا دیتا ہے۔ دوسری جانب میڈم روبی کے ایجنٹ ہاشم اور ڈوما شیخ حامد کے اہم ترین آدمی "بلیک ٹائیگر" کو گھیر کر موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ سراج جو لیاقت حسین کی ماورائی قوتوں کے حوالے سے خدمات حاصل کر لیتا ہے، اب اورنگ زیب، سراج اور لیاقت حسین مل جل کر شیخ حامد کو گھیرنے کی پلاننگ کرتے ہیں۔ سیاہ فام ہاشم کو سیون اسٹار کی جانب سے بگ باس کو ختم کرنے کی اجازت مل جاتی ہے لیکن ایک غلطی کی وجہ سے اسے خودکشی کرنی پڑتی ہے۔ اسی دوران رستم علی آغا خانی کو فون پر دھمکی ملتی ہے جسے اس کا بیٹا دارا سن لیتا ہے۔ دارا اپنے دوست سابق میجر عاطف کو حالات سے باخبر کر دیتا ہے۔ اورنگ زیب اور سراج اسپتال سے ملازمہ گلابو کی خودکشی کی تفتیش کر کے واپس لوٹ رہے تھے جب لیاقت حسین اچانک گاڑی کا رخ پھیر دیتا ہے۔ وہ ایسا نہ کرتا تو سب موت کے منہ میں چلے جاتے۔ دوسری جانب شیخ حامد کی کنول سے شادی کی سہاگ رات کی ساری کارروائی مووی کیمرے کے ذریعے محفوظ کر لی جاتی ہے۔ لیاقت حسین فرحین کو اس کے ایک رشتے دار کی موت کی خبر سن کر اسے گاؤں بھیج دیتا ہے۔ دوسری جانب جگا اور اپنے سرپرست امداد علی کے پاس پہنچ کر اسے صورتِ حال سے آگاہ کرتا ہے مگر امداد علی اسے فی الحال صبر کی تلقین کرتا ہے۔ شبنم اور افضل خان کے فلیٹ سے شبنم کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ شیخ حامد کی کوٹھی پر حملہ ہوتا ہے جس پر وہ چراغ پا ہوتا ہے اور پولیس کے سربراہ کو سخت سست سناتا ہے اور نگزیب ملزمان کو گرفتار کر کے سخت پوچھ گچھ کرتا ہے جس کے نتیجے میں کئی انکشافات سامنے آتے ہیں جبکہ سراج کی بیوی الماس کے اغوا کی کوشش ناکام بنانے کی سعی میں پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کر لیتی ہے اور اس پر تشدد کیا جاتا ہے۔ ایس پی اورنگزیب اینڈ کمپنی شیخ حامد کے خلاف گھیرا تنگ کرتی ہے۔ شبنم کے اغوا کا ڈراما بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا، اورنگزیب نے شبنم سے مل کر اسے اعتماد میں لیا اور وہ ان کا ساتھ دینے پر راضی ہو گئی۔ دوسری جانب شیخ حامد کے ایجنٹ نے اسے الماس کے اغوا میں لیاقت حسین کے سبب ناکامی کی اطلاع دی اور بتایا کہ پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کر کے لے گئی ہے جہاں ایس پی اورنگزیب نے اس کارروائی کو ڈکیتی کی واردات کا رنگ دے کر رپورٹ بنائی ہے۔ گاؤں سے فرحین نے فون پر اطلاع دی کہ شاہ پری کے ذریعے اسے معلوم ہوا ہے کہ لیاقت کے باپ کی کسی سیٹھ سے کاروباری بدمزگی ہوئی ہے، لیاقت حسین جان گیا کہ سیٹھ عثمان سے ہی معاملہ ہوا ہے لہٰذا اس نے ان سے مل کر اپنی اصلیت ظاہر کرتے ہوئے گلے شکوے دور کرا دیے۔ واپسی پر لیاقت پر قاتلانہ حملے کی ناکامی پر بچ جانے والے زخمی حملہ آور کو اپنی تحویل میں لے کر تمام کارروائی پر اپنے قابلِ اعتماد افسر کو ہدایت دیں۔ حملہ آور سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق بلیک ٹائیگر کے بعد نمبر نو کے کوڈ سے کام کرنے والے۔ ایجنٹ کی بنیادی حیثیت تھی جو انڈر ورلڈ میں اسلم ڈنکا کے نام سے جانا جاتا تھا۔ شیخ حامد کے رہائش گاہ پر لوچن اور ڈوما نے حملہ کر کے اسے تباہ کر دیا تھا۔ اسی حملے کے دوران ڈوما مارا گیا جبکہ لوچن کو ایس پی اورنگزیب نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اس کے تین اہم بندوں کی لاشیں بھی طابوت میں بند اس کی حویلی کے سامنے ڈال دی گئی تھیں اور کنول نے فون کر کے کسی اجنبی کی دھمکی آمیز کال کی اطلاع دی تھی۔ شیخ حامد سخت طیش کے عالم میں ڈی آئی جی آغا منظور سے جواب طلبی کرتا ہے اور ایس پی اورنگزیب کے رویے کی شکایت مرکزی وزیرِ داخلہ سے کرتا ہے اس پر اورنگزیب معذرت کر کے اس سے کچھ دن کی مہلت طلب کرتا ہے اور ناکامی کی صورت میں شیخ حامد کو فیصلے کا اختیار دیتا ہے۔ دوسری جانب لیاقت حسین کو سیٹھ عثمان اپنے آفس کا سپروائزر بنا کر اس کی تنخواہ میں اضافہ کر دیتا ہے لیاقت اپنی خوشی میں فرحین کو یاد کرتا ہے، اور اسی دوران پلید پرتاب بھوشن اپنے عمل کے ذریعے پجارن مدھو کو فرحین کے روپ میں لیاقت حسین کے پاس بھیجتا ہے لیکن یہاں بھی غیبی طاقت اسے بچا لیتی ہے۔ جبکہ

ثریا کے مشورے پر میڈم آغا منظور کے دل میں اپنے متعلق جذبات کے تحت اس سے ملاقات کا اہتمام کرتی ہے۔ یہ ملاقات ان دونوں کے مابین رشتے کی آمادگی پر منتج ہوتی ہے۔ دوسری جانب افضل خان غیر معمولی حالات میں دوسری جگہ منتقل کر دیا جاتا ہے اور اورنگزیب اس کی پاداش میں شبنم پر الزام لگا کر اسے بگ باس کے حوالے کرنے کا عندیہ دیتا ہے جو کہ اس کی ایک چال بھی ہو سکتی ہے۔ افضل خان اور شبنم دوبارہ بگ باس کی تحویل میں چلے گئے۔ افضل خان، اسلم ڈنکا کی زیرِ نگرانی بگ باس کے احکامات کا پابند تھا یہاں اس سے جگا کو اس کے سرپرست امداد علی کے ذریعے پھانسنے کا کام لیا گیا۔ کیونکہ جگا کے نام سے بگ باس کو چند تصویریں موصول ہوئی تھیں جن میں اس کے کنول کے ساتھ سہاگ رات کے مناظر واضح تھے۔ دوسری جانب لوچن کی ملاقات زخمی قیدی سے کرائی گئی جہاں اس نے اسے دیال سنگھ عرف دشنو کے طور پر شناخت کر لیا۔ لیاقت حسین گاؤں کو اس کی ماں نے حفاظت کے لیے ایک تعویذ دیا۔ شیخ حامد کے خلاف برسرِ پیکار گروپ میں ماسٹر مائنڈ کا کردار اورنگ زیب ادا کر رہا تھا جبکہ ملٹری انٹیلی جنس بھی اس اہم معاملے میں انوالو تھی اور شیخ حامد کے خلاف گھیرا تنگ سے تنگ تر ہوتا جا رہا تھا اگرچہ اس نے شبنم اور اسلم ڈنکا کو ختم کرنے کی کوشش کی لیکن اسے ناکامی کا سامنا ہوا۔ بالآخر بگ باس نے ہیلی کاپٹر میں فرار ہونے کی کوشش کی مگر سمندر برد ہو گیا، البتہ لاش نہ مل سکی۔ دوسری جانب دشنو اور لوچن کرنل احتشام کی گرفت سے فرار ہو گئے۔ اورنگ زیب اور سراج آرمی کے تعاون سے مجرموں کے گرد جال بن رہے تھے۔ لیاقت حسین اپنے والد کی شہر آمد پر خوش تھا مگر اسی دوران ان پر قاتلانہ حملہ ہو گیا۔ لیاقت حسین کی ماں نے جو کہ خود بھی لیاقت کی طرح ماورائی قوتوں کے زیرِ سایہ ہے کچھ مبہم تفصیلات فراہم کیں لیکن مکمل معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ اورنگ زیب ہنوز یہ ماننے پر تیار نہیں کہ شیخ حامد مر چکا ہے۔ حالانکہ اس خوشی میں ایک تقریب میں اسے قومی اعزاز بھی دیا گیا۔ اسی دوران لودھی بھی اورنگ زیب سے ملتا ہے لیکن اس کے بعد اس کا وحشیانہ قتل ہو جاتا ہے اور اس کے تانے بانے آکٹوپس یعنی بگ باس سے ملتے ہیں، میڈم روبی ڈی آئی جی سے نکاح پر تیار ہو گئی اور اس کا اعلان بھی کر دیا گیا۔ سرفراز خان واپس جانے پر بضد تھا لیکن اسے پندرہ دن کے لیے روک لیا گیا۔ شہر میں کئی وارداتیں ایسی ہوئیں جن میں آکٹوپس کی مہر استعمال کی گئی تھی۔ شیخ حامد کی موت یا حیات بدستور ایک معما بنی ہوئی تھی جبکہ اورنگ زیب اپنے موقف پر قائم تھا۔ شیخ حامد کی کوٹھی کو باوجود سخت پہرے کے تباہ کر دیا گیا۔ شیخ حامد کی بیوہ کنول کو دوبارہ اغوا کر لیا گیا اور اس کی ماں کو قتل۔ دوسری جانب راحیلہ بیگم کی کار جو کہ لیاقت حسین ڈرائیو کر رہا تھا، کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی ادھر ڈی آئی جی اور میڈم روبی کی منگنی کی تقریب منعقد کی گئی جس میں سراج اور اورنگ زیب کے علاوہ سیٹھ عثمان کی فیملی کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ منگنی کی رسم تو ادا کر دی گئی لیکن شادی کا اعلان نہیں کیا گیا اور اسے آکٹوپس کی موت کی تصدیق سے مشروط کر دیا گیا۔ شیخ حامد نے کنول کو طلاق دے کر اسے بری حالت میں ویران جگہ پھنکوا دیا، جگا کے فرنیچر کے شوروم کو بگ باس کے غنڈوں نے تباہ کر دیا۔ دشنو کو فون کے ذریعے بگ باس کی جانب سے چند شخصیات کو قتل کرنے کی ہدایت دی گئی جس کی اطلاع لوچن نے اورنگ زیب کو دے دی۔ لیاقت حسین کا سامنا پرتاب بھوشن سے ہوا مگر اس کی ماں کے دیے ہوئے نگینے نے اس کی رہنمائی اور حفاظت کی اور پرتاب کو پسپا ہونا پڑا۔ کنول نیند کی گولیاں کھا کر پہلے اخبار کے آفس پھر ملٹری آفس گئی اور انہیں بگ باس کے زندہ ہونے کی اطلاع دی۔ دوسرے دن کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہو گئی۔ لیاقت حسین کو رات میں آہٹ محسوس ہوئی چند حملہ آوروں نے اس کے گھر پر نقب لگائی تھی۔ فرحین کے اغوا کے لیے آئے ہوئے دشمنوں کو لیاقت حسین نے جہنم واصل کیا۔ فرحین تھوڑی زخمی ہوئی اسے اسپتال داخل کرا دیا گیا جہاں ایک جعلی میل نرس نے اسے زہر آلود انجکشن لگانے کی کوشش کی جو لیاقت حسین نے اپنی ماں کی دی ہوئی انگوٹھی کی نشاندہی کی بدولت ناکام بنا دی۔ دشنو انٹیلی جنس کی قید سے فرار ہو گیا۔ میڈم روبی کی سیکریٹری ثریا کو تنبیہ کے طور پر اغوا کر کے دھمکی کے بعد چھوڑ دیا گیا۔ اورنگ زیب اور سراج ایک نئے کردار سکندر علی شاہ کی فائل حاصل کر کے اس کے متعلق معلومات اکٹھی کرتے ہیں جس کی بیوی نگینہ شیلا اور ما کے بیوٹی پارلر میں جاتی رہی ہے اور شیلا اور ما اور جونی نوجوان لڑکیوں کی اسمگلنگ میں ملوث ہیں۔ دوسری جانب جگا اور لوچن شیخ حامد کی کوٹھی کو دھماکوں سے تباہ کر دیتے ہیں۔ آئی جی کا انتقال منظور نہیں ہو رہا تھا اسے "کوبرا" کے نام سے ایک کال موصول ہوئی جس میں اسے دھمکی دی گئی کہ وہ لیاقت حسین کا معاملہ حل کرے یا اورنگ زیب کا تبادلہ کر دے بصورتِ دیگر اسے اور اس کی مرحومہ بیوی کو خفیہ تصاویر کے ذریعے اخبارات میں بدنام کر دیا جائے گا۔ لہٰذا وہ جو پہلے اورنگ زیب کو اپنے مکمل تعاون کا یقین دلا چکا تھا اس کا تبادلہ منظور کر لیا اور اورنگ زیب اس کی مجبوری بھانپ گیا لیکن بظاہر دونوں کے درمیان تلخی قائم ہو گئی۔ دشنو کو افضل خان کے ذریعے پکڑ لیا گیا۔ اورنگ زیب نے اپنی جگہ سراج کو تعینات کر کے سکندر علی شاہ کی فائل اس کے حوالے کی جس میں انسپکٹر رانا حمید نے اس کے متعلق تفصیلات جمع کی تھیں۔ اورنگ زیب کی رہائش گاہ جسے وہ پہلے ہی چھوڑ چکا تھا تباہ کر دیا گیا۔ بینا نامی لڑکی کے اغوا کو ناکام بنا کر ملٹری ایجنسی نے مفید معلومات حاصل کیں۔ سکندر علی شاہ کو "شکرہ" کے نام سے کال موصول ہوئی جس میں اس ناکامی کے بعد محتاط رہنے کا مشورہ دیا گیا۔ سکندر کے ڈیرے پر ایک لڑکی ماروی لائی گئی۔ جسے رات کی تاریکی میں جنونی عمل سے گزارا گیا۔ اورنگزیب، سراج اور کرنل احتشام مل کر آکٹوپس کے خلاف تحقیقات کر رہے ہیں۔ اسی سلسلے میں اورنگزیب بینا سے پوچھ گچھ کرتا ہے کرنل احتشام دشنو سے تفتیش کر رہا ہے دوسری جانب شیخ حامد آئی جی کو کوبرا اور سکندر علی شاہ کو شکرہ نام سے بلیک میلنگ کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہے۔ سکندر علی شاہ ماروی کے ساتھ سلوک کی انکوائری کراتا ہے اسی دوران اسے اطلاع دی جاتی ہے کہ شیلا اور ما کے بیوٹی پارلر میں توڑ پھوڑ کی گئی ہے۔ یہ لوچن اور جگا کی کارروائی تھی۔ لیاقت حسین کے حملہ آوروں کو زخمی کرنے کے بعد گرفتاری دینے کے بعد اسے بری کرنے والے مجسٹریٹ کی پراسرار موت واقع ہوتی ہے۔ دارا کی بیوی روشنا کو اغوا کر کے بے عزت کیا جاتا ہے اور سابق چیف پولیس علیم احمد کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ اورنگ زیب ماروی سے پوچھ گچھ کرتا ہے۔ دوسری جانب دشنو ملٹری کسٹڈی میں تفتیش کے دوران مارا جاتا ہے۔ دشنو کی لاش کو ایک ہندو سماجی تنظیم کے ذریعے جلا دیا جاتا ہے۔ لوچن اور جگا سکندر علی شاہ کی بیوی نگینہ کو پھانس کر اسے قابلِ اعتراض حالت میں واپس کرتے ہیں یہ سکندر کے لیے دھمکی ہے۔ دوسری جانب سکندر بگ باس سے حاصل شدہ اطلاعات کی روشنی میں اورنگ زیب کو پھانسنے کی کوشش کرتا ہے۔ سکندر کی دستِ راست دلربا کے ٹھکانے پر ایک اجنبی اس کی چند ہوشربا تصاویر اتار کر غائب ہو جاتا ہے۔ دشنو جس دم کا ماہر تھا اور سانس روک کر کرنل کو دھوکا دے کر شمشان گھاٹ سے فرار ہو گیا اور افضل خان کے ٹھکانے پر فائرنگ کی لیکن اورنگزیب نے افضل خان کے ذریعے ہی اسے جہنم واصل کیا۔ دوسری جانب میڈم روبی کے گھر شیخ احمد نے پہنچ کر اسے دھمکایا اور بے ہوش کر کے فرار ہو گیا۔ لوچن نے نگینہ کو فون کر کے اس سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی اور سکندر علی شاہ کے حصار میں نقب لگانے میں کامیاب ہو گیا۔ لیاقت حسین کو حالتِ خواب میں چند مناظر دکھائے گئے اور خبردار کیا گیا۔ اس کے بعد اس کا سامنا پرتاب بھوشن سے ہو گیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

لیاقت حسین نے حقارت سے فرش پر تھوکا تو پرتاب بھوشن نے مسکرا کر کہا۔

’’تو نے میری ایک مشکل خود آسان کردی مورکھ...... آج اپنا تھوکا تجھے خود ہی چاٹنا ہوگا۔‘‘

لیاقت حسین کے تن بدن میں جیسے آگ لگ گئی۔ ’’تو کئی بار میرے ہاتھوں سے بچ کر نکل گیا مگر آج...... آج میں تجھے قبر تک پہنچانے کا کام بھی خود انجام دوں گا۔‘‘

’’اب سپنا دیکھنا چھوڑ دے مسلے۔‘‘ پرتاب بھوشن کے سیدھے ہاتھ کی انگلیاں مالا کے دانوں پر گردش کرنے لگیں۔ ’’دیوی نے اس بار جو شکتی اپنے سیوک کو دان کی ہے اس کے سامنے تیری کسی چھایا کا زور نہیں چلے گا۔‘‘

’’تم...... تم دو ٹکے کے مداری ہو......‘‘ لیاقت حسین تلملا کر بولا۔ ’’اپنے ہاتھوں سے مٹی اور گارا تھوپ تھاپ کر جو صورت بناتے ہو اس کو رنگ بھنگ لگا کر اسی کے آگے سر جھکا دیتے ہو۔ تمہاری کھوپڑیوں میں دماغ کے بجائے دنیا جہاں کا گند بھرا ہے جو تم کو سیدھا اور سچا راستہ کبھی نظر نہیں آتا۔‘‘

’’بول لے...... اور اونچے سروں میں جی بھر کے جو چاہے راگ الاپ لے...... اس کے بعد میں تیری کھاٹ کھڑی کرنے میں دیر نہیں لگاؤں گا۔ تیرے ہوتے سوتے بھی کیا یاد کریں گے تو نے کس شکتی سے پنجہ لڑانے کی بھول کی تھی۔‘‘ پرتاب بھوشن نے بل کھا کر کہا پھر ادھر ادھر دیکھ کر بولا۔ ’’آج وہ تیری سندری نظر نہیں آرہی۔ وہ ہوتی تو میں اس سے بھی ایک بدلہ چکتا کر دیتا۔‘‘

’’زبان کو لگام دے ولدالحرام۔‘‘ لیاقت حسین آپے سے باہر ہونے لگا۔ ’’تیری زبان پر دوبارہ اس کا نام آیا تو کتے سے بدتر موت ماروں گا...... وہ میری ہم سفر ہے...... تیرے مندروں کی پجارن نہیں جس کو سارے چھوٹے بڑے پنڈت پجاری پرساد سمجھ کر منہ مارتے ہیں اور پھر اسی منہ سے رام رام بھی کرتے ہیں۔‘‘

’’کتے کی جب موت آتی ہے تو شمشان کی طرف منہ اٹھا کر بھونکنا شروع کر دیتا ہے......‘‘ پرتاب بھوشن نے بل کھا کر جواب دیا۔ ’’ہماری پوتر پستکوں میں اس کی موت کی یہی نشانی لکھی ہے...... تو بھی آخری بار بھونک لے۔ اس کے بعد میں تجھے بتاؤں گا کہ دیوی کا پرساد کیا ہوتا ہے...... تیرے بعد تیری سندری کا نمبر بھی ترنت آجائے گا۔ جانتا ہے کیوں؟...... تیرے کارن میری مدھو پجارن کی ہتیا ہوئی تھی، اس کا حساب تیری گھروالی چکتا کرے گی۔‘‘

فرحین کے سلسلے میں پرتاب بھوشن کی گندی زبان لیاقت حسین کے لیے ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔ اس نے دشمن کو ٹھکانے لگانے کی ٹھان کر قدم اٹھانے کی کوشش کی جب فرحین اچانک ہی کھلے دروازے سے اندر آگئی۔ وہ پرتاب بھوشن کے قریب سے گزر کر آئی تھی لیکن اس نے شاید اس کی موجودگی پر غور نہیں کیا تھا...... لیاقت حسین اس بات پر غور کر رہا تھا جب پرتاب بھوشن کی آواز ابھری۔ ’’تو جو دیکھ رہا ہے وہ سپنا نہیں ہے مورکھ...... یہ دیوی کی دان ہوئی انمول شکتی کا چمتکار ہے کہ تیری سندری مجھے دیکھ نہ سکی۔ یہ میری آواز بھی نہیں سن سکے گی۔‘‘

لیاقت حسین کے دل و دماغ پر برف جمنے لگی۔ پرتاب بھوشن نے جو کچھ کہا تھا اسے سن کر فرحین نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ اس کے برعکس اس نے لیاقت حسین سے حیرت سے پوچھا تھا۔

’’یہ تو یہاں کھڑا کھلے دروازے کی طرف کیا دیکھ رہا ہے؟‘‘

’’تو......‘‘ لیاقت حسین کے لیے وہ صورت حال پریشان کن تھی۔ وہ مرد تھا، موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جان دے سکتا تھا لیکن فرحین اس کا پیار تھی۔ محبت تھی جسے وہ کسی مصیبت میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ جس ناقابل یقین سچویشن سے دوچار تھا وہ بھی اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ اس نے فوری طور پر فرحین کو وہاں سے روانہ کر دینا ہی مناسب سمجھا...... ’’تو...... بیگم صاحبہ کی طرف واپس چلی جا...... مجھے ابھی ایک ضروری کام سے جانا ہے۔‘‘

’’یہ کیسی دل توڑنے والی بات کر رہا ہے لیاقت......‘‘ فرحین نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ ’’کیا میرے علاوہ اور بھی کوئی زیادہ ضروری کام ہو سکتا ہے تجھے......‘‘

’’کہا ناں...... مجھے کہیں کام سے جانا ہے......‘‘ لیاقت حسین کو وقت کی نزاکت نے بری طرح الجھا دیا تھا۔

’’کیوں دل توڑ رہا ہے مورکھ اپنی گھر والی کا...... مرد ہے تو بانہوں میں سمیٹ کر دو گھڑی کے لیے اس کی پیاس بجھا دے...... اس کے بعد تو یہ بھی میری شکتی کے آگے دم توڑ دے گی...... شریر ٹھنڈا پڑ جائے تو پھر گرم نہیں پڑتا......‘‘ پرتاب بھوشن نے سینہ تان کر کہا۔ ’’اسے بھی میری کرپا سمجھ لے جو تجھے جیون میں آخری بار موج مستی کرنے کا سمے دے رہا ہوں۔‘‘

’’کیا سوچ رہا ہے لیاقت......؟‘‘ فرحین نے بڑی لگاوٹ سے کہا۔ ’’چل...... دروازہ بند کرلے...... آج میں تجھے کچھ نئی باتیں بتاؤں گی...... بیگم صاحبہ نے بتائی تھیں......‘‘

لیاقت حسین کا ذہن بری طرح الجھنے لگا...... ایک طرف اس کا بدترین دشمن اس کے سامنے کھڑا اسے موت کی دھمکی دے رہا تھا اور دوسری جانب فرحین دروازہ بند کرنے کی دعوت دے رہی تھی۔ لیاقت حسین نے اس مشکل مرحلے پر خدا کو یاد کیا تو ایک آواز کہیں دور سے ابھری......

’’بے شک، وہ تمہاری رگ جاں سے بھی زیادہ تمہارے قریب ہے...... تم اسے دل کی گہرائیوں سے پکارو تو وہ تمہیں کبھی مایوس نہیں کرے گا۔‘‘

’’مم...... میں...... اس وقت غیر یقینی حالات سے دوچار ہوں......‘‘ لیاقت حسین کے دل کی دھڑکنیں مجسم سوال بن گئیں۔

’’جو کچھ تم دیکھ رہے ہو وہ فریب ہے...... سحر ہے...... خوب صورت جال ہے جو تمہیں پھانسنے کے لیے بچھایا گیا ہے۔‘‘

’’پھر...... میں کیا کروں؟...... فرحین میرے قدموں کی بیڑی بن رہی ہے۔‘‘

’’یہ بھی فریب ہے...... خدا کا نام لے کر اسے توڑ دو......‘‘

لیاقت حسین کو ایسا لگا جیسے وہ ایک لمبے کسی گہری غنودگی میں غرق رہنے کے بعد بیدار ہوا ہے...... جملے جو اس کے دل کی گہرائیوں سے ابھرے تھے...... صدائے بازگشت بن کر گونج رہے تھے۔ اس نے فرحین کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نشہ گھل رہا تھا۔ اس نشے کے عقب میں فریب کا کوئی جال تھا۔ لیاقت حسین نے جھپٹ کر فرحین کے گلے کے گرد اپنی گرفت مضبوط کرلی۔ اس اچانک ردعمل پر پرتاب بھوشن بھی ٹپٹا گیا۔ فرحین کی صورت بھی حیرت انگیز طور پر بدل گئی۔ وہ پرتاب بھوشن کو آواز دے رہی تھی۔

’’مہاراج...... تمہاری شکتی اپرم پار ہے...... میں نے سب کو چھوڑ کر کیول تمہارا ہاتھ تھاما تھا...... بھگوان کے لیے...... اپنی چکوری کو اس مسلے کے گندے ہاتھوں سے بچالو......‘‘

چکوری کا نام سن کر لیاقت حسین بھی چونکا...... اس نے غور سے دیکھا، اس کے ہاتھوں کی گرفت میں فرحین کی نہیں کسی مندر کی پجارن کی گردن تھی...... لیاقت حسین کی گرفت یکلخت ڈھیلی پڑ گئی...... پرتاب بھوشن کی خوشی بھی معدوم ہونے لگی، اسی لمحے ایک آواز کہیں دور سے لیاقت حسین کے کانوں میں گونجی۔

’’سنبھلو لیاقت حسین...... ماں کی دعاؤں نے تمہیں اس وقت ایک موذی کے چنگل میں پھنستے پھنستے بچالیا۔‘‘

لیاقت حسین دو قدموں پیچھے ہٹ گیا۔ پرتاب بھوشن کی سرسراتی ہوئی آواز دوبارہ اس کے کانوں میں گونجی۔ ’’میں سمجھ رہا ہوں...... کوئی چھایا پھر تجھے ہتھیلی لگانے کی کوشش کر رہی ہے لیکن بھوانی نے جو کہا ہے وہ بھی اوش پورا ہوگا۔ تیرا انت بھوانی کی کرپا سے میرے ہی ہاتھوں ہوگا...... جے بھوانی۔‘‘

پرتاب بھوشن نے نعرہ لگا کر ایک اور منتر پھونکا۔ گرم ہواؤں کی گردش لیاقت حسین کے گرد گھیرا تنگ کر رہی تھی جب کسی کے سرد ہاتھوں نے اس کی کلائی تھام لی۔ کسی نے رہنمائی کی۔

’’لیاقت حسین...... ماں نے جو کہا تھا اسے یاد کرو...... تمہاری انگلی میں جو بزرگوں کی دی ہوئی کراماتی انگوٹھی ہے وہ آج خدا کے حکم سے تمہارے کام آئے گی......‘‘

لیاقت حسین کی قوت سماعت میں وہ جملے گونجنے لگے جو ماں نے خواب میں کہے تھے...... وہ سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ تیز نظروں سے اس نے پرتاب بھوشن کو گھورا جس کے ہونٹ کسی منتر کا جاپ پڑھ رہے تھے...... چکوری پجارن موقع پا کر کمرے سے نکل گئی تھی۔ ’’پرتاب بھوشن......‘‘ لیاقت حسین نے خدا کا نام لے کر اسے للکارا...... ’’تیرے کالے کرتوت اور جنتر منتر آج تیرے کسی کام نہیں آئیں گے...... میری بات غور سے سن لے نادان...... تیرا وقت پورا ہو رہا ہے...... آخری چند سانسوں کا شمار کرلے۔ اس کے بعد زندگی میں تجھے کبھی خواب دیکھنے کا موقع نہیں ملے گا۔‘‘

’’مسلے......‘‘ جواب میں پرتاب بھوشن بھی گرج اٹھا۔ ’’تو بھی کان کھول کر سن لے...... میں بھی بھوانی کا سچا اور کھرا سیوک ہوں جس نے جیون میں کبھی ہارنا نہیں سیکھا۔ میرے تیرے جیون میں کسی کا انت آج اوش ہوگا۔‘‘

جملہ پورا کرنے کے ساتھ ہی پرتاب بھوشن نے الٹا ہاتھ فضا میں بلند کر کے جھٹکا تو سیاہ سنگریزوں کی بارش ہوگئی۔ لیاقت حسین نے ماں کی دی ہوئی انگوٹھی اتار کر مضبوطی سے گرفت میں لے لی۔ کوئی سرد اور یخ بستہ ہاتھ اب بھی اس کی کلائی پر موجود تھا۔ وہ قدم جما کر پرتاب بھوشن کی سمت بڑھنے لگا۔

پرتاب بھوشن ایک کے بعد دوسرے جنتر پھونکتا رہا۔ ایک لمحے کو لیاقت حسین کے قدم کی روانی تھم گئی۔ وہ چھٹی

WWW.PAKSOCIETY.COM

پھٹی نظروں سے اس کھائی کو دیکھنے لگا جو اس کے اور پجاری کے درمیان میں حائل ہوگئی تھی۔ اس میں شعلوں کا رقص ہو رہا تھا۔ شعلوں کے درمیان مردہ انسانوں کی سالخوردہ کھوپڑیاں ادھر ادھر اچھلتی نظر آرہی تھیں۔

''یہ بھی نظروں کا فریب ہے......'' ایک سرگوشی پھر لیاقت حسین کے کانوں میں ابھری تو نظر آنے والا طلسم بھی ٹوٹ گیا۔ پرتاب بھوشن اور اس کا درمیانی فاصلہ دوبارہ بتدریج کم ہونے لگا۔

''جہاں ہے وہیں رک جا مسلے......'' پرتاب بھوشن نے بڑے گھن گرج سے للکارا۔ ''بھوانی کا کہا اوش پورا ہوگا۔ تیرے بعد تیری سندری بھی جیوت نہیں رہے گی۔ اس کے گرم خون سے ہولی کھیلنے کے بعد مدھو پجارن کی آتما بھی شانت ہوجائے گی۔''

''جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں لیاقت حسین...... ایک بات ہمیشہ پیش نظر رکھنا...... جو قدرت نے لکھ دیا وہ اٹل ہے...... جو گمان کیا جائے وہ وہم...... فتح اسی کی ہوتی ہے جو کھرے دل سے خدا کو یاد رکھے...... سارے معاملات اسی کے حوالے کردے۔ یہ یقین کرلے کہ وہ جو بھی کرتا ہے اسی میں انسان کی کوئی نہ کوئی بھلائی بھی ضرور ہوتی ہے۔''

لیاقت حسین خدا کا نام لے کر قدم بڑھاتا رہا۔ کسی کے سرد ہاتھ کی گرفت اسے حوصلہ دے رہی تھی۔ ماں کے کہے ہوئے جملے اس کے کانوں میں صدائے بازگشت بن کر ابھر رہے تھے...... دوسری جانب پرتاب بھوشن بھی آخری بازی کھیلنے کی خاطر بھوانی کا نام لے کر قدم جمائے کھڑا تھا جب لیاقت حسین نے قریب پہنچ کر ماں کی انگوٹھی اس کے جسم سے لگادی۔ پھر جو کچھ ہوا اس کا یقین خود پرتاب بھوشن کو بھی نہیں آسکا...... ایسا ہی لگا تھا جیسے اس کے ننگے بدن کے ایک ایک انگ پر انگارے دہک اٹھے ہوں...... اس کے حلق سے کربناک چیخیں بلند ہونے لگیں۔ خود کو اس آفت ناگہانی سے بچانے کی خاطر اس نے کئی جتن کیے لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔

چند لمحے پیشتر وہ کامیابی کے سنہرے خواب دیکھ رہا تھا۔ اب اس کی الٹی تعبیر اس کے جسم کو شعلوں سے داغ رہی تھی۔ خود اپنے ہی ہاتھوں سے سر پیٹتا ہوا وہ لہرا کر فرش پر گرا اور لوٹنے لگا۔ لیاقت حسین کھلی نظروں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ پرتاب بھوشن کی چیخیں ہر لمحہ تیز سے تیز تر ہوتی جارہی تھیں۔ وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا جب اس کے حلق سے گاڑھے گاڑھے خون کے لوتھڑے نکلنے لگے...... وہ

بار بار ہچکی لے رہا تھا۔ پھٹی پھٹی سی نظروں سے لیاقت حسـ دیکھ رہا تھا جو ایک طرف خاموش تماشائی بنا کھڑا تھا۔

پرتاب بھوشن کے مکروہ جسم نے خون تھوکتے ہوـ کئی جھٹکے کھائے پھر اس کے بدن سے شعلے بھڑک اٹـ اس کا جسم راکھ کے ڈھیر کی صورت اختیار کرنے لگا۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور ساری راکھ کو سمیٹ لے گیا۔

''یہ ہے انسان کی ناپائیدار زندگی جس پر وہ خوا کے محل تعمیر کرتا رہتا ہے...... آج کے دھوکے میں مبتلا ہوکر کو یکسر فراموش کردیتا ہے......'' دور سے ایک آواز لیاقت حسین کے کانوں میں گونجی۔ اس کے ساتھ ہی اس کلائی بھی سرد گرفت سے آزاد ہوگئی۔

لیاقت حسین پر رقت طاری ہونے لگی...... ما خواب غلط نہیں تھا۔ اس نے جو کہا تھا وہ پورا ہوگیا۔ پرتا بھوشن جو اس کے راستے کی دیوار تھا جل کر خاک ہوگیا۔

''لیاقت......'' اس کے کانوں میں فرحین کی ما آواز ابھری۔ ''یہ تو پھوٹ پھوٹ کر کیوں رو رہا ہے ہوا تجھے؟''

لیاقت حسین نے دیکھا۔ فرحین اس کی نظروں سامنے موجود تھی۔ اچانک لیاقت حسین کو ماں کی دی ہوئی انگو کا خیال آیا...... اس نے ہاتھ پر نظر ڈالی۔ انگوٹھی اسے نظر نہ آئی...... یہ تصدیق بھی اس بات کی تھی کہ اس کی نظروں۔ کچھ دیر پیشتر جو کچھ دیکھا وہ غلط نہیں تھا...... سچ ہی تھا۔

''تو چپ کیوں ہے؟'' فرحین نے اس کے قریب آکر بڑی اپنائیت سے پوچھا۔ ''سچ بتا...... تو رو کیو رہا تھا۔ کس بات کی پریشانی ہے؟''

''وہ...... وہ...... ماں نے جو انگوٹھی دی تھی بڑ پیار سے...... وہ کہیں گم ہوگئی ہے......'' لیاقت حسین معصومیت سے جواب دیا تو فرحین مسکرا کر بے اختیار ا کے چوڑے چکلے سینے میں سمٹ گئی۔

☆☆☆

کرنل احتشام نے اسے جو تحفظ فراہم کیا تھا وہ یقیـ پائیدار ہی رہا ہوگا۔

وہ فوج کا اعلیٰ عہدیدار اور تجربہ کار فرد تھا، جو دشمنو کے لیے محاذ جنگ پر سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر سرحدوں حفاظت کرتے تھے، ان کے لیے ایک بنگلے کی حفاظت بائیں ہاتھ کے کھیل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی ہوگی لیکن جو حامد نے میڈم روبی کی روح کو جو دوسرا گھاؤ پہنچایا تھا وہ آ وقت مندمل ہوسکتا تھا جب وہ پوری طرح کھل کر اپنی مرضـ

سے اس کمینگی کا منہ توڑ جواب دے سکتی۔

اپنی خواب گاہ میں بیٹھی وہ بہ ظاہر اخبار پڑھتی نظر آرہی تھی لیکن اس کے ذہن میں ایک تنہا عورت کی وہ کمزوری مچل رہی تھی جو اخلاق سوز تصویروں کی صورت میں موجود تھی۔ جو کچھ ہوا...... وہ طاقت کے بل پر ہوا لیکن اس کا جواب بہ زور طاقت نہیں دیا جاسکتا تھا۔ تصویروں کے سلسلے میں اس کے پاس اپنی صفائی کے لیے کوئی جواز نہیں تھا۔ جو تیر کمان سے نکل جائے اس کی واپسی ناممکن ہوتی ہے۔

صرف ایک صورت تھی...... کمان اور تیر جس کے قبضے میں تھے اسے ہمیشہ کے لیے نیست و نابود کردیا جاتا مگر...... وہ شخص جو پولیس اور فوج کے ذہین دماغوں اور ان کی ماہرانہ صلاحیتوں کے باوجود چھومنتر ہو رہا تھا۔ اسے تلاش کرنا ایک عورت کے بس میں بھی نہیں تھا۔

اس کے ذہن میں تیز آندھی کے جھکڑ چل رہے تھے۔ بجلیاں کوندرہی تھیں، انتقام کی آگ شعلوں کا روپ اختیار کررہی تھی جب اپنی بے بسی کے احساس کے ساتھ ہی ایک بچھڑے ہوئے ساتھی کی آواز اس کے کانوں میں ابھری۔

''مجھے تمہاری پریشانیوں کا احساس ہے...... جب میں مرد ہوکر اس کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس گیا...... تم سے بچھڑ گیا تو تم...... تم ایک عورت ہوکر کیا کرلوگی......''

''میں اس مرد کی آنکھوں کو ان کے حلقوں سے نکال کر پیروں تلے روندوں گی جنہوں نے مجھے بے لباس دیکھا ہے۔''

''تم اس وقت ہوش میں نہیں تھیں۔''

''اب بھی میرے ہوش و حواس میرا ساتھ نہیں دے رہے مگر...... میں نے تنہا رہ کر بھی ہار نہیں مانی...... اب بھی زندگی کی آخری سانسوں تک حالات کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکوں گی۔''

''میری ایک بات مانو گی؟''

''تمہارا ایک اشارہ بھی میرے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے...... کہو۔''

''جو شہر...... جو ملک تم جیسی معصوم اور وفاشعار عورت کو تحفظ نہیں دے سکا اس کو چھوڑ کر کہیں دور چلی جاؤ......''

''نہیں......'' میڈم روبی کی روح تڑپ اٹھی۔ ''یہاں تم ہو...... تمہارے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کی حسین یادیں دفن ہیں میں ان سے دور نہیں جاسکتی......''

''پھر...... ایک ہی طریقہ ہے......'' آواز اور لہجہ دونوں حسرت زدہ ہوگیا۔ ''جو تمہیں سہارا دے سکے...... اس کا ہاتھ تھام لو۔''

''وہ بھی ایک مرد ہوگا......'' میڈم روبی نے تڑپ کر کہا۔ ''مرد...... جو سب کچھ برداشت کرسکتا ہے لیکن جب عورت کی مجبوریاں ننگی تصویروں کی شکل میں سامنے آجائیں تو وہ بھی سارے رشتے بھول کر جذباتی بن جاتا ہے۔ دوسرے مرد سے انتقام لینے کے بجائے اپنی بیوی کو ہی مجرم کہتا ہے۔''

''دنیا بہت وسیع ہے روبی...... ساری انگلیاں برابر نہیں ہوتیں...... میرا مشورہ مان لو...... وقت کا یہی تقاضا ہے۔''

''جانتی ہوں لیکن تمہاری بات ماننے سے پہلے میں اسی موذی ناگ کا پھن کچلوں گی جو کسی سپیرے کی طرح مجھے اپنی بین کی دھن پر نچانے کے خواب دیکھ رہا ہے۔''

میڈم روبی شوہر کے تصور سے باتوں میں محو تھی جب کسی نے شکوہ کیا۔

''ایسی بھی کیا بے مروتی کہ میں اتنی دیر سے کھڑی ہوں اور تم خبروں میں گم ہو......''

میڈم روبی نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کے سامنے الماس کھڑی تھی۔

''تم کب آئیں......؟'' اس نے تیزی سے اٹھ کر بے تکلفی سے الماس کا ہاتھ تھاما۔ اس کے ساتھ باہر لاؤنج میں آگئی جہاں تھریسا پہلے سے موجود تھی۔

''کیا پیو گی......؟'' میڈم نے اس کے ساتھ ایک ہی صوفے پر بیٹھ کر بے تکلفی سے پوچھا۔

''چائے یا سلائس پر بات نہیں ٹلے گی...... راستے میں مردوں کو فٹ پاتھ پر بنچی میزوں پر گرما گرم پوریاں کھاتے دیکھ کر تمہاری طرف آگئی، حالانکہ بازار سے ضروری سامان لینے نکلی تھی......'' الماس نے ایک ہی سانس میں جملہ مکمل کیا پھر تھریسا سے بولی۔ ''تم کس مرض کی دوا ہو۔ جلدی سے آلو کی چٹ پٹی ترکاری، گرم گرم پوریاں اور تھوڑا سا سوجی کا حلوا بنا کر فٹافٹ میز سجادو...... میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

''گڈ آئیڈیا......'' میڈم روبی نے بھی بے تکلفی سے کہا۔ ''بہت عرصے سے میں نے بھی حلوا پوری کا ناشتا نہیں کیا۔'' پھر جب اس نے تھریسا سے اہتمام کرنے کو کہا تو اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''سب کچھ گرما گرم اور ریڈی میڈ تیار ہے...... میں میز لگانے میں پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لوں گی۔''

تھریسا چلی گئی تو میڈم روبی نے شکایتی نظروں سے الماس کو دیکھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"تم نے تکلف سے کام لیا...... یہاں آکر فرمائش کردیتیں تو ملازم جا کر سب کچھ لے آتا۔"

"رسک لینا میری عادت نہیں ہے......" الماس نے بہ دستور شوخی سے جواب دیا۔ "مرد حضرات جس انداز میں ہاتھ صاف کررہے تھے اس سے یہی اندازہ ہورہا تھا کہ تمہارے پاس آتے آتے حلوائی کڑھاؤ بھی دھلوا چکا ہوگا۔"

"سراج بھائی کو بھنک مل گئی تو وہ ضرور برا مانیں گے۔" میڈم روبی کا لہجہ معنی خیز تھا۔

"کیا مطلب......؟"

"مطلب صاف ہے۔ تم اول تو یہ کہ عورت ہو اور پولیس کی یونیفارم میں بھی نہیں ہو اس لیے حلوائی نے حلوا پوری کے دام بھی......"

"خبردار جو تم نے میرے شوہر پر مفت خوری کا الزام لگایا۔" الماس نے روایتی عورت کی طرح برا مان کر کہا۔ "میرا گھر والا پولیس میں ضرور ہے لیکن چھین جھپٹ کر کھانے والا نہیں...... پہلے پیسے منہ پر مارتا ہے پھر تھیلا اٹھاتا ہے۔"

کچھ دیر الماس اور میڈم روبی کے درمیان اسی قسم کے دلچسپ مکالمے جاری رہے پھر الماس نے ناشتے کی میز پر بیٹھنے کے بعد سنجیدگی سے پوچھا۔

"آج باہر جو لوگ پہرا دے رہے ہیں انہوں نے میری گاڑی بھی دو جگہ رکوائی تھی...... سب خیریت تو ہے؟"

"تھریسا نے ایک کمپنی سے معاہدہ کیا ہے۔" میڈم روبی نے خوب صورتی سے بات بنائی پھر اس نے باتوں کا موضوع بدل دیا۔ الماس نے اسی بات کو ملحوظ خاطر رکھا تھا کہ خود سے یہ ظاہر نہ کرے کہ اسے حالات کا علم کرنل احتشام سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ وہ سراج کے مشورے پر ہی اس وقت آئی بھی تھی۔

ناشتے کے بعد میڈم روبی الماس کے ساتھ دوبارہ لاؤنج میں آگئی۔

"اب میں تمہیں کھانے کے بعد ہی جانے دوں گی......" اس نے بڑی اپنایت سے الماس کو دعوت دی۔

"سوچ لو...... اگر سراج کو میرے گھر سے لاپتا ہونے کی بھنک مل گئی تو وہ پہلی فرصت میں ایف آئی آر بھی درج کرا سکتے ہیں۔"

جواب میں میڈم روبی نے موبائل اٹھا کر سراج کے نمبر ڈائل کیے پھر مائیک بھی آن کر دیا۔

"خیریت...... اس وقت کیسے یاد کیا......؟" دوسری جانب سے سراج کی آواز ابھری۔

"بہت روز سے آپ نے بھی کال نہیں کیا...... کیا الماس نے پابندی لگا دی ہے؟"

"یہ کیسے سوچ لیا آپ نے......؟" سراج نے سنجیدگی سے کہا۔ "اب تو وہ سگی بہنوں کی طرح آپ کی عزت کرتی ہے۔"

"پھر بھی آپ کبھی اسے ساتھ لے کر غریب خانے پر تشریف نہیں لائے۔" میڈم روبی نے شکوہ کیا۔

"ڈبل چارج کے باوجود سر اٹھانے کی فرصت ملی تو ضرور آؤں گا۔"

"ایک انفارمیشن دینی ہے آپ کو...... میں نے ابھی الماس کو فون کیا تھا لیکن ملازمہ نے بتایا کہ وہ گھنٹے بھر سے کہیں گئی ہوئی ہے۔"

"پریشان مت ہوں......" سراج نے بے تکلفی سے جواب دیا۔ "مجھے الماس پر مکمل اعتماد ہے۔ صبح اس نے کہا تھا کہیں بازار جانے کا پروگرام ہے۔"

"ابھی تک آپ کے اورنگ زیب صاحب نے میرے کام کے سلسلے میں کوئی موثر قدم نہیں اٹھایا۔" میڈم روبی نے گفتگو کا رخ بدلا۔ "کوئی سراغ ملا ان کو آکٹوپس کا......؟"

"سوری...... فون پر میں آپ کو تفصیل نہیں بتا سکتا۔" سراج بھی سنجیدہ ہوگیا۔ "فی الحال اتنا عرض کرسکتا ہوں کہ وہ جس مجرم کے پیچھے پڑ جائیں اسے قبر تک پہنچانے کے بعد ہی سکون کا سانس لیتے ہیں۔"

"مجھے اس لمحے کا بڑی شدت سے انتظار رہتا ہے......" اس بار میڈم کے جذبات میں ہلچل کی ایک لہر بھی ابھری تھی لیکن اس نے الماس کی موجودگی میں خود کو سنبھال کر کہا۔ "میں ہمیشہ اورنگ زیب صاحب کے حق میں کامیابی کی دعا کرتی رہوں گی۔"

"یہ میری حق تلفی بھی ہوگی......" سراج نے شکوہ کیا تو الماس نے جھپٹ کر موبائل میڈم کے ہاتھ سے لے لیا۔

"میں سب سن رہی ہوں اور آپ بھی کان کھول کر سن لیں کہ آپ کے جملہ حقوق صرف الماس کے پاس محفوظ ہیں...... اس کے علاوہ آپ کا حق بھی صرف مجھ پر چلتا ہے...... دوسروں سے کیسے گھل مل کر حق کی بات کی جاتی ہے۔"

"آئی ایم سوری الماس۔" سراج نے دیدہ و دانستہ سوری کہا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ مائیک آن ہوگا۔

"صرف سوری سے کام نہیں چلے گا...... مجرم رنگے ہاتھوں پکڑا جائے تو اسے جان بچانے کی خاطر فوری طور پر

ٹک ٹکا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس ویک اینڈ پر کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں ڈنر کا وعدہ کرلیں تو تھانہ کچہری سے بھی بچ جائیں گے...... بولیں...... منظور یا نہیں۔"

"اورنگ زیب صاحب کے رشتے سے دھونس دے رہی ہو تو منظور ہے......" سراج نے سرد آہ بھر کر کہا تو الماس کے علاوہ میڈم روبی بھی مسکرادی۔ فون کا رابطہ بھی ختم کردیا گیا۔

کرنل احتشام اور آئی جی کے درمیان فون پر گفتگو ہو جانے کے بعد اورنگ زیب نے ایک دو روز تک خود کو گھر کی حد تک محدود رکھا پھر اس نے بلیک پینتھر کو کال کیا۔ دوسری جانب سے رابطہ قائم ہو جانے کے بعد بے حد سنجیدگی سے بولا۔

"دلربا کی اہمیت قانون کی نظروں میں بھی ہے اس لیے اس کی طرف سے تم ذاتی طور پر بھی غافل نہ ہونا۔"

"بہتر ہے...... اور کوئی حکم......؟"

"ایک پاس ورڈ اور نوٹ کرو...... ریکور (Recover)"

"اس کی کوئی اہمیت بھی ہوگی؟......" دوسری جانب سے پوچھا گیا۔

"ہاں...... اس پاس ورڈ کو میرے علاوہ جو بھی استعمال کرے اس کے فوراً بعد تمہیں قانونی اہمیت کو موجودہ جگہ سے نکال کر کسی محفوظ مقام پر منتقل کرنا ہوگا۔ اس کے بعد وہ تمہاری ذاتی نگرانی میں رہے گی۔" اورنگ زیب نے ہدایت دے کر رابطہ منقطع کردیا۔ دس منٹ بعد اس نے سکندر علی شاہ کے خاص نمبر ملائے۔

"ہیلو......" کال خود سکندر علی شاہ نے ریسیو کی تھی۔

"دوست بول رہا ہوں......" اورنگ زیب نے بے تکلفی سے کہا۔

"زہے نصیب...... اس وقت میں آپ ہی کو یاد کررہا تھا۔"

"میرے لیے کوئی حکم؟"

"ہم دوستوں کو حکم نہیں دیا کرتے۔ صرف ان کی خیریت دریافت کرنا مقصود ہوتا ہے۔" بے تکلفی سے کہا گیا۔ "آپ کی ذہنی الجھن کا کیا حال ہے؟"

"آپ نے جو مشورہ دیا ہے۔ اسی پر عمل کرنے کا فیصلہ کرچکا ہوں۔" اورنگ زیب نے سنبھل کر جواب دیا۔ "آئی جی چھٹی دینے کے موڈ میں نہیں تھا اس کی خاطر مجھے دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑا...... فی الحال دس بارہ روز تک وہ مجھے کال نہیں کرے گا۔"

"پھر...... کب ہمارے مہمان بن رہے ہیں؟"

"آنے والے ہفتہ کے دن کا سوچ رہا تھا لیکن آپ کی مصروفیت کا خیال بھی ہے۔"

"ہفتے میں ابھی چار دن باقی ہیں...... میری طرف سے ڈن (Done) سمجھیں۔"

"ایک درخواست کروں گا......" اس بار اورنگ زیب نے کچھ ایسا لب ولہجہ اختیار کیا کہ اپنا مفہوم بھی ظاہر کردیا۔

"جب میں نے آپ کو دوست کہا ہے تو دوستی کے تقاضے بھی پورے کروں گا......" جواب بھی دوستانہ لہجے میں دیا گیا۔ "آپ مطمئن رہیں۔ فارم ہاؤس میں میرے ایسے نمک حلال موجود ہیں جو زبان رکھتے ہوئے خود سے بولنے کی جرأت نہیں کرتے۔"

"جانتا ہوں لیکن ماروی کے ساتھ......"

"وہ اتفاق ہی تھا...... اس کے بعد سے میں نے جو سختی کی ہے اس نے سب کو محتاط کردیا ہے۔"

"میرے ساتھ ایک جز وقتی ڈرائیور بھی ہوگا۔ بااعتماد بھی ہے، پہلے بھی خاص معاملات میں آزما چکا ہوں۔" اورنگ زیب نے کہا۔ "دراصل میں اس موقع پر ذاتی گاڑی کا استعمال بھی مناسب نہیں سمجھتا۔ کسی اور گاڑی کو ڈرائیو کرنے کی صورت میں خود کو لوگوں کی نظروں سے محفوظ رکھنا بھی مشکل ہوگا...... آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہوں گے۔"

"جیسا آپ مناسب خیال کریں...... مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"علاج کے لیے جو دوا استعمال کی جائے اگر وہ غیر ملکی ہو تو زیادہ مناسب ہوگا۔" اورنگ زیب نے قدرے ہچکچاتے ہوئے دبی زبان میں کہا۔

"آپ اس کی فکر نہ کریں...... ہمارے یہاں بازاری دوائیں نہیں استعمال نہیں کی جاتیں...... ہمارے کارندے بڑی حکمت سے سیل بند دوائیں فراہم کرنے کا تجربہ رکھتے ہیں۔"

"او۔کے، پھر ہفتہ کو ملاقات ہوگی۔"

"آنے سے پیشتر ایک کال کردیجیے گا تاکہ میں فارم ہاؤس پر آپ کو خوش آمدید کہہ سکوں۔ نفس کشی کی خاطر مجھے بھی وقت گزارنے کے لیے کچھ نہ کچھ اہتمام کرنا ہوگا۔"

"جیسا آپ کا حکم......" اورنگ زیب نے چند رسمی جملوں کے بعد سلسلہ منقطع کیا تو اس کے ہونٹوں پر بڑا تلخ مگر معنی خیز تبسم بھی پھیل کر گہرا ہوتا گیا۔ یہ پہلا اتفاق تھا

WWW.PAKSOCIETY.COM

جب اس نے شیر کی کچھار میں گھس کر اسے شکار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

❁❁❁

افضل خان بالکونی میں کھڑا کچھ سوچ رہا تھا جب شبنم نے اسے پشت سے مخاطب کیا۔

''پلیز اندر آجاؤ...... میں چائے لے کر آتی ہوں۔''

افضل خان پلٹ کر اندر آگیا لیکن وہ اس وقت بھی سنجیدہ ہی تھا۔ چہرے پر ایک عجیب سی کشمکش طاری تھی جو بے وجہ بھی نہیں تھی۔ اس بار اسے براہ راست کرنل احتشام نے سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر فلیٹ سے قدم باہر نہ نکالے۔

شبنم چائے کی ٹرے لے آئی جب بھی وہ اپنے خیالوں میں گم رہا۔ شبنم اس کی جھلاہٹ کی وجہ جانتی تھی۔ وشنو کی موت کے بعد ہی کرنل نے اسے فلیٹ تک محدود ہوجانے کا حکم دیا تھا۔

وشنو معمولی حیثیت کا مالک نہیں تھا۔ وہ انٹرپول کو مطلوب ہونے کے علاوہ شیخ حامد کا بھی خاص مہرہ تھا اور افضل خان نے شیخ حامد کے ہاں سے نکالے جانے کے بعد کچھ ایسے اقدامات کیے تھے جو پسندیدہ نہیں تھے لیکن اب وشنو کا مہرہ پٹ جانے کے بعد وہ زخم بھی دوبارہ تازہ ہوگئے ہوں گے۔ کرنل بھی ان باتوں کو ضرور سمجھ رہا ہوگا، اسی لیے اس نے افضل خان کی زندگی بچانے کی خاطر بندشیں عائد کی ہوں گی۔

''کیا سوچ رہے ہو......؟'' شبنم نے چائے کا کپ افضل خان کی طرف بڑھاتے ہوئے بڑی اپنایت سے دریافت کیا۔

''تمہارا کیا خیال ہے......؟'' افضل خان نے اسے پلٹ کر سوالیہ نظروں سے گھورا۔

''کم آن، پلیز......'' شبنم نے مسکرا کر کہا۔ ''حالات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ ابھی آکٹوپس کے زخم تازہ ہوں گے۔ اسی لیے کرنل نے تمہاری بہتری کے لیے وقتی طور پر ایک فیصلہ صادر کیا ہے۔''

''پھر تم کرنل سے ایک فرمائش اور کردو......''

''وہ کیا......؟''

''تم کرنل سے کہو کہ وہ فوری طور پر کسی قاضی کو یہاں بھیج دے، پھر...... یہ قید خانہ میرے لیے حجلۂ عروسی سے کم نہ ہوگا۔'' اس بار افضل خان نے شبنم کی آنکھوں میں دور تک جھانکا تو وہ شرما کر بولی۔

''یہ درخواست تم بھی کر سکتے ہو...... کرنل کا تعلق بھی تمہاری جنس سے ہے۔ ممکن ہے وہ تمہاری مشکل حل کردے۔''

افضل خان نے شبنم کو غور سے دیکھا پھر اس نے موبائل بھی آن کرلیا لیکن قبل اس کے وہ کسی کے نمبر ڈائل کرتا اسے کسی کی کال موصول ہوئی...... افضل خان نے اسکرین پر نظر ڈالی۔ وہاں کوئی نام نہیں تھا جس کا مطلب یہی تھا کہ وہ لسٹڈ نمبر نہیں تھا۔ ایک لمحے تک اس نے غور کیا پھر چوتھی گھنٹی پر اس نے کال ریسیو کرنے کا بٹن دبا دیا۔

''ہیلو......''

''تم شاید افضل خان بول رہے ہو؟''

''تمہیں کس سے بات کرنی ہے؟'' افضل خان نے آواز بدل کر پوچھا۔

''جس پنجرے میں تم موجود ہو وہاں افضل خان کے علاوہ اور کون ہوسکتا ہے؟'' مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا گیا۔ ''تمہاری بلبل کے ساتھ کوئی اور ہو...... یہ بات تمہیں بھی گوارا نہ ہوگی۔''

''مطلب کی بات کرو......'' افضل نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''میں بکواس سننے کا عادی نہیں ہوں۔''

شبنم نے چونک کر افضل خان کو دیکھا تھا۔

''ہمارے پاس بھی فالتو وقت نہیں ہے۔'' کرخت انداز میں جواب ملا۔ ''ایک بات غور سے سن لو۔ کرنل اور اورنگ زیب کے علاوہ چاہے فوج کی پوری بٹالین اور پولیس کا محکمہ بھی تمہارے ساتھ ہو لیکن تمہاری زندگی کے سات دنوں میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ ان سات دنوں میں تم دل بھر کر موج میلا کرلو۔ ساتویں دن ہم تمہیں اوپر پارسل کردیں گے۔''

''اگر تم افضل خان سے واقف ہو تو یہ بھی جانتے ہوگے کہ میں نے کبھی اپنا تعاقب کرنے والے بھونکتے کتوں کی پروا نہیں کی......'' افضل خان نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ''یہ بات اسے بھی بتا دینا جس نے تم کو خریدا ہے۔''

''جس کے دن گنے چنے رہ گئے ہوں، ہم اس کی بات کا برا بھی نہیں مانتے...... ہم تمہیں روز بتاتے رہیں گے کہ تمہاری زندگی کے کتنے دن گھٹتے جارہے ہیں۔''

''جو خود اندھیروں میں ہو وہ دوسروں کو روشنی نہیں دکھا سکتا۔'' افضل خان نے حقارت سے کہا۔ ''تم زرخرید کتے ہو جسے خریدنے والا ذاتی طور پر بھی زنخوں کی طرح سات پردوں میں چھپا بیٹھا ہے۔''

''دنوں کا شمار کل سے ہوگا...... بائی۔''

دوسری جانب سے کال منقطع کردی گئی۔ افضل خان آنے والے نمبروں کو دیکھنے میں مشغول تھا جب شبنم نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

''میرا خیال ہے کہ کال ہمارے کسی نادیدہ دشمن کی تھی۔''

''ہاں......'' افضل خان نے موبائل رکھ کر چائے کا ایک گھونٹ لیا۔ ''مجھے صرف سات روز زندہ رہنے کا پرمٹ ملا ہے۔''

''اوہ......'' شبنم فکرمند ہوگئی۔ ''کرنل نے شاید اسی لیے......''

''ڈونٹ وری۔ مجھے ان گیدڑ بھبکیوں کی کبھی کوئی فکر لاحق نہیں ہوئی۔'' افضل خان نے بڑے رومانٹک انداز میں کہا۔ ''مجھے فون کرنے والے کی اس بدذوقی پر رونا آرہا ہے جنہوں نے مجھے سات روز موج میلا کرنے کو کہا ہے جبکہ میرے خیال میں موج اور میلا کے لیے سات مہینے بھی کم ہوتے ہیں۔''

''پلیز افضل......'' شبنم بہ دستور سنجیدہ تھی۔ ''تمہیں اس فون کے بارے میں فوری طور پر کرنل اور ایس پی اورنگ زیب صاحب کو اطلاع دینی چاہیے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے......؟ کیا دھمکی دینے والے فوجی کمانڈوز کے گھیرے کو بھی توڑ سکتے ہیں؟ ہماری حفاظت پر پولیس کے سادہ لباس والے بھی تعینات ہیں۔''

''جانتی ہوں لیکن...... اس کے باوجود کم از کم اورنگ زیب صاحب کو اطلاع دینی ضروری ہے۔'' شبنم نے بہ دستور سنجیدگی سے کہا۔ پھر افضل خان کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے اپنا موبائل اٹھا کر اورنگ زیب کے نمبر ڈائل کیے۔ ایک منٹ بعد ہی وہ اسے افضل خان کو کسی نامعلوم فرد کی جانب سے ملنے والی دھمکی کے بارے میں بتا رہی تھی۔

''جس نمبر سے فون کیا گیا ہے وہ مجھے ایس ایم ایس کردو۔''

''کیا کرنل احتشام کو بھی......''

''میں نمبر چیک کرنے کے بعد ہی کوئی فیصلہ کروں گا۔'' دوسری جانب سے جواب دینے کے ساتھ ہی رابطہ بھی منقطع کردیا گیا۔

شبنم نے مطلوبہ نمبر ایس ایم ایس کرنے میں دیر نہیں کی۔

❁❁❁

عیدقرباں کی تیاریاں
ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ
اکتوبر 2013ء کے شمارے کی گل آرائیاں

خوابوں کا سوداگر ● گرد و پیش کی ہمہ گیر تسخیر کا خواب دیکھنے والے نوجوان کی دلچسپ و دلنشین روداد...... صبا احمد کی آمد
گرداب ● واقعات کے نئے گرداب میں گرفتار کرداروں کا آغاز و انجام اسما قادری کا سلسلہ
جواری ● احمد اقبال کے شربار قلم سے ایک جواری کے کھیل کے نت نئے انداز
مغرب کے نرالے انداز ● مغرب کی تہذیب اور ماحول کی عکاس جرم اور محبت کی ناقابل فراموش کہانیاں
سرورق کی کہانیاں
پہلی کہانی ● ہمارے اردگرد کے ماحول سے رنگین و سنگین حقیقت کے رموز......
دوسری کہانی ● ہندسوں اور حسابات کے معاملات میں خسارے کے سودے بھی مقدر میں ہوتے ہیں...... فراڈ کے تانے بانوں میں الجھی داستان
آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کتھائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھریسا نے میڈم روبی کی خواب گاہ میں داخل ہو کر اسے دیکھا تو اس کا اندیشہ درست ہی ثابت ہوا۔ میڈم مسہری کی پشت گاہ سے ٹیک لگائے اس طرح آنکھ بند کیے لیٹی تھی جیسے نینداس کی آنکھوں سے کوسوں دور ہو۔ اگر اس کا سونے کا ارادہ ہوتا تو حسب معمول وہ دروازہ بند کر چکی ہوتی پھر شاید تھریسا اسے جگانے کے بجائے دروازے سے ہی پلٹ جاتی لیکن...... وہ محسوس کر رہی تھی کہ میڈم، الماس کے ساتھ بھی زبردستی ہنسنے مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی واپسی کے فوراً ہی بعد وہ یکلخت سنجیدہ ہو گئی تھی...... مگر کیوں؟

کرنل کے خفیہ آدمیوں کی تعیناتی کی وجہ بھی تھریسا کی سمجھ میں نہیں آسکی تھی۔ اس نے دو ایک بار سوچا بھی تھا کہ میڈم روبی سے اس تبدیلی کا سبب دریافت کرے گی لیکن ہر بار یا تو میڈم کے موڈ کی وجہ سے اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا یا کوئی ایسی مصروفیت آڑے آگئی کہ اس نے ازخود اس ذکر کو چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا لیکن الماس کے جانے کے بعد اس نے میڈم روبی کے موڈ میں جو نمایاں تبدیلی محسوس کی وہ اس بات کی غماز تھی کہ وہ اندر ہی اندر کسی گھٹن کا شکار تھی۔

چند لمحے وہ دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی میڈم روبی کے افسردہ چہرے کو دیکھتی رہی پھر اس نے یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ واپس لوٹ جائے لیکن خواب گاہ میں موجود فون سیٹ جاگ اٹھا، اس کی آواز سن کر میڈم نے بھی ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دی تھیں۔ تھریسا کسی خیال سے آڑ میں چلی گئی۔

''ہیلو......'' میڈم نے ریسیور اٹھا کر کال اٹینڈ کی۔

''خادم بول رہا ہوں۔'' دوسری جانب سے ڈی آئی جی کی مانوس آواز ابھری۔ ''میں آپ کے آرام میں مخل تو نہیں ہوا؟''

''جی نہیں......'' میڈم نے سنبھل کر جواب دیا۔ ''میں رات ساڑھے نو بجے لائٹ آف کرتی ہوں۔ اس کے بعد آنے والی کوئی کال اٹینڈ نہیں کرتی۔''

''ایک خاص بات دریافت کرنا تھی...... میں نے سنا ہے کہ آج کل آپ کی رہائش گاہ پر کچھ فوجی کمانڈوز بھی تعینات ہیں۔''

''جی ہاں...... اس کی درخواست خود میں نے کرنل احتشام سے کی تھی......''

''اس درخواست کا کوئی سبب بھی ضرور ہوگا......؟''

''ہوسکتا ہے کہ وہ کسی کی شرارت ہو لیکن مجھے فون پر جان سے مار ڈالنے کی دھمکی دی گئی تھی۔''

''آپ کا کیا خیال ہے......؟ کیا دی جانے والی دھمکی شرارت بھی ہوسکتی ہے؟''

''میں یقین سے نہیں کہہ سکتی......''

''میرا خیال ہے کہ آپ شاید کسی وجہ سے اصل بات بتانے سے گریز کر رہی ہیں۔'' ڈی آئی جی نے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جو لوگ کسی کو جان سے مار دینے کا ارادہ کرلیتے ہیں وہ اسے انتہائی خاموشی اور رازداری سے ٹھکانے لگانے میں دیر نہیں کرتے...... دعوت دے کر آنے کی حماقت نہیں کرتے۔''

''مجھے خوشی ہے کہ آپ یہ بات اپنا سمجھ کر کہہ رہے ہیں۔'' میڈم نے اپنایت کا اظہار کیا۔

''ویسے مجھے آپ سے ایک شکایت بھی ہے۔''

''وہ کیا......؟''

''کرنل احتشام کے بجائے آپ مجھے بھی خدمت کا موقع دے سکتی تھیں۔''

''میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔''

''کیا مطلب......؟'' دوسری جانب سے حیرت کا اظہار کیا گیا۔

''سمجھنے کی کوشش کریں۔'' میڈم نے دبی زبان میں جواب دیا۔ ''آپ کے علاوہ میں نے مسٹر اورنگ زیب اور سراج بھائی کو بھی اس کی اطلاع نہیں دی...... جن کو میں اپنا سمجھتی ہوں ان کو خطروں سے بھی دور ہی رکھتی ہوں۔''

''اپنا سمجھنے کا شکریہ...... اب یہ بھی عرض کر دیں کہ دھمکی دینے والوں کے بارے میں آپ کا کیا اندازہ ہے؟''

''ریاض کی موت کے بعد سے دنیا میں ہر شخص نے مجھ سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ سوائے ایک کے...... آپ بھی اس ایک سے واقف ہیں۔''

''شیخ حامد......؟''

''جی ہاں......'' میڈم نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔ ''وہ روز اول سے میری خوشیوں کا دشمن رہا ہے...... اس کا ایک قرض بھی واجب ہے مجھ پر...... جب تک اسے ادا نہ کرلوں گی، مجھے سکون کی سانس کبھی میسر نہیں ہوگی۔''

''اس کا اظہار آپ ایک شرط عائد کر کے بھی کر چکی ہیں۔'' ڈی آئی جی نے میڈم کے جواب پر اپنی پسند کا حوالہ بھی دے ڈالا۔ ''میری خوشی کے درمیان بھی اس کی منحوس شخصیت آڑے آ رہی ہے۔''

میڈم نے اس بار کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی وجہ تھریسا بھی ہوسکتی تھی جو دروازے سے اندر داخل ہوئی تھی۔

''آپ کے لیے ایک اطلاع میرے پاس بھی ہے......'' ڈی آئی جی نے تھوڑے توقف کے بعد کہا۔ ''مسٹر اورنگ زیب کو مرکزی حکومت کی جانب سے کوئی اہم ذمے داری سونپی گئی ہے جس کی وجہ سے وہ آئی جی آفس میں ڈیوٹی کے بھی پابند نہیں رہے۔''

''اس اطلاع میں میرے لیے کیا خاص بات ہے......؟''

''آکٹوپس......'' ڈی آئی جی نے جواب دیا۔ ''میری ذاتی اطلاع یہی ہے کہ کرنل احتشام کو اسی لیے درمیان میں ڈالا گیا ہے تاکہ آئی جی کو اس کی بھنک نہ ملے۔''

''میں اب بھی نہیں سمجھی......''

''مسٹر اورنگ زیب کو آکٹوپس کی نقل و حرکت کے بارے میں کچھ معلومات ہوئی ہیں۔ وہ اب پوری توجہ سے اس موذی جانور کے تعاقب میں لگا ہوگا۔''

''گڈ......'' میڈم نے خوشی کا اظہار کیا۔ ''میں آپ کے ایس پی کی کامیابی کے لیے دعا کروں گی۔''

''اس کی کامیابی میری زندگی میں بھی اجالا بکھیر دے گی...... آپ کا کیا خیال ہے۔''

''بار بار اس کا حوالہ نہ دیا کریں......'' میڈم نے دبی آواز میں جواب دیا۔ ''مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔''

''آئندہ کوئی خدمت ہو تو مجھے بھی فراموش نہ کیجیے گا۔''

''آپ کی یہ فرمائش بھی نوٹ کرلی ہے۔'' میڈم نے جواب کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع کر دیا تو تھریسا نے قریب آ کر کہا۔ ''شاید ڈی آئی جی کا فون تھا؟''

''تم ابھی تک اپنے کمرے میں نہیں گئیں؟'' میڈم روبی نے اس کے سوال کو نظرانداز کر کے پوچھا۔

''آپ کے کمرے کا دروازہ کھلا دیکھ کر ادھر آگئی تھی۔'' تھریسا قریبی کرسی پر بیٹھ گئی پھر اس نے بڑی اپنایت سے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ کوئی بات ایسی ہے جو آپ کو مضطرب کر رہی ہے۔ الماس کی موجودگی میں بھی میں یہی محسوس کر رہی تھی۔''

''میں تمہارے خیال کی تردید نہیں کروں گی۔'' میڈم روبی نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ''جب تک شیخ حامد زندہ ہے میں سکون کی نیند نہیں لے سکتی......''

''کوئی خاص بات......؟''

''آں...... ہاں۔'' میڈم نے جلدی سے بات بناتے ہوئے کہا۔ ''ابھی تمہارے ڈی آئی جی صاحب بھی یہی رونا رو رہے تھے کہ آکٹوپس کی وجہ سے ان کی خوشیاں بھی درمیان میں لٹکی ہوئی ہیں۔''

''آپ ایک بات بھول رہی ہیں کہ میں کتنے عرصے سے آپ کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے سانس لے رہی ہوں۔''

''اور میں نے تمہیں ہمیشہ اپنا ہی سمجھا ہے، کبھی غیریت کا احساس نہیں ہونے دیا۔''

''اسی بنیاد پر کہہ رہی ہوں کہ آپ کوئی اہم بات مجھ کو بتانے سے گریز کر رہی ہیں۔'' تھریسا نے کریدنے کی کوشش کی۔ ''ہمارے گارڈز کی جگہ اب کرنل احتشام کے خاص آدمی ڈیوٹی دے رہے ہیں، آپ نے اگر کرنل سے درخواست کی تھی تو اس کی بھی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی۔''

''ہاں......'' میڈم نے بڑی خوب صورتی سے بات بنائی۔ ''میرے دشمن نے فون کر کے مجھے بھی تمہاری طرح اغوا کرنے کی دھمکی دی تھی۔ میں نے حفظ ماتقدم کے پیش نظر کسی کے مشورے پر کرنل سے سیکیورٹی فراہم کرنے کی درخواست ضروری سمجھی تھی۔''

تھریسا نے اس کے بعد مزید نہیں کریدا۔ کچھ دیر بیٹھ کر واپس چلی گئی لیکن وہ قلبی طور پر مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ اسے شبہ تھا کہ میڈم کسی خاص بات کے اظہار سے گریز کر رہی تھی۔

سکندر علی شاہ کی دعوت قبول کر لینے کے بعد سے اورنگ زیب نے خود کو سراج کے گھر تک محدود کر لیا تھا، آکٹوپس کے شکار کے لیے اسے ذہنی سکون کے علاوہ موثر پلاننگ کی بھی ضرورت تھی۔ اس نے گزشتہ دو روز سے خود کو بالائی منزل تک محدود کر لیا تھا تاکہ سراج کے ملازموں کو بھی گھر میں اس کی موجودگی کا علم نہ ہو، کامیابی کے حصول کے لیے رازداری بھی شرط تھی جس کے پیش نظر وہ ناشتے اور کھانے کے لیے بھی نیچے نہیں آتا تھا۔ خود الماس بھی ملازموں کی موجودگی میں اوپر جانے سے گریز کرتی تھی۔

سراج کا زیادہ وقت بھی اوپر ہی گزرتا تھا۔ اس وقت بھی اوپر ہی بیٹھا فارم ہاؤس میں آکٹوپس کی موجودگی کے امکانات کے شبہے کے بارے میں ضروری چھان بین کی گفتگو میں محو تھا جب اسے ڈی آئی جی کی کال موصول ہوئی۔

''میرا خیال ہے آپ کسی خاص پروجیکٹ پر ضرورت سے زیادہ مصروف ہیں جو دفتر میں آپ کی سیٹ خالی ہوتی ہے؟''

''یس سر۔'' سراج نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''میرا مقصد غیر حاضری کی تفتیش نہیں تھا۔'' ڈی آئی

WWW.PAKSOCIETY.COM

جی نے کہا۔ ''کچھ دیر پیشتر مجھے رستم علی آغا خانی کی کال موصول ہوئی تھی، ان کا کہنا ہے کہ کوئی بلاوجہ انہیں فون پر تنگ کر رہا ہے...... ایک بار دبی زبان میں یہ دھمکی بھی دی ہے کہ اگر اس کا مطالبہ پورا نہ ہوا تو انجانے میں کسی نامعلوم سمت سے آنے والی سنسناتی گولی اس کی موت کا سبب بھی بن سکتی ہے۔''

''کسی پر شبے کا اظہار کیا گیا ہے؟'' سراج نے دریافت کیا۔

''نہیں......'' ڈی آئی جی نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''صرف اس شبے کا خیال سرسری طور پر کیا تھا کہ ممکن ہے کوئی دیرینہ دشمن انہیں اپنی برتری کا احساس دلانے کی خاطر اوچھے ہتھکنڈے استعمال کر رہا ہے۔''

''اس کی کوئی وجہ بھی ضرور بتائی ہوگی۔''

''ہاں...... رقم کی ادائیگی میں رستم علی نے فون کرنے والے کو ٹریپ کرنے کی خاطر ایک آفر دی تھی۔ یہ شرط بھی عائد کی تھی کہ رقم کی ادائیگی وہ براہ راست کریں گے...... جگہ اور طریقہ کار کا تعین انہوں نے دوسری پارٹی پر چھوڑ دیا تھا مگر اس کے بعد لائن کاٹ دی گئی...... دو گھنٹے بعد پھر کال آئی، رقم کا مطالبہ کرنے والے نے اس بار ایک انوکھی ہدایت دے کر کہا تھا کہ وہ مطلوبہ رقم ایک لفافے میں بند کر کے دفتر کے نائٹ شفٹ کے چوکیدار کے حوالے کر دے اور اسے تاکید کر دے کہ جو شخص بھی ملاقات کے بعد ''خفیہ بزنس'' کا کوڈ استعمال کرے چوکیدار وہ لفافہ اس کے حوالے کر دے...... رستم علی آغا خانی نے یہ شرط ماننے سے انکار کر دیا...... اس گفتگو کے ایک گھنٹے بعد انہیں پھر کسی نئے آدمی کی کال موصول ہوئی جس نے صرف ایک جملہ کہہ کر لائن کاٹ دی تھی...... مرنے کے لیے بروقت تیار رہنا......'' ڈی آئی جی نے تھوڑے توقف سے کہا۔ ''میں نے کچھ سادہ لباس والوں کی ڈیوٹی لگا دی ہے لیکن آپ بھی کسی وقت رستم علی سے مل لیں...... ممکن ہے کوئی ایسی بات بھی ہو جو وہ فون پر بتانے سے گریز کر رہا ہو۔''

''رائٹ سر...... میں کل دوپہر میں ملاقات کر لوں گا۔''

''اورنگ زیب صاحب کے بارے میں کیا اطلاع ہے......؟''

''دو دن سے ان سے ملاقات نہیں ہوئی سر۔'' سراج نے پہلو بدل کر کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ وہ آکٹوپس پر جال ڈالنے کی خاطر کوئی آخری حربہ تیار کر رہے ہوں گے۔''

دوسری جانب سے صرف ''ہوں......'' کی مبہم آواز سنائی دی پھر رابطہ ختم ہو گیا۔

''کس کا فون تھا......؟'' اورنگ زیب نے سوال پھر تفصیل سننے کے بعد کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے اس کے بارے میں؟''

''آپ کے اچانک پردہ نشین ہو جانے کی وجہ آئی جی کے پیٹ میں بھی مروڑ ہو رہی ہو گی...... شاید آئی جی صاحب کو یہ شکایت لاحق ہو کہ آپ نے اپنی رو کے سلسلے میں انہیں بھی مطلع نہیں کیا۔''

''میں رستم علی آغا خانی کو موصول ہونے والے فو کے بارے میں تمہاری رائے جاننا چاہتا ہوں؟''

''اس کا اندازہ تو اس سے ملاقات کے بعد ہو سکے گا۔''

''یہ جواب پولیس کا ایک عام کارندہ بھی دے سکتا لیکن تم اس بات کو فراموش کر رہے ہو کہ ہمارا مقابلہ آکٹوپس سے ہے جو ایک ہی وقت چھ سات دشمنوں میں نہایت آسا سے ہلچل پیدا کر سکتا ہے۔''

''آکٹوپس کا بلیک میلنگ یا سرمایہ داروں سے ٹیکس وصول کرنے کا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟''

''تم بھول رہے ہو مائی ڈیئر......'' اورنگ زیب نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ ''ایک ایسے ہی موقع پر میں نے شبنم کے اغوا ہونے کا خیال ظاہر کیا تھا مگر روشنا کو اغوا کر کے بے عزت کیا گیا...... سابقہ ڈی آئی جی علیم احمد کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا...... وہ زخم ابھی ہمارے لیے تازہ ہے......'' اورنگ زیب نے بات جاری رکھی۔ ''اس بار بھی میرا خیال ہے کہ افضل خان کو دھمکی دینے والا ہماری توجہ ایک سمت کر کے دوسری جگہ وار کرے گا۔ رستم علی آغا خانی کو فون بھی اسی بچگانا اسکیم کے تحت کیا گیا ہو گا۔''

''پھر...... اصل نشانہ کون بنے گا......؟''

''قبل از وقت یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا اور...... یہ بھی ممکن ہے کہ اس بار بیک وقت کئی دھماکے ہوں۔''

''اس خیال کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟''

اورنگ زیب کوئی جواب دینا ہی چاہتا تھا جب اس کا موبائل روشن ہو گیا۔ اسکرین پر پینتھر کے نمبر نظر آ رہے تھے۔ ''کیا خبر ہے؟'' اورنگ زیب نے موبائل آن کر کے دریافت کیا۔

''میں قانونی اہمیت والی ہستی پر پوری طرح چوکس ہوں۔'' سنجیدگی سے کہا گیا۔ ''لیکن ایک بات قابل حیرت ہے۔''

''پہیلیاں نہیں...... کھل کر فون کرنے کا مقصد بیان کرو۔''

''آپ جانتے ہیں کہ میں جگا کا پروردہ ہوں...... اب بھی اس کی سرپرستی مجھے حاصل ہے...... یہ بھی یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ لنگوٹ کا پکا ہے، اس کے سنگی ساتھی بھی ادھر ادھر منہ مارنے سے گریز ہی......''

''فون کرنے کا اصل مقصد بیان کرو۔'' اورنگ زیب نے قدرے ترش لہجہ اختیار کیا۔

''سوری سر لیکن...... ابھی پندرہ منٹ پیشتر میں نے استاد کو دلربا کے بنگلے میں داخل ہوتے دیکھا ہے، مجھے دلربا کی ایک جھلک بھی نظر آئی جس نے دروازے پر آ کر بات کی تھی پھر دونوں اندر چلے گئے...... یہ بھی عرض کر دوں کہ جو گاڑی نظر آئی وہ بھی استاد کے استعمال میں کبھی نہیں رہی......''

''میرے فون کا انتظار کرو...... ایک لمحے کے لیے بھی موجودہ سچویشن سے غافل نہ ہونا......'' اورنگ زیب نے رابطہ ختم کر کے دوسرے موبائل پر جگا کے نمبر ڈائل کیے۔

''آپ کا خادم بول رہا ہوں جناب۔'' ابھرنے والی آواز جگا کے سوا کسی اور کی نہیں تھی۔ ''میرے لائق کوئی خدمت......''

''تم اس وقت کہاں ہو......؟''

''اپنی رہائش گاہ پر...... آپ حکم کریں......''

''دلربا نامی کسی لڑکی کا نام سنا ہے؟''

''لڑکی...... دلربا...... اور جگا؟'' اس بار زیادہ سنجیدگی سے جواب ملا۔ ''آپ کو کسی دشمن نے غلط اطلاع دی ہو گی جناب...... میں اس لائن کا آدمی نہیں ہوں۔''

''ٹھیک ہے...... میں نے کسی وجہ سے تصدیق کی تھی...... آرام کرو۔'' اورنگ زیب نے جگا سے رابطہ ختم کیا پھر اس نے دوسرے موبائل پر دوبارہ پینتھر کو کال کیا۔

''پینتھر آن دی لائن......'' کال فوراً ہی اٹینڈ کی گئی۔

''جو شخص نظر آیا وہ جگا نہیں...... کوئی اور ہے......''

''میرا ذاتی خیال بھی......''

''میری بات غور سے سنو......'' اورنگ زیب نے سرسراتے لہجے میں ہدایت کی۔ ''وہ جو بھی ہو اسے جان سے نہ مارنا لیکن زخمی کرنا ضروری ہے...... اس کام کے لیے اپنے کسی خاص آدمی کو مامور کر دو...... یہ بھی معلوم کرنا ضروری ہے کہ وہ زخمی ہونے کے بعد کہاں جاتا ہے...... میں تمہاری کال کا انتظار کروں گا۔''

اورنگ زیب نے رابطہ ختم کیا تو سراج نے اسے کریدا۔

''آپ کی باتوں سے اندازہ ہو رہا ہے کہ آکٹوپس کے کچھ شکاری کتے بھی میدان میں آ گئے ہیں۔''

''ہو سکتا ہے اس کے اشارے پر اس کا کوئی خاص آدمی عمل کر رہا ہو......''

''کون ہو سکتا ہے......؟ سکندر علی شاہ؟''

''اس کا بھید بھی بہت جلد کھل جائے گا......'' اورنگ زیب نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا پھر اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ سراج نے اس حالت میں مزید کوئی سوال نہیں کیا مگر...... وہ محسوس کر رہا تھا کہ اورنگ زیب کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات کسی زلزلے کا پیش خیمہ بھی ہو سکتے تھے

☆☆☆

نگینہ کے ذہن میں اس وقت ایک لاوا پھٹ پڑنے کو مچل رہا تھا لیکن وہ اس پوزیشن میں نہیں تھی کہ اس کا اظہار کر سکتی...... وقت اس کے ہاتھوں سے ریت کی طرح پھسل چکا تھا۔ اس نے بہت کچھ کھو کر جو مقام حاصل کیا تھا، جس بلندی پر پہنچی تھی وہ محض ایک خواب بن کر رہ گئی تھی۔ اس خواب کی اب کوئی تعبیر نہیں تھی اور اگر تھی بھی تو وہ اس قدر بھیانک تھی کہ اس کے تصور ہی سے وہ کانپ اٹھتی تھی۔

کل وہ گمنام تھی، ایک جھونپڑی میں زندگی گزار رہی تھی جہاں پاس پڑوس کے رہائشی بھی وہاں ایک دوسرے سے واقف نہیں تھے لیکن اب وہ اس جھونپڑی سے نکل کر محلوں میں آ گئی تھی جہاں کے در و دیوار کی زینت بھی دور دور تک مشہور تھی۔ سکندر علی شاہ بذات خود بھی صاحب حیثیت تھا۔ اس سے منسوب ہونے کا تصور اس نے خواب میں بھی نہیں کیا تھا مگر وہ خواب ایک حقیقت میں ڈھل چکا تھا۔ پہلے وہ فٹ پاتھ کے کنارے ایک تنگ تاریک جھونپڑی میں جمیلہ کے نام سے رہتی تھی اب وہ محل میں آ کر نگینہ بن گئی تھی جس کی چمک دور دور تک پھیل گئی تھی۔

گزرے وقت کی تلخ باتیں اس کے وجود میں نشتر بن کر چبھ رہی تھیں۔ سب سے پہلے ایک مرد نے اسے زبردستی کلی سے پھول بنا دیا تھا پھر اسی مرد کی سفارش پر وہ سکندر علی کی بیوی بن گئی تھی؟ وہ مرد کون تھا؟ اس کا علم اس کے علاوہ خود سکندر علی شاہ کو بھی نہیں تھا۔ اگر وہ نامعلوم مرد سفارش نہ کرتا تو وہ سکندر علی شاہ کی ہوس کا نشانہ بننے کے بعد ایک مرد کی آغوش سے نکل کر کسی اور کی گود تک پہنچ جاتی...... پھر اس کی منزل کوٹھی کے بجائے بالاخانہ ہوتی جہاں اس کو خریدنے

WWW.PAKSOCIETY.COM

والی اس کی قیمت مقرر کر دیتی۔ اس قیمت کو چکتا کرنے کے بعد کوئی بھی اس کے جسم کو روندنے کا حقدار بن سکتا تھا لیکن قسمت نے اس کی یاوری کی تو سکندر علی شاہ سے منسوب ہوگئی اور اب...... اب جس مرد نے اسے پہلی بار بے آبرو کیا تھا...... جس کی سفارش پر سکندر علی شاہ نے اسے طوعاً و کرہاً بیوی کی حیثیت سے قبول کرلیا تھا۔ اسی مرد کے حکم پر اسے دوبارہ کوئی سزا ملنے والی تھی۔ اس سزا کے تصور نے اسے دم بخود کر دیا تھا۔ ایک بار مار دیا جاتا تو زندگی کا خاتمہ ہو جاتا لیکن وہ زندگی میں بار بار مر کر زندہ ہوتی رہی تھی اور شاید آئندہ بھی اس کے نصیب میں ٹھوکریں ہی لکھ دی جاتیں۔

سکندر علی شاہ نے بیوی کی حیثیت سے قبول کرنے کے بعد اپنے خاص کمرے کی زینت بنا دیا تھا۔ پہلی بیوی کو یکسر نظرانداز کر کے وہ ہر رات نگینہ کی خواب گاہ میں اس کے ساتھ رہتا تھا لیکن پھر ایک مرد ہی نے اسے بڑی خوب صورتی سے ٹریپ کرلیا تھا۔

رینبو کلب سے سکندر علی شاہ کے لیے ایک نوخیز کلی کو شیشے میں اتارنے کے دوران وہ خود ایک سنہری جال میں پھنس گئی تھی...... وہ کون لوگ تھے؟...... کیا چاہتے تھے؟ وہ اس راز سے قطعی لاعلم تھی لیکن انہوں نے جس حالت میں اسے سکندر علی شاہ تک پہنچایا تھا اسے دیکھنے کے بعد کوئی مرد اسے بحیثیت بیوی قبول نہ کرتا۔ سکندر علی شاہ نے بھی اس کا برہنہ گفٹ پیک دیکھ کر اس پر تھوک دیا تھا...... شاید وہ اسے رازداری سے اپنے آدمیوں کے ہاتھ مروا کر کہیں دفن کرا دینے سے بھی گریز نہ کرتا لیکن پھر وہی مرد آڑے آگیا جس نے پہلی بار اسے برباد کیا تھا...... اس کی کسی ہدایت کے بعد ہی سکندر کا عذاب نازل ہوتے ہوتے رہ گیا اور اب سارا منظر ہی اس کی توقع کے خلاف بدل گیا تھا...... کل تک وہ سکندر علی کی خواب گاہ میں صوفے پر لیٹی کسی اور لڑکی کی عزت کی دھجیاں اڑتے دیکھ کر مسکرایا کرتی تھی...... آج ایک اور لڑکی سکندر علی کی آغوش گرم کرتے وقت اسے نفرت اور حقارت بھری نظروں سے گھور کر مکافات عمل کے معنی سمجھا رہی تھی۔

ہاتھ میں آئے ہوئے تمام سنہری موقعے نگینہ کے ہاتھوں سے ریت کے ذروں کی طرح ایک ایک کر کے نکل گئے تھے لیکن وہ بہرحال ایک عورت تھی۔ حسین اور خوب صورت بھی تھی۔ وقت کے نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے اس بات کا اندازہ بھی خوب ہوگیا تھا کہ عورت اگر مہربان ہو تو گھر کی دوزخ کو بھی جنت بنا سکتی تھی اور...... اگر تریا ہٹ پر اتر آئے تو اسی جنت کو جہنم میں بھی تبدیل کر سکتی تھی۔

اس وقت بھی اپنی خواب گاہ کے کونے میں لیٹی تھی جہاں سکندر علی شاہ اپنی قیمتی مسہری پر ایک نوخیز کلی سے چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھا۔ سکندر علی شاہ نے اسے یہ حکم بھی دیا تھا کہ وہ آنکھیں بند نہ کرے لیکن...... وہ صرف نگینہ کے جسم کو قابو کر سکتا تھا...... اپنی ہر بات زور زبردستی سے منوا سکتا تھا لیکن اس کی سوچوں پر پابندی لگانا اس کے اختیار میں نہیں تھا۔

نگینہ بڑی سنجیدگی سے آنے والے کل کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وقت نے اسے زندگی کے بہت سارے نشیب سے آگاہ کر دیا تھا...... سکندر علی شاہ کی کوٹھی میں اب اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ وہ سر کے تاج سے پاؤں کی جوتی بن چکی تھی جسے کسی وقت بھی کچرا کنڈی میں پھینکا جاسکتا تھا۔ سکندر علی شاہ کو بس کسی نامعلوم شخص کے اشارے کا انتظار تھا...... لیکن اگر وہ وقت کے آنے سے پیشتر ہی کسی طرح اس کی قید سے نکل بھاگتی تو پھر زندگی کو کسی نہ کسی طور برقرار رکھنے کی خاطر ہاتھ پاؤں چلا سکتی تھی...... ابھی تک کوٹھی کے ملازموں کو اس کی گرتی ہوئی حیثیت کی بھنک نہیں ملی تھی۔ وہ کسی کو بھی پیسوں سے خرید کر ایک بار فرار ہو جاتی تو پھر بے بسی کی ان کیفیتوں سے کسی نہ کسی طرح چھٹکارا بھی حاصل کر سکتی تھی۔

دو روز بعد قدرت نے اسے ایک خاص موقع فراہم کر دیا۔ سکندر علی شاہ اس کو خواب گاہ میں بند کر کے کہیں چلا گیا تھا۔ جاتے جاتے یہ دھمکی بھی دے گیا تھا کہ اگر نگینہ نے کوئی غلط قدم اٹھانے کا ارادہ کیا تو اس کا انجام بھیانک ہوگا۔

تنہائی کے اس موقع پر نگینہ کے ذہن میں کئی نام ابھر رہے تھے۔ شیلا ورما کا نام بھی ابھرا تھا۔ وہ بھی سکندر علی شاہ کے لیے تر و تازہ مال فراہم کرنے کی خدمت انجام دیتی تھی۔ بیوٹی پارلر میں جونی سے دو چار ملاقاتوں کے بعد وہ اس کی آغوش کی زینت بن چکی تھی۔ شیلا ورما کے مقابلے میں جونی مختلف سوچ کا مالک تھا لیکن اتنا قابل اعتماد بھی نہیں تھا کہ آنکھ بند کر کے اس پر بھروسا کیا جاسکتا۔ کوٹھی کے ملازم بھی سکندر علی شاہ کے عتاب کی وجہ سے اس کی مدد کو بھی آمادہ نہ ہوتے۔

خاصی دیر تک نگینہ اندر اندر ہی الجھتی رہی پھر یکلخت ایک نام اس کے ذہن میں اندھیرے میں کسی جگنو کی طرح چمکا، دوسرے ہی لمحے اس نے کمرے میں تنہا ہونے کے باوجود خوفزدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھا پھر اس نے الماری

کھول کر اپنا وہ موبائل نکال لیا جس کا علم سکندر علی شاہ کو بھی نہیں تھا۔ یہ موبائل اسے جونی نے پہلی بار ہونے والی تنہائی کی تفصیلی ملاقات کے بعد گفٹ کیا تھا۔ نگینہ نے اسے یادگار سمجھ کر محفوظ کرلیا تھا۔ اس وقت وہی موبائل اس کے لیے دنیا میں سب سے بڑی نعمت بن گیا۔ بیٹری لگانے کے بعد اس نے آن کیا پھر ایک نمبر جو اس کے ذہن میں نقش ہو کر رہ گیا تھا اس کو ڈائل کر کے اپنی قسمت کو آزمایا۔ دوسری جانب سے گھنٹی کی آواز ابھرتی رہی لیکن کسی نے کال ریسیو نہیں کی۔ دوسری بار بھی اسے ناکامی ہوئی لیکن تیسری بار کسی نے سرد لہجے میں کال ریسیو کرلی۔ جھلائے ہوئے لہجے میں سوال کیا گیا۔

"کون ہے......؟"

"مجھے پروفیسر چنگ لائی فارچون سے بات کرنی ہے...... اٹ از ارجنٹ۔"

"تم نے غلط جگہ فون کیا ہے، یہاں اس نام کا......"

"پلیز...... رابطہ منقطع نہ کرنا۔" نگینہ نے گھبرا کر کہا۔ "میں پروفیسر سے ایک بار ملاقات کر چکی ہوں، یہ بھی جانتی ہوں کہ وہ بغیر کسی سفارش کے کسی کا ہاتھ نہیں دیکھتا لیکن وہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے...... پلیز، تم اسے بتا دو میرا نام نگینہ ہے۔"

دوسری جانب سے کوئی جواب دیے بغیر لائن کاٹ دی گئی تو نگینہ کے دل کی دھڑکن بھی تیز ہوگئی۔ امید کی جو ایک کرن اسے تاریکی میں نظر آئی تھی۔ گھپ اندھیروں میں ڈوبنے لگی لیکن تقریباً دس منٹ بعد موبائل کی روشنی بزر کے ساتھ نظر آئی تو نگینہ نے اسے آن کرلیا۔

"ہیلو...... میں نگینہ بول رہی ہوں۔"

"کون نگینہ......؟" آواز کچھ مانوس لگ رہی تھی اس لیے نگینہ نے وقت ضائع کیے بغیر رینبو کلب کے حوالے سے اپنا مختصر تعارف بھی کرا دیا۔

"سمجھ گیا...... تمہاری آواز بھی سن چکا ہوں لیکن تم شاید مجھے دوبارہ دیکھو تو پروفیسر کی ایک جھلک بھی تلاش نہ کر سکو گی۔" اس بار بے تکلفی سے کہا گیا۔

"جانتی ہوں...... لیکن اس کے باوجود اس وقت مجھے تمہاری مدد درکار ہے۔"

"یہ بھی جانتا ہوں کہ سکندر علی شاہ کو تمہارا گفٹ پیک کھول کر آٹھ سو اسی وولٹیج کا جھٹکا ضرور لگا ہوگا لیکن یہ نہیں سمجھ سکا کہ تم اب تک اس کے عتاب سے محفوظ کس طرح رہیں؟"

"اسی نامعلوم شخص کا حکم سکندر علی شاہ کے ارادوں کے آڑے آگیا جس کی تلاش تم کو بھی ہے۔" نگینہ نے مجسم التجا بن کر جواب دیا۔ "لیکن میں زیادہ دنوں محفوظ نہیں رہ سکوں گی۔"

"پھر...... کچھ نہ کچھ تو سوچا ہوگا؟" سپاٹ اور کھردری آواز میں پوچھا گیا۔

"ایک ہی آخری تدبیر ہے...... میں کسی طرح یہاں سے فرار ہو جاؤں۔" نگینہ نے گڑگڑا کر درخواست کی۔ "تم نے مجھے جب رینبو کلب سے اغوا کیا تھا۔ وہ میری موت کا پہلا دن تھا۔ اب میں تم ہی سے زندگی کی بھیک مانگ رہی ہوں...... میری بات کا یقین کرو، میرے پاس اس کے سوا کوئی دوسرا آپشن (Option) نہیں ہے۔"

دوسری جانب سے کچھ توقف کے بعد پوچھا گیا......

"کیا تم کو یقین ہے کہ سکندر علی شاہ کی قید سے فرار ہو سکتی ہو۔"

"اذیت ناک موت مرنے سے پہلے ہر ذی نفس پھڑپھڑا کر زندگی کی آرزو کرتا ہے۔ ایک کوشش میں بھی کروں گی لیکن تمہارے سوا میں کسی اور کے سامنے جھولی بھی نہیں پھیلا سکتی۔"

"ایک بات میری بھی غور سے ذہن نشین کرلو......" اس بار سرد و سفاک لہجے میں جواب ملا۔ "پروفیسر چنگ لائی کے علاوہ بھی میرے بہت سارے روپ ہیں...... تم نے اگر دھوکا دینے کی کوشش کی تو تمہارے ساتھ اور بھی کچھ لوگ کام آجائیں گے۔"

"انسان جب موت کے دہانے پر کھڑا ہو تو کسی سے فریب کرنا اس کے اختیار کی بات نہیں ہوتی...... میں اس وقت صرف تمہارے رحم و کرم پر ہوں۔" نگینہ کی بے بس آواز آنسوؤں میں بھرا گئی۔ "پلیز، مجھے مایوس مت کرنا......"

"ڈونٹ وری...... میں نے اپنے تجربے کی روشنی میں تمہاری آواز ہی سے تمہاری کیفیت کا اندازہ لگا لیا ہے...... میری بات غور سے سنو...... کوئی قدم جلد بازی میں اٹھانے کی ایسی غلطی نہ کرنا جس کے بعد تمہارے تمام راستے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں۔"

"مجھے خود بھی اس کا اندازہ ہے۔"

"کوٹھی سے نکل کر تم ٹیکسی پکڑ کر ساحلی علاقے کی طرف جاؤ گی۔" بے حد سنجیدگی سے ہدایت ملی۔ "راستے میں اگر کوئی تم کو لفٹ دینے کی کوشش کرے تو اس کو قبول کرلینا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے لیکن...... اگر تم لفٹ دینے والے کی کوئی شناخت بتا دو تو زیادہ مناسب ہوگا۔"

"تم اس وقت بارگیننگ کی پوزیشن میں نہیں ہو۔ جتنا

WWW.PAKSOCIETY.COM

کہا گیا ہے اسی کو ذہن نشین کرلو۔" دوسری جانب سے اس جواب کے ساتھ لائن منقطع کردی گئی۔

نگینہ کو اندھیرے میں کہیں دور ایک امید کی کرن ٹمٹماتی نظر آرہی تھی۔

⁂⁂⁂

اورنگ زیب کو بڑی شدت سے پینتھر کے فون کا انتظار تھا۔ جگا سے گفتگو کرنے کے بعد اس کے ذہن میں متعدد خیالات گڈمڈ ہو رہے تھے۔ دلربا جس پیشے سے منسلک تھی وہاں اس کے دروازے تک کوئی بھی جاسکتا تھا لیکن سکندر علی شاہ کے لیے وقف ہوجانے کے بعد اس نے کسی سے بھی ملنا جلنا ترک کر دیا تھا۔ ماروی کے ساتھ ریسٹ ہاؤس میں پیش آنے والے سانحے کے بعد سکندر علی شاہ نے بھی اسے باہر آنے جانے سے روک دیا تھا۔ اسے یہ بھی علم ہوگیا تھا کہ پولیس کے سادہ لباس والے بھی اورنگ زیب کی ہدایت پر دلربا کے بنگلے کی نگرانی پر مامور ہیں۔ خود اورنگ زیب نے بھی ماروی سے ملنے کے بعد دلربا سے براہ راست ملنے سے گریز کیا۔ اس میں اس کی بہت ساری مصلحتیں تھیں۔ پینتھر نے بھی یہی کہا تھا کہ نگرانی کے بعد سے دلربا نے بھی گھر سے نکلنا بند کردیا تھا پھر...... ایسی صورت میں خاص طور پر جگا کا روپ اختیار کر کے وہاں کون گیا ہوگا؟ کیا یہ محض اتفاق تھا کہ وہاں جانے والا جگا کا ہم شکل تھا یا اس میک اپ کی پشت پر بھی کوئی سوچی سمجھی اسکیم کارفرما تھی۔

"جگا کے تردید کرنے کے بعد اب آپ کس پہلو پر غور کررہے ہیں؟" سراج نے کچھ توقف سے سوال کیا۔ "کیا اس میں بھی آکٹوپس یا سکندر علی شاہ کا ہاتھ شامل ہوگا؟"

"کم از کم آکٹوپس ایسی بچگانا حرکت کبھی نہیں کرسکتا...... رہا سکندر علی شاہ تو میرے خیال میں تو اس کے امکانات بھی کم ہیں۔"

"پھر اور کون ہوگا......؟"

"ممکنہ ہے وہ دلربا کا کوئی پرانا آشنا ہو جس سے خود دلربا بھی واقف ہو۔" اورنگ زیب نے ایک امکانی بات کہی۔ "اگر واقف نہ ہوتی تو وہ اسے مکان کے اندر لے جانے کی غلطی نہ کرتی مگر...... اہم بات یہ ہے کہ اس ملاقاتی نے جگا کا میک اپ کیوں اختیار کیا......؟"

"ہمیں غلط لائن پر ڈالنے کی خاطر یہ سب کچھ بھی بہرحال کسی نہ کسی سوچی سمجھی اسکیم کے تحت کیا ہوگا۔" سراج نے پہلو بدل کر کہا۔ "ممکن ہے وہ آکٹوپس کے وہ شکاری سکتے ہوں جنھوں نے جگا کے شوروم پر اسے گھیرنے کی کوشش کی تھی لیکن لوچن اور آپ کے بروقت پہنچنے کے سبب انہیں کامیابی حاصل نہیں ہوسکی تھی۔"

اورنگ زیب نے جواب دینے کے بجائے سراج کو غور سے دیکھا، کچھ سوچتا رہا پھر مسکرا کر بولا۔ "اگر تمہارا یہ اندازہ درست تسلیم کرلیا جائے تو پھر یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ دلربا اس کہانی کے بیچ کس طرح شامل ہوگئی؟"

سراج نے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن اسی وقت اورنگ زیب کے موبائل پر سگنل موصول ہوئے۔ اورنگ زیب نے نمبر دیکھ کر فون آن کرلیا۔

"کیا خبر ہے......؟"

"آپ کے کہنے کے مطابق میرے ایک آدمی نے جگا کے ہم شکل کو باہر نکلنے کے کچھ دیر بعد زخمی کر دیا تھا...... کوئی ہنگامہ نہیں کھڑا ہوا۔ اس کے کچھ ساتھی بھی کہیں قریب موجود تھے جو لوگوں کے متوجہ ہونے سے پہلے ہی اسے ایک پک اپ میں ڈال کر لے گئے تھے۔" پینتھر نے بات جاری رکھی۔ "میں ان لے جانے والوں میں سے کسی کو شناخت نہیں کرسکا۔"

"بہرحال...... وہ جو کوئی بھی تھا، ہاتھ آکر نکل گیا۔" اورنگ زیب نے الجھن کا اظہار کیا۔

"ایسا بھی نہیں ہے......" پینتھر نے فوراً ہی جواب دیا۔ "آپ کے معاملات میں...... میں ہمیشہ بہت محتاط رہتا ہوں...... استاد کی شکل اختیار کرنے والے نے بھی مجھے چونکا دیا تھا اس لیے میں نے یہی فیصلہ کرلیا تھا کہ آنے والے کو زخمی ہونے کے بعد بھی ہاتھ سے نہیں جانے دوں گا۔"

"کیا بتانا چاہتے ہو......؟" اورنگ زیب جواب سن کر چونکا۔

"جو لوگ زخمی کو لے گئے تھے میرے ایک ساتھی نے موٹر سائیکل پر ان کا تعاقب کیا تھا۔ ان کی اطلاع کے مطابق وہ اس وقت نواحی بستی کے ایک مکان میں موجود ہیں...... میں نے اسے تاکید کردی تھی کہ میرے دوسرے فون کا انتظار کیے بغیر وہ اس مکان سے دور نہ رہے۔"

"گڈ......" اورنگ زیب نے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے بڑی تفصیل سے اس علاقے اور اس مکان کا پتا معلوم کر کے ذہن میں محفوظ کیا پھر لائن کاٹ کر سراج سے بولا۔ "مجھے دیکھنا ہوگا کہ زخمی نے خاص طور پر جگا کا روپ اختیار کرنے کی حماقت کیوں کی تھی۔"

"پھر...... کیا پروگرام ہے......؟" سراج نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "وقت ضائع کرنے کے بجائے ہمارے لیے فوری اقدام کرنا ضروری ہے۔"

"تم نہیں...... میں اکیلے جاؤں گا۔" اورنگ زیب نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا پھر سراج کے سمجھانے کے باوجود اس نے اٹھ کر ایک ریڈی میڈ میک اپ اختیار کیا اور بنگلے کے عقبی دروازے سے باہر نکل گیا......

آدھے گھنٹے بعد وہ ٹیکسی سے اتر کر اس بستی میں داخل ہو رہا تھا جہاں پینتھر کی اطلاع کے مطابق زخمی موجود تھا۔ وہاں زیادہ تر مکان اسی اور سو گز پر تعمیر تھے۔ جس مکان میں اسے جانا تھا وہ سڑک کے قریب ہی بستی میں تعمیر شدہ مکانوں کی دوسری لائن میں واقع تھا۔ اورنگ زیب نے ایک جگہ رک کر پھر کسی سے موبائل پر رابطہ قائم کیا۔ "اب اندر کی کیا پوزیشن ہے؟"

"زخمی کے علاوہ اندر دو آدمی اور بھی ہیں۔ یہ بھی عرض کردوں کہ ان کا تعلق ایسے ہی گروہ سے ہے جو منہ مانگی رقم کے عوض خود اپنا گلا کاٹنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔"

"اور کچھ......"

"میری ذاتی معلومات کے مطابق اس گروہ کا سربراہ ناگی ہے جو کئی بار سرکاری مہمان بھی رہ چکا ہے۔ پولیس کے کچھ اہلکار بھی درپردہ اس کی مدد کرتے رہتے ہیں۔ جو زخمی ہوا ہے اس کو سب جگنو کے نام سے مخاطب کرتے ہیں۔"

"میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔" اورنگ زیب نے موبائل آف کر کے جیب میں ڈالا پھر وہ کن انکھیوں سے دائیں بائیں دیکھتا مطلوبہ مکان کے دروازے کے سامنے جا کر رکا...... دروازے پر ایک مخصوص انداز میں دوبار دستک دی پھر اس کا سیدھا ہاتھ جیب میں رینگ گیا جہاں اس کا آٹومیٹک پستول موجود تھا۔

دوبار مخصوص دستک دینے کے بعد دروازہ اندر سے کھول دیا گیا۔

"کس سے ملنا ہے......؟" سامنے آنے والے نے سرسراتے لہجے میں دریافت کیا۔

"مجھے جگنو کی خیریت دریافت کرنی ہے...... اسے فوری طور پر یہاں سے کسی اور ٹھکانے پر پہنچانا ہے۔" اورنگ زیب نے بدلی ہوئی آواز میں خاص پولیس والوں کا لہجہ اختیار کیا۔

"تم نے اپنا نام نہیں بتایا......" دروازہ کھولنے والے نے دوبارہ اپنا سوال دہرایا۔

گھر۔ اُداس۔ ویران
جو اولاد نہیں

آج بھی ہزاروں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ اولاد نہ ہونے سے دوسری شادی یا طلاق جیسے گھریلو جھگڑے، اُداسیاں اور جدائیاں جنم لے رہی ہیں۔ آپ خدا تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں کیونکہ مایوسی تو گناہ ہے۔ ہم نے صرف دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں پر ریسرچ کر کے ایک ایسا خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کرلیا ہے۔ جس کے استعمال سے اِن شاءاللہ آپ کے ہاں بھی خوبصورت اولاد پیدا ہوسکتی ہے۔ آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھِل سکتے ہیں۔ آج ہی فون پر اپنی تمام علامات سے آگاہ کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوالیں۔ خدا کے لئے ہمارا بے اولادی کورس ایک دفعہ تو آزمالیں اور خدارا اپنے گھر کے ماحول کو تو جنت بنالیں۔

المُسلم دارالحکمت رجسٹرڈ
ضلع حافظ آباد۔ پاکستان
0301-6690383
0300-6526061

فون اوقات
صبح 10 بجے سے عصر 4 بجے تک

WWW.PAKSOCIETY.COM

جواب میں اورنگ زیب نے علاقہ پولیس کے ایک بدنام ہیڈ کانسٹیبل کا نام لیا تو اس کو روکنے والا ایک جانب ہٹ گیا۔ اورنگ زیب قدم بڑھاتا اندر داخل ہوا...... وہاں دو آدمی اور بھی موجود تھے۔ ان کی نظریں بھی اورنگ زیب کو کرید رہی تھیں لیکن وہ رکے بغیر سامنے والے کمرے میں چلا گیا جہاں سامنے بچھے ایک تخت پر ایک زخمی پڑا کراہ رہا تھا۔ پہلی نظر میں اس کی صورت دیکھ کر خود اورنگ زیب کو بھی اس پر جگا ہونے کا شبہ ہوا تھا۔ اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ دو آدمی اس کے پیچھے آکر پوزیشن سنبھال چکے تھے، تیسرا باہر ہی رہا تھا۔ اورنگ زیب نے پلٹ کر ان دونوں کو مخاطب کیا۔

''اس سے پیشتر کہ پولیس یہاں پہنچے تمہیں جگنو کو لے کر کسی بھی دوسرے ٹھکانے تک پہنچنا ہے...... میں یہی اطلاع دینے آیا ہوں۔''

''ہم تم سے براہ راست واقف نہیں ہیں۔'' ایک نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ''تم نے جس ہیڈ کانسٹیبل کا حوالہ دیا ہے وہ بے شک ہمارا قیمتی آدمی ہے لیکن ہم استاد کے حکم کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے۔''

''تم جانو......'' اورنگ زیب نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''مجھے جو اطلاع دینی تھی وہ دے دی۔ آگے تمہاری مرضی۔''

''اس ہمدردی کے باوجود تم بھی واپس نہیں جا سکتے۔'' دوسرا سینہ تان کر بولا۔ ''استاد کی اجازت کے بغیر تم کو بھی ہم جانے کی اجازت نہیں دیں گے۔''

جواب میں اورنگ زیب کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا، اس کی گرفت پستول کے دستے پر جمی تھی۔ وہ اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ ان دونوں کو قابو کرنے کے بعد تیسرے کو بھی گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر سکتا...... مگر دوسرے ہی لمحے جو صورت حال پیش آئی اس نے اورنگ زیب کے ہاتھ آئی بازی کو بھی پلٹ دیا۔

تیسرا آدمی جو باہر موجود تھا یکلخت اندر داخل ہو کر فرش پر اوندھے منہ گرا...... اس کے ساتھ اورنگ زیب کے علاوہ باقی دو آدمیوں کی نظریں بھی دروازے کی سمت اٹھیں جہاں ناگی ہاتھ میں پستول لیے کھڑا تھا۔

''اپنے ہاتھ جیب سے واپس نکال لو ایس پی!'' ناگی نے براہ راست اورنگ زیب کو مخاطب کیا۔ ''کوئی چالبازی نہ کرنا ورنہ تمہارا کھیل بھی تمہارے ساتھ ہی ختم ہو جائے گا۔''

اورنگ زیب کے لیے موجودہ سچویشن میں کوئی قدم اٹھانا مناسب نہیں تھا۔ اس نے خاموشی سے ہاتھ جیب سے نکال لیے لیکن اس کی نظریں بہ دستور ناگی کو گھور رہی تھیں۔

''بہت دنوں بعد ناگی کے ہاتھ آئے ہو ایس پی...... آج تمہاری تھوڑی بہت خاطر مدارات کرنا بھی ہمارا حق ہے۔ اس کے بعد تمہیں بھی اندازہ ہو جائے گا کہ ناگی کس درندے کا نام ہے۔''

اورنگ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تیسرا آدمی جو اندر آکر گرا تھا وہ یا تو بے ہوش ہو چکا تھا یا اس نے ناگی کے مزید عتاب سے بچنے کی خاطر دیدہ و دانستہ آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ دوسرے دو آدمیوں نے بڑے خونخوار انداز میں اپنے ہتھیار نکال کر اورنگ زیب پر تان لیے تھے۔

''نہیں......'' ناگی نے اپنے مسلح آدمیوں سے کہا۔ ''ایک نہتے آدمی پر تین تین ہتھیار اٹھانا مردانگی نہیں ہے۔ تم دونوں اپنا اسلحہ ایک طرف ڈال دو...... ایس پی صاحب کے لیے خادم موجود ہے اور آپ......'' اس بار ناگی نے اورنگ زیب کی جانب دیکھ کر سنجیدگی سے کہا۔ ''اگر آپ اپنے قوت بازو سے میرے دو سانڈوں کی گردن توڑ کر جا سکتے ہو تو میں...... روکوں گا بھی نہیں۔''

ان دونوں کے علاوہ اورنگ زیب نے بھی ناگی کے اشارے پر اپنا پستول نکال کر اسی کی طرف اچھال دیا۔ اسے کسی ایک موقع کی تلاش تھی جس کے بعد وہ بازی پلٹ سکتا۔

بستر پر پڑا زخمی بھی حقارت بھری نظروں سے اس کھیل تماشے کو دیکھ رہا تھا جو اورنگ زیب اور اس کے دونوں ساتھیوں کے درمیان شروع ہو چکا تھا۔ ناگی بہ دستور دروازے پر جما کھڑا تھا۔ اورنگ زیب کے لیے ناگی کی وہ انوکھی پیشکش ایک نیا تجربہ تھی۔ ناگی کے بارے میں اس کو یہی معلوم تھا کہ وہ کسی دشمن کے ساتھ رعایت کرنے کا عادی نہیں تھا۔ گولیوں کی آواز میں دشمنوں سے بات کرنا اس کا پہلا اصول تھا۔ نفری گنتا اور دشمن کو فرار ہونے کا موقع دینا ایک عام بدمعاش بھی کبھی پسند نہیں کرتا...... ناگی تو محض ایک معمولی شبہے کی بنا پر لاشیں گرانے کا عادی تھا۔

بہر حال اورنگ زیب اس وقت ان دونوں آدمیوں پر نظریں جمائے ہوئے تھا جو اسے گھیر کر دبوچنے کی کوشش میں بار بار جھکائی دے رہے تھے۔ اورنگ زیب نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ وہ جوڈو اور کراٹے کے علاوہ مارشل آرٹ کے بھی تمام داؤ پیچ سے پوری طرح واقف تھا۔

کچھ دیر تک تینوں دائرے کی صورت میں جگہ تبدیل کرتے رہے پھر ایک نے اچانک جست لگا دی، اورنگ زیب پوری طرح چوکس تھا اس نے چھلانگ لگانے والے کو ڈاج دے کر سیدھے پاؤں کے جوتے کی نوک سے اس پر

ایسی نپی تلی ٹھوکر لگائی جس کے بعد وہ رانوں کے بیچ دونوں ہاتھ رکھ کر اس طرح ماہی بے آب کی طرح فرش پر لوٹنے لگا جیسے کسی لمحہ بھی سانس اکھڑنے والی ہو...... اس کا دوسرا ساتھی صورت حال دیکھ کر سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا جب اورنگ زیب نے ایک پاؤں زمین پر جما کر کسی پھرکنی کی طرح فضا میں گھوم کر دوسرے پاؤں کی ٹھوکر اس کی گردن پر ماری، وہ بھی ایک لمحے کو چکرا گیا۔ گرتے گرتے سنبھلا، پھر سنبھلنے کے بعد جیسے دیوانہ ہو گیا ہو...... کسی زخمی گینڈے کی طرح اس نے اورنگ زیب پر چھلانگ لگائی تھی۔ اورنگ زیب نے پوزیشن بدل کر جوابی وار کیا تو اس کی ناک سے بھل بھل خون ابلنے لگا۔ وہ جواب میں وحشیوں کی طرح حملہ آور ہوا لیکن اس بار ہوا میں اچھلتا ہوا سامنے والی دیوار سے ٹکرا کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ دوبارہ اس نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی، شاید اسے مد مقابل کی مہارت اور قوت کا اندازہ ہو چکا تھا۔

دونوں سے چھٹکارا پانے کے بعد اورنگ زیب نے دروازے پر کھڑے ناگی کو تیز نظروں سے گھورا۔ ناگی کی نظریں چمک رہی تھیں۔ اس چمک میں خوشی کا ایک عکس بھی نمایاں تھا۔ اورنگ زیب ناگی سے کچھ کہنا چاہتا تھا جب ناگی نے برق رفتاری سے ہاتھ میں دبے ہوئے پستول سے ایک گولی خارج کر دی۔ اورنگ زیب نے نگاہوں کا زاویہ بدل کر دیکھا۔ تخت پر پڑا زخمی تڑپ کر فرش پر اوندھا گیا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک شکاری چاقو پڑا تھا۔ اپنے دو ساتھیوں کا انتقام لینے کی خاطر اس نے شاید اورنگ زیب کو عقب سے نشانہ بنانا چاہا تھا لیکن ناگی کا عتاب اس کے آڑے آگیا...... یہ صورت حال اور ناگی کا رویہ اورنگ زیب کے لیے تعجب خیز ہی تھا جب ناگی نے اگلا قدم اٹھایا...... اس نے اپنے ہاتھ میں دبا ہوا پستول اورنگ زیب کے قریب اچھال دیا۔ جذباتی انداز میں بولا۔

''مجھے یقین تھا صاحب کہ تم ان دو کوڑی کے کتوں کے قابو میں نہیں آؤ گے۔''

''اورنگ زیب اس آواز کو سن کر دم بخود رہ گیا پھر ناگی نے اپنے چہرے سے ریڈی میڈ میک اپ اتارا تو شبہ کی کوئی گنجائش بھی باقی نہیں رہ گئی...... اب تک جو ناگی کا رول ادا کر رہا تھا وہ جگا کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔

''اب یہاں سے نکل چلو صاحب...... باقی کہانی میں آپ کو راستے میں سنا دوں گا۔''

''میرے لیے یہ تینوں زخمی بھی اہم ہیں......''

''ان کی فکر نہ کرو صاحب...... میرے آدمی باہر موجود ہیں...... وہ ان دم توڑتے کتوں کو بھی سمیٹ کر ایک ٹھکانے تک پہنچا دیں گے۔''

اورنگ زیب جگا کے ساتھ قدم اٹھاتا باہر آگیا۔ کچھ فاصلے پر سیاہ رنگ کی ایک پرانی شیورلیٹ کھڑی تھی۔ گاڑی کو بستی سے نکال لے جانے کے ساتھ ہی جگا نے اصل صورت حال کی کہانی بھی شروع کر دی۔

''مجھے خوشی ہے کہ وکی (پینتھر) نے آپ کے ساتھ دغابازی نہیں کی۔ دلربا کے بنگلے پر میرے ہم شکل کو دیکھ کر اس نے پہلے آپ ہی سے رابطہ کیا تھا پھر اسے زخمی کرنے کے بعد اس نے مجھے بھی ساری سچویشن سمجھا دی تھی۔ معاملے کی تہ تک پہنچنے کے بعد ہی میں نے ناگی کا روپ اختیار کیا تھا۔''

''اس کی کوئی خاص وجہ بھی ضرور ہوگی؟''

''آپ کو یاد ہوگا صاحب کہ ایک بار میرے شوروم پر بڑا منظم حملہ ہوا تھا، لوچن بھی بروقت آگیا تھا پھر آپ نے درمیان میں آکر میرے قدموں میں برداشت کرنے کی بیڑی ڈال دی تھی۔'' جگا نے کہا۔ ''اس روز ناگی کے کچھ بھاڑو ہی کسی کے اشارے پر مجھے مارنے آئے تھے اور اب انہوں نے میرا روپ اختیار کر کے پھر میری غیرت کو للکارا تھا اس لیے میں نے بھی ناگی ہی کا روپ اختیار کر کے اینٹ کا جواب پتھر سے دینا مناسب سمجھا۔ میری اس حرکت سے آپ کو اگر شکایت ہو تو میں معافی ہی طلب کروں گا۔''

''نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ اگر سامنے والے نے شطرنج کی بساط کے کچھ مہرے ادھر ادھر کر دیے ہوں گے تو مجھے کچھ دشواریوں کا سامنا ہوگا۔''

''آپ کا اشارہ کس طرف ہے؟''

''دلربا میرے لیے خاصی اہمیت رکھتی ہے۔'' اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اگر تم نے مجھے پہلے صورت حال بتا دی ہوتی تو میں کم از کم اسے ہاتھ سے نکلنے کا کوئی موقع نہ دیتا۔ میرا خیال ہے کہ ناگی کے وہاں جانے اور زخمی ہونے کی اطلاع سکندر علی شاہ تک بھی ضرور پہنچ گئی ہوگی۔''

''شطرنج کی چالیں کچھ کچھ مجھے بھی آتی ہیں صاحب۔'' جگا نے کسمسا کر جواب دیا۔ ''امداد علی نے میری مدد نہ کی ہوتی تو جیل یاترا کر کے واپسی کے بعد میں بھی ناگی کی طرح کوئی روپ اختیار کر لیتا۔ مگر اوپر والے کا کرم تھا جو سیدھے راستے پر لگ گیا لیکن وقت کی نزاکت کا خیال رکھنا میرے لیے بھی اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے جتنی کسی اور کے لیے ضروری ہوتی ہے......'' جگا نے بات جاری رکھی۔ ''یہ بات میں بھی سمجھتا ہوں کہ دلربا کی کیا حیثیت ہے اور وہ قانون کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

نظروں میں کیا اہمیت رکھتی ہے اس لیے میں نے بھی موقع کی نزاکت بھانپ کر وکی (پینتھر) کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ پہلی فرصت میں اسے چھومنتر کر کے کسی محفوظ مقام پر پہنچا دے۔"

"گڈ...... لیکن کیا پینتھر کامیاب ہو گیا ہے؟"

"ابھی معلوم کیے لیتا ہوں۔" جگا نے موبائل نکال کر مطلوبہ نمبر ملائے پھر اپنی مخصوص زبان میں یہ بات بھی کنفرم کر لی کہ دلربا کو نہایت خاموشی سے اس کے بنگلے سے نکال کر دوسری محفوظ جگہ پر منتقل کر دیا گیا ہے۔

اورنگ زیب نے جگا کو ستائشی نظروں سے دیکھا پھر وہ ناگی کے سلسلے میں کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا تھا جب اس کے موبائل پر سگنل ملے...... اورنگ زیب اسکرین پر ابھرنے والے نمبر کو دیکھ کر چونکا پھر بڑے مہذب لہجے میں بولا۔

"اس وقت خادم کو کیسے یاد کر لیا؟"

"چند ناگزیر حالات کی وجہ سے آپ کے ساتھ جو پروگرام طے ہوا تھا اس میں کچھ تبدیلی کرنی ضروری ہو گئی ہے۔" دوسری جانب سے سکندر علی شاہ کی آواز ابھری۔ "میں ایک دو روز بعد آپ کو تفصیل سے آگاہ کروں گا۔"

"کیا میں آپ کے کسی کام آ سکتا ہوں؟"

"جب دوست کہا ہے تو کبھی آپ کو بھی ضرور آزماؤں گا لیکن فی الحال ایسی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"بہرحال...... آپ نے میرے علاج کے لیے جو وعدہ کیا ہے اسے فراموش نہ کر دیجیے گا۔" اورنگ زیب نے دیدہ و دانستہ عاجزی سے کہا۔

"ڈونٹ وری......" دوسری جانب سے رابطہ منقطع کر دیا گیا...... اورنگ زیب کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ ابھر کر گہری ہوتی چلی گئی۔

☆☆☆

نگینہ کے فرار ہو جانے کی اطلاع سکندر علی شاہ کے لیے کسی ایٹمی دھماکے سے کم ہولناک نہیں تھی۔ کسی زخمی درندے کی طرح اس وقت وہ اپنی خواب گاہ میں ٹہل رہا تھا۔ دروازے پر موجود اس کا خاص آدمی بھی سر جھکائے کھڑا تھا۔

نگینہ کی حیثیت سکندر علی شاہ کے لیے پاؤں کی جوتی سے زیادہ اہم نہیں تھی جنہیں وہ دو ایک بار استعمال کر کے یا تو پھینک دیتا ہے یا کسی دوسرے ضرورت مند کے حوالے کر دیتا ہے۔ نگینہ گدڑی کا لعل تھی جسے پہلی بار استعمال کرنے کے بعد سکندر علی شاہ نے اس کے قرب کی گرمی سے متاثر ہو کر دو تین بار مزید اپنے بستر کی زینت بنانے کا ارادہ کیا تھا۔ اس کے بعد اس کا بھی وہی انجام ہوتا جو دوسروں کا ہوتا تھا جب شکرہ کے حکم پر سکندر علی شاہ کو مجبوراً اس کے ساتھ نکاح کرنا پڑا۔ یہ اور بات تھی کہ بیوی کی حیثیت حاصل ہونے کے بعد نگینہ نے اپنی معصوم اداؤں اور خودسپردگی کے والہانہ انداز سے سکندر علی شاہ کی نظروں میں ایک مقام ضرور بنا لیا تھا پھر جب نگینہ نے سکندر علی شاہ کے لیے شیلا ورما اور جونی کے ساتھ سانٹھ گانٹھ کر کے تازہ راشن کی فراہمی میں ہاتھ بٹانا شروع کیا تو سکندر علی شاہ نے بھی اسے ڈھیل دے دی تھی مگر......

ریٹیو کلب سے نگینہ کے اغوا کی اطلاع کے بعد جب اسے اس کا برہنہ گفٹ پیک ملا تو سکندر علی شاہ نے اس خوب صورت فتنے کو ٹکڑوں میں منقسم کرنے کے بعد سمندر برد کرانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جن لوگوں نے اغوا کیا تھا وہ نگینہ کے حوالے سے اسے بلیک میل بھی کر سکتے تھے۔ ان کے جال کو توڑنے کی خاطر یہی مناسب تھا کہ نگینہ کے قصے کو یکسر ختم کر دیا جاتا جس کے بعد اغوا کرنے والے اس کی رعایت سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے لیکن شکرہ نے درمیان میں آ کر کچھ دن انتظار کرنے کو کہا تھا اور اب......

نگینہ کوٹھی سے فرار ہو کر اس کی پہنچ سے کہیں دور نکل گئی تھی۔

سکندر علی شاہ ٹہلتے ٹہلتے رک گیا۔ اس نے دروازے پر موجود اپنے خاص کارندے جابر کو سرسراتے لہجے میں مخاطب کیا۔ "میری غیر موجودگی میں تجھے نگاہیں کھلی رکھنی چاہیے تھیں۔"

"صرف کوٹھی کے باہر کی حد تک۔" کارندے نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔ "زنان خانے میں دوسروں کی طرح میرا داخلہ بھی منع ہے...... اس کے علاوہ آپ کے حکم کے بموجب میں صدر دروازے سے گزر کر آنے جانے والوں پر نگاہ رکھنے کا پابند ہوں۔ کوٹھی کے عقبی حصے میں ملازماؤں کے کوارٹر ہیں شاہ جی...... اس لیے میں اس طرف جانے سے بھی پرہیز ہی کرتا ہوں۔"

"تیرا شبہ کس پر ہو سکتا ہے؟" سکندر علی شاہ نے عقبی راستے کے حوالے پر ہونٹ چباتے ہوئے دریافت کیا۔

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن...... میری معلومات کے مطابق چھوٹی بیگم صاحبہ کے ساتھ رانی کا میل جول دوسروں کے مقابلے میں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی تھا۔"

پھر...... سکندر علی شاہ کے حکم پر جابر نے...... جس کا اصل نام جبار خان تھا رانی کو بھی لا کر پیش کر دیا جو بڑی سہمی سہمی نظر آ رہی تھی۔

"کوٹھی سے ایک نفری کم ہو گئی ہے؟" سکندر علی شاہ نے غضب ناک انداز میں سوال کیا۔ "اس کے بارے میں تو کیا کہے گی؟"

"میں دھوکا کھا گئی......" رانی نے موقع کی نزاکت بھانپ کر ہاتھ جوڑ لیے۔ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "چھوٹی بیگم نے مجھے جو کہانی سنائی وہ شاید غلط ہی تھی۔"

"کھل کر سب کچھ اگل دے حرافہ......" سکندر علی شاہ نے الٹا ہاتھ رسید کیا تو رانی گرتے گرتے بچی پھر اس کی زبان بھی فر فر چلنے لگی۔

رانی کی کہانی کے مطابق نگینہ بیگم نے اسے موبائل پر کال کر کے طلب کیا تھا۔ خواب گاہ کا دروازہ بھی باہر سے بند تھا جسے رانی نے کھولا تھا۔ نگینہ نے اس کے بعد جو کچھ کہا اس پر بھی رانی کو آنکھیں بند کر کے اعتبار کرنا پڑا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ایک مرید شاہ جی کو کسی بہانے سے لے گیا ہے۔ اسی نے باہر سے دروازہ بھی بند کر دیا تھا۔ نگینہ نے سکندر علی شاہ کو واپس لانے کی خاطر ضروری بندوبست اور اپنے ذرائع کو استعمال کرنے کی بات کہی تھی۔ یہ بھی حکم دیا تھا کہ اس بات کی بھنک کسی اور کو نہ ملے۔ وہ رانی کے ساتھ ہی عقبی دروازے کی طرف گئی تھی۔ گاڑی نہ لے جانے کا یہ جواز پیش کیا تھا کہ دشمنوں کو اس کی نقل و حرکت کا سراغ نہ ملے۔

"بکواس بند کر......" سکندر علی شاہ گرج کر بولا۔ "کیا میں اتنا ہی گیا گزرا ہوں کہ کوئی مجھے اغوا کر کے لے جاتا اور میرے شکاری کتوں کو اس کی بھنک بھی نہ ملتی۔"

جواب میں رانی تھوک نگل کر رہ گئی۔ ہاتھ باندھے کھڑی خوف سے کپکپا رہی تھی جب سکندر علی شاہ کی گھن گرج دوبارہ اس کی قوت سماعت سے ٹکرائی۔ اس بار اس نے جابر کو مخاطب کر کے فیصلہ کن انداز میں حکم دیا۔

"تم اس کمینی کو لے جا کر سچ اگلوانے کی کوشش کرو۔ جو ہاتھ سے نکل گئی اس کے لیے تم بھی اپنے آدمیوں کو اطلاع کر دو، میں بھی اپنے ذرائع استعمال کرتا ہوں۔"

"جو حکم سرکار......" جابر خان، رانی کا ہاتھ تھام کر باہر گھسیٹ کر لے گیا۔ وہ نگینہ کے ماضی اور اس کے کردار سے بھی ناواقف نہیں تھا، یہ بھی سمجھتا تھا کہ وہ شیلا ورما اور جونی کے ساتھ کھیل کود کرنے کے بعد کتنی گہرائی میں اتر چکی ہے۔ رانی کے بیان کے مطابق اسے فرار ہوئے دو گھنٹے ضرور گزر چکے تھے۔ اس عرصے میں اس کی مدد کرنے والوں نے بھی سکندر علی شاہ کے خوف سے کہیں تہ خانے میں چھپا دیا ہو گا جہاں تک رسائی میں کسی آسانی کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ فی الحال وہ اس بات پر خوش تھا کہ رانی کو اس کے حوالے کیا گیا تھا جس کو حاصل کرنے کی خواہش اس کے دل میں ایک مدت سے تڑپ رہی تھی۔

سکندر علی شاہ جابر کے جانے کے بعد بھی ذہنی طور پر الجھتا رہا۔ ایک ذرا سی غلطی اس کی ساکھ اور بنی بنائی شہرت کو ملیامیٹ کر سکتی تھی۔ نگینہ کو واپس لانے یا اس کا قصہ ختم کرا دینے کی خاطر کسی فوری اقدام کی ضرورت تھی۔ اس نے کچھ سوچ کر ایک خاص آدمی کو فون کیا۔

"آپ کا خادم بول رہا ہوں شاہ جی......" دوسری جانب سے خادمانہ لہجے ہی میں جواب ملا۔

"تم اس وقت کہاں ہو......؟"

"آپ حکم کریں، میں تعمیل میں تاخیر نہیں کروں گا۔"

"ایک قیمتی چیز ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ اگر وہ فوری واپس نہ ملی تو بلاوجہ کی پریشانی ہو گی۔"

"اشارہ کریں...... میں آپ کا پرانا تابعدار ہوں۔"

"نگینہ......" سکندر علی شاہ نے مدھم لہجے میں ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔ "وہ تقریباً دو گھنٹے سے غائب ہے۔"

"اوہ......" دوسری جانب سے بھی تشویش کا اظہار کیا گیا۔ "وقت زیادہ ہو گیا پھر بھی...... آپ کو کسی نہ کسی پر تو شبہ ہو گا۔"

"شبہ ہوتا تو اب تک اسے جہنم رسید کر چکا ہوتا لیکن......" سکندر علی شاہ نے غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "تم اسے کونے کھدروں میں بھی تلاش کرنا شروع کر دو...... میرا خیال ہے کہ اسے کسی اچھے آدمی نے فرار کا راستہ نہیں دکھایا ہو گا۔"

"ٹھیک ہے شاہ جی...... میں اپنے بندوں کو بھی......"

"نہیں......" سکندر علی شاہ نے اس کا جملہ درمیان سے اچک لیا۔ "بات پھیلی تو میری بدنامی بھی ہو گی۔"

"یہ مجھ پر چھوڑ دیں جناب...... میں نے جو کتے پالے ہیں وہ میری مرضی کے بغیر دم ہلانے کی بھی غلطی نہیں کرتے۔"

"ایک آخری ہدایت بھی نوٹ کر لو۔ وہ جہاں بھی ملے اسے وہیں ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا۔" سکندر علی شاہ نے بے حد سفاک لہجے میں کہا۔ "کاغذ جل جائے تو پھر اس کی راکھ بھی ہوا میں اڑا دینا۔ میں اپنے دامن پر کوئی داغ دھبا برداشت کرنے کا عادی نہیں ہوں۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

"بے فکر ہو جائیں...... ایک بار وہ مل جائے پھر ہم اس کے حمایتوں کی کھٹیا اٹھانے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔"

سکندر علی شاہ نے موبائل بند کر کے دوبارہ ٹہلنا شروع کر دیا۔ اس کے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ ایک ہی سوال رہ رہ کر ابھر رہا تھا کہ نگینہ کو ہتھیلی لگانے والے کون ہو سکتے ہیں؟ ...... وہ اس منحوس گھڑی کو گالیاں سنا رہا تھا جب اس نے شکرہ کے دباؤ میں آ کر نگینہ سے شادی کی غلطی کی تھی...... ایک خوب صورت ناگن کو پال لیا تھا جو اب پٹارے سے نکل جانے کے بعد پلٹ کر اسے ڈسنے کی کوشش بھی ضرور کرے گی...... خیالات کا ایک ہجوم تھا جو گرم ہوا کے تند جھونکوں کی طرح اس کے وجود میں چبھ رہا تھا جب اس کے فون کی گھنٹی کی آواز ابھری۔ ٹہلتے ٹہلتے اس نے چونک کر فون کو گھورا پھر لپک کر ریسیور اٹھا لیا۔

"سکندر علی شاہ بول رہا ہوں......"

"جانتا ہوں کہ اب تمہاری خواب گاہ میں کوئی دوسرا فون ریسیو کرنے والا نہیں رہا......" چبھتے ہوئے لہجے میں دوسری جانب سے شکرہ کی آواز ابھری۔ "میں تمہیں پہلے بھی متعدد بار بتا چکا ہوں کہ تمہاری کوٹھی کے کسی کونے میں رینگنے والے کیڑے کی سرسراہٹ کی آواز بھی میرے کانوں تک پہنچ جاتی ہے...... شکرہ بلندیوں پر پرواز کے دوران سمندر کی تہوں میں چھپے اپنے شکار سے بھی کبھی غافل نہیں رہتا۔"

"جانتا ہوں۔" سکندر علی شاہ نے پہلی بار جھلاہٹ کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔ "جس روز اس بدکردار کا گفٹ پیک ملا تھا، میں نے اسی دن اس خطرے کو ہمیشہ کے لیے دفن کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن......"

"ہوش میں رہنے کی کوشش کرو سکندر علی شاہ۔" دوسری جانب سے بولنے والے کا لہجہ یکلخت تبدیل ہو گیا۔ "تم اس پوزیشن میں نہیں ہو کہ مجھ سے شکایت کی جرأت کر سکو...... دوبارہ کبھی بھول کر خواب میں بھی ایسی جرأت نہ کرنا۔"

"میرا مطلب یہ نہیں تھا بلکہ......"

"کوئی وضاحت مت کرو...... صرف اپنی کھال کے اندر رہنے کی عادت ڈالو۔" اس بار بھی درشت لہجے میں پھنکارا گیا تو سکندر علی شاہ کی پیشانی پر شکنوں کا جال پھیل گیا۔ یہ پہلا اتفاق تھا جب کسی نے اسے حقارت اور نفرت سے مخاطب کیا تھا۔ وہ ابھی خود پر قابو پانے کی کوششوں میں مصروف تھا جب شکرہ کی تیز آواز دوبارہ ابھری۔

"تم نے میرے اس وقت فون کرنے کا مقصد نہیں پوچھا......؟"

"میں نے اپنے ایک وفادار شکاری کتے کو نگینہ کو کسی بھی قیمت پر تلاش کرنے اور جہنم رسید کرنے کی ہدایت جاری کر دی ہے۔" سکندر علی شاہ نے غصہ بہ مشکل ضبط کر کے جواب دیا۔

"میرے لیے سب سے زیادہ اہمیت ایس پی کی ہے۔" شکرہ نے اس بار سنجیدگی سے کہا۔ "اس کو ٹھکانے لگانے کے بعد ہی میں سکون کا سانس لوں گا۔"

"اس کی سانسیں بھی اب گنی چنی رہ گئی ہیں۔ کل میرے پروگرام کے مطابق فارم ہاؤس آنے کے لیے وہ شدت سے بے چین ہوگا۔"

"اسے تر نوالہ سمجھنے کی غلطی کبھی نہ کرنا...... ہو سکتا ہے کہ فارم ہاؤس آنے کے لیے بھی وہ کسی منصوبے کی پلاننگ میں مصروف ہو لیکن وقتی طور پر اب پروگرام کینسل کر دو۔"

"کوئی خاص وجہ......؟" سکندر علی شاہ نے تعجب سے پوچھا۔

"وجہ کی ذمے داری بھی تم ایس پی پر ڈال سکتے ہو......" کچھ توقف سے کہا گیا۔ "میری اطلاع کے مطابق ایس پی کو بھی ابھی تک کسی مچھلی کے جال سے نکل جانے کی خبر نہیں ملی۔"

"میں نگینہ کو اتنا اہم نہیں سمجھتا کہ ایس پی......"

"غلط اندازہ لگایا تم نے...... میں نگینہ کی نہیں دلربا کی بات کر رہا ہوں...... وہ بھی تمہاری دسترس سے دور جا چکی ہے۔"

دوسری جانب سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ دلربا کے ہاتھ سے نکل جانے کی اطلاع سکندر علی کے لیے بم کے دھماکے سے کم نہیں تھی پھر...... شکرہ کی ہدایت پر ہی اس نے اورنگ زیب سے پروگرام کی تبدیلی کی بات کی تھی۔

ساحلی علاقے کی ایک اوسط درجے کی ہٹ میں پہنچنے کے بعد نگینہ نے سکون کا سانس ضرور لیا تھا لیکن کچھ باتیں تھیں جو اسے الجھا رہی تھیں۔ جن حالات میں وہ سکندر علی شاہ کی کوٹھی تک پہنچی تھی اور جس طرح اسے نکاح میں قبول کیا گیا تھا وہ محض ایک خواب ہی تھا ورنہ یہ بات اسے بھی معلوم تھی کہ سکندر علی شاہ پاؤں کی جوتیاں بھی صبح و شام بدلنے کا عادی تھا۔ جس نے اسے شادی کرنے کا حکم دیا تھا وہ ابھی ایک معما تھا...... خود سکندر علی شاہ بھی براہ راست اس سے واقف نہیں تھا لیکن کوئی راز ایسا ضرور تھا جو وہ اس کی کسی بات سے انکار بھی نہیں کر سکتا۔ یہ بات بھی سکندر علی شاہ کی زبان ہی سے ایک دن نکل گئی تھی کہ...... "جس نے تمہیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

پہلی بار روندا تھا اسی کے کہنے پر میں نے تم کو گھر کی زینت بنا لیا ہے۔"

نگینہ کے ذہن میں بھی اس کی بس ایک دھندلی سی نامکمل شکل تھی جو ماضی کے پردوں پر کبھی کبھی پرچھائیں بن کر ابھر آتی تھی۔ اس نے کبھی اس کے بارے میں غور وخوض کرنے کی کوشش بھی نہیں کی مگر وقت کے ساتھ ساتھ وہ سکندر علی شاہ کی ایک ایک رگ کو اچھی طرح پہچاننے لگی تھی۔ حالات کے پیش نظر اس نے خود کو اسی ماحول کے سانچے میں ڈھال لیا تھا۔ خوب صورت لڑکیوں کی تازہ کھیپ تلاش کرنے میں بھی اس نے کبھی ہچکچاہٹ نہیں کی تھی۔ یہ بات بھی سچ تھی کہ اس راستے پر قدم بڑھاتے ہوئے کبھی کبھی اس کے پاؤں بھی رپٹ گئے تھے۔ شیلا ورما کے بیوٹی پارلر میں آنے جانے کے دوران جونی سے بھی اس کی بے تکلفی ہوگئی تھی۔ اس کے بعد جو ہوا اس کی خبر شیلا ورما کو بھی مل گئی تھی لیکن سکندر علی شاہ کی وجہ سے شیلا ورما نے کھل کر کسی بات کی سرزنش نہیں کی تھی...... صرف اتنا کہا تھا کہ اس نے اپنا بہت کچھ کھو کر جونی کو پایا ہے اور...... اب اسے پالینے کے بعد کسی بھی قیمت پر کھودینے کو تیار نہیں تھی۔ یہ ایک اشارہ ہی نگینہ کے لیے بہت تھا۔ اس نے جونی سے ملنے جلنے میں کمی کردی تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ سکندر علی شاہ کے بارے میں بھی جان گئی تھی کہ اس نے محض اچھی شہرت حاصل کرنے کی خاطر پیری مریدی کا ڈھونگ رچا رکھا تھا ورنہ عام زندگی میں کسی شیطان سے کم نہیں تھا۔ اسی فطرت کے پیش نظر وہ گھر میں کام کرنے والی عام ملازماؤں پر بھی کڑی نگرانی رکھتا تھا۔ کون کہاں اٹھتی ہے؟...... کہاں بیٹھتی ہے؟ کہاں آتی جاتی ہے؟...... کس کس سے ملتی ہے؟...... اس ملاقات کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟

اپنی عزت کا بھرم قائم رکھنے کی خاطر اس نے بہت سخت اصول بنا رکھے تھے...... ایسی صورت میں نگینہ کا ہاتھ سے نکل جانا وہ کس طرح منظور کرسکتا تھا؟...... کیا اس کو علم نہیں ہوگا وہ کس وقت گھر سے نکلی تھی؟...... اس وقت کہاں تھی......؟

ساحلی علاقے کی ہٹ میں بیٹھی اس وقت بھی اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کو گن رہی تھی...... کچھ وسوسے تھے جو اس کے ذہن کی گہرائیوں میں چبھ رہے تھے...... جن حالات کے پیش نظر اس نے فرار ہونے کا منصوبہ بنایا تھا وہ غلط بھی نہیں تھا...... اس بات کو وہ سمجھ چکی تھی کہ "برہنہ گفٹ پیک" ملنے کے بعد وہ سکندر علی شاہ کی نظروں سے گر چکی تھی، کسی کا حکم آڑے نہ آجاتا تو شاید وہ نگینہ کے ٹکڑے ٹکڑے کرا کے سمندر برد کرنے میں ایک دن کی بھی تاخیر نہ کرتا لیکن اسی نامعلوم آدمی کے مشورے پر اس کا عتاب وقتی طور پر ٹل گیا تھا۔ منسوخ نہیں کیا گیا تھا...... اسی مہلت سے فائدہ اٹھا کر اس نے ایک انتہائی قدم اٹھا لیا تھا۔

بہت غور وخوض کرنے کے بعد ہی اس نے پروفیسر چنگ لائی فارچون کو فون کیا تھا جس نے اسے رینبو کلب سے اغوا کرنے کے بعد موت کی آخری سرحدوں تک پہنچا دیا تھا۔ وہ جو بھی تھا اس نے بھی کسی خاص مصلحت کی بنا پر سکندر علی شاہ کو بلیک میل کرنے کا منصوبہ تیار کیا تھا...... اس کے بعد آنے والی فون کالز کے بعد نگینہ کو بھی اس بات کا بخوبی اندازہ ہوگیا تھا کہ پروفیسر چنگ لائی کا ڈھونگ رچانے والے کو بھی اسی نامعلوم شخص کی تلاش تھی جس نے سکندر علی شاہ کو اپنے اشاروں پر ناچنے پر مجبور کردیا تھا۔ اسی کے مشورے پر وہ کوٹھی سے نکلی تھی۔ خوش قسمتی سے اسے باہر نکلتے ہی ایک خالی ٹیکسی بھی مل گئی جس میں بیٹھ کر وہ ساحلی علاقے کی سمت جارہی تھی جب ایک موٹر سائیکل سوار کئی بار اس کی ٹیکسی کے قریب آیا تھا۔ ایک بار نگینہ کی نظریں اس سے چار ہوئیں تو اس نے بہت واضح طور پر کسی عیاش آدمی کی طرح آنکھ مار کر ساتھ چلنے کا اشارہ دیا تھا...... وہ اسے پہلی دفعہ ٹال گئی لیکن دوسری بار جب وہ ٹیکسی کے قریب آیا تو نگینہ کو وہ ہدایت یاد آگئی جو اسے پروفیسر چنگ لائی نے دی تھی...... اس نے فوری طور پر ٹیکسی والے کو رکنے کو کہا تھا۔ ٹیکسی رکنے کے بعد میٹر پر نظر آنے والی رقم سے کچھ زیادہ رقم دے کر اترنے کی خاطر اس نے دروازہ کھولا تو ٹیکسی ڈرائیور نے بڑی بردباری سے ایک جملہ دبی زبان میں کہا تھا۔

"آج کل نوجوان نسل بگڑتی جارہی ہے دوسروں کو بھی اپنے رنگ میں رنگنا چاہتی ہے۔"

وہ اس جملے پر خون کا گھونٹ پی کر رہ گئی تھی...... ٹیکسی کے آگے بڑھ جانے کے بعد وہی نوجوان موٹر سائیکل اس کے قریب لے آیا تھا۔

"تشریف رکھیں......" اس نے نگینہ کو معنی خیز نظروں سے گھور کر ایک خاص انداز میں دعوت دی تو وہ انکار بھی نہ کرسکی لیکن اب وہ بڑی سنجیدگی سے غور کررہی تھی کہ کہیں غلط ہاتھوں میں تو نہیں پھنس گئی......؟ اس کی وجہ بھی معقول تھی۔ جس نے اسے لفٹ دی تھی وہ بہرحال وہ نہیں تھا جسے اس نے فون کیا تھا۔

نگینہ اسی نکتے پر غور کررہی تھی جب نوجوان جو اسے ہٹ میں چھوڑ کر باہر چلا گیا تھا، دوبارہ اندر آگیا۔ اس کے ساتھ ہٹ کا چوکیدار تھا جس نے ایک ٹرے میں ڈرائی فروٹس اور ڈرنکس کے سربند گتے کے ڈبے اٹھا رکھے تھے۔ ٹرے درمیانی میز پر رکھ کر وہ نظریں جھکا کر واپس چلا گیا تو نوجوان نے ٹرے کی سمت اشارہ کرکے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ تم پہلے فریش ہولو پھر دوسری باتیں بھی ہوتی رہیں گی۔"

"کیا میں تمہارا نام معلوم کرسکتی ہوں؟" اس نے نوجوان کو خالی خالی نظروں سے گھورتے ہوئے سنبھل کر پوچھا۔

"اس کا خیال تمہیں اتنی دیر میں کیوں آیا......؟"

"کچھ اتفاق ہی سمجھ لو جو میں آگئی ورنہ......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"جانتا ہوں۔" نوجوان نے سنجیدگی سے کہا۔ "تم نے دوسری جانب سے ملنے والی ہدایت پر عمل کیا ہوگا۔"

"لیکن تم وہ نہیں ہو جس کو میں نے......"

"شاطر کھلاڑی وہی ہوتا ہے جو سوچ سمجھ کر قدم اٹھائے...... ورنہ کبھی کبھی گوٹ پھنس بھی جاتی ہے۔ تم جس کا حوالہ دے رہی ہو وہ عالمی شہرت کا مالک ہے...... راستے کو ہموار دیکھ لینے کے بعد وہ بھی یہاں آنے میں دیر نہیں کرے گا...... ایک بات گرہ سے باندھ لو...... میں بھی اس کا جز وقتی کارندہ ہوں، میں نے کبھی اس کی اصل شکل نہیں دیکھی۔ صرف اس کے حکم پر عمل کرنے کا عادی ہوں۔" نوجوان نے اپنی بات جاری رکھی۔ "تم جس کوٹھی سے نکل کر آئی ہو وہاں کیاری میں پودوں کی بھی پوری طرح نگرانی ہوتی ہے۔ تم تو پھر نگینہ ہو جس کے گم ہوجانے کے بعد وہ ڈبا پیر بھی سکون سے نہیں بیٹھا ہوگا۔"

بات نگینہ کی سمجھ میں آگئی تو وقتی الجھن بھی دور ہوگئی...... نوجوان نے غلط بھی نہیں کہا تھا۔ تین گھنٹے بعد پروفیسر چنگ کے قد و قامت کا ایک شخص بھی آگیا۔ "تم نے فرار کا جو راستہ اختیار کیا ہے میں اس کی وجہ بھی جانتا ہوں۔" نوجوان کے جانے کے بعد اس نے بے حد سنجیدگی سے نگینہ کو مخاطب کیا۔ "یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہارے شاہ جی کے دل ودماغ پر بھی بجلیاں کوندرہی ہوں گی۔ وہ شپٹا رہا ہوگا جس نے وقتی طور پر تمہاری حمایت کی تھی۔"

"ایسی صورت میں کیا یہ ہٹ میرے لیے محفوظ ثابت ہوگی؟" نگینہ نے سہمی ہوئی آواز میں دریافت کیا۔

"نہیں...... یہاں کے چوکیدار بھی مٹھی گرم کیے جانے کے بعد اپنی وفاداری فروخت کردیتے ہیں...... یہاں تم محفوظ نہیں ہو لیکن پریشان مت ہو۔ تم نے مجھ پر بھروسا کیا ہے تو میں بھی تمہارے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔"

آنے والا جو لوچن کے سوا کوئی اور نہیں تھا کچھ دیر تک نگینہ سے سکندر علی شاہ کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہا پھر اس نے موبائل نکال کر...... نمبر پنچ کیے اور کان سے لگالیا۔

"کس سے بات کرنی ہے؟" ریسیور پر ایک مانوس نسوانی آواز ابھری۔

"سیون اسٹار!" لوچن نے مخصوص کوڈ بتانے پر اکتفا کیا۔

"کیا وہ جال میں پھنس گیا......؟"

"نہیں...... اسی کا تعاقب کرتے ہوئے ایک کام کی چیز ہاتھ آگئی ہے جو سونے کی چڑیا ہی ثابت ہوگی۔"

"فالتو نہیں...... صرف کام کی بات کرو......" روکھائی سے کہا گیا۔

"میں سکندر علی شاہ کی ماڈرن بیوی نگینہ کی بات کررہا

نئی لہجے کے منفرد شاعر تنویر عباس نقوی کا دوسرا شعری مجموعہ
"مسئلہ دل کا ہے" شائع ہوگیا ہے

منگوانے کے لیے پتہ:
دُعا پبلی کیشنز
DUA PUBLICATIONS
042-37233585 :فون
E-mail: duapublications@yahoo.com
0300-9476417 :رابطہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوں جو اپنے کسی عبرتناک انجام سے بچنے کی خاطر ہمارے پاس آگئی ہے۔ اس نے شکار کے بارے میں پہلے بھی ایک دو کام کی باتیں بتائی تھیں...... اس وقت بھی کچھ اشارے ایسے آئے ہیں جو شکار پر جال ڈالنے کی خاطر بہت کارآمد ثابت ہوں گے۔"

"یہ سوچنا تمہارا کام ہے......" اس بار ٹھوس لہجہ اختیار کیا گیا تھا۔ "میں تمہیں منہ مانگا انعام پیشگی بھی ادا کرسکتی ہوں لیکن ہمارا مطلوبہ آدمی زندہ یا مردہ ہر صورت میں ہاتھ آنا شرط ہے۔"

"میرے سینے پر اپنے دونوں ساتھیوں ڈوما اور قاسم کا بوجھ بھی ہے۔ وہ حساب میرے لیے کسی انعام کی لالچ سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔"

"اس وقت فون کرنے کا اصل مقصد کیا ہے؟"

"نگینہ کے لیے کسی محفوظ ٹھکانے کا بندوبست کرنا ہے...... شکاری کتے اس کی بو سونگھتے پھر رہے ہوں گے۔" لوچن نے مطلب کی بات کی۔ "میں اس کو زیادہ دیر کہیں چھپا کر نہیں رکھ سکتا۔"

"او۔کے...... میری کال کا انتظار کرو، میں کوئی حل نکالتا ہوں۔"

دوسری جانب سے سلسلہ ختم ہوا تو لوچن نے ایک بار پھر نگینہ کو سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا۔ اس کے وجود پر اس وقت بھی موت کے کربناک سائے کپکپا رہے تھے۔ لوچن نے کچھ توقف کے بعد دوبارہ کریدا۔

"سکندر علی شاہ کیا واقعی اس آدمی سے واقف نہیں ہے جس کے آگے دم ہلاتا رہتا ہے؟"

"ہاں، مجھے اس کا یقین ہے...... اگر واقف ہوتا تو اس سے کسی نہ کسی طرح چھٹکارا پانے کی کوشش ضرور کرتا۔"

"اسے کسی نہ کسی پر شک تو ہوگا؟"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی......" نگینہ نے طویل سانس لے کر جملہ پورا کیا۔ "وہ بہت گہرا آدمی ہے۔ کسی پر اعتماد کرنا اس کی سرشت کے خلاف ہے۔"

پندرہ بیس منٹ تک ان کے درمیان آکٹوپس کے حوالے سے بات ہوتی رہی لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا...... پھر مطلوبہ کال بھی آگئی...... مخصوص کوڈ ورڈ کے حوالے کے بعد کہا گیا۔

"تم نگینہ کو آج رات گیارہ اور بارہ کے درمیان مس جوزف کے پرائیویٹ وومن ہاسٹل کی انچارج کے دفتر تک پہنچا دو...... اسے صرف خفیہ دستاویز کا حوالہ دینا...... اس سے زیادہ کسی بات کا جواب نہ دینا...... میں نے بات کرلی ہے۔"

لوچن کو پرائیویٹ وومن ہاسٹل کی تجویز نہایت مناسب معلوم ہوئی تھی۔ شہر میں اس ٹائپ کے اور بھی رہائشی ہاسٹل موجود تھے جہاں لڑکیوں کی رہائش کی آڑ میں اور بھی کئی مذموم کام ہو رہے تھے لیکن مس جوزف کے ہاسٹل کے بارے میں ایسی کوئی افواہ نہیں پھیلی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ ایک کروڑ پتی بیوہ تھی۔ اس کے علاوہ ایک مقامی گرلز کالج میں پروفیسر بھی رہ چکی تھی جو دوسروں کے مقابلے میں سرفہرست تھا وہاں کا ایڈمنسٹریشن بھی اتنا سخت تھا کہ کالج کی تمام لڑکیوں کی سرگرمیوں پر پوری طرح نظر رکھتا تھا۔

مس جوزف کا ہاسٹل دوسروں کے مقابلے میں کچھ مہنگا ضرور تھا لیکن لڑکیوں کے لیے نہایت محفوظ خیال کیا جاتا تھا شاید اس لیے کہ مس جوزف صبح سات بجے سے شام سات بجے تک بذات خود وہاں کے تمام شعبوں میں پھرکی کی طرح ناچتی رہتی تھی۔ ہر بات کا خاص خیال رکھتی تھی۔ اصول کے معاملے میں وہ کسی سے سمجھوتا کرنے کی عادی نہیں تھی اس کے باوجود اسی فیصد طالبات اور رہائشی لڑکیاں نہ صرف اس سے مطمئن تھیں بلکہ پرسکون ماحول میں رہتی تھیں۔ سات بجے کے بعد مس جوزف کی ایک قریبی رشتہ دار وہاں نائٹ ڈیوٹی کے لیے پوری طرح چوکس رہتی تھی۔ تمام خارجی راستوں پر گارڈز موجود رہتے تھے جو مس جوزف کے مخصوص اجازت نامے کے بغیر کسی کو بھی وہاں آنے جانے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

حکومت وقت نے بھی اس ہاسٹل کی افادیت اور ریپوٹیشن پرکھنے کے بعد اسے سالانہ مالی گرانٹ دینے کی کوشش کی تھی جسے مس جوزف نے نہایت شکریہ کے ساتھ ٹھکرا دیا تھا۔

☆☆☆

رات کے کھانے پر اورنگ زیب اور سراج کی ملاقات نہیں ہوسکی۔ الماس نے بتایا تھا کہ وہ ڈی آئی جی کے کہنے کی وجہ سے رستم علی آغا خانی کی طرف چلا گیا تھا کچھ اور ضروری کام بھی نمٹانے تھے۔ اورنگ زیب بھی زخمی اور جگا کے بارے میں مختلف پہلوؤں پر الجھا ہوا تھا۔ اسے دلربا کا خیال بھی تھا جسے جگا کی اطلاع کے مطابق اس کے بنگلے سے نکال کر کسی محفوظ جگہ پر منتقل کردیا تھا لیکن ابھی تک پینتھر نے اسے اس بارے میں کوئی اطلاع نہیں دی تھی۔

"آپ تو کھانا کھالیں......" الماس نے کہا۔ "میں سراج کو فون کرتی ہوں۔"

"نہیں...... اسے کام کرنے دو۔" اورنگ زیب نے

مسکرا کر اپنے تھکے ہوئے ذہن کو سکون پہنچانے کی خاطر کہا۔ "میں محسوس کر رہا ہوں کہ میری وجہ سے اب اس نے تنہا اپنے ہاتھ پاؤں چلانا کم کردیا ہے۔"

"پھر آپ ایسا کریں...... نہا دھو کر فریش ہولیں۔ اتنی دیر میں آپ کے لیے کافی تیار کردیتی ہوں۔"

اورنگ زیب بھی تھکن اتارنے کے ارادے سے اپنے رہائشی کمرے کی طرف جارہا تھا جب اسے پینتھر کی کال ملی۔

"مجھے تمہاری ہی کال کا انتظار تھا...... قانونی اہمیت کے سامان کو کہاں منتقل کیا ہے؟"

"سب سے پہلے معذرت چاہوں گا جناب کہ میں نے آپ سے براہ راست بات ہونے کے باوجود استاد کے کہنے پر قدم اٹھالیا۔ استاد نے کہا تھا کہ وہ آپ کے ساتھ ہی کسی معاملے میں مصروف تھا۔"

"مطلب کی بات کرو......" اورنگ زیب نے بات کو طول دینے سے گریز کیا۔

"میں نے اسے تمام تر احتیاطی تدبیریں اختیار کرنے کے بعد ایک محفوظ مقام پر پہنچا دیا ہے۔ اس وقت بھی اسی کمرے کے باہر موجود ہوں جسے وہ اندر سے دیوانوں کی طرح توڑنے کی کوشش کر رہی ہے۔"

"اسے زبردستی حماقت سے باز رکھنے کی کوشش کرو...... کسی کو بھنک بھی مل گئی تو کھیل خراب ہوجائے گا۔"

"اسی لیے آپ کی اجازت کی ضرورت ہے...... دو چار گھنٹے کے لیے بے خبر کرنے کی ڈوز دے دوں؟"

"ٹھیک ہے......" اورنگ زیب نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ "تم تنہا ہو یا کوئی اور بھی تمہارے ساتھ ہے؟"

"فی الحال میں نے آپ کی اجازت کے بغیر کسی کو ساتھ رکھنے کی غلطی نہیں کی۔"

"اچھا کیا لیکن...... اب میں تمہاری مدد کے لیے دو آدمیوں کو ہدایت جاری کر رہا ہوں...... ان سے زیادہ بے تکلف ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"رائٹ سر......"

پینتھر کی کال موصول ہونے کے بعد اس نے اپنے دو خاص سادہ لباس والوں کو ضروری ہدایت دی پھر کسی خیال کے پیش نظر اس نے فوری طور پر سکندر علی شاہ کے نمبر ملائے۔

"اس وقت اس پیر فقیر کا خیال ذہن میں کیسے آگیا؟......" سکندر علی شاہ نے فون ریسیو کرنے کے بعد خود

WWW.PAKSOCIETY.COM

پر قابو پاتے ہوئے بڑے خوشگوار موڈ میں دریافت کیا تھا ورنہ نگینہ کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد اس کے سینے پر بھی سانپ لوٹ رہے تھے۔

"آپ کے علم میں ہے کہ میں نے بھی دلربا کی نگرانی پر ایک آدمی مامور کر رکھا تھا۔"

"جانتا ہوں...... آپ کے تسلیم کر لینے کے بعد میں نے کوئی اعتراض بھی نہیں کیا تھا۔"

"اس وقت دلربا گھر پر نہیں ہے......" اورنگ زیب نے دیدہ ودانستہ دوستانہ انداز میں بے چینی کا اظہار کیا۔ "مجھے کچھ دیر پہلے اطلاع ملی تھی کہ کچھ نامعلوم افراد نے دلربا کے گھر میں داخل ہونے کی جبراً کوشش کی تھی۔ میرے آدمی نے مداخلت کی تو وہ اسے بھی زخمی کر کے دلربا کو اٹھا لے گئے۔ پاس پڑوس والوں میں سے کسی نے سامنے آنے کی کوشش بھی نہیں کی۔"

"آپ مذاق تو نہیں کر رہے؟" سکندر علی شاہ کے لہجے میں یکلخت تناؤ پیدا ہو گیا۔

"جی نہیں بلکہ اس اطلاع کے ساتھ ہی اپنی پوزیشن صاف کرنے کی کوشش بھی کر رہا ہوں۔"

"میں آپ کو دوست تسلیم کرنے کے بعد کسی قسم کا شبہ بھی نہیں کر سکتا...... یہ بھی جانتا ہوں کہ جس وقت میں نے آپ کو پروگرام منسوخ کرنے کی اطلاع دی تھی اس وقت آپ کہاں موجود تھے اور...... ون منٹ ہولڈ کریں...... دوسرے نمبروں پر کسی کی کال آرہی ہے۔" سکندر علی شاہ نے غالباً مائیک پر ہاتھ رکھ کر دوسری کال اٹینڈ کی تھی پھر تین منٹ بعد اس کی آواز ابھری جس میں جھلاہٹ بھی شامل تھی۔ "آپ کی اطلاع کی تصدیق ہو گئی ہے۔ میرے دو سادہ لباس والے بھی بے ہوش ملے ہیں...... میں دیکھتا ہوں کہ کس کی موت آئی ہے جس نے براہ راست مجھ سے ٹکرانے کی حماقت کی ہے۔"

"کیا میں اپنی ذاتی حیثیت میں آپ کی کوئی خدمت کر سکتا ہوں؟"

"شکریہ......! میں اپنے نجی معاملات کو سرکاری وردیوں سے دور ہی رکھتا ہوں۔" سکندر علی شاہ نے سرد لہجے میں کہا۔ "وہ جو بھی ہے اس نے مجھے للکار کر اپنی موت ہی کو دعوت دی ہے۔"

دوسری جانب سے رابطہ ختم کر دیا گیا...... اورنگ زیب نے سکون کا سانس لیا پھر نہانے کے بعد تازہ دم ہو کر نیچے آیا تو سراج ڈائننگ ٹیبل پر ہی اس کا منتظر تھا۔ الماس میز سجانے میں مصروف تھی۔

"کیا معلومات حاصل ہوئیں رستم علی آغا خانی سے؟"

"ظاہر ہے کہ وہ فون پر دھمکیاں دینے والوں کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا جو ان کی نشاندہی کرنے کی پوزیشن میں ہوتا...... بہرحال، میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ دارا اور روشنا کے بیرون ملک منتقل ہو جانے کے بعد فرسٹیشن کا شکار بھی ہے۔"

"میں سمجھا نہیں...... کیا دارا اور روشنا مستقل طور پر باہر چلے گئے؟"

"روشنا جانے کے لیے آمادہ نہیں تھی لیکن دارا......" سراج نے کسمسا کر کہا۔ "اسے شاید اپنی عزت زیادہ عزیز تھی جو وہ روشنا کو لے کر ہنگاموں سے دور چلا گیا...... یہاں رہتا تو روشنا کو برباد کرنے والے اس کو سکون سے نہ رہنے دیتے۔"

الماس نے کھانے کی طرف توجہ دلائی تو اورنگ زیب بھی کھانے میں مشغول ہو گیا۔ جگا کا کردار اور کارکردگی دونوں ہی اس کے لیے خلاف توقع ثابت ہوئی تھیں...... وہ کھانے کے دوران اسی بات پر غور کر رہا تھا جب اسے میڈم روبی کی کال موصول ہوئی...... اورنگ زیب نے دوستانہ انداز میں اسے کھانے پر آنے کی پیشکش کی۔

"سویٹ ڈش میں کیا ہے......؟" بے تکلفی سے پوچھا گیا۔

"مکس فروٹ کے ساتھ ٹرائفل جو سراج کو زیادہ مرغوب ہے۔"

"اور میں نے آپ کی خاطر خالص دیسی مرغیوں کے تازہ انڈوں کی پڈنگ کا بندوبست کیا ہے...... چکھنے سے پہلے ڈش کو دیکھتے ہی آپ ہماری کارکردگی اور مہارت کی داد دیے بغیر بھی نہیں رہ سکیں گے۔"

پھر...... جب سویٹ ڈش کے حوالے کے بعد میڈم روبی نے اسے نگینہ کے بارے میں تفصیل سے آگاہ کیا تو اورنگ زیب کے لیے وہ اطلاع دلربا کے بعد دوسرے کسی ایٹمی دھماکے سے...... کم بھی نہیں تھی...... کھانے کے بعد اس نے تنہائی میں سراج کو دلربا اور نگینہ کے بارے میں بتایا تو وہ بھی ششدر رہ گیا...... خاصی دیر تک وہ اسی موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔

☆☆☆

لیاقت حسین کی مصروفیات دفتر میں زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ ماربل ایکسپورٹ کا کاروبار اس وجہ سے بھی فائدہ مند ثابت ہوا کہ سردار سرفراز خان نے اپنے علاقے میں کچھ نئے پہاڑوں کے پتھر خرید لیے تھے۔ یہ سودا اس وقت ہوا جب پہاڑ بیچنے والوں کو بھی اس کا اندازہ نہیں تھا کہ اندر سے کس قسم اور ڈیزائن کا مال برآمد ہوگا۔ یہ سرفراز کی قسمت تھی کہ جو ماربل نکلا نہ صرف وہ نئے اور خوب صورت ڈیزائن کا تھا بلکہ قیمتی بھی تھا، ضروری پروسیسنگ اور پالشنگ کے بعد اس کے نمونے بیرونی منڈی روانہ کیے گئے تو تمام آرڈرز میں خاطر خواہ اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ نئے خریدار بھی لسٹ پر آگئے، سیٹھ عثمان کو اپنے حصے کی مناسبت سے بھی فائدہ پہنچ رہا تھا۔

اس وقت لیاقت حسین دفتر میں بیٹھا نئے آرڈرز کی تکمیل کے کاغذات تیار کر رہا تھا جب سرفراز خان کا فون آگیا اس نے بھی کام کی نوعیت کی بات کی پھر دوسری جانب سے ماں کی ممتا بھری آواز ابھری۔

"تو اب کیسا ہے لیاقت؟ فرحین کیسی ہے؟"

"سب تیری دعائیں ہیں ماں۔ تیری دعاؤں سے کاروبار بھی ترقی کر رہا ہے۔ اس کافر پلید سے بھی چھٹکارا مل گیا ہے لیکن انگوٹھی گم ہو جانے کا دکھ بھی ہے۔"

"سب کچھ خدا کے حکم اور اسی انگوٹھی کے کرشمے سے ہوا...... اس کا دکھ مت کر۔ جو پلید مر گیا وہ میرے تیرے لیے جی کا جنجال بنا ہوا تھا، تیرے بڑے نانا نے جو کہا تھا وہ بھی سچ نکلا لیکن اب بھی تجھے دیکھ بھال کر قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔"

"جس اللہ نے پہلے مدد کیا تھا وہ اب بھی ہر مصیبت میں ہمارا حفاظت کرے گا......" لیاقت حسین نے سادگی سے کہا۔

"وہی آخری سہارا ابھی ہے مگر تیرے بڑے نانا نے ایک بات اور بھی کہا تھا۔ بڑا طوفان گزر جانے کے بعد چھوٹے چھوٹے جھٹکے بھی آتے رہیں گے۔"

"میں سمجھا نہیں ماں۔"

"جو پلید غرق ہو گیا۔ جل کر راکھ ہو گیا وہ بڑی شیطانی قوتوں کا مالک تھا۔" ماں نے دبی زبان میں اپنا مدعا سمجھانے کی کوشش کی۔ "پتھر کی مورتی ٹوٹ جائے تو اس کے ٹھیکرے بھی پیروں تلے چبھتے ہیں...... تیرا ایک بڑا خطرہ اللہ کے حکم سے دور ہو گیا لیکن تو اپنا اور فرحین کا بہت خیال رکھنا۔ میری دعائیں بھی تم دونوں کے ساتھ ہیں۔"

"میرے اور فرحین کے لیے اللہ کے بعد تیری

سچی کہانیوں، آپ بیتیوں، جگ بیتیوں کا بے مثال مجموعہ

ماہنامہ سرگزشت

شمارہ نومبر 2013ء کی جھلکیاں

زیرلب
ایک معروف ومقبول شاعر کا زندگی نامہ

عقوبت بے کراں
ٹارچر سیل میں تڑپتے انسانوں کی کتھا

شاہی سوتن
مغرب سے درآمد ایک شہزادی کا احوال

انتظار
وہ آج بھی منتظر ہے، ایک دردبھری سچ بیانی

اس کے علاوہ
سفرنامہ، شکار کتھا، فلمی دنیا کی کہی ان کہی داستانیں، اور لہو کی گردش تیز کر دینے والی روداد "سراب"

20 سے زائد سچے واقعات، سچ بیانیاں اور سچے قصے
وہ سب کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں آپ کو پڑھنا چاہیے

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر اپنا شمارہ مختص کرالیں

خاص شمارہ...... ہر شمارہ، خاص شمارہ...... ہر شمارہ، خاص شمارہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

دعائیں ہی سب سے بڑی نعمت ہیں...... مقدس کتابوں میں بھی یہی لکھا ہے کہ موت اور زندگی خدا کے اختیار میں ہیں۔ وقتی طور پر جو پریشانیاں آتی ہیں وہ انسان کے اپنے کسی نہ کسی اعمال کا نتیجہ ہوتی ہیں۔"

"سب کو میرا دعا اور سلام بولنا۔ تیرے لیے ایک خوش خبری اور بھی ہے۔" ماں نے بات جاری رکھی۔ "تیرا باپ نے ادھر پہاڑوں کے قریب ایک پرانا مکان خرید لیا ہے۔ اس کا نیا سرے سے مرمت کرا رہا ہے۔ یہ بھی کہا تھا کہ اب کی بار تم دونوں کو بلا کر ادھر ہی رکھے گا...... بڑا خوبصورت جگہ ہے۔"

لیاقت حسین ماں کی باتیں سنتا رہا پھر فون بند کر کے وہ دوبارہ ضروری کام کرنے میں مصروف ہوا تو...... سیٹھ عثمان کا بلاوا آ گیا۔ انہوں نے بیرونی منڈیوں سے ماربل کے سلسلے میں نئے ڈیزائن کے سلسلے میں جو آرڈر حاصل کیے تھے اس میں قیمت کے اضافے کی بات بھی کی تھی جو تاجروں نے تھوڑی ردوبدل کے بعد منظور کر لی تھی۔ سیٹھ عثمان نے لیاقت حسین کو ان نئی قیمتوں کے حساب سے بل بنانے کو کہا تو لیاقت حسین کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔

"آج میں جو کچھ بھی ہوں آپ کی بدولت ہوں صاحب۔" لیاقت حسین نے بڑے خلوص سے کہا۔ "آپ نے ملازمت اور سر چھپانے کا ٹھکانا نہ دیا ہوتا تو اس وقت نہ جانے کہاں ہوتا......"

"تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ تمہاری قربانیاں بھی ہمارے گھر کے لیے بہت کام آئی ہیں۔"

"میں نے جو کیا وہ میرا فرض تھا صاحب۔"

"فرض کی ادائیگی ہی سب سے بڑی صفت ہے لیاقت حسین۔ قدرت ہر شخص کو زندگی میں ایک موقع ضرور دیتی ہے۔ جو دیکھ بھال کر قدم اٹھاتا ہے وہی کامیاب بھی رہتا ہے۔ تم نے جو مقام حاصل کیا ہے اس میں بھی تمہاری صلاحیتوں کو زیادہ دخل ہے۔"

کچھ دیر تک کاروباری باتیں ہوتی رہیں۔ گفتگو کے دوران سیٹھ عثمان کو کاروباری فون بھی آتے رہے۔ لیاقت حسین فارغ ہو کر جانے کے لیے اٹھا تو سیٹھ عثمان نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"راحیلہ کا خیال ہے کہ اب بنگلے کی انیکسی میں ماربل کے کاروبار کو منتقل کر دیا جائے۔"

"اچھا مشورہ ہے صاحب......" لیاقت حسین نے خوشی کا اظہار کیا۔

"وہ تو ہے لیکن پھر تم اور فرحین کہاں رہو گے؟" سیٹھ عثمان نے لیاقت حسین کی سادگی سے متاثر ہو کر کہا پھر بولے۔ "فی الحال اس پروگرام پر فوری عمل نہیں ہوگا۔ راحیلہ ہی کے مشورے پر میں نے اس بنگلے کے اوپر دو کمرے اور ڈرائنگ، ڈائننگ کا نقشہ دیگر ضرورتوں کے ساتھ منظور کرا لیا ہے۔ دس پندرہ روز میں کنسٹرکشن کا کام بھی شروع ہو جائے گا۔ تعمیر مکمل ہونے کے بعد تم اور فرحین اوپر شفٹ ہو جاؤ گے تو پھر انیکسی میں ماربل کے علیحدہ آفس کا کام بھی آہستہ آہستہ ہوتا رہے گا۔"

"یہ بیگم صاحبہ اور آپ کی مہربانی ہے صاحب ورنہ ہمارے لیے وہ انیکسی بھی بہت ہے۔"

"تم جانتے ہو کہ میں راحیلہ کی کسی فرمائش سے انکار نہیں کرتا...... اس لیے تمہیں جو بھی کہنا ہو اسی سے کہنا۔" سیٹھ عثمان نے مسکرا کر بات ختم کی پھر لیاقت حسین اجازت لے کر جانے کے لیے اٹھا ہی تھا کہ یکلخت لڑکھڑا گیا۔ صرف وہی نہیں کمرے کے در و بام اور فرنیچر بھی ہل کر رہ گئے تھے...... باہر ہونے والا دھماکا کچھ اتنا شدید تھا کہ ایک لمحے کو سب ہی ششدر رہ گئے۔

لیاقت حسین کے ساتھ ہی سیٹھ عثمان بھی آفس سے باہر آ گئے۔ گیٹ کا چوکیدار اسے چار فٹ دور زمین پر پڑا نظر آیا۔ گیٹ کے دونوں پلر بھی منہدم ہو چکے تھے۔ اس حصے میں اب بھی دھول اڑتی نظر آ رہی تھی۔

"خدا خیر کرے......" لیاقت حسین نے چوکیدار کے خون آلود جسم کو دیکھ کر آگے جانے کی کوشش کی تو سیٹھ عثمان نے اسے ٹوکا۔

"رک جاؤ لیاقت حسین...... ادھر خطرہ ہے۔"

"جو خطرے کی زد میں آ چکا ہے اسے بچانا بھی ہمارے لیے ضروری ہے صاحب۔"

لیاقت حسین جواب دیتا ہوا تیزی سے چوکیدار کے قریب پہنچا لیکن اسی وقت قریب ہی دوسرا دھماکا ہوا۔ گرد و غبار کے ساتھ ہی سیٹھ عثمان نے لیاقت حسین کو بھی دو تین فٹ بلند ہوتے دیکھا تو ان کے دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہو گئیں۔

"یا اللہ مدد......" سیٹھ عثمان نے دل سے لیاقت حسین کے لیے دعا کی...... پھر دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔ خود ان کی حالت بھی غیر ہونے لگی تھی۔

اس پراسرار اور تحیر آمیز سلسلے کے مزید واقعات آیندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

تصویر کی گواہی

امجد رئیس

ہوس عورت کی ہو یا دولت کی... اچھے بھلے انسان کو بھیڑیا بنا دیتی ہے۔ اسے تو بیک وقت کئی خواہشیں آزمائش میں مبتلا رکھتی تھیں... خواہشوں کا انبار ہو اور کوئی غلطی سرزد نہ ہو ایسا ممکن نہیں... اس نے بھی جب اپنی سفلی خواہش پر عمل کرنا چاہا تو ایک ناقابلِ معافی جرم کا ارتکاب کر بیٹھا اور ساتھ ہی کسی کی آنکھوں میں بسا خواب بھی بکھیر دیا... لیکن کیمرے کی آنکھ نے جو منظر قید کیا اس کے حوالے سے وہ اپنے گرد کھنچے حصار کو تادیر قائم نہ رکھ سکا۔

مجرم کی چالاکی اور ایک عاشق کی تفتیش کا دلچسپ ماجرا

چیز ایپک بوٹ کلب کے ارکان مجھے دیوانہ سمجھ رہے تھے۔ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ میں خراب موسم میں نینسی کے ساتھ بوٹ کے ذریعے خلیج میں جانے کا ارادہ باندھ چکا ہوں جبکہ طوفان تیزی سے اسی جانب بڑھتا چلا آ رہا تھا۔

وہ کہہ رہے تھے کہ ہمارا دماغ چل گیا ہے جو ہم خطرناک موسم میں یہ ایڈونچر کرنے جا رہے ہیں۔ میں ان پر ہنس رہا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی سیل بوٹ کو مجھ سے بہتر

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہینڈل نہیں کر سکتا تھا۔ نینسی کو پانی میں لے جانے کی میرے پاس معقول وجہ تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا راؤنڈ تھا۔ مجھے طوفان کی پروا نہیں تھی جبکہ نینسی بھی میری ہمنوا تھی۔

میں نے کلب کے اراکین سے کہا۔ ”کیا فرق پڑتا ہے، ہوا چلنے دو...... میں سنبھال سکتا ہوں۔ کیا تم لوگ نہیں جانتے کہ میں اور میری بیوی نینسی ہر اتوار کو جاتے ہیں۔ مسئلہ کیا ہے؟“

”یہ صرف ہوا نہیں بلکہ طوفان کی آمد ہے۔“ کسی نے تصحیح کی۔

میں نے ہال والس کو آتے دیکھا۔ کیمرا حسبِ معمول اس کے ہاتھ میں تھا۔ کیمرا گویا اس کے وجود کا حصہ تھا۔ لگتا تھا کہ وہ سوتا بھی کیمرے کے ساتھ ہی ہے۔ اس کے چہرے پر سرخی جھلک رہی تھی۔ وہ میرا ارادہ بدلنے کے لیے بحث کرنے کے لیے تیار معلوم ہوتا تھا۔

”دیکھو، جم۔“ اس نے آغاز کیا۔ ”موسم کے تیور ٹھیک نہیں ہیں۔“ ہال والس، اتوار کے دن کلب کی ممبر شپ انجوائے کرتا تھا۔ باقی چھ دن وہ ٹائمز کے لیے فوٹو گرافر کے فرائض انجام دیتا تھا۔

تین سال قبل وہ نینسی سے شادی کر چکا ہوتا اگر میں درمیان میں نہ کودا ہوتا۔ جسامت کے اعتبار سے وہ میرے مقابلے میں کافی ہلکا تھا۔ ہمارے درمیان زیرِ سطح ناپسندیدگی کا عنصر موجود تھا۔ شاید میں سیلنگ کے لیے نہ نکلتا لیکن ہال کو دیکھ کر میرا ارادہ پختہ ہو گیا۔ یہ اور بات ہے کہ خراب موسم میں سیلنگ کے لیے جانے کی وجہ ہال نہیں تھا، ہیلن تھی۔ ہیلن، نینسی کی چھوٹی بہن تھی۔

ہیلن کی عمر محض بیس سال تھی۔ وہ نیویارک میں ماڈلنگ کرتی تھی۔ اپنی خوب صورتی کے حسین رنگ شاید اس نے دلکش ترین پھولوں سے چرائے تھے۔ وہ لالا ٹرنر جیسے لباس زیب تن کرتی تھی۔ اس کی سرخ زلفوں میں سنہرا رنگ جھلکتا تھا۔ اس کے بدن کی تراش خراش کسی رومانوی مصور کا ہیجانی تخیل تھا۔

ظاہر ہے کہ نینسی اس بات سے بے خبر تھی کہ میں ہیلن کے لیے کیسے احساسات رکھتا ہوں اور ہیلن بھی لاعلم تھی۔

ہال اب تک طوفان کے بارے میں اپنی تشویش سے آگاہ کر رہا تھا۔

”تو کیا ہوا؟“ میں نے کہا اور نینسی کو بوٹ میں سوار ہونے میں مدد دی۔ ”ہم آج کی شام برباد نہیں کر سکتے، ویسے بھی ہم زیادہ دور نہیں جائیں گے۔“

نینسی کھلکھلائی اور اپنا بھورے بالوں والا سر لہرایا۔ اس کی گردن میں چمک دار رنگین اسکارف بندھا ہوا تھا۔ اس کا نصف سر اسکارف میں چھپا ہوا تھا۔

”ماما وہیں جائیں گی جہاں پاپا جائیں گے۔“ اس نے کہا۔

ہال، اب منت سماجت پر اتر آیا تھا۔ ساتھ ہی طوفان کے خطرات کا ذکر کر رہا تھا۔ وہ مجھ سے مایوس ہو کر نینسی کو قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہاں موجود دیگر افراد خاموش تھے۔

”ہاں، ہاں...... اور دیکھو بادل بھی کتنے گہرے اور سیاہ ہیں۔“ میں نے بوٹ میں چھلانگ لگائی۔

ہال مطمئن نہیں تھا۔ ”نینسی، ہوش سے کام لو۔“ اس نے کہا۔

نینسی نے ہنس کر جواب دیا۔ ”جم کا دل مضبوط ہے اور اس نے کبھی پیراکی سیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کا اعتماد جانے کے لیے کہتا ہے تو پھر جانا ہے۔ کوئی گڑبڑ ہوئی تو شاید مجھے جم کو بچانا پڑے گا۔“ وہ پھر ہنسنے لگی۔

ہال نے مایوس کن انداز میں ہتھیار ڈال دیے اور عادت سے مجبور ہو کر کیمرا اٹھالیا۔ ”ٹھیک ہے، جاؤ تو جانا ہے لیکن ایک تصویر ضروری ہے۔“ اس نے کیمرا چہرے سے لگایا۔

”اچھی تصویر بنانا۔“ نینسی نے مطالبہ کیا۔

”یہ تصویر ہیڈ لائن بنائے گی۔“ ہال نے بلند آواز میں جواب دیا۔

نینسی نے ہنس کر انداز اپنایا۔ ”ہاں، بہترین تصویر ہونی چاہیے۔ اولین صفحات پر مجھے خوب صورت نظر آنا چاہیے۔“ ہم دونوں نے الوداعی ہاتھ ہلائے۔ کنارے پر موجود افراد نے بھی ہاتھ ہلائے۔ ہال نے مجھے مخاطب کر کے کچھ کہا بھی تھا جو میں سن نہ سکا۔

☆☆☆

بوٹ نے خلیج کے سرد پانی میں مختصر سفر کا آغاز کیا۔

”بے چارا، ہال۔“ نینسی نے چیختے ہوئے کہا کیونکہ ہوا کی تیزی میں بہت شور تھا۔ ”وہ پریشان لگ رہا تھا۔“

”ہاں۔“ میں نے تصور میں اسے اور اس کے کیمرے کو دیکھا۔ ”وہ تین سال سے پریشان ہے۔“

نینسی کا ایک ابرو از خود پیشانی پر چڑھ گیا۔ ”تم نے کبھی اسے پسند نہیں کیا۔“

”نہیں، وہ اچھا ہے۔“ میں نے جھوٹ بولا۔

”ٹھیک ہے، اچھا فوٹو گرافر ہے۔“ میں نے گول مول سا جواب دیا۔

ہمیشہ کے مانند نینسی نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ ”کیوں جم، مجھے یقین ہے کہ تم اس کے ساتھ حسد کرتے ہو۔“

”احمقانہ باتیں مت کرو۔“ میں بولا۔ اس کی اس بات نے مجھے مشتعل کر دیا۔ دل نے کہا۔ ”ابھی اسے اٹھا کر پانی میں پھینک دوں۔“

دوسری حرکت نینسی نے یہ کی کہ میری جانب پشت کر کے بیٹھ گئی۔ میں نے خود پر قابو پایا ورنہ قبل از وقت اپنے منصوبے پر عمل کر بیٹھتا۔ میں نے چلا کر اسے بوٹ کے درمیانی حصے میں آنے کے لیے کہا تا کہ سیلنگ بوٹ کا توازن قائم رہے۔ بارش اچانک شروع ہوئی تھی اور پوری شدت سے برس رہی تھی۔ تیز ہوا کے جھکڑوں نے اس کا اسکارف سر سے ہٹا دیا تھا اور گیلے بال چہرے سے چپک رہے تھے۔

میں بوٹ کو متوازن رکھنے کی جدوجہد میں لگ گیا۔ نینسی ہراساں دکھائی دی۔ مجھے بھی خوف کا احساس ہوا۔

نینسی نے واپسی کے لیے گڑگڑانا شروع کر دیا۔ ”اگر ہال ہوتا تو بھی......“

میں نے اس کا جملہ کاٹ دیا۔ ”ہال نہیں ہیلن۔“ میں زور سے ہنسا۔

بے اختیار نینسی کا ایک ہاتھ اس کے منہ پر چسپاں ہو گیا۔ وہ پھیلی ہوئی آنکھوں کے ساتھ چلائی۔ ”میری بہن۔“

میں بولا۔ ”ڈراما مت کرو۔ کیا تمہیں نہیں معلوم؟“ جبکہ میں جانتا تھا کہ اسے کچھ نہیں معلوم۔ میں قصداً اسے احساس دلا رہا تھا کہ وہ بھی شریکِ جرم ہے۔ میری اس حرکت نے اسے سخت ذہنی تکلیف پہنچائی۔ اس کا منہ لٹک گیا۔ اس نے بہ مشکل کہا۔ ”یہ چکر کب سے چل رہا ہے؟“

”اس وقت سے جب ہیلن پچھلے ماہ ہم سے ملنے آئی تھی۔“

نینسی نے سوال کیا کہ کیا ہیلن بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔ میرا جواب تھا کہ وقت آنے پر کرنے لگے گی۔

”وہ بچی ہے۔“ نینسی نے کہا۔ وہ ریلنگ پکڑ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی تھی۔

”اگر بچی ہے تو اسے بڑا تو کرنا ہے ناں۔“ میں نے بےدھڑک جواب دیا۔

لوگ کیا کہیں گے

فوتگی کی غیر ضروری اور فضول رسموں سے لوگ بے تحاشا تنگ ہیں۔ یہ رسمیں امرا تو اس لیے کرتے ہیں وہ کر بھی سکتے ہیں لیکن ہم غریب لوگ بھی یہ رسمیں نبھانا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور یہی سوچتے ہیں کہ اگر ہم نے یہ رسمیں نہ کیں تو لوگ کیا کہیں گے؟“

فوتگی والے گھر میں جہاں صدمے کی وجہ سے چولہا تک نہیں جلایا جاتا تھا اور تین دن سوگ رہتا تھا اب یہ حال ہے کہ وہاں اس دن دیگیں پکائی جا رہی ہوتی ہیں۔ قل خوانی کے نام پر اس گھر میں تازہ پھلوں کی بے قدری ہوتی ہے۔ سات پھل پورے کیے جاتے ہیں۔ ٹینٹ لگتے ہیں، دریاں بچھتی ہیں۔ مسجد اور گھر میں بھی خوب اہتمام کیا جاتا ہے۔ دور نزدیک سے ڈھیروں مہمان آتے ہیں اور پیٹ بھر کر پھل اور کھانا کھاتے ہیں۔ کم از کم چالیس روز تک اسی طرح یہ سب جاری رہتا ہے۔ خوب پھل، مرغ، چاول اور پیسا غرضیکہ کسی بھی چیز میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں آنے دیتے ورنہ لوگ کیا کہیں گے۔

مرنے والے کو اتنی عزت، وقت اور پیسا دیا جا رہا ہے حالانکہ جب وہ زندہ تھا اور بیمار تھا تو ترستا رہتا تھا کہ کوئی اس سے چند منٹ بات ہی کر لے۔ اس کی خیریت ہی پوچھ لے۔ اب چالیس دن اس کا چرچا ہے جبکہ اس کی زندگی میں اس کے پاس اس لیے نہ آسکے کہ مہنگائی بہت ہے۔ ہم مسلمان ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ موت کا ایک دن متعین ہے لیکن مرنے والے کو مرنے کے بعد جتنا وقت، پیسا، پھل اور خوراک پر روپیہ پیسا خرچ کیا جاتا ہے اس سے بھی بہت کم اسے زندگی میں دے دیا جائے تو یقیناً اس کی حالت بہتر ہو جائے۔

مرسلہ: طالب حسین طلحہ، نیو سینٹرل جیل ملتان

WWW.PAKSOCIETY.COM

نینسی چلاتی ہوئی اچھل کر مجھ پر جھپٹی۔ ”اسے تنہا چھوڑ دو۔“

”ہاں وہ تنہا رہے گی...... میرے ساتھ۔“ نینسی کی زد میں آتے ہی میں نے بادبانی شہتیر کو ڈھیل دے دی۔ بھاری شہتیر کی ٹکر سے وہ گڑیا کے مانند قلابازیاں کھاتی ہوئی لحہ بہ لحہ بپھرتے پانی میں جا گری۔ پانی میں جانے سے پہلے ہی وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ میں نے کچھ دیر انتظار کیا تاہم وہ زیر آب غائب ہو چکی تھی۔

میرے منصوبے کا پہلا حصہ پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تھا اور بہت خوب صورتی سے مکمل ہوا تھا۔ اب دوسرے حصے کی باری تھی۔

☆☆☆

ہال والس حسب معمول کیمرے کے ساتھ تھا۔ اس کا چہرہ دہشت و کرب سے سفید پڑ گیا تھا۔ جب میں بوٹ واپس لے کر آیا تو وہ پہلا شخص تھا جس نے مجھے دیکھا۔

وہ متواتر چلا رہا تھا۔ ”نینسی کہاں ہے؟ نینسی کہاں ہے؟“

مجھے لگا کہ وہ پانی میں کود پڑے گا۔ میرا چہرہ تاثرات سے عاری تھا۔ میں ایک ٹوٹا پھوٹا شخص نظر آ رہا تھا۔

کلب کے کسی رکن نے مجھے بوٹ سے اتارا۔ مجھے نہیں پتا وہ کون تھا۔ میں ہوش و حواس سے بیگانگی کی اداکاری میں ڈوبا ہوا تھا۔ اچانک ہر کوئی بیک وقت بولنے لگا۔ میں نے لڑکھڑاتے ہوئے چلنے کی کوشش کی۔ یوں لگ رہا تھا کہ کمزوری کے باعث میں کھڑا بھی نہیں رہ سکتا۔ کسی نے میری بغلوں میں ہاتھ دیا، کسی نے کمر میں۔

ہال ایک طرف کھڑا تھا۔ مجھے اس کے سفید چہرے کی جھلک نظر آئی۔ وہ کسی جنگلی بھینسے کے مانند میری جانب چڑھ دوڑا۔ اس نے مجھے کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑا اور چیخا۔ ”نینسی کے ساتھ کیا ہوا؟ وہ کہاں ہے؟“

”وہ چلی گئی......“ میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ”مم...... میں نے اسے بچانے کی بہت کوشش کی۔“ میں نے سر جھکایا اور میرے گھٹنے مڑ گئے، میں گر رہا تھا۔

چند ہاتھوں نے مجھے سنبھالا۔ کسی نے کہا کہ پہلے اسے کلب ہاؤس میں لے چلو۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر بعد میں نے خود کو کلب کے لاؤنج میں پایا۔ کسی نے میرے اوپر کمبل پھینکا۔ سب میرے گرد جمع تھے۔ میرے منصوبے کا دوسرا حصہ کامیابی سے آگے [illegible] رہا تھا۔

ہال نے چیخ کر پلک کو پیچھے ہٹنے کے لیے کہا [illegible] میں ٹھیک سے سانس لے سکوں۔ میں نے ادھ کھلی آنکھ[illegible] سے دیکھا۔ ہال ایک ہاتھ میں برانڈی کا گلاس لیے [illegible] بناتا آ رہا تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل میرے قریب بیٹھ [illegible] ایک ہاتھ سے میرے سر کو سہارا دیا اور گلاس میرے ہون[illegible] سے لگا دیا۔

”اسے پی لو۔“ اس نے کہا۔

میں نے کراہ کر آنکھیں کھولیں۔ ڈراما کلائمکس [illegible] قریب آ رہا تھا۔ ڈرنک کی واقعی مجھے ضرورت تھی۔ میں [illegible] بلاتوقف برانڈی کو معدے کی نذر کیا۔ کہانی سنانے کا وق[illegible] سر پر تھا۔ ہال کی موجودگی میں مجھے نہایت احتیاط سے [illegible] لینا تھا۔ مجھے دوسروں کی کوئی خاص فکر نہیں تھی۔

میں نے دونوں ہاتھوں سے ہال کا بازو تھام لیا [illegible] سسکیاں لینے لگا۔ ”مجھے کیا ہوا تھا؟ آخر میں نے تمہا[illegible] بات کیوں نہیں مانی؟“ مجھے اپنی شاندار اداکاری پر [illegible] حیرت ہو رہی تھی۔

”کیا ہوا تھا؟“ ہال کی آنکھوں میں نمی تھی۔ وہ [illegible] مجھے سہارا دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے رک رک [illegible] بتانا شروع کیا کہ طوفانی لہر کس جانب سے ٹکرائی تھی۔ نین[illegible] کہاں بیٹھی تھی اور میں نے بوٹ کو قابو کر لیا تھا۔ میں [illegible] بتایا کہ ”میں نے نینسی کو بوٹ کے محفوظ حصے میں آنے [illegible] لیے کہا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی تو بوٹ طوفان کی زد [illegible] آ گئی۔ میں بوٹ کے ساتھ لڑنے لگا۔ نینسی لڑکھڑا رہی تھ[illegible] میں چیخا کہ وہ ریلنگ کو نہ چھوڑے اسی وقت بادبانی شہ[illegible] نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ وہ نہ دیکھ سکی میں نے اس وقت [illegible] دیکھا جب شہتیر نے اسے ہٹ کیا۔“ میں رک گیا اور [illegible] سسکنے لگا۔ وہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔

”وہ تصادم کے بعد الٹ کر پانی میں جا گری۔ [illegible] تیرنا نہیں آتا۔ میں اسے بچا سکتا تھا۔ میرا دماغ ماؤ[illegible] ہو گیا۔ مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھے لائف رنگ [illegible] خیال آیا۔ Life ring جھپٹ کر میں نے اس کی جان[illegible] پھینکا، تب تک تند و تیز لہریں اسے دور لے گئی تھیں۔ [illegible] دیکھتا رہ گیا اور وہ غائب ہو گئی۔“ میں نے بال نوچنے شرو[illegible] کر دیے۔ کسی کی آواز آئی۔

”ڈاکٹر کو بلاؤ۔“ لاؤنج میں بھنبھناہٹ شرو[illegible] ہو گئی۔

میں نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ سب کے چہرے لٹکے ہوئے تھے۔ کلب کی چند لڑکیاں اپنے آنسو پونچھ رہی تھیں۔ ہال گھٹنوں کے بل میرے قریب بیٹھا پتھر کا مجسمہ لگ رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں خالی گلاس تھا۔ وہ پلک جھپکائے بغیر لاؤنج کے پار کسی نادیدہ نقطے کو گھور رہا تھا۔

منظر نامہ اطمینان بخش تھا۔ میں نے تصور میں خود کو شاباش کی تھپکی دی۔ منصوبے کا دوسرا حصہ کامیابی سے ادا ہوا تھا۔

دفعتاً جیسے تاریک رات میں رعد کا چندھیا دینے والا مہیب...... کڑاکا ہوا، میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ لاؤنج میں پڑے صوفے سے گرتے گرتے بچا۔ میں جوش اداکاری میں زیادہ آگے نکل گیا تھا۔ لائف رنگ تو بوٹ میں اپنی جگہ پر موجود تھی۔ مجھے اپنے ہاتھ پیروں سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ایک مکمل جرم کے بعد ایسی فاش غلطی۔

”مجھے جلد از جلد لائف رنگ کو غائب کرنا ہے۔“ میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ اس وقت کوئی بوٹ کی طرف متوجہ نہ ہو۔

☆☆☆

کچھ دیر بعد ہال مجھے گاڑی میں گھر پہنچا گیا تھا۔ وہ شائستگی اور ہمدردی سے پیش آ رہا تھا۔ جب ہم بوٹ پر روانہ ہو رہے تھے تو وہ بے چین و بے کل تھا لیکن اس وقت میں اپنے بستر میں جیسے سوئیوں اور کیلوں کی نوکوں پر پڑا تھا۔ باہر مکمل اندھیرا چھا چکا تھا۔

میری خواہش تھی کہ ہال جلد از جلد رخصت ہو جائے تاکہ میں واپس بوٹ تک پہنچ سکوں۔ اس نے گرم چائے کا کپ بنا کر مجھے دیا۔ اس کے چہرے پر اداسی کا رنگ جم سا گیا تھا۔

”کسی اور چیز کی تو ضرورت نہیں ہے تمہیں؟“ میں نے جواب میں اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنا منہ پھیر لیا۔ ہال، نینسی کی تصویر کو تک رہا تھا جو ایک خوب صورت فریم میں دیوار پر آویزاں تھی۔ یکایک احساسِ جرم کی لہر نے میرے ذہن میں سر اٹھایا۔ جسے میں نے فوراً دبا دیا، ہال کچھ کہہ رہا تھا۔

”تم جانتے ہو کہ مجھے تم سے دلی ہمدردی ہے۔“ وہ رکا پھر آہستہ سے بولا۔ ”نینسی کے لیے...... نینسی کی وجہ سے۔“ یہ کہہ کر وہ فوراً پلٹ کر رخصت ہو گیا۔

یک نہ شد...؟

لڑکی نے لڑکے کو اپنی ممکنہ شادی کے روشن پہلوؤں کے بارے میں سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”ہماری شادی پر کم از کم ایک خرچا تو ہرگز نہیں ہوگا...... یعنی نکاح کی فیس بچ جائے گی، میرے ابا خود نکاح خواں ہیں۔“

”پھر تو ہمیں شادی کر ہی لینی چاہیے۔“ لڑکا خوش ہوتے ہوئے بولا۔ ”میرے ابا وکیل ہیں اور صرف طلاق کے کیس لیتے ہیں۔“

..........☆☆..........

سوا سیر

ایک لڑکا رشتے کے سلسلے میں لڑکی دیکھنے گیا۔

لڑکے کو لڑکی پسند آ گئی تو اس نے لڑکی سے پوچھا۔ ”کیا آپ کے والد کی اتنی حیثیت ہے کہ وہ سلامی میں مجھے کار دے سکیں؟“

لڑکی نے جواب دیا۔ ”میرے ابا کی حیثیت تو ہوائی جہاز دینے کی ہے، کیا آپ کے ابا کی حیثیت ایئرپورٹ بنانے کی ہے۔“

مرسلہ: مہرین ناز، حیدرآباد، کینٹ

میں نے کچھ دیر انتظار کیا کہ وہ اتنی دیر میں دور نکل جائے پھر اچھل کر بستر سے باہر آیا اور کپڑے بدل کر بوٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں بہت احتیاط کر رہا تھا کہ کسی کی نظر میں نہ آ جاؤں حالانکہ اس کا امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔

اندھیری رات اور پُرہول سناٹا...... تاہم میرا دل عام رفتار سے زیادہ تیز دھڑک رہا تھا۔ میں کہہ چکا تھا کہ لائف رنگ، نینسی کو بچانے کے لیے میں نے پانی میں پھینکا تھا جبکہ وہ بوٹ میں ہی موجود تھا اور اس کی موجودگی میری موت تھی۔ منصوبے کے صرف دو حصے تھے جبکہ میری غیر متوقع حماقت کے باعث تیسرے حصے کا اضافہ ہو گیا تھا اور منصوبے کا یہ تیسرا حصہ آخری بھی تھا اور خطرناک بھی۔ میں عقبی راستے سے نکل کر ڈرائیو وے میں اپنی کار تک پہنچا۔ اگرچہ کوئی پڑوسی کار کی آواز سے میری روانگی کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ تاہم یہ رسک تو لینا تھا۔ مجھے ہر حال میں لائف رنگ جلد از جلد بوٹ سے ہٹانا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

تمام تر ممکنہ احتیاطی اقدام اٹھاتے ہوئے میں سڑک پر آ گیا۔ کلب سے کچھ فاصلے پر میں نے کار سائڈ کی غیر استعمال شدہ سڑک پر ڈال دی۔ جس پر دن میں بھی ٹریفک نہیں نظر آتا تھا۔ یہ سڑک اپنی انتہا پر آگے سے بند تھی۔ اختتامی سرے پر پہنچ کر میں نے کار گھما کر اسی طرح کھڑی کی کہ واپسی پر سیدھا نکلتا چلا جاؤں۔ میں خلیجی پانی سے بہت کم فاصلے پر تھا۔

جہاں ذیلی سڑک بلاک تھی وہاں سے میں نے دیوار پھلانگی اور پیدل ساحل کی طرف چل پڑا۔ کلب کی طرف سے مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔ شام کے طوفان نے ہوا کو مزید سرد کر دیا تھا اور پانی میں بھونچال کے اثرات باقی تھے۔

میں چھپتا چھپاتا منزل تک پہنچا اور دبک کر اطراف کا جائزہ لینا شروع کیا۔ سناٹا اور ویرانی ......۔ جوتے موزے اتار کر میں پانی میں اتر گیا۔ کچھ فاصلے پر میری بوٹ پانی میں ڈول رہی تھی۔ بوٹ پر چڑھ کر میں نے لائف رنگ کو کانپتے ہاتھوں سے کھولا اور واپس ہوا۔ جوتے، موزے میرے دوسرے ہاتھ میں تھے۔ میں کامیابی سے کار تک پہنچ گیا۔ میرا ذہنی تناؤ اب کچھ کم ہو گیا تھا۔

گھر پہنچنے پر جب تک میں خواب گاہ میں نہیں آ گیا، اس وقت تک مجھ پر گھبراہٹ طاری رہی پھر میں بستر پر گر گیا اور گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے میں کوئی اونچی پہاڑی چوٹی سر کر کے آیا ہوں۔ بہرحال اس دوران کوئی مجھے نہیں دیکھ سکا تھا۔ پانی پینے کے بعد میں نے لائف رنگ کو ایک مناسب جگہ پر چھپایا۔ میرا ارادہ تھا کہ کچھ روز بعد بوٹ لے کر نکلوں گا تو اسے پانی میں پھینک دوں گا۔

اگلے چند روز میں تعزیت کرنے والوں کا سامنا کرتا رہا۔ جن میں نینسی کے شناسائی بھی تھے۔ فون کالز آ رہی تھیں یا پھر افراد براہِ راست گھر کا رخ کر رہے تھے۔ ہر کوئی مجھ سے اظہارِ ہمدردی کر رہا تھا۔ بعض آبدیدہ ہو جاتے ...... ہر ایک کو میری زیادہ فکر تھی۔ بیشتر سے میں تنہائی مانگتا رہا۔ لائف رنگ کی غلطی سے پہلے میں خوف زدہ نہیں تھا لیکن اب مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ میں نے اپنی بیوی کو مار دیا تھا۔ ہر بار مجھے احساس ہوتا کہ نینسی میرے قریب ہی ہے۔ جب کوئی دروازہ، کھڑکی چرچراتی، جب کوئی پردہ ہلتا، جب کہیں سے موسیقی کی آواز آتی، جب درختوں میں تیز ہوا سرسراتی۔ مجھے لگتا کہ نینسی آ گئی ہے۔

ایک روز ہال چند منٹ کے لیے اپنے دوست فوئنن کے ساتھ آیا۔ ایڈ کا تعلق پولیس میں قتل کے شعبے سے تھا۔ میں نے کوئی غیر معمولی بات محسوس نہیں کی۔ فوئنن مہمان کئی بار میرے گھر آ چکا تھا۔ وہ دونوں اچھے دوست تھے اور اکثر ایک ساتھ دیکھے جاتے تھے۔ فوئنن کی کے لیے میں نے اپنی کہانی ایک بار پھر دہرائی۔ میں یہ اتوار کے بعد مختلف لوگوں کے سامنے درجنوں بار دہرا چکا تھا اور اب یہ مجھے ازبر ہو گئی تھی۔

میں نے اخبار میں نینسی کے بارے میں پڑھا۔ جس کی تصویر اولین صفحے پر تھی۔ جیسے اس نے اتوار کے دن روانہ ہوتے وقت ہال سے کہا تھا۔ جب وہ تصویر بنا تھا۔ کیسا المناک اتفاق تھا۔

وہ دونوں زیادہ دیر نہیں رکے اور مجھے تسلی دے کر چلے گئے۔ فوئنن سے مجھے معلوم ہوا کہ نینسی کی لاش خلیج کے پانیوں میں تلاش کی جا رہی ہے۔

☆☆☆

اسی شام سات بجے ڈور بیل کی آواز پھر سنائی دی۔ وہ ہال تھا۔ میں نے اسے اندر آنے دیا لیکن اتنی جلدی واپسی پر میں حیرت زدہ تھا۔ اس نے مجھ سے معذرت کی اور بتایا کہ نینسی کی لاش مل گئی ہے اور مجھے مردہ خانے جانا پڑے گا۔

"مردہ خانے، نینسی؟" میری آواز دھیمی تھی لیکن آواز میں تناؤ تھا۔

"ہاں، تمہیں لاش کی شناخت کرنی ہے۔" وہ بولا۔ میرا حلق خشک ہو گیا۔ بہرحال میں نے اوکے کہا اور چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔

راستے میں ہم دونوں نے زیادہ بات نہیں کی۔ مردہ خانے پر پہنچ کر ہم کار سے اترے۔ مجھے اپنے گھٹنوں میں لرزش محسوس ہوئی۔ میں اس سے پہلے کبھی کسی مردہ خانے میں داخل نہیں ہوا تھا۔

وہاں ہر چیز سفید تھی۔ موت کی طرح ...... شاید فرشتہ اجل کا جلوہ بھی سفید رنگ کا ہوتا ہو۔ میں ہال کی رہنمائی میں مردہ خانے میں آگے بڑھتا رہا۔ وہاں سکوت تھا۔ سکوتِ اجل۔ لاشوں پر بھی سفید چادریں پڑی تھیں۔ کچھ لوگ اور بھی تھے جو لاشیں دیکھ رہے تھے۔

ایک مقام پر پہنچ کر ہم رک گئے۔ میں نے فوئنن اور ڈاکٹر کو گلی کو پہچان لیا۔ وہاں قطار اندر قطار دیوار میں بہت سی درازیں تھیں۔ ماحول سرد تھا۔ یہ درازیں نہیں تھے دراز نما لمبے بستر تھے۔ ڈاکٹر نے ایک دراز کا ہینڈل پکڑ کر کھینچا اور انتہائی سرد خانے سے بستر نما دراز باہر آ گئی۔ سفید چادر کے نیچے کوئی تھا۔ میں جانتا تھا کون ہے مگر میں دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ میں فوئنن کی جانب مڑا اور سرتاپا لرز گیا۔

ایڈ فوئنن کے ہاتھ میں ایک خالی لفافہ تھا۔ ڈاکٹر نے چادر ہٹا کر مجھے اپنی جانب متوجہ کیا۔ "کیا یہ تمہاری بیوی ہے، مسٹر کیلن؟"

"ہاں۔" میں نے تھوک نگلا اور نظر پھیر لی۔ نینسی کا چہرہ مسخ ہونا شروع ہو گیا تھا۔ سرد پانی میں رہنے کی وجہ سے وہ اب تک قابلِ شناخت تھی۔

ڈاکٹر نے چادر واپس لاش پر ڈال دی اور دراز اندر دھکیل دی۔ میں نے ہال کو دیکھا۔ فوئنن خاکی لفافہ اس کے حوالے کر رہا تھا۔

میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ ہال نے لفافہ کھول کر چند تصاویر برآمد کیں۔ کیمرا اب بھی اس کے شانے سے جھول رہا تھا۔ اس نے ایک تصویر میرے چہرے کے سامنے کی۔

"پہچانا؟" اس نے سوال کیا۔ یہ وہ تصویر تھی جب ہم اتوار کو خلیج میں جانے کے لیے تیار تھے۔ نینسی اور میں تصویر میں ہاتھ لہرا رہے تھے۔

میں نے پھر خشک گلے کو تر کرنے کی کوشش کی اور اثبات میں سر ہلایا۔ یہ تصویر اخبارات میں بھی چھپی تھی۔

"گڈ۔" ہال نے کہا اور قدم بڑھا کر میرے کافی نزدیک آ گیا۔ مجھے لگا اس کے چہرے پر پاگل پن کے تاثرات تھے۔

"اب تم مجھے بتاؤ گے کہ لائف رنگ کے ساتھ تم نے کیا کیا؟" مجھے لگا کہ جیسے کسی نے میرے چہرے پر تھپڑ دے مارا ہو۔

"لائف رنگ؟" میری اداکاری ختم ہو گئی اور زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا بولوں۔

"مجھے نہیں پتا ہال، تم کیا کہہ رہے ہو؟" میری آواز کی کمزوری عیاں تھی۔

"تم اتوار کی رات بوٹ پر گئے تھے۔" ہال نے کہا۔ "جب میں وہاں پہنچا تو لائف رنگ غائب تھا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ مجھے لگا کہ وہ مجھ پر حملہ کر دے گا۔

"جم! تم شروع سے جھوٹ بولتے رہے۔ تمہاری کہانی ریکارڈ بھی ہو گئی۔ اگرچہ اس کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ تم یہ کہانی بہت سارے لوگوں کو سنا چکے ہو اور مکرنے کی گنجائش صفر ہے۔" اس کا ہر لفظ مجھے ٹکڑوں میں تقسیم کر رہا تھا۔ تاہم میں ابھی تک بات کی تہ تک نہیں پہنچ سکا تھا۔

"تم نے اپنی بیوی کو قتل کیا تھا۔ مجھے نہیں پتا کیوں کیا لیکن تم نے ایسا کیا۔ مجھے شروع میں ہی پتا چل گیا تھا لیکن میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔" اس نے نینسی والی دراز کی جانب اشارہ کیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں نمی دیکھی۔

میں نے ہتھیار پھینک دیے۔ "تمہیں کب پتا چلا؟" میں نے سوال کیا۔ "سب کچھ ختم ہو گیا...... لیکن میں جاننا چاہتا ہوں۔"

"کلب میں۔" ہال نے جواب دیا۔ "جب تم کہانی سناتے سناتے غلطی کر گئے اور لائف رنگ کا ذکر کر دیا۔" اس نے ایک اور تصویر آگے کر دی۔ "اس تصویر کو تم نہیں پہچان سکو گے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

میں نے تصویر کو دیکھا۔ تصویر میں کلب کے افراد مجھے نڈھال حالت میں بوٹ سے اتار رہے تھے۔ میرا سر جھکا ہوا تھا۔

"بیک سیٹ کے قریب، لائف رنگ کو دیکھو۔" ہال نے تصویر پر انگلی رکھی۔

مہکتی کلیاں

☆ جلد سے جلد تجربہ کار ہونے کے لیے ایک اصول یاد رکھیں زبان بند مگر آنکھیں اور کان کھلے رکھیں۔

☆ مشکلات کو دور کرنے، خواہشات کو دبانے اور تکالیف برداشت کرنے سے انسان کا کردار مضبوط اور پاکیزہ ہوتا ہے۔

☆ خاموشی میں الفاظ کی نسبت قوت گویائی زیادہ ہوتی ہے۔

☆ محتاط لوگ عموماً کم غلطیاں کرتے ہیں۔

☆ جو شخص کسی بات کی جرأت نہیں کرتا، اسے کسی چیز کی امید بھی نہیں رکھنی چاہیے۔

مرسلہ: عائشہ ثاقب جنجوعہ عاشی، پنڈ دادنخان

WWW.PAKSOCIETY.COM

بازی گر

مرزا امجد بیگ

بے شک دل پر اختیار نہیں مگر جب گھوڑا بے لگام ہو جائے تو ہر گام پر اس کی منزل بدلتی جاتی ہے... کوئی کسی دل کو فتح کرلے اور حسن غلام بن جائے... محبت کنیز بن کر ہاتھ باندھے کھڑی رہے... گھر کی چہار دیواری میں تمام سکھ چین میسر ہو تو ایسے میں گھوڑے کو لگام ڈال لینی چاہیے ورنہ ناشکری ہمیشہ بڑی مصیبتوں کو دعوت دیتی آئی ہے... اس نے بھی میسر خوشیوں کی قدر نہ کی اور کسی کے اعتماد میں نقب لگا کر خیانت کا مرتکب ہوتا رہا... قدرت کبھی دلوں کو دکھا کر خوشیاں دامن میں نہیں ڈالتی... شاید وہ بھی قدرت کا یہ اصول نظرانداز کر بیٹھا تھا۔ ایسے میں اگر چوری چوری کھیر کھانے والے کے منہ میں کڑوا بادام آجائے تو عجب کیا... کیونکہ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔

محبتوں کا سودا کرنے والے ایک بازی گر کا قصہ......

بیگ صاحب کا دلچسپ انداز

قانون کو اگر عام نظر سے دیکھا جائے تو وہ خاصا الجھا ہوا اور پیچیدہ لگتا ہے مگر یہ بات طے ہے کہ وہ گونگا بہرا یا لولا لنگڑا ہرگز نہیں۔ بعض معاملات میں، انصاف کے تقاضے پورے ہونے میں توقع سے زیادہ وقت لگ جاتا ہے اور ہر مرحلے پر یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ کیس کبھی ختم ہونے کا نام نہیں لے گا۔ خاص طور پر دیوانی مقدمات میں تو انصاف کے حصول کے لیے بچے جوان، جوان بوڑھے اور بوڑھے مرحوم ہوجاتے ہیں مگر مقدمہ چلتا چلا جاتا ہے۔ اسی طرح فوج داری کے مقدمات میں بھی بعض اوقات ایسی قانونی رکاوٹیں پڑ جاتی ہیں کہ بہ ظاہر الف کے مانند سیدھا اور سادہ نظر آنے والا معاملہ برسوں پر محیط ہو کر رہ جاتا ہے۔

اس تمہید کے بعد میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔

وہ موسم بہار کا آغاز تھا۔ مارچ کا آخری ہفتہ چل رہا تھا۔ ایک روز میں عدالتی بکھیڑوں سے تھوڑا جلدی فارغ ہو کر اپنے دفتر پہنچا تو انتظار گاہ میں ایک خاتون کو براجمان پایا۔ میں نے سر کی خفیف سی جنبش سے اس کے سلام کا جواب دیا اور وزیٹنگ لابی سے گزر کر اپنے مخصوص کمرے میں پہنچ گیا، اگلے ہی لمحے میری سیکریٹری صدف نے انٹرکام پر مجھے اطلاع دی۔

"بیگ صاحب! مسز عرفان آپ سے ملاقات کے لیے کافی دیر سے انتظار کر رہی ہیں......"

"مسز عرفان......!" میں نے استفساریہ انداز میں کہا۔ "وہی خاتون جو وزیٹنگ لابی میں بیٹھی ہیں؟"

"جی...... جی سر...... وہی۔" صدف نے تائیدی انداز میں جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، انہیں اندر بھیج دیں۔" میں نے کہا۔

صدف کی آواز سنائی دی۔ "اوکے سر...... بھیجتی ہوں۔"

چند سیکنڈ کے بعد مسز عرفان میرے سامنے بیٹھی تھی۔ اس کے پہناوے اور رکھ رکھاؤ سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ بناؤ سنگار بھی بڑے سلیقے سے کر رکھا تھا۔ میں یہ اندازہ لگانے سے قاصر رہا کہ وہ بہ دست خود تیار ہو کر میرے پاس آئی تھی یا یہ کسی

WWW.PAKSOCIETY.COM

بیوٹی پارلر کا کارنامہ تھا۔

میں نے حسبِ معمول پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا اور پوچھا ”جی مسز عرفان! فرمائیں، میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟“

اس نے میرے سوال کو سنا، اَن سنا کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ”بیگ صاحب! آپ کی پریکٹس کیسی چل رہی ہے؟“

اس کے سوال سے میرے ذہن میں پہلا تاثر یہی ابھرا کہ وہ اپنے مسئلے کے ساتھ سنجیدہ نہیں ہے یا پھر یہ کہ اس کا مسئلہ کسی خاص اہمیت کا حامل نہیں یا یہ کہ اس کے ساتھ کوئی مسئلہ سرے سے ہے ہی نہیں بہرحال، حقیقت جو بھی تھی وہ بات چیت کے بعد ہی کھل کر سامنے آسکتی تھی۔

”اللہ کا شکر ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”پریکٹس ٹھیک ٹھاک چل رہی ہے۔“

”آج ہماری پہلی ملاقات ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں آپ کو جانتی نہیں۔“ وہ خاصی بے تکلفی سے بولی۔ ”میں آپ سے غائبانہ طور پر واقف ہوں۔“

”بڑی اچھی بات ہے۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔

”یہ نہیں پوچھیں گے......!“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ ”میں آپ سے کس طرح غائبانہ طور پر واقف ہوں؟“

”آپ خود ہی بتادیں۔“ میں اس کی جانب متوجہ ہوگیا۔

”دو سال پہلے آپ نے رشیدہ نامی ایک مڈوائف کا خلع کا کیس لڑا تھا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”رشیدہ میری گہری دوست ہے۔ اسی نے مجھے آپ کا پتا دیا ہے۔ میری دوستی اس کیس کے بعد رشیدہ سے ہوئی تھی۔“

وہ کسی نرس رشیدہ کا ذکر کررہی تھی لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ فوری طور پر مجھے یاد نہ آسکا کہ وہ کس مڈوائف رشیدہ کا حوالہ دے رہی تھی تاہم اخلاقیات کا تقاضا یہی تھا کہ میں اس کے تعارف کا بھرم قائم رکھوں چنانچہ نہایت ہی شائستگی کے ساتھ میں نے پوچھ لیا۔

”آج کل وہ آپ کی دوست رشیدہ کیا کررہی ہیں؟“

”خلع کے کچھ ہی عرصہ بعد اس نے دوسری شادی کرلی تھی۔“ مسز عرفان نے بتایا۔ ”آج کل وہ اپنے شوہر کے ساتھ بیرونِ ملک میں مقیم ہے۔“

”بیرونِ ملک......!“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”یورپ یا امریکا......؟“

”مڈل ایسٹ میں......“ اس نے جواب دیا۔

”ہوں......!“ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”چلیں، یہ بھی اچھا ہے۔ وہ جہاں بھی رہے، اللہ اسے خوش اور مطمئن رکھے۔“

”آمین......!“ اس نے تہِ دل سے کہا۔

میں نے گھما کر اسے اصل موضوع کی طرف لانے کی کوشش کی۔ ”مسز عرفان! کیا آپ مجھے اپنی دوست رشیدہ کے بارے میں معلومات فراہم کرنے تشریف لائی ہیں یا......؟“

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا تاکہ اس کا ری ایکشن دیکھنے کو ملے۔ اس نے حسبِ توقع فوراً ہی ردِعمل دیا تھا۔ وہ میرے سوال کو سمجھ گئی۔

”نہیں بیگ صاحب!“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”رشیدہ کا تذکرہ تو ضمناً نکل آیا۔ میں دراصل اپنے ایک ذاتی کام سے آپ کے پاس حاضر ہوئی ہوں۔“

”جی ارشاد!“ میں ہمہ تن گوش ہوگیا۔ ”فرمائیں، میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں......؟“ میں نے اس کے ساتھ ہی رف پیڈ اور قلم بھی سنبھال لیا۔

وہ یک دم بے حد سنجیدہ نظر آنے لگی۔ اب نہ تو وہ ”آئیں بائیں شائیں“ دکھائی دیتی تھی اور نہ ہی اس کے دماغ کا کوئی پیچ ڈھیلا محسوس ہوتا تھا۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ اس کے انداز میں لجاجت جھلکتی تھی۔

”بیگ صاحب! اگر آپ میرا یہ کام کردیں تو میں زندگی بھر آپ کی احسان مند رہوں گی۔“ میں اپنے شوہر کے لیے بے حد پریشان ہوں......“

”آپ کے شوہر...... یعنی عرفان صاحب......؟“

”جی ہاں، میں انہی کی بات کررہی ہوں۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”میرا نام ہما ہے اور عرفان میرے شوہر ہیں۔“

”آپ کے شوہر کو کیا ہوا ہے۔“ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ”آپ ان کے لیے اتنی پریشان کیوں ہیں؟“

”عرفان کہیں گم ہوگیا ہے۔“ وہ ٹھوس انداز میں بولی۔

”گم ہوگیا ہے......“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”عرفان کہاں گم ہوگیا ہے اور...... میں اس سلسلے میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں؟“

”عرفان کو واپس لانے کے لیے آپ بھرپور کردار ادا کرسکتے ہیں۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ”بیگ صاحب! میں ایسے ہی آپ کے پاس نہیں آگئی ہوں۔“

”لیکن مسز عرفان......!“ میں نے بے حد الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”گمشدہ افراد کی بازیابی کے لیے اپنے علاقے کے پولیس اسٹیشن جاکر رپورٹ درج کرانا پڑتی ہے۔ یہ وکیل کا نہیں، پولیس کا کام ہے۔“

”آپ سمجھے نہیں بیگ صاحب۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”عرفان کی گمشدگی دراصل وہ نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔“

”پھر یہ کس قسم کی گمشدگی ہے محترمہ؟“ میں سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔

ایک مرتبہ پھر مجھے ہما کی ذہنی صحت پر شبہ ہونے لگا تھا مگر اس سے پہلے کہ میرا شبہ یقین میں بدل جاتا، اس نے بڑے صاف الفاظ میں وضاحت کردی۔

”عرفان کو ان دنوں ایک لیڈی ڈاکٹر نے اپنے جال میں پھانس رکھا ہے اور مجھے بھول کر وہ دن رات اسی ڈاکٹر کے چکر میں پڑا ہوا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا ہے، لیڈی ڈاکٹر ناہید نے عرفان کو مجھ سے چھین لیا ہے۔ عرفان کہیں گم ہوگیا ہے بیگ صاحب...... اور آپ عرفان کو واپس لے کر آئیں گے۔ میں بڑی آس امید لے کر آپ کے پاس آئی ہوں......“

ہما کی بات اب بھی میرے پلے نہیں پڑی تھی۔ صرف اتنا سمجھ میں آیا تھا کہ ان میاں بیوی کے درمیان ایک تیسرا کردار آگیا تھا یعنی ڈاکٹر ناہید۔ میں نے اس کی پرابلم کو سمجھنے کے لیے سوالات کا سلسلہ شروع کیا۔

”یہ ڈاکٹر ناہید کون ہے اور آپ کے شوہر سے اس کا کیا تعلق ہے؟“

”ڈاکٹر ناہید، عرفان کے اسپتال میں کام کرتی ہے۔“ ہما نے جواب دیا۔

”کیا مطلب......؟“ میں نے رف پیڈ پر قلم گھستے ہوئے پوچھا۔ ”کیا آپ کے شوہر عرفان بھی ڈاکٹر ہیں؟“

اب معاملہ کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا تھا۔ ڈاکٹری کا پیشہ نہایت ہی اینٹی سوشل پروفیشن ہے جس میں انسان کا زیادہ تر وقت کلینک یا اسپتال میں مریضوں کے ساتھ گزرتا ہے۔ اگر زندگی کا ساتھی میڈیکل کے شعبے سے تعلق نہ رکھتا ہو تو قدم قدم پر مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ نان میڈیکل لائف پارٹنر یہی سمجھتا ہے کہ اس کا شوہر/بیوی اسے نظرانداز کرکے کسی ساتھی ڈاکٹر/لیڈی ڈاکٹر کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھا رہا ہے۔ اکا دکا کیسز میں ایسا ہوتا بھی ہوگا تاہم میرا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ تو یہی کہتا ہے کہ ڈاکٹر ہمارے معاشرے کا مظلوم ترین پیشہ ور انسان ہوتا ہے۔ میرے ایک بہت ہی محسن ڈاکٹر صبح پانچ بجے اٹھتے تھے۔ سات بجے انہیں ایک معروف سرکاری مقامی اسپتال پہنچنا ہوتا تھا۔ دوپہر ایک بجے وہاں سے فارغ ہوتے اور سہ پہر تین سے شام سات بجے تک ایک پرائیویٹ اسپتال کے کلینک میں بیٹھتے تھے۔ رات کو آٹھ بجے سے ساڑھے بارہ، ایک بجے تک ایک انتہائی پسماندہ بستی میں دس روپے پرچی والے کلینک پر بلامعاوضہ اپنی رضاکارانہ خدمات پیش کرتے تھے، رات گئے وہ گھر پہنچتے تھے اور پہلی فرصت میں سونے کی کوشش کرتے...... کہ صبح جلدی اٹھنا ہے۔ ان ڈاکٹر صاحب کی بیوی اکثر مجھ سے ایسے شکوے کرتی رہتی تھیں جیسا مسز عرفان کررہی تھیں اور میں انہیں ہنس کر یہ مشورہ دیتا تھا۔

”بھابی! یہ بتائیں، آپ کی ڈاکٹر صاحب سے شادی پہلے ہوئی تھی یا یہ ڈاکٹر پہلے بنے تھے؟“

”ظاہر ہے، یہ ڈاکٹر پہلے بنے تھے۔“ وہ جواب دیتی تھیں۔ ”ہماری شادی تو بعد میں ہوئی ہے۔“

”پھر میں سمجھتا ہوں، ڈاکٹر صاحب کو قصوروار نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔“ میں نے کہا۔ ”یہ بات شادی سے پہلے سوچنے کی تھی کہ آپ نے کس قسم کے مصروف انسان کو جیون ساتھی چنا ہے۔“

”پہلے تھوڑی پتا تھا کہ ان کا اوڑھنا بچھونا اسپتال اور مریض ہی ہوں گے۔“ وہ بے بسی سے کہہ دیتیں۔

”چلیں، اب تو پتا چل گیا ہے نا......!“ میں شرارت سے مسکرانے لگتا۔

”کیا مطلب بیگ صاحب!“ وہ گھور کر مجھے دیکھتی تھیں۔ ”پتا چل گیا ہے تو......؟“

”تو اب آپ کے پاس صرف دو ہی آپشن ہیں۔“ میری شرارت میں گہری سنجیدگی شامل ہوجاتی۔

وہ ٹٹولنے والی نظر سے مجھے دیکھنے لگتی تھیں ”کون سے دو آپشنز بیگ صاحب؟“

”یا تو آپ ڈاکٹر صاحب کا پروفیشن چھڑا کر انہیں جنرل اسٹور کھلوادیں۔“ میں کہتا ”اور یا پھر......!“

”اور یا پھر کیا؟“ وہ اضطراری انداز میں پوچھتیں۔

”یا پھر آپ اپنے فیصلے پر نظرثانی کرلیں۔“ میں زیرلب مسکراتے ہوئے مذاق کے رنگ میں کہہ ڈالتا۔

”میرے پاس ایک تیسرا آپشن بھی ہے بیگ صاحب!“ وہ میری شرارت کی تہ میں اتر جاتیں۔

”تیسرا آپشن!“ میں ان جان بن جاتا۔ ”بھابی! میں کچھ سمجھا نہیں۔“

”ایک بات آپ کان کھول کر سن لیں بیگ صاحب۔“ وہ بڑے اعتماد سے کہتیں۔ ”میں نہ تو ان کو چھوڑوں گی اور نہ ہی ان سے ان کا پیشہ چھڑواؤں گی......“

”پھر آپ کیا کریں گی بھابی......؟“

”میں انہی کو بدل کر رکھ دوں گی۔“ وہ بڑے وثوق

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے کہتیں۔

”میں آپ کے حق میں دعا کروں گا بھابی!“

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگتیں۔

”مطلب...... وقت گزرنے کے ساتھ خود ہی آپ کی سمجھ میں آجائے گا۔“ میں مبہم انداز میں اس بحث کو ختم کر دیتا۔ ”اس سے زیادہ فی الحال میں کچھ نہیں کہہ سکتا......“

بات آئی گئی ہو جاتی۔ مہینے، دو مہینے میں جب بھی میرا ان کے یہاں جانا ہوتا تو میں ان سے پوچھنا نہیں بھولتا تھا۔

”بھابی! آپ کی کوشش کا کیا ہوا؟“

”کوشش جاری ہے۔“ وہ بڑے یقین کے ساتھ جواب دیتیں۔ ”میں اتنی جلدی ہمت ہارنے والی نہیں ہوں۔ آپ دیکھ لیجیے گا۔ میں ان کو بدل کر ہی دم لوں گی۔“

بھابی نے کہا تھا۔ ”آپ دیکھ لیجیے گا۔“ اور میں دیکھتا رہا۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ دونوں میاں بیوی اپنی اکلوتی بیٹی کے ہمراہ یو۔ کے پہنچ گئے۔ قدرت نے ڈاکٹر صاحب کی محنت کا صلہ دے دیا تھا۔ میرے وہ دوست ڈاکٹر جس جاں فشانی سے اٹھارہ گھنٹے روزانہ ڈیوٹی دیا کرتے تھے اس خلوص اور جذبے کے نتیجے میں وہ آج کل لندن کے ایک معروف اسپتال میں سیٹ ہیں۔ میں نہیں جانتا، بھابی اپنے مشن میں کس حد تک کامیابی حاصل کر پائی ہیں البتہ یہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ برطانیہ میں میڈیکل کا پروفیشن اینٹی سوشل لائف کے زمرے میں نہیں آتا۔

اپنے سامنے بیٹھی ہوئی مسز عرفان کو میں اس نوعیت کے مشوروں سے نہیں نواز سکتا تھا جو اپنے دوست ڈاکٹر کی بیوی کو دیتا رہا تھا لہٰذا میں پیشہ ورانہ سنجیدگی کے ساتھ اس سے سوال کر رہا تھا۔

”جی ہاں......!“ ہما نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”عرفان خود بھی ڈاکٹر ہیں وہ چائلڈ اسپیشلسٹ ہیں۔“

میں نے تصدیق کی خاطر پوچھنا ضروری جانا۔ ”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کے شوہر اسپتال کے مالک ہیں اور لیڈی ڈاکٹر ناہید ایک گائنا کالوجسٹ کی حیثیت سے وہاں کام کرتی ہے۔“

”جی ہاں...... میرا یہی مطلب ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

میں نے رف پیڈ پر نوٹس لیتے ہوئے سوالات کا سلسلہ جاری رکھا۔ ”اور آپ کو شک ہے کہ ڈاکٹر ناہید، عرفان کو آپ سے چھیننے کی کوشش کر رہی ہے؟“

”شک نہیں، مجھے یقین ہے بیگ صاحب۔“ وہ اصراری لہجے میں بولی۔ ”وہ چڑیل اتنی تیزی سے عرفان کو مجھ سے دور کر رہی ہے کہ اگر میں نے فوری طور پر کوئی ہنگامی قدم نہیں اٹھایا تو خدانخواستہ کہیں...... عرفان مجھے چھوڑ کر مستقل طور پر اسی کا نہ ہو جائے......!“

بات ختم کرتے کرتے اس کے چہرے پر پریشانی پھیل گئی تھی۔ ان لمحات میں وہ بڑی قابلِ رحم نظر آ رہی تھی۔ میں نے اس کی حالت کے پیشِ نظر ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔

”بتائیں...... میں اس سلسلے میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“

”آپ کو ہر صورت میری مدد کرنا ہوگی۔“ وہ زور دیتے ہوئے بولی۔ ”آپ نے عرفان کو اس منحوس ڈاکٹر کے چنگل سے نکال کر واپس میرے پاس لانا ہے۔“

”ہوں......!“ میں گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر گمبھیر انداز میں کہا۔ ”آپ کا کیس خاصا ٹیپیکل ہے، جب تک میں خود نہ مطمئن ہو جاؤں، کوئی حتمی بات نہیں کر سکتا۔“

”مطمئن نہ ہو جائیں......!“ اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ ”بیگ صاحب! آپ کس قسم کا اطمینان چاہتے ہیں...... اپنی فیس کا اطمینان یا یہ کہ میں کس حد تک آپ کے ساتھ سچ بول رہی ہوں؟“

”آپ کی دوسری بات زیادہ درست ہے۔“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”فیس تو میں ہر صورت میں آپ سے وصول کروں گا اور وہ بھی ایڈوانس میں......“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ”سب سے اہم امر یہ ہے کہ مجھے پتا ہونا چاہیے، میں جس کیس کی پیروی کرنے جا رہا ہوں اس کی حقیقت کیا ہے......“

”تو آپ کا خیال ہے، میں غلط بیانی سے کام لے رہی ہوں؟“ وہ مجھ سے مستفسر ہوئی۔

”میں نے ایسا کچھ نہیں کہا مسز عرفان!“ میں نے اس کا ذہن صاف کرنے کی غرض سے کہا۔ ”میں آپ کو پیش آمدہ حالات کی تفصیل جاننا چاہتا ہوں تاکہ یہ فیصلہ کر سکوں کہ اس معاملے میں کس حد تک قانونی مدد لی جا سکتی ہے۔ عین ممکن ہے جسے آپ اپنی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ سمجھ رہی ہیں وہ بظاہر سادہ سے معاشرتی مشوروں ہی سے حل ہو جائے......!“

”بیگ صاحب! یہ اتنا بھی آسان نہیں ہے کہ محض آپ کے مشورے سے سب ٹھیک ہو جائے۔“ وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”آپ کو بہت محنت کرنا پڑے گی......“

”ٹھیک ہے!“ میں نے اس کے چہرے پر

جماتے ہوئے کہا۔ ”آپ پہلے مجھے اپنے معاملے کی تفصیلات سے آگاہ کریں۔ اس کے بعد میں فیصلہ کروں گا کہ میں آپ کے لیے قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے کیا کر سکتا ہوں۔“

اس نے ایک گہری سانس لی اور چند لمحات کے لیے خاموش رہ کر خیالوں میں گم ہو گئی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ اپنے ذہن میں بکھرے ہوئے خیالات کو ایک جگہ مجتمع کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد اس نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولنا شروع کیا۔ میں ہما کی فراہم کردہ معلومات میں سے غیر ضروری باتوں کو حذف کر کے خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ زیرِ نظر کیس کے مختلف پہلوؤں سے اچھی طرح آگاہ ہو جائیں اور آگے چل کر آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو......!

☆☆☆

ہما کروڑ پتی باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس کا باپ شیخ سلطان رئیل اسٹیٹ کے بزنس کا کنگ تھا۔ بڑے بڑے پراپرٹی ایجنٹ اس سے کاروباری مشورہ لینے آتے تھے۔ ایک روز اچانک اس کے ذہن میں پرائیویٹ اسپتال قائم کرنے کا خیال آیا۔ یہ ایک ایسا خیال تھا کہ جس نے بھی سنا، حیرت کا اظہار کیا کیونکہ وہ بذاتِ خود ڈاکٹر نہیں تھا اور نہ ہی اس کی کبھی میڈیکل کے شعبے سے وابستگی رہی تھی۔ جب قریبی یا بے تکلف دوست اس سے سوال کرتے تو وہ کہتا۔

”کیا ہمارے ملک میں ہر شخص وہی کام کر رہا ہے جو اس کا اصل پیشہ ہے......؟“

”یہ ضروری نہیں ہے۔“ اسے جواب ملتا۔

”تو پھر مجھ پر بھی یہ فارمولا لاگو نہیں ہوتا۔“ وہ بڑے اعتماد سے کہتا۔

”شیخ صاحب! دوسرے پیشوں کی بات الگ ہے۔“ اس سے کہا جاتا۔ ”میڈیکل کا شعبہ بالکل مختلف ہے۔“

”میری بات سنو بھائی!“ وہ گہری سنجیدگی سے کہتا۔ ”میں اسپتال کھولنے جا رہا ہوں اور یہ کام میں خالصتاً کمرشل پوائنٹ آف ویو پر کروں گا۔ اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں اپنے اسپتال میں خود بھی ایک ڈاکٹر بن کر لوگوں کا علاج معالجہ شروع کر دوں گا تو پھر آپ بالکل غلط انداز میں سوچ رہے ہیں۔“

”تو پھر آپ کیا کریں گے......؟“ ان سے پوچھا گیا۔

”میں صرف انویسٹمنٹ کروں گا۔“ شیخ سلطان ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیتا۔ ”اپنی جیب سے پیسا لگا کر ایک پرائیویٹ اسپتال قائم کروں گا جہاں شہر کے قابل ڈاکٹرز، نرسز اور ٹیکنیکل اسٹاف کام کرے گا۔ اسپتال کی اپنی ایک معیاری لیبارٹری اور ایک فارمیسی ہوگی۔ میں اس اسپتال میں ایکسریز اور دیگر ٹیسٹس کے لیے جدید مشینیں بھی لگاؤں گا تاکہ میرے اسپتال میں علاج کی غرض سے آنے والے مریضوں کو کسی ٹیسٹ وغیرہ کے لیے کہیں اور نہ جانا پڑے۔ اسپتال کے نظام کی دیکھ بھال کے لیے میں ایک تعلیم یافتہ اور تجربہ کار ایڈمنسٹریٹر بھی رکھوں گا۔ وہ ایک جدید اور معیاری اسپتال ہوگا جہاں علاج کے سلسلے میں کوئی کمی یا خامی دیکھنے کو نہیں ملے گی......“

”پھر تو ٹھیک ہے۔“ اعتراضات کرنے والوں کو تسلی ہو جاتی۔ ”اگر آپ اس بزنس میں صرف پیسا لگائیں گے اور میڈیکل کے معاملات میں پریکٹیکلی آپ کا کوئی عمل دخل نہیں ہوگا تو پھر یہ کسی طور بھی نامناسب نہیں۔“

”مناسب اور نامناسب کی کیا بات کرتے ہو بھائی!“ شیخ سلطان برا سا منہ بناتے ہوئے کہتا۔ ”چاروں طرف بڑی عجیب و غریب صورتِ حال ہے۔ جو لوگ اپنے گھر کا نظام سنبھالنے کی اہلیت نہیں رکھتے وہ ملک کے حکمران بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔ پان سگریٹ کی دکانوں پر عام استعمال کی تمام ادویات میسر ہیں۔ جس کا جدھر منہ اٹھتا ہے وہ وہی پیشہ اختیار کر لیتا ہے۔“

الغرض...... شیخ سلطان نے ”شیخ اسپتال“ کے نام سے نارتھ ناظم آباد کے علاقے میں ایک چھوٹا سا پرائیویٹ اسپتال قائم کر لیا۔ اس کی نیت چونکہ صاف اور شفاف تھی لہٰذا یہ بزنس بہت اچھا چل نکلا۔ ویسے بھی میڈیکل کا شعبہ اور ہوٹل لائن ایسے کاروبار ہیں جو اگر مناسب توجہ دی جائے تو ضرور ترقی کرتے ہیں۔

شیخ سلطان نے معیار پر سمجھوتا نہیں کیا تھا۔ اس نے ٹیکنیکل اسٹاف اور ڈاکٹرز کے انتخاب میں ان کی قابلیت کو بنیاد بنایا تھا اور اس کام میں ایڈمنسٹریٹر جمال فریدی نے شیخ سلطان کی بہت مدد کی تھی۔ جمال فریدی بہت ہی مخلص اور وفادار شخص تھا۔

ہما سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق ڈاکٹر عرفان بھی ”شیخ اسپتال“ کے ڈاکٹروں میں سے ایک تھا۔ وہ چائلڈ اسپیشلسٹ تھا اس لیے شیخ سلطان اس کی بہت عزت کرتا تھا۔ ہما اپنی زندگی کے ابتدائی حصے میں بہت زیادہ بیمار رہا کرتی تھی اور ایک چائلڈ اسپیشلسٹ کی توجہ اور علاج ہی سے اسے دوسری زندگی ملی تھی۔ زندگی اور موت دینے والی تو خدا کی ذات ہے لیکن ڈاکٹر کو اسی لیے مسیحا کہا جاتا

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہے کہ وہ مریضوں کو موت کے منہ سے نکال لاتا ہے۔ قصہ مختصر، شیخ سلطان ہما کی بیماری کے باعث ماضی میں ایک چائلڈ اسپیشلسٹ ڈاکٹر احمد کا بہت شکر گزار تھا لہٰذا وہ اپنے اسپتال میں ڈاکٹر عرفان کو بہت زیادہ اہمیت دیتا تھا۔

ڈاکٹر عرفان اپنے شعبے کا تو ماہر تھا ہی، علاوہ ازیں وہ اخلاقیات اور کردار کے حوالے سے بھی ایک مثالی انسان تھا چنانچہ شیخ سلطان کا اس سے متاثر ہو جانا فطری امر تھا۔ اس نے رئیل اسٹیٹ کے بزنس میں بھانت بھانت کے لوگوں کو ڈیل کر رکھا تھا۔ وہ ایک مردم شناس اور سرد و گرم چشیدہ شخص تھا لہٰذا ڈاکٹر عرفان کی خوبیوں نے اس کے دل میں گھر کر لیا اور اس نے ڈاکٹر عرفان کو اپنی نظر میں رکھ لیا۔

وقت کا پہیا بہت تیزی سے گردش میں رہا اور ڈاکٹر عرفان کو شیخ اسپتال میں کام کرتے ہوئے تین سال گزر گئے۔ ان دنوں شیخ سلطان بیمار رہنے لگا تھا۔ ایک روز عرفان اپنی ڈیوٹی آف کر کے گھر جانے ہی والا تھا کہ اس کے لیے شیخ سلطان کا فون آ گیا۔

”جی شیخ صاحب!“ ڈاکٹر عرفان نے لائن پر آنے کے بعد کہا۔ ”حکم کریں سر!“

”ڈاکٹر عرفان! کیا آپ ابھی میرے پاس آ سکتے ہیں؟“ شیخ سلطان نے استفسار کیا۔ ”مجھے آپ سے چند ضروری باتیں کرنا ہیں……“

پچھلے ایک سال سے شیخ سلطان کی صحت بڑی تیزی سے گرتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر عرفان کو یہ تو اندازہ تھا کہ شیخ صاحب کے ساتھ کوئی پُراسرار مسئلہ ہے لیکن وہ اس میڈیکل پرابلم تک پہنچنے سے قاصر تھا کیونکہ شیخ سلطان نے اپنی بیماری کو اپنے اسپتال کے کسی ڈاکٹر سے ڈسکس نہیں کیا تھا۔

”سر! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا……؟“ ڈاکٹر عرفان نے ہمدردی بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”آپ کا حکم ہو تو میں اپنے ساتھ کسی ڈاکٹر……!“

”نہیں!“ شیخ سلطان نے قطعیت سے کہا۔ ”مجھے اس وقت صرف ایک چائلڈ اسپیشلسٹ کی ضرورت ہے…… ڈاکٹر عرفان کی!“

”او۔کے سر!“ ڈاکٹر عرفان نے کسی بحث میں پڑے بغیر حتمی لہجے میں کہا۔ ”میں آ رہا ہوں۔“

راستے بھر ڈاکٹر عرفان اسی ادھیڑ بن میں پھنسا رہا کہ شیخ سلطان کو کسی چائلڈ اسپیشلسٹ کی کیوں کر ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ ان کے گھر میں تو کوئی بچہ بھی نہیں تھا۔ سب جانتے تھے کہ شیخ صاحب کی صرف ایک ہی بیٹی ہے جو جوان ہو چکی۔ اس کی ابھی شادی بھی نہیں ہوئی جو یہ سمجھ لیا جا[تا کہ] انہیں اپنے کسی نواسے یا نواسی کے لیے چائلڈ اسپیشلس[ٹ کی] ضرورت ہو گی۔ بہرحال، اپنے باس کے حکم پر ڈاکٹر عر[فان] اس کے گھر پہنچ گیا۔

گھریلو ملازم نے ڈاکٹر عرفان کو سیدھا بیڈ[روم] میں پہنچا دیا۔ شیخ سلطان اپنے بیڈ روم میں موجود تھا اور [بیڈ] پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر خاصی پریشانی دکھائی [دے رہی] تھی۔ وہ کسی سنجیدہ الجھن میں نظر آتا تھا۔

ڈاکٹر عرفان، شیخ سلطان کے بیڈ کے قریب ہی ایک کرسی ڈال کر بیٹھ گیا اور خاصے گمبیر لہجے میں پوچھ[ا۔] ”سر…… خیریت تو ہے نا……؟“

”خیریت نہیں ہے ڈاکٹر عرفان……!“ وہ نقاہت بھرے لہجے میں بولا اور اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی۔ ”آپ [کو] حیرت تو ہوئی ہو گی کہ میں نے اپنے لیے ایک چائ[لڈ] اسپیشلسٹ کو کیوں کال کیا؟“

”جی سر…… بات تو حیرت ہی کی ہے۔“ ڈاکٹر عرفان نے اثبات میں گردن ہلائی اور سوالیہ نظر سے شیخ سلطان [کو] دیکھنے لگا۔

شیخ صاحب نے فرمایا۔ ”آپ کو معلوم ہو گا، میری صرف ایک ہی بیٹی ہے، ہما، ہما کی والدہ کا بچپن ہی [میں] انتقال ہو گیا تھا۔ میں نے اسے ماں اور باپ دونوں کی حیثیت سے پالا ہے اور خود سے زیادہ اس کے لیے پریشان رہتا ہوں……!“

اب بھی ڈاکٹر عرفان کے پلے کچھ نہ پڑ سکا۔ وہ بے حد الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”سر! مجھے آپ کی طبیعت ٹھیک نظر نہیں آ رہی اور آپ اپنی صاحب زادی کا ذکر کر رہے ہیں؟“

اسی لمحے ملازم ایک ٹرے اٹھائے بیڈ روم میں داخل ہوا۔ ٹرے میں چائے کے برتنوں کے علاوہ لائٹ ریفریشمنٹ کا سامان سجا نظر آ رہا تھا۔ اس تکلف بروقت کے لیے یقیناً شیخ صاحب نے اپنے ملازم کو پہلے ہی احکام دے رکھے تھے۔

ملازم وہ ٹرے ڈاکٹر عرفان کے نزدیک ہی ایک چھوٹی سی میز پر رکھ کر واپس چلا گیا تو شیخ سلطان نے کہا۔ ”بات تو ہو ہی رہی ہے۔ ساتھ ساتھ یہ بھی لیتے جائیں۔“

ڈاکٹر عرفان نے ٹرے کی جانب ہاتھ بڑھانے سے پہلے پوچھا۔ ”سر! آپ چائلڈ اسپیشلسٹ کے حوالے سے کوئی وضاحت کرنے والے تھے؟“

”ہاں……“ وہ بیڈ کی پشت گاہ سے ٹیک لگا[کر] کمزوری آواز میں بولا۔ ”ہما جب چھوٹی سی تھی تو اس وقت اسے چائلڈ اسپیشلسٹ کے پاس لے جانا پڑتا تھا……“

شیخ مبہم سی بات کر کے خاموش ہوا تو ڈاکٹر عرفان پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ”مگر اب تو آپ کی صاحب زادی چائلڈ نہیں رہیں پھر چائلڈ اسپیشلسٹ کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟“

”بچے چاہے کتنے بھی بڑے ہو جائیں وہ والدین کی نظر میں بچے ہی رہتے ہیں۔“ شیخ نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”میں سمجھتا ہوں، اب ہما کو ایک چائلڈ اسپیشلسٹ کی زیادہ ضرورت ہے۔“

”سر! میں کچھ بھی نہیں سمجھ سکا……“ ڈاکٹر عرفان کی حالت دیدنی تھی۔

ایک لمحے کے لیے تو اسے یوں محسوس ہوا کہ شیخ سلطان اپنے حواس کھو بیٹھا ہے جو یوں بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے پھر جب شیخ صاحب نے تھیلے میں سے بلی کو باہر نکالا تو حقیقت پوری طرح اس پر آشکار ہو گئی۔

”ڈاکٹر عرفان!“ شیخ سلطان نے نہایت ہی سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔ ”آپ کو یقیناً اس بات کا احساس ہو گا کہ میں اپنے اسپتال کے دیگر ڈاکٹرز کی بہ نسبت آپ کو زیادہ قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔“

”یہ تو آپ کی ذرہ نوازی ہے سر!“ ڈاکٹر عرفان نے ممنونیت بھرے انداز میں کہا۔

”آپ کی نظر میں یہ ”ذرہ نوازی“ ہو گی ڈاکٹر عرفان۔“ وہ اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے بولا۔ ”لیکن میں اسے ”جوہر شناسی“ سمجھتا ہوں۔“

ڈاکٹر عرفان نے سوالیہ نظر سے اپنے باس کو دیکھا۔

شیخ سلطان اپنی دھن میں بولتا چلا گیا۔ ”میں نے ابتدا ہی میں آپ کی صلاحیتوں کو پہچان لیا تھا۔ اپنے پیشے کے ساتھ آپ کی محبت اور لگن، ایمان داری اور قابلیت نے مجھے بہت متاثر کیا تھا پھر ہر گزرتے دن کے ساتھ یہ تاثر گہرے سے گہرا ہوتا چلا گیا اور اب……“ وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ”اب میں نے ایک اہم فیصلہ کیا ہے!“

”کیا آپ کے اس فیصلے کا تعلق میری ذات سے ہے؟“

”بالکل آپ کی ذات سے بھی ہے۔“ شیخ نے جواب دیا۔

ڈاکٹر عرفان نے پوچھا۔ ”بھی ہے…… سے آپ کی مراد یقیناً یہ ہے کہ اس فیصلے میں میرے علاوہ کوئی اور بھی شامل ہے؟“

”بالکل درست سمجھے آپ۔“ شیخ سلطان تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میرے اس فیصلے کے دو کردار ہیں۔ نمبر ایک ڈاکٹر عرفان اور نمبر دو ہما……!“

”اوہ……!“ ڈاکٹر عرفان نے ایک بوجھل سانس خارج کی۔ اگرچہ بات اس کی سمجھ میں بیٹھ گئی تھی تاہم تصدیقی انداز میں پوچھنا بھی ضروری تھا۔ ”سر! اور آپ کے اس فیصلے کی تفصیل کیا ہے؟“

”ڈاکٹر عرفان!“ شیخ سلطان اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مدبرانہ انداز میں بولا۔ ”میں آپ کو بیٹا بنا کر اپنے خاندان میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔“

”جی……؟“ ڈاکٹر عرفان نے کمزوری حیرت ظاہر کی۔

”میں سمجھتا ہوں، میرے پاس وقت بہت کم ہے۔“ شیخ سلطان نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”میں اپنی آنکھ بند ہونے سے پہلے ہما کے مستقبل کو محفوظ ہاتھوں میں سونپ دینا چاہتا ہوں اور…… میری نظر میں آپ سے زیادہ موزوں اور مناسب داماد مجھے اور کہیں سے نہیں مل سکتا جو میری بیٹی کو بھی خوش رکھ سکے اور میرے بعد اس اسپتال کو بھی بہ طریق احسن چلا سکے……!“

”سر! آپ مایوسی کی باتیں نہ کریں۔“ ڈاکٹر عرفان نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ”آپ کو کچھ نہیں ہو گا۔ خدا آپ کا سایہ ہمیشہ ہمارے سروں پر سلامت رکھے گا۔ آپ دل چھوٹا نہ کریں۔“

”زندگی کی امید دلانا اور حوصلہ بڑھانا تو آپ کے پیشے کا اوّلین تقاضا ہے ڈاکٹر عرفان!“ شیخ سلطان نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”لیکن یہ بھی طے ہے کہ ایسی باتوں سے محض وقتی تسلی تو ہو جاتی ہے مگر حقیقت نہیں بدل سکتی اور حقیقت یہ ہے کہ میرے جیون کا اختتام ہونے والا ہے……!“

”سر! آپ نے کبھی اپنی بیماری کے بارے میں بتایا بھی تو نہیں!“ ڈاکٹر عرفان نے شاکی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”ورنہ ہمارے ملک میں ہر علاج کی سہولتیں موجود ہیں اور اگر ملک سے باہر جانے کی ضرورت بھی پیش آ جائے تو آپ ماشاءاللہ ہر نوعیت کے اخراجات افورڈ کر سکتے ہیں پھر……؟“

”افورڈ کر رہا ہوں ڈاکٹر عرفان!“ شیخ سلطان، ڈاکٹر عرفان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ”میں ہر تین مہینے کے بعد چند روز کے لیے ملک سے باہر جاتا ہوں۔ انگلینڈ کے ایک اسپتال میں بڑے قابل ڈاکٹرز میرا علاج کر رہے ہیں لیکن…… اب وہ بھی امید چھوڑ بیٹھے ہیں……“

اتنا کہہ کر شیخ سلطان خاموش ہوا تو ڈاکٹر عرفان بڑی حد تک اس کی بیماری کے بارے میں سمجھ چکا تھا۔ رہی سہی

WWW.PAKSOCIETY.COM

تفصیل بھی شیخ سلطان نے آنے والے پندرہ منٹ میں بتا دی۔ اس کی آواز بری طرح پھولنے لگی تھی۔ ڈاکٹر عرفان نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"سر! آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ہم اس موضوع پر بعد میں بھی بات کرسکتے ہیں۔ آپ کو اس وقت آرام کی ضرورت ہے......"

"نہیں ڈاکٹر عرفان!" وہ قطعیت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے نحیف سی آواز میں بولا۔ "میں نے زندگی میں کبھی آج کا کام کل پر نہیں ٹالا اور...... "بعد میں" جیسے الفاظ میری ڈکشنری میں کہیں بھی نہیں ہیں۔" وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا، چند گہری سانسیں لینے کے بعد اپنی کیفیت کو قابو میں کیا پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"میں نے کچھ سوچ کر ہی اس وقت آپ کو یہاں بلایا ہے۔ یہ بہت اچھا موقع ہے اس معاملے کو فائنل کرنے کا۔ اس وقت ہما گھر میں نہیں۔ وہ اپنی کسی دوست کی شادی میں گئی ہوئی ہے لہٰذا جو بھی طے کرنا ہے، ابھی اور اسی وقت کرنا ہے اور...... مجھے امید ہے ڈاکٹر عرفان! آپ میری درخواست کو مسترد نہیں کریں گے۔"

"سر! آپ مجھے شرمندہ کررہے ہیں۔" ڈاکٹر عرفان جلدی سے بولا۔ "آپ میرے لیے بہت محترم ہیں، میرے بزرگوں کی طرح ہیں۔ آپ مجھ سے درخواست کریں گے تو میں ندامت کے بوجھ تلے دب کر مر جاؤں گا۔"

"آپ کی اسی سعادت مندی اور شائستگی نے مجھے ہما کے لیے آپ کے انتخاب پر مجبور کیا ہے ڈاکٹر عرفان۔" شیخ سلطان نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے، میں آپ کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے اس کام کے لیے درخواست نہیں کرتا بلکہ حکم دیتا ہوں کہ...... آپ کو ہر صورت میں میری خواہش...... آخری خواہش کو تکمیل تک پہنچانا ہے......"

بات کے اختتام پر شیخ سلطان کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے۔ ان لمحات میں وہ بے حد جذباتی ہو رہا تھا۔ بیڈروم میں گمبھیر خاموشی کا راج تھا۔ شیخ کی اس کیفیت کے پیشِ نظر ڈاکٹر عرفان نے کہا۔

"سر آپ اتنے اچھے ہیں...... اور مجھ پر آپ کے اتنے احسانات ہیں کہ میں آپ کے حکم کو ٹال ہی نہیں سکتا مگر......!"

"مگر کیا؟" ڈاکٹر عرفان کے خاموش ہوتے ہی شیخ نے بے تابانہ لہجے میں استفسار کیا۔

"سر یہ معاملہ یک فریقی تو نہیں ہے نا۔" ڈاکٹر عرفان وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اس کام کے لیے دونوں فریقوں کی رضامندی ضروری ہے۔"

"مجھے صرف آپ کی رضامندی چاہیے ڈاکٹر عرفان!" شیخ نے شدید ترین نقاہت کے باوجود ٹھوس لہجے میں کہا۔ "ہما میری بیٹی ہے۔ وہ میری مرضی سے باہر جا ہی نہیں سکتی۔ وہ میری بیماری سے اچھی طرح واقف ہے۔ ہم رشتے میں ضرور باپ بیٹی ہیں لیکن درحقیقت ہم دو دوستوں کی طرح اپنا ہر معاملہ ایک دوسرے سے شیئر کرتے ہیں۔"

ڈاکٹر عرفان کے پاس انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ویسے بھی شیخ سلطان کی مخلصانہ پیشکش میں اس کے لیے فائدہ ہی فائدہ تھا۔ وہ آنے والے دس سال بھی جان توڑ کوشش کرتا پھر بھی اپنا ایسا اسپتال نہیں بنا سکتا تھا جیسا شیخ سلطان نے قائم کر رکھا تھا۔ ہما سے شادی کی "ہامی" بھرنے میں اس کا فائدہ ہی فائدہ تھا لہٰذا چند لمحات کی رکی سوچ بچار کے بعد اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"سر! جو آپ کا حکم...... میں آپ کی توقع پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔"

"سر نہیں......" شیخ سلطان نے تنبیہی انداز میں کہا۔ "ڈاکٹر عرفان! آج کے بعد آپ مجھے "سر" نہیں کہیں گے۔"

"او کے انکل......!" ڈاکٹر عرفان نے سادگی سے کہا۔

"ویری گڈ!" شیخ سلطان نے تعریفی نظر سے ڈاکٹر عرفان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "پہلے آپ کے طرزِ تکلم میں صرف ادب و احترام تھا۔ اب اس میں اپنائیت بھی شامل ہوگئی ہے۔"

ڈاکٹر عرفان نے شیخ سلطان کی آخری خواہش کا احترام کرنے کا فیصلہ سنا دیا تو شیخ صاحب کے گویا کلیجے میں ٹھنڈک سی پڑ گئی۔ اگلے دو ماہ کے اندر ہما اور ڈاکٹر عرفان کی شادی ہوگئی۔ ہما کی طرح ڈاکٹر عرفان کا خاندان بھی نہایت مختصر سا تھا لہٰذا شادی کی تقریب شاندار انداز میں مگر سادگی سے انجام پا گئی اور اسی سال کے اختتام پر شیخ سلطان اپنی بیماری سے لڑتے لڑتے ہار گیا۔

شیخ کے انتقال کے بعد "شیخ اسپتال" کا مکمل انتظام و انصرام ڈاکٹر عرفان کے ہاتھ میں آگیا تھا لہٰذا اس کی ذمے داریوں میں بے پناہ اضافہ ہوگیا۔ اس نے اسپتال کے اندر ایک چائلڈ اسپیشلسٹ کو بھی اپائنٹ کرلیا تھا تاکہ اس کی انتظامی مصروفیت کے باعث یہ ڈیپارٹمنٹ کسی بھی طرح متاثر نہ ہو۔

شادی کے بعد ڈاکٹر عرفان نے ہما کا اتنا زیادہ خیال رکھا اور اس قدر ٹوٹ کر محبت دی کہ وہ اپنے باپ کی موت کا

غم بھی بھول گئی۔ پھر پے در پے شادی کے بعد آٹھ سالوں میں ان کی تین اولادیں بھی ہوگئیں۔ ہما کو ڈاکٹر عرفان سے گویا عشق ہوگیا تھا۔ ان کی زندگی بڑے سکون سے گزر رہی تھی کہ ڈاکٹر ناہید کی اسپتال میں آمد نے سب کچھ تلپٹ کر کے رکھ دیا۔

ناہید ایک لیڈی ڈاکٹر تھی۔ نہایت ہی حسین و جمیل اور پرکشش۔ اسے ڈاکٹری پاس کیے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ ہاؤس جاب مکمل کرنے کے بعد اس نے "شیخ اسپتال" جوائن کرلیا تھا۔ ناہید کا تعلق لوئر مڈل کلاس سے تھا تاہم اپنے اسٹائل اور رکھ رکھاؤ سے وہ اپر کلاس والی نظر آتی تھی۔

ناہید کی آمد نے ڈاکٹر عرفان کی ازدواجی زندگی میں ہلچل مچا دی تھی۔ جلد ہی اسپتال کے اسٹاف کو یہ محسوس ہوگیا کہ وہ بڑی تیزی سے ڈاکٹر عرفان کے نزدیک ہونے کی کوشش کررہی تھی اور پھر لوگوں نے دیکھا کہ وہ درحقیقت ڈاکٹر عرفان کے قریب ہو بھی گئی تھی۔ اب ڈاکٹر عرفان کا زیادہ تر وقت اسپتال میں گزرنے لگا تھا۔ گھر اور بیوی بچوں پر سے اس کی توجہ ہٹ گئی تھی۔ ہما نے ڈاکٹر عرفان کے رویے میں پیدا ہونے والی اس تشویشناک تبدیلی کو فوراً نوٹ کرلیا اور یہیں سے ایک سنسنی خیز کہانی کا آغاز ہوا تھا...... وہ کہانی جس نے ہما کو میرے پاس آنے پر مجبور کردیا تھا۔

☆☆☆

اپنی کہانی کو مفصل بیان کرنے کے بعد ہما نے مجھ سے کہا۔ "بیگ صاحب! میں نے اسپتال کے عملے کے ایک بندے کو "اعتماد" میں لے کر ڈاکٹر عرفان اور ناہید کی سرگرمیوں کی خبر رکھنے پر مامور کردیا تھا۔ وہ بندہ میرے لیے بہت بھروسے کا تھا۔"

"پھر آپ کے اس جاسوس نے کیا رپورٹ دی؟" میں نے پوچھا۔

"وارڈ بوائے طفیل نے لگ بھگ ایک ماہ تک ان دونوں کی کڑی نگرانی کی۔ اسپتال کے اندر بھی اور اسپتال سے باہر بھی۔" ہما نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بتایا۔ "اس نے بڑے وثوق سے مجھے بتایا ہے کہ ناہید اور عرفان میں بڑے مضبوط کنکشن پیدا ہوچکے تھے اور وہ اسپتال سے باہر ایسے ہی ملتے تھے جیسے ان کے بیچ کوئی بہت ہی گہرا رشتہ ہو۔"

"ایک منٹ!" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "کنکشن پیدا ہوچکے تھے سے آپ کی کیا مراد ہے...... کیا آپ مجھے ماضی کا کوئی قصہ سنا رہی ہیں؟"

"ماضی قریب کا!" اس نے تحمل لہجے میں جواب دیا۔ "یہ ایک سال پہلے کے واقعات ہیں۔"

"اور اب کیا صورتِ حال ہے؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ تشویش بھرے لہجے میں بولی۔ "اب یہ معاملہ بہت ہی خطرناک صورت اختیار کرچکا ہے۔"

"جی بتائیں، میں سن رہا ہوں۔" میں پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہوگیا۔ "جب آپ نے یہ تصدیق کرلی کہ آپ کا شوہر ڈاکٹر ناہید سے بہت گھل مل رہا ہے تو پھر آپ نے کون سا اقدام کیا؟"

"میں نے سیدھا سیدھا عرفان سے بات کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔" اس نے جواب دیا۔ "مجھے یہی ایک راستہ نظر آیا تھا۔"

"ویری گڈ!" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ "پھر آپ کے شوہر نے کس ڈھنگ سے اپنی صفائی پیش کی تھی؟"

"پہلے تو وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "جب میں نے طفیل کا ذکر کیے بغیر ان کی ملاقاتوں کے چند مستند ثبوت مہیا کیے تو وہ شرمندہ ہوا اور ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ "ہما! مجھ سے غلطی ہوگئی۔ تم بے فکر ہوجاؤ۔ میں خود کو سنبھال لوں گا۔ آیندہ تمہیں کسی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔"

"اور آپ نے اپنے شوہر کی بات پر یقین کرلیا؟" میں نے دلچسپی لیتے ہوئے استفسار کیا۔

"اس کی معذرت اور اقبالِ جرم کے بعد میرا یقین کرلینا تو فطری بات تھی۔" وہ سرسری لہجے میں بولی۔ "لیکن میں نے اس پر ایک کڑی شرط بھی عائد کردی تھی۔"

میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ "کیسی شرط مسز عرفان؟"

"میں نے عرفان پر واضح کردیا تھا کہ میں اپنے اور اس کے بیچ کسی تیسرے کو کبھی برداشت نہیں کرسکتی۔" اس نے بتایا۔ "اگر آیندہ ایسا کچھ سننے یا دیکھنے میں آیا تو میں کوئی بھی سنگین قدم اٹھا سکتی ہوں۔" لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

"اور وہ جو میں نے شرط والی بات کہی ہے نا...... وہ شرط یہ تھی بیگ صاحب کہ عرفان پہلی فرصت میں ڈاکٹر ناہید کو اپنے اسپتال سے فارغ کردے گا اور آیندہ کبھی اس سے کسی قسم کا میل جول نہیں رکھے گا۔"

"تو کیا اس نے آپ کی یہ کڑی شرط مان لی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "نہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

صرف عرفان نے زبانی میرا مطالبہ ماننے کی ہامی بھری بلکہ اس نے اپنے اسپتال سے ڈاکٹر ناہید کو فارغ بھی کر دیا تھا۔"

"گڈ......!" میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "گویا آپ کا مسئلہ نہایت ہی آسانی اور خوش اسلوبی سے حل ہو گیا تھا۔"

"اس وقت تو میں یہی سمجھی تھی کہ مسئلہ حل ہو گیا۔" وہ افسردہ لہجے میں بولی۔ "میں مطمئن بھی ہو گئی تھی کہ میری پُرسکون زندگی میں سے ڈاکٹر ناہید کا کانٹا نکل چکا ہے لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد میرا یہ اطمینان ریت کی دیوار کے مانند ثابت ہوا......"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" میں نے حیرانی بھرے لہجے میں پوچھا۔

"چند ماہ بہت سکون سے گزر گئے تھے۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "پھر مجھے محسوس ہونے لگا کہ عرفان کی توجہ ایک بار پھر گھر کے معاملات سے ہٹتی جا رہی ہے۔ اس نے رات کو دیر سے گھر آنا شروع کر دیا تھا۔ پہلے تو میں نے اسے اس کی اسپتال کی مصروفیت جانا لیکن اس خوش گمانی سے جب میرے تجسس کی تسکین نہ ہوئی تو میں نے اپنی فطرت سے مجبور ہو کر ایک بار پھر "جاسوس" کی خدمات حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ طفیل ہمیشہ میرے اعتماد پر پورا اترا تھا اور میں بھی اس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ میں نے طفیل کی مٹھی گرم کرنے کے بعد اسے خصوصی ہدایات کے ساتھ ایک مشن سونپ دیا۔"

"لگتا ہے، آپ کے جاسوس نے کوئی نہایت ہی سنسنی خیز اطلاع دی ہے۔" میں نے بال پین کو انگلیوں میں گھماتے ہوئے کہا۔ "ورنہ آپ کو میرے پاس آنے کی ضرورت پیش نہیں آتی......"

"آپ کا اندازہ بالکل درست ہے بیگ صاحب۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "عرفان اور ناہید کا میل جول اب بھی جاری ہے۔ ناہید نیپا چورنگی کے قریب واقع ایک پرائیویٹ اسپتال میں کام کر رہی ہے، اس کی رہائش گلشن اقبال کی ایک اپارٹمنٹس بلڈنگ میں ہے......"

اس کے خاموش ہونے پر میں نے پوچھا۔ "مگر تھوڑی دیر پہلے تو آپ نے بتایا تھا، ناہید پاپوش نگر میں کہیں رہتی تھی؟"

"جی ہاں، میری پرانی معلومات کے مطابق تو وہ پاپوش نگر کے ایک گھر ہی میں رہتی تھی۔" اس نے جواب دیا۔ "وہ ایک چھوٹا سا دو منزلہ مکان تھا۔ نیچے کا حصہ اس کے بھائی کی فیملی کے پاس تھا۔ بالائی منزل پر ناہید نے رہائش رکھی ہوئی تھی لیکن تازہ ترین معلومات کے مطابق وہ گلشن اقبال کے ایک لگژری فلیٹ میں شفٹ ہو چکی ہے۔"

"اوہ......!" میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ "تو ڈاکٹر عرفان آج کل ناہید سے ملنے اس کے اسپتال جا رہے ہیں؟"

"نہیں جناب......!" وہ شدت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "وہ اسپتال میں بالکل نہیں ملتے بلکہ عرفان اس حرافہ کے فلیٹ پر جاتا ہے اور بعض اوقات آدھی آدھی رات تک وہیں بیٹھا رہتا ہے۔"

"یہ تو کافی گمبھیر حالات ہیں۔" میں نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔ "آپ نے اس سلسلے میں ڈاکٹر عرفان سے بات کی؟"

"نہیں......!" اس نے بتایا۔

میں نے پوچھا۔ "کیوں نہیں کی بات؟"

"میں اندر سے ڈر رہی ہوں۔" وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔ "میرے اندر ایک خوف سا بیٹھ گیا ہے۔"

"کیسا خوف......؟" میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے شک ہے کہ کہیں عرفان نے اس کمینی کے ساتھ شادی نہ کر لی ہو۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "اگر میں نے اس معاملے کو اچھالا تو بڑی گڑبڑ ہو جائے گی......"

"گڑبڑ...... کیسی گڑبڑ؟" میں نے سوال کیا۔

"اگر میرا شک درست نکلا اور عرفان نے واقعی ناہید سے شادی کر رکھی ہے تو میرے لیے بہت برا ہو جائے گا۔" وہ بدستور پریشان لہجے میں بولی۔

"یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کا اس میں کیا نقصان ہے؟"

"میرے شور مچانے یا پوچھ گچھ کرنے سے عرفان کا مستقل جھکاؤ ناہید کی طرف بھی ہو سکتا ہے۔" وہ اپنے خدشات کو الفاظ کا جامہ پہناتے ہوئے بولی۔ "یوں سمجھ لیں کہ میرے ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے ہیں۔ اگر عرفان نے مجھے چھوڑ کر مستقلاً ناہید کے ساتھ رہنا شروع کر دیا تو میرا کیا ہوگا، میں تین بچوں کے ساتھ کہاں جاؤں گی......؟"

"تو دراصل آپ کو یہ ڈر ہے کہ اگر اس کھٹ راگ میں عرفان نے آپ کو طلاق دے دی تو آپ کہاں جائیں گی۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "آپ خود کو، اپنے تین بچوں کو غیر محفوظ سمجھ رہی ہیں۔"

"جی ہاں...... یہی بات ہے۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

میں نے اس سے چند اہم سوالات کیے۔ "مسز عرفان! اس وقت آپ کی رہائش کہاں پر ہے؟"

"پی۔ ای۔ سی۔ ایچ سوسائٹی میں۔" اس نے جواب دیا۔ "شادی سے پہلے میں اور ابو سوسائٹی آفس کے نزدیک ایک چھوٹے سے بنگلے میں رہتے ہیں۔"

"اس وقت آپ کی جہاں رہائش ہے وہ بنگلا کس کے نام ہے؟"

"میرے نام ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"اور اسپتال؟" میں نے پوچھا۔

"وہ میں نے اصرار کر کے عرفان کے نام کرا دیا تھا۔" اس نے بتایا۔

"یعنی فوری طور پر آپ کے لیے اور بچوں کے لیے رہائش کا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔" میں نے "دو اور دو چار" کے فارمولے کی روشنی میں کہا۔ "آپ اس لیے پریشان ہیں کہ آمدنی کا بڑا ذریعہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔"

"ایسی بات نہیں ہے بیگ صاحب۔" وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "مجھے یہ فکر نہیں ہے کہ اگر عرفان نے مجھے اپنی زندگی سے نکال دیا تو میرا اور بچوں کا گزارہ کیسے ہوگا۔ اس بنگلے کے علاوہ بھی میرے پاس بہت کچھ ہے۔ اللہ کے فضل سے میرا بینک بیلنس بھی خاصا معقول ہے۔ ابو نے میرے نام سے بعض اسکیمز میں بھی پیسا لگا رکھا ہے جہاں سے ماہانہ، ششماہی اور سالانہ منافع آتا رہتا ہے۔ پھر میں نے ایم ایس سی کر رکھا ہے۔ اگر خدانخواستہ اپنی اور بچوں کی ذمے داری مجھ پر آن بھی پڑی تو میں بڑی خوش اسلوبی سے نمٹ سکتی ہوں......"

"پھر......!" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "پھر آپ کی پریشانی کا سبب کیا ہے؟"

"دو بڑے اسباب ہیں بیگ صاحب!" وہ پہلو بدلتے ہوئے بولی۔

میں سوالیہ نظر سے اسے تکنے لگا۔

"نمبر ایک!" وہ سنجیدہ لہجے میں بتانے لگی۔ "میں بچوں کو ان کے باپ سے محروم ہوتا نہیں دیکھ سکتی۔ باپ جیسا تیسا بھی کیوں نہ ہو، بچوں کے سر پر اس کا سایہ ہمیشہ قائم و دائم رہنا چاہیے۔ جن بچوں کی تربیت باپ کے بغیر ہوتی ہے ان کے کندھے ہمیشہ جھکے رہتے ہیں۔ نمبر دو......" وہ لمحے بھر کے لیے سانس درست کرنے کو رکی پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

"بیگ صاحب!" اس کی آواز میں بڑا پختہ عزم تھا۔ "مجھے یہ کسی قیمت پر منظور نہیں کہ ناہید مجھے شکست دے کر عرفان کو اپنا بنا لے۔ یہ میرے لیے زندگی موت کا مسئلہ ہے۔"

"ہوں......" میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مسز عرفان! موجودہ صورتِ حال میں آپ کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ پائی ہیں، آپ نے جو حالات و واقعات بیان کیے ہیں ان کی رو سے دو امکانات ہیں۔ اوّل یہ کہ ڈاکٹر ناہید اور ڈاکٹر عرفان کے بیچ سنجیدہ نوعیت کا دوستانہ چل رہا ہے۔ ڈاکٹر عرفان اکثر و بیشتر ڈاکٹر ناہید سے ملنے اس کے فلیٹ پر جاتا رہتا ہے......" میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ "دوم یہ کہ ان دونوں نے آپس میں شادی کر لی ہے اور ڈاکٹر عرفان ایک شوہر کی حیثیت سے وہاں اپنی بیوی ناہید سے ملنے جاتا ہے۔ جب تک صورتِ حال واضح نہ ہو، میں آپ کو درست مشورہ نہیں دے سکوں گا۔ آپ کسی طرح یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ عرفان نے ناہید کے ساتھ باقاعدہ شادی کی ہے یا محض ان میں دوستی کا رشتہ چل رہا ہے۔"

"یہ سب کچھ آپ ہی کو معلوم کرنا ہے بیگ صاحب۔" وہ اُمید بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "یاد ہے، رشیدہ کے کیس میں آپ نے عدالت کے باہر بھی بہت بھاگ دوڑ کی تھی......"

"ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" میں نے بات نبھانے کی غرض سے کہہ دیا۔ "بعض اوقات کیس سے متعلق اہم ثبوت جمع کرنے کے لیے مجھے خود بھی فیلڈ میں گھوم پھر کر سرگرمی دکھانا پڑتی ہے۔"

"بس تو پھر آپ میرے کیس کے لیے بھی کمر کس لیں۔" وہ جوشیلے انداز میں بولی۔ "پہلے کسی طرح یہ پتا لگانے کی کوشش کریں کہ انہوں نے باقاعدہ شادی کر لی ہے یا نہیں۔"

"فرض کریں، میں نے پتا لگا لیا پھر......؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"پھر......!" اس نے میرے کہے ہوئے آخری لفظ کو خاصے دبنگ انداز میں دہرایا اور بولی۔ "اگر انہوں نے ابھی تک شادی نہیں کی تو انہیں کسی ایسے قانونی چکر میں الجھائیں کہ ہزار کوشش کے باوجود بھی شادی نہ کر سکیں۔ اس سلسلے میں، میں آپ سے ہر قسم کا تعاون کرنے کو تیار ہوں۔"

بعض اوقات کلائنٹس مجھ سے ایسی توقعات وابستہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

کر لیتے ہیں جو بہ ظاہر بہت غیر منطقی دکھائی دیتی ہیں۔ بہرحال ایک لاکنسلٹنٹ کی حیثیت سے مجھے ان کی خواہشات اور جذبات کا احترام کرنا پڑتا ہے۔ اسی خیال کے پیش نظر میں نے کہہ دیا۔

''ٹھیک ہے مسز عرفان! اگر وہ لوگ بغیر نکاح کے خفیہ ملاقاتوں کا پُراسرار سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں تو انہیں نکیل ڈالنے کے لیے کوئی قانونی چارہ جوئی کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے لیکن اگر وہ باقاعدہ شادی کر چکے ہیں اور ان کی حیثیت میاں بیوی کی ہے تو پھر......؟''

میں نے سوالیہ انداز میں جملہ نامکمل چھوڑا تو وہ جلدی سے بولی۔ ''تو پھر آپ ان کے نکاح کو باطل کر دیں گے۔''

''باطل...... کیا مطلب ہے آپ کا؟'' میں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

''کمال ہے......!'' وہ حیرت سے مجھے گھورتے ہوئے بولی۔ ''آپ اتنے تجربہ کار وکیل ہیں اور آپ کو اس قانون کے بارے میں آگاہی نہیں؟''

میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ کون سے عائلی قانون کی جانب تھا تاہم میں نے اسی کی زبانی سننے کی غرض سے کہہ دیا۔

''ہوسکتا ہے، میرے ذہن سے نکل گیا ہو۔ آپ ہی وضاحت کر دیں۔''

''میری معلومات کے مطابق کوئی بھی شادی شدہ مرد اپنی پہلی بیوی کی اجازت حاصل کیے بغیر دوسری شادی نہیں کرسکتا۔'' وہ بڑے فخر سے بتانے لگی۔ ''اگر کوئی شخص ایسا کرے گا تو اس کا دوسرا نکاح باطل قرار پائے گا......''

''اچھا، آپ اس قانون کی بات کر رہی ہیں۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''یہ قانون سابق صدر پاکستان فیلڈ مارشل ایوب خان مرحوم نے فیملی کورٹ قوانین کے سیکشن میں شامل کیا تھا جس کا مقصد بیویوں کو تحفظ فراہم کرنا تھا لیکن میں اپنی ذاتی حیثیت میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس قانون میں بہت سے سقم ہیں اسی لیے جب بھی اس قانون کے استعمال کا موقع آتا ہے تو اس سے سب سے زیادہ نقصان بھی بیویوں ہی کو پہنچتا ہے۔''

''میں کچھ سمجھی نہیں۔'' وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔ ''آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟''

''دراصل یہ قانون انسان کی بنیادی ضرورت، اس کی نفسیات، اس کی فطرت اور اسلام کی روح سے متصادم ہے۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''ممکن ہے، بعض لوگوں کو میری رائے سے مکمل اختلاف ہو لیکن یہ میری ذاتی رائے ہے جسے تجربے کی کسوٹی پر غلط ثابت نہیں کیا جاسکتا۔''

میں نے لمحاتی توقف کر کے اپنے سامنے بیٹھی ہوئی مسز عرفان کے چہرے کا جائزہ لیا۔ وہ بڑی توجہ سے میری بات سن رہی تھی۔ میں نے وضاحت کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''پہلی بات تو یہ کہ اگر کوئی شوہر دوسری شادی کا ارادہ رکھتا ہو اور وہ اپنی پہلی بیوی سے عقد ثانی کی اجازت مانگے تو وہ کسی بھی قیمت پر ایسی اجازت نہیں دے گی۔ آپ اس سچویشن میں خود کو رکھ کر دیکھ لیں۔ دوسری بات یہ کہ اگر وہ شخص پہلی بیوی کی اجازت کے بغیر دوسری شادی کرنے جا رہا ہے اور پہلی بیوی نے اس قانون کا سہارا لے کر اور بہت زیادہ اثر و رسوخ استعمال کر کے اپنے شوہر کو عقد ثانی سے روک بھی دیا تو یہاں سے شوہر کے سامنے دو راستے کھل جائیں گے۔''

''کون سے دو راستے؟'' میں لمحے بھر کو خاموش ہوا تو اس نے سوال داغ دیا۔

''نمبر ایک، وہ اپنی پہلی بیوی کے سامنے قانونی سطح پر بہت کمزور پڑ جائے، مطلب یہ کہ وہ پہلی بیوی کو چھوڑنا افورڈ نہ کرسکتا ہو یعنی چھوڑنے کی صورت میں وہ اپنی بیوی کے حقوق پورے کرنے اور واجبات ادا کرنے کی حیثیت میں نہ ہو تو پھر وہ دوسری شادی سے تو باز آجائے گا مگر اپنی نفسانی اور جبلی ضرورت پوری کرنے کے لیے وہ چوری چھپے حرام کاری کا مشغلہ ضرور اپنا سکتا ہے، گویا وہ اپنی بیوی کے ساتھ مخلص و وفادار نہیں رہے گا۔''

''اور دوسرا راستہ؟'' ہمانے پوچھا۔

میں نے بہ دستور ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''دوسری صورت میں وہ پہلی بیوی کو چھوڑ کر دوسری شادی کرلے گا۔''

''گویا دونوں صورتوں میں نقصان پہلی بیوی ہی کا ہے؟'' وہ پریشان ہوتے ہوئے بولی۔

''ہاں، یہ حقیقت تو بڑی واضح اور کھلی ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''چھری خربوزے پر گرے یا خربوزہ چھری پر، دونوں صورتوں میں خربوزہ ہی کٹتا ہے۔''

''یہ تو بڑی زیادتی والی بات نہیں؟'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

''جو بھی ہے، میں نے حقائق آپ کے سامنے رکھ دیے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے۔''

''آپ وکیل ہیں، قانونی داؤ پیچ کے ماہر ہیں۔'' وہ

امید بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میرے لیے کوئی مناسب راہ نکالیں۔ ایسی راہ جس پر چلتے ہوئے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی سلامت رہے......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''میں کسی بھی قیمت پر عرفان کو کھونا نہیں چاہتی...... اور آپ ہر صورت میں اسے واپس لے کر آئیں گے۔ اگر اس نے ابھی تک ڈاکٹر ناہید سے شادی نہیں کی تو وہ اس خیال سے باز آجائے اور اگر انہوں نے شادی کرلی ہے تو بھی وہ ناہید کو اپنی زندگی سے نکال کر صرف اور صرف میرا اور اپنے تین بچوں کا ہو جائے۔''

''میں نے آپ کے تمام تر حالات سن لیے ہیں۔'' اس کے خاموش ہونے پر میں نے کہا۔ ''آپ مجھے چار پانچ دن کی مہلت دے دیں تاکہ میں لائحہ عمل تیار کرسکوں کہ اس پروجیکٹ پر کس انداز میں پیش قدمی کرنا ہے۔''

''آپ کو جتنا وقت چاہیے، لے لیں اور خوب غور و خوض کے بعد آگے بڑھیں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''آپ جو بھی چکر چلائیں، کوئی بھی قانون آزمائیں لیکن ہر صورت میں اور ہر قیمت پر جیت میری ہونا چاہیے۔ آپ ڈاکٹر عرفان کو ڈاکٹر ناہید کے چنگل سے نکال کر میرے حوالے کریں گے۔''

''او کے!'' میں نے پُراعتماد انداز میں کہا۔ ''کچھ کرتے ہیں......!''

''میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیں؟'' اس نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا اور اپنے ہینڈ بیگ کی جانب ہاتھ بڑھا دیے۔

میں نے وکالت نامہ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ ''اسے پُر کرنے کے بعد دستخط کر دیں۔'' میں نے کہا۔ ''آپ کے دستخط کر دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ میں نے آپ کا کیس ڈیل کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ یہ بہ ظاہر تو ایک رسمی سی کاغذی کارروائی ہے لیکن یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ آپ نے ایک قانونی کام میرے سپرد کیا ہے اور میں نے اس کام کو کرنے کی ہامی بھری ہے۔''

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور وکالت نامے کے ضروری کالمز میں ضروری معلومات کا اندراج کرنے لگی۔ پھر وکالت نامے کے آخری حصے میں اپنے دستخط کر کے اس نے کام مکمل کر دیا۔ اس نے وکالت نامہ میری جانب بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کی فیس کا کیا ہے بیگ صاحب......؟''

میں نے اپنی فیس کے اماؤنٹ سے اسے آگاہ کرنے کے بعد کہا۔ ''میں فیس ایڈوانس میں لیتا ہوں اور یہ صرف میری فیس ہے۔ اس کے علاوہ جو بھی عدالتی اخراجات ہوں گے، وہ آپ کے ذمے ہیں۔''

''او۔کے......!'' اس نے مضبوط لہجے میں کہا اور فیس کی رقم گن کر میرے حوالے کر دی۔

میں نے گنے بغیر مذکورہ رقم کو اپنی میز کی دراز میں ڈال دیا اور ثبوت کے طور پر فیس کی وصولی کی مد میں ایک رسید بنا کر اس کے حوالے کر دی۔ اس نے مذکورہ رسید پر ایک سرسری سی نگاہ ڈالی پھر میرے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

''بیگ صاحب! میں نے آپ کو جو رقم دی ہے وہ آپ نے گنی کیوں نہیں؟''

''گن لی ہے......!'' میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔

''کب......؟'' اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''جب آپ ہینڈ بیگ میں سے نکال کر نوٹ گن رہی تھیں تو آپ کی انگلیوں کے ساتھ ساتھ میری آنکھوں نے بھی گن لیے تھے۔'' میں نے بہ دستور مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپ اطمینان رکھیں۔ آپ کی ادا کردہ رقم میری فیس کے عین مطابق ہے۔ اگر کوئی اونچ نیچ ہوتی تو میں آپ کے ہاتھ سے نوٹ لینے سے پہلے ٹوک دیتا......!''

''بیگ صاحب! آپ کی نظر تو بہت تیز ہے......!'' وہ دیدے گھماتے ہوئے بولی۔

''میں ایک پروفیشنل ہوں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اس لیے اپنے پیشے کے تقاضے پورے کرتے ہوئے نظر کو تیز اور مغز کو بیدار رکھنا پڑتا ہے۔''

''آپ کی ان نظری اور مغزی صلاحیتوں کے بارے میں جان کر بڑی خوشی ہوئی بیگ صاحب۔'' وہ مطمئن انداز میں بولی۔ ''مجھے اُمید ہے، آپ کی یہی پیشہ ورانہ صلاحیتیں مجھے میرے مقصد میں کامیابی دلائیں گی۔''

''انشاءاللہ!'' میں نے تہ دل سے کہا۔

اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور چند روز بعد دوبارہ ملاقات کا وعدہ کر کے رخصت ہوگئی۔ جاتے ہوئے وہ میرا وزیٹنگ کارڈ بھی لے گئی تھی جس پر میرے کاروباری رابطہ نمبر درج تھے۔ اس نے ضد کر کے میرے گھر کا فون نمبر بھی کارڈ کے پیچھے لکھوا لیا تھا اور اس بات کا وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

مجھے خوامخواہ تنگ نہیں کرے گی۔

☆☆☆

ہما عرفان نے جو کیس میرے حوالے کیا تھا اس میں فی الحال عدالتی کام سے زیادہ سراغ رسانی کا کام تھا۔ مجھے اپنے ہتھکنڈے اور ذرائع استعمال کر کے سب سے پہلے یہ معلوم کرنا تھا کہ آیا ڈاکٹر عرفان کی ڈاکٹر ناہید کے ساتھ محض دوستی کا رشتہ تھا یا انہوں نے باقاعدہ شادی کر لی تھی۔ اس کے بعد ہی لائحہ عمل ترتیب دیا جاسکتا تھا۔ یہ میرے لیے نہایت ہی آسان کام تھا لہٰذا میں نے اسے ایک دو روز بعد پر ٹال دیا اور دیگر ہنگامی نوعیت کے عدالتی کاموں میں مصروف رہا۔ میں نے شاید اس معاملے کو اس لیے بھی دوسری عدالتی مصروفیات پر فوقیت نہیں دی تھی کہ اس کیس میں مجھے کسی قسم کی ایمرجنسی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

یہ تین روز بعد کی بات ہے۔ میں اپنے گھر میں، سونے سے پہلے کسی ضخیم قانونی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھا کہ میرے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ تیسری گھنٹی پر میں نے ریسیور اٹھالیا۔

''ہیلو......!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

دوسری جانب سے ہما کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''بیگ صاحب......!''

''ہاں...... بات کر رہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اینی پرابلم؟''

''آپ اس وقت کہاں ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

اس کا یہ سوال مجھے احمقانہ سا لگا۔ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''آپ نے میرے کس نمبر پر رنگ کیا ہے مسز عرفان؟''

''گھر کے نمبر پر......'' وہ بہ دستور گھبراہٹ آمیز لہجے میں بولی۔

''بس تو پھر آپ اطمینان رکھیں کہ میں اس وقت اپنے گھر پر ہی ہوں۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''آواز سے اندازہ ہوتا ہے، آپ کی جانب کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے؟''

''بہت بڑی گڑبڑ...... بیگ صاحب!'' وہ ہراساں لہجے میں بولی۔

''اوہ......!'' میں نے گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔ ''تفصیل کیا ہے؟''

''عرفان کو پولیس نے گرفتار کرلیا ہے......'' وہ بکھری ہوئی آواز میں بولی۔

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ ''کیا مطلب؟''

''ڈاکٹر ناہید کو کسی نے گزشتہ رات اس کے فلیٹ پر قتل کر دیا ہے۔'' ہما نے بہ دستور پریشان لہجے میں بتایا۔

''تو کیا عرفان کو ناہید کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں......!'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''میں ابھی اور اسی وقت آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔''

اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے میں نے سوال کیا۔ ''عرفان اس وقت کہاں ہے؟''

وہ متعلقہ تھانے کا نام بتانے کے بعد بولی۔ ''مجھے یقین ہے، عرفان نے ناہید کو قتل نہیں کیا۔ پولیس کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''عرفان کو کب اور کہاں سے گرفتار کیا گیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''آج رات آٹھ بجے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''شیخ اسپتال میں اس کی گرفتاری عمل میں آئی ہے۔''

''کیا گرفتاری کے بعد آپ کی عرفان سے ملاقات ہوئی ہے؟''

''جی ہاں، میں ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی اس سے مل کر آئی ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''تھانے سے نکلنے کے بعد میں سب سے پہلے آپ ہی کو فون کر رہی ہوں۔''

''عرفان اس واقعے کے بارے میں کیا کہتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس نے اپنی قطعی لاعلمی ظاہر کی ہے۔''

''پولیس کا موقف کیا ہے؟''

''میں نے تھانا انچارج سے بات کی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''اس نے کھل کر مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ بس اتنا بتایا ہے کہ ڈاکٹر ناہید کی لاش دریافت ہونے کے بعد جب پولیس نے اس سلسلے میں تفتیش کا آغاز کیا تو جلد ہی انہیں پتا چل گیا کہ عرفان نامی ایک ڈاکٹر اکثر و بیشتر ناہید سے ملنے اس کے فلیٹ پر آیا کرتا تھا۔ پولیس نے بڑی سرگرمی سے تلاش کرتے ہوئے اس بات کا سراغ لگالیا کہ مذکورہ ڈاکٹر عرفان ''شیخ اسپتال'' کا مالک ہے لہٰذا انہوں نے اسپتال پہنچ کر عرفان کو گرفتار کرلیا......!''

میں نے پوچھا۔ ''اس کے علاوہ تھانا انچارج نے اور کچھ بتایا؟''

''نہیں بیگ صاحب!'' وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔ ''میں نے بہت پوچھنے کی کوشش کی۔ تھانا انچارج کا ایک ہی جواب تھا...... باقی کی باتیں عدالت میں ہوں گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے ہما کی بپتا سننے کے بعد کہا۔ ''آپ زیادہ پریشان نہ ہوں۔ میرے اندازے کے مطابق پولیس کل صبح عرفان کو عدالت میں پیش کر کے اس کا ریمانڈ لینے کی کوشش کرے گی۔ آپ بھی عدالت آجائیں۔ میں آپ کو وہیں مل جاؤں گا۔''

''کیا آپ اس وقت مجھ سے نہیں مل سکتے بیگ صاحب؟'' اس کی توقع سے لبریز آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

میں نے جواب دینے سے پہلے نگاہ اٹھا کر دیوار گیر کلاک کی جانب دیکھا اور کہا۔ ''مسز عرفان! اس وقت رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ میرا خیال ہے، آدھی رات کو ہماری ملاقات بے سود ہی ثابت ہوگی۔ عرفان، پولیس کی کسٹڈی میں ہے۔ وہ اسے کل صبح ہی عدالت میں پیش کرے گی۔ آپ کے پاس جو معلومات تھیں وہ آپ مجھے فراہم کر چکی ہیں......''

''میں چاہتی ہوں، عرفان کا کیس آپ فوراً ہاتھ میں لے لیں۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''مجھے صد فیصد یقین ہے کہ وہ بے گناہ ہے۔ عرفان کو کسی گہری سازش کے تحت پولیس اس کیس میں پھنسانے کی کوشش کر رہی ہے۔''

''اگر آپ کا کہا یہ سب درست بھی ہے تو بھی اس وقت تھانے جانے سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''آپ اس بات کی تسلی رکھیں کہ یہ کیس میں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ آپ فیس تو مجھے ایڈوانس میں ادا کر ہی چکی ہیں۔ کل صبح عدالت کا وقت شروع ہونے سے پہلے میں ڈاکٹر عرفان سے وکالت نامہ وغیرہ بھی سائن کرالوں گا۔''

''بیگ صاحب! اگر اس وقت تھانے جانے سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا تو ممکن ہے کوئی عام فائدہ ہی حاصل ہوجائے۔'' وہ ملتجیانہ انداز میں بولی۔ ''بیگ صاحب...... پلیز!''

جب مصیبت میں گھری ہوئی خواتین اس انداز میں ''پلیز'' کہتی ہیں تو انکار کرنا میرے بس میں نہیں رہتا۔ میں نے ہما کے اطمینان کی خاطر اپنا آرام قربان کرنے کا فیصلہ کرلیا اور فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے مسز عرفان! میں آدھے گھنٹے کے بعد آپ کو متعلقہ تھانے کے باہر ملوں گا۔ آپ بھی وہیں پہنچ جائیں۔''

''میں اس وقت آپ کی رہائش کے بہت قریب سے آپ کو فون کر رہی ہوں۔'' اس نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ ''تھانے سے نکلنے کے بعد میں ڈرائیو کرتے ہوئے آپ کے علاقے کی طرف آگئی تھی تاکہ آپ کو پک کر کے اپنے ساتھ لے جاؤں۔''

''اوہ......!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔

''میں براہ راست بھی آپ کی ڈوربیل بجاسکتی تھی۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''فون اس لیے کیا کہ پتا چلا سکوں، آپ گھر میں موجود بھی ہیں یا نہیں۔''

''مسز عرفان!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ مجھے دس سے پندرہ منٹ دے دیں، پھر میں آپ کے ساتھ تھانے جانے کے لیے تیار ملوں گا۔''

''او۔کے بیگ صاحب!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''ٹھیک بیس منٹ کے بعد میں آپ کے بنگلے کے سامنے اپنی گاڑی میں آپ کی منتظر ملوں گی۔''

''آپ نے میری رہائش گاہ دیکھ رکھی ہے؟'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''لوکیشن کا اندازہ ہے۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ''دس، پندرہ منٹ میں یقیناً ڈھونڈ لوں گی۔''

''او۔کے......!'' میں نے مختصراً کہا۔

''تھینک یو بیگ صاحب!'' اس کی ممنونیت بھری آواز سنائی دی۔

میں نے ''خدا حافظ'' کہہ کر ریسیور کریڈل کر دیا۔

اس رات میں نے تھانے جا کر ڈاکٹر عرفان سے ایک بھرپور ملاقات کی۔ پولیس کسٹڈی میں کسی ملزم خصوصاً قتل کے ملزم سے ملاقات کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے مجھے مختلف ہتھکنڈے استعمال کرنا پڑتے ہیں جن کا ذکر میں پہلے کئی بار تفصیلاً کر چکا ہوں لہٰذا مختصراً یہی سمجھ لیں کہ میں نے اپنے آزمودہ کار طریقوں پر عمل کر کے ڈاکٹر عرفان سے ملاقات کرلی۔

یہ ملاقات خاصی سنسنی خیز ثابت ہوئی۔ عرفان کی زبانی جو معلومات مجھے حاصل ہوئیں وہ انتہائی دلچسپ اور سبق آموز تھیں۔ ان کی تفصیل عدالتی کارروائی کے دوران میں گاہے بہ گاہے آپ کے سامنے کھلتی رہے گی...... بس، اتنا بتاتا چلوں کہ ڈاکٹر عرفان نے لگ بھگ چار ماہ پہلے ڈاکٹر ناہید سے شادی کرلی تھی۔

میں نے درخواست ضمانت اور وکالت نامے پر ڈاکٹر عرفان کے دستخط لیے۔ اسے ضروری ہدایات دیں اور تھانے سے باہر نکل آیا۔

میں چونکہ ہما کی گاڑی میں بیٹھ کر اپنے گھر سے تھانے پہنچا تھا لہٰذا واپسی میں اسی نے مجھے ڈراپ بھی کرنا تھا۔ ہم تھانے سے روانہ ہوئے تو اس نے مجھ سے پوچھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"بیگ صاحب! عرفان سے آپ کی ملاقات کیسی رہی؟"

اس کے لہجے سے گہری تشویش جھلکتی تھی۔ تھانا انچارج نے صرف مجھے حوالات میں جاکر ڈاکٹر عرفان سے ملنے کی اجازت دی تھی۔ اس دوران میں ہمابر آمدے میں بچھی ایک چوبی بینچ پر بیٹھی رہی تھی لہٰذا وہ نہیں جانتی تھی کہ میرے اور عرفان کے بیچ کس نوعیت کی گفتگو ہوئی تھی۔

میں نے کھنکار کا گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کے لیے دو خوشخبریاں ہیں مسز عرفان......!"

"کون سی خوشخبریاں بیگ صاحب؟" اس نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے چونک کر پوچھا۔

"خوشخبری نمبر ایک......!" میں نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "آپ ڈاکٹر عرفان کو جس چڑیل کے چنگل سے آزاد کرانے کی تگ ودو میں میرے پاس پہنچی تھیں وہ ہمیشہ کے لیے یہ دنیا چھوڑ کر دوسری دنیا میں جاچکی ہے۔ میرا اشارہ ڈاکٹر ناہید کی جانب ہے......!"

"میں آپ کا اشارہ بہ خوبی سمجھ رہی ہوں بیگ صاحب!" وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔ "لیکن وہ چڑیل تو مرنے کے بعد بھی عرفان کی ذات سے چپٹی ہوئی ہے۔ عرفان کو پولیس نے اسی کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا ہے۔"

"دوسری خوش خبری اسی حوالے سے ہے۔" میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "عرفان نے مجھے جو معلومات فراہم کی ہیں ان کی روشنی میں، میں بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ عرفان بے گناہ ہے۔ اس نے ڈاکٹر ناہید کو قتل نہیں کیا۔"

"آپ کا وثوق اس امر کا مظہر ہے کہ آپ عرفان کی باعزت رہائی کے لیے سر توڑ کوشش کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوچکے ہیں......؟" وہ ٹھوس مگر سوالیہ انداز میں بولی۔

"بالکل!" میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "میں نے عرفان سے وکالت نامہ اور درخواست ضمانت سائن کروائی ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ میں اس کا کیس جی جان سے لڑوں گا۔"

"شکریہ بیگ صاحب!" وہ تشکر آمیز لہجے میں بولی۔

"اس کے ساتھ ہی ایک ایسی خبر بھی ہے جس سے آپ کو جذباتی صدمہ پہنچ سکتا ہے۔" میں نے محتاط انداز میں کہا۔

"کیا مطلب؟" اس کے استفسار سے تشویش جھلکتی تھی۔

"چار ماہ پہلے عرفان نے ناہید سے شادی کرلی تھی۔" میں نے انکشاف انگیز انداز میں کہا۔

"کک......کیا......؟" اس کے حلق سے حیرت بھری آواز خارج ہوئی۔

"ہاں......یہ حقیقت ہے۔" میں نے تصدیقی انداز میں کہا۔

عرفان اور ناہید کی شادی کی خبر سے ہما کو ذہنی دھچکا لگا تھا۔ چند لمحات کے لیے وہ سن سی ہوکر رہ گئی تھی۔ اسٹیئرنگ پر ایک لمحے کے لیے اس کے ہاتھ بھی بوکھلاہٹ کا شکار ہوئے تھے تاہم جلد ہی وہ خود کو سنبھالنے میں کامیاب ہوگئی تھی اور اس کامیابی میں سب سے بڑا ہاتھ اس اطمینان کا تھا کہ اس کی حریف ڈاکٹر ناہید اب اس دنیا میں باقی نہیں رہی تھی۔ اگر وہ چار ماہ پہلے اس کی سوتن بن بھی گئی تھی تو اس کی موت نے یہ کانٹا بھی نکال دیا تھا۔

"کیا شادی والی بات آپ کو خود عرفان نے بتائی ہے؟" اس نے میرے گھر کی سمت ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔

"ظاہر ہے، اور مجھے کیسے پتا چل سکتا تھا۔" میں نے سرسری انداز میں جواب دیا۔

"لیکن تھوڑی دیر پہلے جب میں عرفان سے مل کر گئی تھی تو اس نے مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔" وہ الجھن زدہ انداز میں بولی۔

"اس کا سبب ندامت کا شدید ترین بوجھ ہوسکتا ہے۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "عرفان یک بہ یک ضمیر کے بوجھ تلے دب کر رہ گیا ہے اسی لیے وہ آپ کے سامنے اپنے جرم کا اقرار نہ کرسکا......"

"دوسری شادی کی تفصیلات کیا ہیں بیگ صاحب؟" ذہنی پریشانی میں گھرے ہونے کے باوجود بھی وہ بیویوں والی مخصوص نفسیات سے مجبور ہوکر یہ سوال کیے بنا نہ رہ سکی۔

میں نے کہا۔ "مسز عرفان! آپ عرفان اور ناہید کی انڈر اسٹینڈنگ سے تو اچھی طرح واقف ہی ہیں۔ بس اس بات کی آپ کو خبر نہیں تھی کہ ان لوگوں نے باقاعدہ شادی کرلی ہے یا ماضی کی دوستی کو بغیر نکاح ہی کے نبھائے چلے جارہے ہیں۔"

"جی ہاں، صورتِ حال میرے نزدیک تو کچھ اسی قسم کی تھی۔" وہ تائیدی انداز میں بولی۔ "یہ انکشاف تو آپ کی زبانی مجھ تک پہنچا ہے کہ وہ پچھلے چار ماہ سے میاں بیوی کی حیثیت اختیار کرچکے تھے۔"

"عرفان کی زبانی جو حالات میرے علم میں آئے ہیں ان کے مطابق ڈاکٹر ناہید نے پوری طرح عرفان کے دل ودماغ کو اپنے قبضے میں کر رکھا تھا۔ عرفان اس کے سامنے خود کو بے بس محسوس کرنے لگتا تھا۔ ان دنوں ناہید جس فیز میں رہ رہی تھی وہ بھی ڈاکٹر عرفان ہی نے اسے اس کے نام سے لے کر دیا تھا......"

"اوہ مائی گاڈ......" اس کی سرسراتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ "معاملات اس نہج تک جاپہنچے تھے اور مجھے کوئی خبر ہی نہیں تھی......؟"

"اس کا بھی ایک خاص سبب ہے؟" میں نے کہا۔ "ابتدا میں آپ نے عرفان پر اندھا اعتماد کیا تھا۔ آپ کے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ عرفان آپ سے اس نوعیت کی بے وفائی کا مرتکب ہوسکتا ہے۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں بیگ صاحب۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "میرا تو کبھی اس طرف دھیان بھی نہیں گیا تھا......"

"اور جب ان معاملات کی طرف دھیان گیا تو بہت دیر ہوچکی تھی۔" میں نے ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "جب تک ڈاکٹر ناہید کا جادو ڈاکٹر عرفان کو اپنے شکنجے میں پوری طرح کس چکا تھا۔"

"ہوں......!" اس نے گمبھیر انداز میں کہا۔

"آپ نے اپنے جاسوس طفیل کی مدد سے عرفان کی چوری پکڑلی۔" میں نے سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "عرفان بوکھلا کر رہ گیا۔ فوری طور پر اس کی سمجھ میں یہی آیا کہ وہ اپنے جرم کا اقرار کرکے آپ کا ہر مطالبہ مان لے۔"

"ہاں واقعی بیگ صاحب......" وہ چونکتے ہوئے انداز میں حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔ "اس نے نہ صرف شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے مجھ سے اپنے کیے کی معافی مانگی تھی بلکہ میری خواہش پر فوراً ناہید کو اپنے اسپتال سے نکال بھی دیا تھا لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ......!"

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہوگئی۔

میں نے کہا۔ "جو کچھ ہوچکا وہ آپ کے سامنے ہے۔ آپ کو اس موقع پر عقل مندی اور بردباری کا ثبوت دینا ہے۔"

"مثلاً......؟" وہ میرے علاقے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔

"مثلاً یہ کہ عرفان اس وقت بری طرح ٹوٹا ہوا ہے۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "اس کو آپ کی جانب سے مورل سپوٹ کی اشد ضرورت ہے۔ آپ اس موقع پر اس کی غلطیاں اور کوتاہیاں گنوانے نہیں بیٹھ جائیں گی۔ ایک تو اس کی بیوی قتل ہوئی، دوسرے اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں اسی کو دھر لیا گیا ہے۔"

"ٹھیک ہے بیگ صاحب!" وہ سمجھ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔ "میں آپ کی ہدایت پر ضرور عمل کروں گی۔ میرے لیے سب سے زیادہ اطمینان بخش بات یہ ہے کہ ڈاکٹر ناہید ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میرے راستے سے ہٹ گئی ہے۔ میں عرفان کی واپسی سے بہت خوش ہوں لیکن وہ بیٹھے بٹھائے جس چکر میں پھنس گیا ہے نا......!"

"آپ اس چکر کی ذرا پروانہ کریں مسز عرفان!" میں نے حوصلہ بخش انداز میں کہا۔ "آپ کے شوہر کو اس چکر سے نکالنے کے لیے میں اپنی بہترین پیشہ وارانہ صلاحیتیں صرف کردوں گا۔"

"اللہ آپ کی زبان مبارک کرے بیگ صاحب!" وہ دعائیہ انداز میں بولی اور میرے گھر کے سامنے گاڑی روک دی۔

"انشاءاللہ! ایسا ہی ہوگا۔" میں نے بڑے وثوق سے کہا پھر پوچھا۔ "آپ کو اس وقت گھر جاتے ہوئے کوئی پرابلم تو نہیں ہوگی؟"

"نو پرابلم بیگ صاحب۔" وہ جلدی سے بولی۔

"اگر آپ کہیں تو میں چھوڑ آتا ہوں......؟"

"اس کی ضرورت نہیں ہے، میں بڑے آرام سے چلی جاؤں گی۔" اس نے پُراعتماد انداز میں کہا۔ "میں پہلے ہی آپ کو بہت زحمت دے چکی ہوں۔"

میں نے اس سے زیادہ جرح بحث مناسب نہیں جانی اور "خدا حافظ" کہہ کر اپنے گھر میں داخل ہوگیا۔

☆☆☆

آئندہ روز پولیس نے میرے مؤکل اور اس کیس کے ملزم ڈاکٹر عرفان کو عدالت میں پیش کرکے اس کا جسمانی ریمانڈ لینے کی درخواست کی۔

میں نے اس موقع پر اپنے وکالت نامے کے علاوہ ملزم کی درخواست ضمانت بھی عدالت میں دائر کردی۔ وکیل استغاثہ نے ملزم کی ضمانت رکوانے کے لیے بڑے بھرپور دلائل دیے۔ میرے دلائل بھی خاصے وزنی تھے۔ جج نے بڑی توجہ سے دونوں جانب کی باتیں سنیں اور ایک گھنٹے کی سماعت کے بعد ملزم کی درخواست ضمانت کو رد کرتے ہوئے ڈاکٹر عرفان کو سات دن کے ریمانڈ پر پولیس کسٹڈی میں دے دیا۔

جج کا فیصلہ میرے لیے حیرت کا موجب نہیں تھا۔ قتل کے ملزم کی ضمانت ناممکن کی حد تک مشکل ہوتی ہے۔ استغاثہ کی جانب سے چند ایسے پوائنٹ عدالت کے سامنے رکھ

WWW.PAKSOCIETY.COM

دیے گئے تھے جن کو نظر انداز کرتے ہوئے عدالت ملزم کو ضمانت پر رہا نہیں کر سکتی تھی۔

میں بہ خوبی جانتا تھا کہ ان اہم "پوائنٹس" کا توڑ کس طرح کرنا ہے لیکن سردست اس بحث کو چھیڑنا ممکن نہیں تھا۔ جب عدالت کی باقاعدہ کارروائی شروع ہو جاتی تو مناسب مواقع پر ان معاملات کو اجاگر کیا جا سکتا تھا۔

ہما خاصی پریشان نظر آ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "مسز عرفان! آپ ابتدائی مرحلے پر ہی اتنی مایوس ہو گئی ہیں تو آگے چل کر کیا ہوگا......؟"

"میں مایوس نہیں ہوں بیگ صاحب!" وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے، بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "بس، یوں محسوس ہو رہا ہے کہ میں یک بیک اکیلی ہو گئی ہوں۔"

"ایسا ہوتا ہے۔" میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ "لگتا ہے، عدالتی معاملات سے آپ کا پہلی مرتبہ واسطہ پڑا ہے؟"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، باقاعدہ واسطہ پہلی مرتبہ ہی پڑا ہے۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "ابو کو پراپرٹی کے معاملات کی غرض سے اکثر عدالت وغیرہ میں آنا پڑتا تھا لیکن انہوں نے کبھی مجھے ان چکروں میں نہیں الجھنے دیا تھا۔"

"تو پھر آپ مجھ پر مکمل بھروسا رکھیں۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میں آپ کو کسی الجھن میں نہیں پڑنے دوں گا اور عرفان کو اس کیس سے اس طرح نکال لوں گا جیسے مکھن میں سے بال کو کھینچ کر نکالا جاتا ہے......"

"آپ پر تو پورا بھروسا ہے بیگ صاحب۔" اس نے کہا۔

"بس، تو مطمئن ہو جائیں۔" میں نے کہا۔ "عدالتی معاملات کو مکمل طور پر مجھ پر چھوڑ دیں۔ آپ اپنے بچوں پر توجہ دیں۔"

"یہ آپ نے خوب کہا۔" وہ چونکے ہوئے لہجے میں بولی۔ "میں کل سے انہیں نظر انداز کیے ہوئے ہوں۔"

"یہ افتاد ہی ایسی تھی۔ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں۔" میں نے کہا۔ "اسپتال کے معاملات کو کون دیکھ رہا ہے؟"

"ایڈمنسٹریٹر صاحب نے سب کچھ سنبھال رکھا ہے۔" وہ پُراعتماد انداز میں بولی۔ "اسپتال کا ایک سسٹم بنا ہوا ہے۔ اس طرف سے مجھے کوئی فکر نہیں۔"

"یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ہمارے بیچ ڈاکٹر عرفان کے کیس کے حوالے سے مزید پانچ چھ منٹ تک بات ہوتی رہی پھر میں اس سے رخصت ہو کر دوسری عدالت کی جانب بڑھ گیا۔

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے عدالت میں چالان پیش کر دیا۔ پولیس نے ملزم کو سخت سزا دلوانے کے لیے خاصا مضبوط چالان تیار کرنے کی کوشش کی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ چالان کی اس بظاہر مضبوط نظر آنے والی دیوار میں کس کس مقام پر شگاف موجود ہیں۔ مجھے انہی شگاف کو اپنے دلائل سے وسعت دے کر بڑا کرنا تھا کہ اس راستے سے بہ آسانی اپنے موکل کو نکال لانے میں کامیاب رہوں اور مجھے سو فیصد یقین تھا کہ میں ایسا کر کے دکھاؤں گا۔

اس پیشی اور آنے والی مزید دو پیشیوں پر کوئی قابلِ ذکر کارروائی عمل میں نہ آ سکی۔ یہ تینوں پیشیاں مختلف نوعیت کی عدالتی تیکنیکی کارروائیوں کی نذر ہو گئیں جن کی تفصیل میں جانا آپ کو بور کرنے کے مترادف ہوگا۔ یوں سمجھ لیں کہ لگ بھگ چار ماہ کے بعد اس کیس کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا۔ آگے بڑھنے سے قبل میں پوسٹ مارٹم رپورٹ کا ذکر ضرور کروں گا۔

اس رپورٹ کے مطابق، ڈاکٹر ناہید کی موت اٹھائیس مارچ کی رات گیارہ، بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ اسے گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اسے موت کے منہ میں دھکیلنے سے قبل جنسی تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس رپورٹ کا سب سے انکشاف انگیز پہلو یہ بھی تھا کہ اپنی موت کے وقت ڈاکٹر ناہید اُمید سے تھی۔ اس کے علاوہ اس رپورٹ کے ساتھ منسلک کیمیکل ایگزامنر کی رپورٹ سے پتا چلتا تھا کہ مقتول ڈاکٹر کے معدے سے خواب آور دوا کے آثار بھی ملے تھے۔ گویا پہلے مقتول کو کوئی نشہ آور شے کھلا کر بے ہوش یا نیم بے ہوش کیا گیا تھا پھر اسے زیادتی کا نشانہ بنایا گیا اور آخر میں اس کا گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا۔ جج نے فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم نے صحتِ جرم سے صاف انکار کر دیا۔ اس کے بعد گواہوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ استغاثہ کی جانب سے کل آٹھ گواہوں کی فہرست دائر کی گئی تھی لیکن میں یہاں نہایت ہی اہم گواہوں اور ان پر ہونے والی جرح کا ذکر کروں گا۔

جیسا کہ پچھلے صفحات میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ مقتولہ ڈاکٹر ناہید، شیخ اسپتال سے بے دخل کیے جانے کے بعد

WWW.PAKSOCIETY.COM

چورنگی پر واقع ایک پرائیویٹ اسپتال سے منسلک ہوگئی تھی اور اس نے پاپوش نگر والی رہائش بھی چھوڑ دی تھی۔ اپنی موت کے وقت وہ گلشن اقبال میں واقع ایک لگژری اپارٹمنٹ بلڈنگ میں رہائش پذیر تھی۔

عام گواہوں میں سب سے پہلے اپارٹمنٹ بلڈنگ کے چوکیدار زمان خان کو پیش کیا گیا۔ زمان خان کی عمر تیس اور چالیس سال کے درمیان رہی ہوگی۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا پھر وکیل استغاثہ اس کے قریب چلا گیا۔ اس نے اپنی جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

”زمان خان! کیا تم اس شخص کو جانتے ہو؟“ سوال کے اختتام پر اس نے ڈاکٹر عرفان کی جانب اشارہ کردیا۔

”جی بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔“ گواہ نے جواب دیا۔

”اس ”اچھی طرح“ کی وضاحت کرو۔“ وکیل استغاثہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

گواہ نے تھوک نگل کر گلا تر کیا پھر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”جناب! میں ڈائمنڈ اپارٹمنٹس کا چوکیدار ہوں لہٰذا مکینوں کے ساتھ ہی میں ان سے ملنے کے لیے آنے والے افراد پر بھی گہری نظر رکھتا ہوں۔“

”تو تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ملزم اکثر و بیشتر مقتول سے ملنے اس کے فلیٹ پر آیا کرتا تھا؟“

”جی...... جی ہاں......“ گواہ نے اثبات میں گردن ہلائی۔

وکیل استغاثہ نے دو چار ضمنی سوالات کے بعد جرح موقوف کردی۔

اپنی باری پر میں وٹنس باکس کے قریب چلا گیا پھر استغاثہ کے گواہ زمان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

”خان صاحب! کیا آپ کو معلوم ہے کہ مرنے کے بعد انسان کہاں جاتا ہے؟“

وہ میرے اس عجیب و غریب سوال پر ٹپٹا کر رہ گیا پھر اضطراری انداز میں جواب دیا۔ ”ظاہر ہے...... قبر میں جاتا ہے۔“

”ویری گڈ!“ میں نے تعریفی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”آپ کا جواب صد فیصد درست ہے خان صاحب۔“

وہ میرے الفاظ پر الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے اپنی جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اور یقیناً آپ کو یہ بھی پتا ہوگا کہ ہر انسان کو اپنی ہی قبر میں جانا ہے؟“

”جی...... جی بالکل......!“ اس نے جواب دیا۔

”تو پھر آپ کسی اور کی قبر میں گھسنے کی کوشش کیوں کررہے ہیں؟“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”ک ک کیا مطلب جناب......؟“ وہ بکھری ہوئی آواز میں بولا۔

”آبجیکشن یور آنر۔“ وکیل استغاثہ نے احتجاجی انداز میں کہا۔ ”میرے فاضل دوست بے تکے سوالات سے استغاثہ کے معزز گواہ کو ہراساں کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔“

جج نے گہری سنجیدگی سے استفسار کیا۔ ”بیگ صاحب! آپ کے اس سوال کی کوئی اہمیت ہے؟“

”یس سر!“ میں نے سر کو تعظیمی انداز میں جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ”اگر وکیل استغاثہ چند لمحات کے لیے صبر و تحمل کا مظاہرہ کریں تو میں اس اہمیت کی وضاحت کردوں گا۔“

”بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ۔“ جج نے مجھے جرح جاری رکھنے کی اجازت مرحمت فرمادی۔

میں دوبارہ گواہ کی جانب متوجہ ہوگیا۔ ”زمان خان! کیا ملزم سے آپ کی کسی قسم کی کوئی دشمنی ہے؟“

”ن ن...... نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”بالکل نہیں۔“

”پھر آپ اسے اس کیس میں پھنسانے کی کوشش کیوں کررہے ہیں؟“

”جی......“ اس کی الجھن میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ ”میں نے تو ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔“

”آپ نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں تھوڑی دیر پہلے معزز عدالت کو بتایا ہے کہ آپ ڈائمنڈ اپارٹمنٹس کے مکینوں کو اچھی طرح جانتے ہیں اور ان کے ملاقاتیوں پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں......؟“

”تو......؟“ اس نے سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھا۔

”تو...... یہ کہ آپ نے اس سلسلے میں کھلا جھوٹ بولا ہے۔“ میں نے رفتہ رفتہ اسے اپنے دام میں لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”نہ تو آپ مقتول ڈاکٹر ناہید کو اچھی طرح جانتے ہیں اور نہ ہی اس کے ملاقاتیوں پر آپ کی گہری نظر تھی......“ ایک لمحے کا توقف کرکے میں نے گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”اگر تم نے اپنے بیان کے مطابق اس ذمے داری کا ثبوت دیا ہوتا تو پھر یہ اندوہناک واقعہ پیش ہی نہ آتا......“

”میں سمجھا نہیں جناب۔“ وہ بے بسی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں نے تو کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ آپ یہ کس قسم کی باتیں کررہے ہیں......“

”یہ کس قسم کی باتیں ہیں۔ میں ابھی بتاتا ہوں۔“

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا پھر گواہ سے پوچھا۔ ”تم مقتول کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“

”وہ ایک اسپتال میں لیڈی ڈاکٹر تھیں۔“ اس نے بتایا۔ ”اور نیپا چورنگی کے قریب ایک اسپتال میں ان کی ڈیوٹی تھی۔“

”اور ملزم کے بارے میں تمہاری کیا معلومات ہیں؟“

”یہ اکثر ڈاکٹر صاحبہ سے ملنے آتا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اور کئی گھنٹے اس کے فلیٹ پر گزار کر جاتا تھا۔“

”اس کے علاوہ تم ملزم کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“

”کچھ نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلادی۔

”تمہارا بیان ہے کہ ملزم اکثر، مقتول سے ملنے اس کے فلیٹ پر آیا کرتا تھا اور کئی گھنٹے وہاں گزار کر واپس جاتا تھا۔“ میں نے جرح کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم بتا سکتے ہو کہ ملزم کس حیثیت سے مقتول ڈاکٹر سے ملنے آیا کرتا تھا؟“

”حیثیت...... یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں جناب۔“

”تم ایسے بتا سکتے ہو کہ......“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ”کہ تھوڑی دیر پہلے تم نے معزز عدالت کے سامنے دعویٰ کیا ہے کہ تم اس بلڈنگ کے مکینوں کو اچھی طرح جانتے ہو اور ان کے ملاقاتیوں پر گہری نظر رکھتے ہو۔“

میں ایک مخصوص انداز میں اسے اپنے گھیرے میں لارہا تھا۔ اس نے ایک ایسا سوال کیا کہ پوری طرح میرے چنگل میں پھنس گیا۔ ”جناب! میں بلڈنگ میں آنے والے ملاقاتیوں کا شناختی کارڈ چیک نہیں کرتا اور نہ ہی ان سے اس سلسلے میں پوچھ گچھ کرتا ہوں کہ ان کا مکین کے ساتھ کیا رشتہ ہے۔“

”تو گویا تم معزز عدالت کو یہ بتانا چاہتے ہو کہ تمہیں اس بات کی کوئی خبر نہیں کہ مقتول ڈاکٹر اور ملزم کے بیچ تعلقات کی نوعیت کیا تھی...... مطلب، ان کے بیچ کیا رشتہ تھا؟“

”جناب عالی! مجھے سخت اعتراض ہے۔“ وکیل استغاثہ ایک بار پھر بیچ میں کود پڑا۔ ”استغاثہ کی تفصیلی رپورٹ اور پولیس کے پیش کردہ چالان میں یہ ساری باتیں درج ہیں۔ مقتول کسی زمانے میں ملزم کے اسپتال میں جاب کرتی تھی۔ ان دونوں کے درمیان گہری وابستگی پیدا ہوگئی تھی۔ ملزم کی بیوی کے دباؤ پر ملزم نے مقتول کو اپنے اسپتال سے فارغ کردیا تھا تاہم وہ تعلقات نبھانے اس کے گلشن اقبال والے فلیٹ پر بھی آتا رہا۔ ملزم کی بیوی ہما نے اپنے بیان میں ان تمام باتوں کی تائید اور تصدیق کی ہے۔“ وہ لمحے بھر کے لیے سانس ہموار کرنے کو رکا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”ظاہر ہے، ملزم اپنے دیرینہ تعلقات نبھانے کے لیے مقتول کے فلیٹ پر آیا کرتا تھا۔ ان تعلقات کی نوعیت بھی پوسٹ مارٹم رپورٹ سے عیاں ہے۔ ان کے جسمانی تعلقات نے جو گل کھلایا تھا وہ اس رپورٹ میں درج ہے۔ ظاہر ہے، اس کے بعد مقتول نے شادی کے لیے ضد کی ہوگی اور ڈاکٹر اس کے لیے تیار نہیں ہوا ہوگا لہٰذا وہی ہوا جو اس طرح کے کاموں میں ہوا کرتا ہے۔“

”گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ......“ میں نے براہ راست وکیل استغاثہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ملزم نے مقتول سے جان چھڑانے اور اپنے گناہ کو چھپانے کے لیے پہلے خواب آور گولیاں کھلا کر مقتول کو بے ہوش کیا، پھر اسے جنسی تشدد سے گزارنے کے بعد موت کے گھاٹ اتار دیا؟“

”جی ہاں...... کرائم سین اسی جانب اشارہ کرتا ہے۔“

”اوکے۔“ میں نے معتدل انداز میں پوچھا۔ ”آپ کے پاس اپنے اس دعوے کا کوئی ثبوت ہے؟“

”پوسٹ مارٹم رپورٹ میں یہ ساری باتیں لکھی ہوئی ہیں۔“ وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔ ”اور کیمیکل ایگزامنر کی رپورٹ بھی یہی کہانی سنا رہی ہے۔“

”یہ سب میں بھی جانتا ہوں۔“ میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”میں نے آپ سے اس امر کا ثبوت مانگا ہے جس سے یہ بات پایۂ یقین کو پہنچ جائے کہ یہ سب کچھ میرے مؤکل اور اس کیس کے ملزم نے کیا ہے۔“

وہ چند لمحات تک ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”تو کیا آپ کے پاس ایسا کوئی ٹھوس ثبوت ہے جس سے ثابت ہوجائے کہ یہ سب ملزم نے نہیں کیا اور وہ بے گناہ ہے؟“

”جی ہاں...... میرے پاس ٹھوس ثبوت موجود ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

عدالت میں ایک دم سناٹا چھا گیا۔ جج نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”بیگ صاحب! آپ وہ ثبوت پیش کریں جو آپ کے مؤکل کی بے گناہی کو ثابت کرتا ہے۔“

”جناب عالی!“ میں نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ”میں وہ ٹھوس ثبوت عدالت کی خدمت میں ضرور پیش کروں گا لیکن اس سے پہلے چند بنیادی باتیں واضح ہوجانا ضروری ہیں اور اس سلسلے میں، میں سب سے پہلے استغاثہ کے گواہ زمان خان پر اپنی جرح مکمل کرنا چاہتا ہوں۔“

جج نے اثبات میں گردن ہلا کر مجھے اجازت دے

WWW.PAKSOCIETY.COM

دی۔ میں دوبارہ گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”زمان خان! کیا تم معزز عدالت کو بتا سکتے ہو کہ ملزم کے علاوہ مقتول ڈاکٹر کے ملاقاتیوں میں اور کون کون شامل تھا؟“

”آں...... کوئی نہیں۔“ اس نے ذرا اٹک کر جواب دیا۔

”کمال ہے......“ میں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ صرف ملزم ہی مقتول سے ملنے اس کے فلیٹ پر آیا کرتا تھا؟“

”جی...... میرا یہی مطلب ہے۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

”اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم گڑبڑ کر رہے ہو۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”کیسی گڑبڑ جناب......؟“ وہ جزبز ہو کر بولا۔

”یا تو تم سراسر جھوٹ بول رہے ہو یا پھر اپنی ڈیوٹی سے غفلت کے مرتکب ہو رہے ہو۔“

”کیا مطلب جناب؟“ وہ روہانسی آواز میں بولا۔

”آپ مجھ پر ہی الزام لگائے جا رہے ہیں۔“

”میں الزام نہیں لگا رہا بلکہ حقیقت بیان کر رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ استغاثہ کا گواہ زمان خان غلط بیانی سے کام لے رہا ہے۔“ وکیل استغاثہ اپنے گواہ کی حمایت میں بولا۔ ”آپ کے مطابق، ملزم کے علاوہ کوئی اور بھی مقتول سے ملنے اس کے فلیٹ پر آیا کرتا تھا اور...... زمان خان کی اس پر نظر نہیں پڑی؟“

”تھینک یو میرے فاضل دوست!“ میں نے وکیل استغاثہ کی جانب فاتحانہ نظر سے دیکھا۔ ”آپ نے تو میرے منہ کے الفاظ چھین کر میرا کام آسان کر دیا ہے...... بس! میں یہی کہنا چاہ رہا تھا۔“

وہ ٹپٹا کر رہ گیا۔ میری اس کاری ضرب نے اسے کافی تکلیف پہنچائی تھی۔ پھنکار سے مشابہ لہجے میں اس نے کہا۔

”تو پھر آپ ہی بتا دیں کہ وہ کون شخص ہے؟“

میں خاموشی سے اپنی فائلوں کی جانب بڑھ گیا۔ پھر ایک فائل میں سے پوسٹ کارڈ سائز کی ایک تصویر نکال کر دوبارہ وٹنس باکس کی طرف چلا گیا۔ یہ تصویر میں نے پاپوش نگر والے اہم سروے میں حاصل کی تھی۔ اس سلسلے میں ملزم کی بیوی ہما نے مجھ سے بھرپور تعاون کیا تھا۔ میں نے اس کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں دو چکر پاپوش نگر کے لگائے تھے جن سے کافی کارآمد معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ یہ تصویر بھی انہی میں سے ایک تھی۔

میں نے مذکورہ فوٹو استغاثہ کے گواہ زمان خان کو دکھاتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا تم اس شخص کو پہچانتے ہو؟“

چند لمحے غور کرنے کے بعد اس نے کہا۔ ”چہرہ کچھ دیکھا بھالا تو لگ رہا ہے لیکن مجھے یاد نہیں آ رہا کہ میں نے اسے کہاں دیکھا ہے......“

”میں یاد دلاتا ہوں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اس شخص کا نام صفدر عباسی ہے۔ یہ پاپوش نگر کا رہنے والا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وقوعہ کی رات یہ شخص مقتول ڈاکٹر ہما سے ملنے اس کے فلیٹ پر آیا تھا۔“

”ہو سکتا ہے...... آیا ہو...... مگر میرے ذہن میں نہیں ہے۔“ گواہ نے بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

میں نے مذکورہ فوٹو جج کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ”جناب عالی! اگرچہ استغاثہ کے گواہ نے اس شخص صفدر عباسی کو وثوق سے نہیں پہچانا لیکن اس نے اس خیال کا اظہار ضرور کیا ہے کہ یہ چہرہ اس کا دیکھا ہوا ہے لہٰذا میں معزز عدالت سے استدعا کروں گا کہ اس شخص کو شامل تفتیش کیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ اس شخص کی گرفتاری کیس کو نیا رخ دے گی۔“

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔ جج نے پندرہ دن بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

☆☆☆

اگلی پیشی پر استغاثہ کی جانب سے تین گواہ عدالت میں پیش کیے گئے لیکن ان کے بیانات اور ان پر ہونے والی جرح میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔

آئندہ پیشی پر میں نے جج سے درخواست کر کے اس کیس کے انکوائری آفیسر کو کٹہرے میں بلا لیا۔

انکوائری آفیسر رینک کے اعتبار سے ایک سب انسپکٹر تھا۔ میں نے بڑے دھیمے مگر قاتلانہ انداز میں اپنی جرح کا آغاز کیا۔

”آئی او صاحب! آپ نے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ تو بڑی توجہ سے پڑھی ہو گی؟“

”یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔“ وہ گہری نظر سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ”پوسٹ مارٹم رپورٹ اور کیمیکل ایگزامنر کی رپورٹ کسی بھی کیس کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی طرح ہوتی ہیں۔ انہیں بھلا کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟“

”بجا فرمایا آپ نے۔“ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی اور کہا۔ ”پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق، مقتول ڈاکٹر ناہید کی موت اٹھائیس مارچ کی شب گیارہ اور

بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ ایم آئی رائٹ؟“

”جی بالکل۔“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔

”لیکن میرے موکل اور اس کیس کے ملزم کا دعویٰ ہے کہ وہ وقوعہ کی رات گیارہ بجے سے پہلے ہی مقتول کے فلیٹ سے رخصت ہو گیا تھا۔ آپ اس سلسلے میں کیا کہیں گے؟“

”ملزم غلط بیانی سے کام لے رہا ہے۔“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

”پوسٹ مارٹم رپورٹ یقیناً غلط بیانی سے کام نہیں لے سکتی۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا پھر اپنی بات کو ان الفاظ میں آگے بڑھا دیا۔ ”اس رپورٹ کے مطابق، مقتول کو گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ کیا آپ کا بھی یہی خیال ہے؟“

”جی بالکل...... لیکن آپ کچھ بھول رہے ہیں؟“ وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

”کیا...... میں کیا بھول رہا ہوں؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”گلا گھونٹنے سے پہلے مقتول کو خواب آور دوا کھلا کر بے ہوش کیا گیا تھا اور اسے موت کے منہ میں دھکیلنے سے قبل ملزم نے اس کے ساتھ زیادتی بھی کی تھی۔ یہ تمام باتیں رپورٹ سے ثابت ہیں۔“

”اوہ...... واقعی، میں تو یہ اہم پوائنٹ بھول ہی گیا تھا۔“ میں نے شرمندہ ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ ”تو ٹھیک ہے۔ پہلے ہم انہی پوائنٹ کو ڈسکس کر لیتے ہیں......“

میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ مقتول کو خواب آور دوا کھلا کر ہوش و حواس سے بے گانہ کیا گیا تھا تاکہ قاتل اپنی ہوس کی تکمیل کر سکے۔ کیا آپ نے وقوعہ پر چائے، کافی یا شربت وغیرہ کے ایسے برتن دیکھے یا دیکھا جس میں خواب آور دوا مقتول کو دی گئی تھی؟“

”ہم نے وقوعہ پر موجود کچن کے تمام برتنوں کو چیک کیا تھا لیکن کسی کپ یا گلاس میں اس قسم کی دوا کے آثار نہیں ملے۔“ وہ خاصے مضبوط لہجے میں بولا۔ ”عیار قاتل نے وقوعہ سے رخصت ہونے سے پہلے ایسے تمام ثبوت مٹا دیے تھے۔“

”عیار قاتلوں سے ایسی توقعات رکھی جا سکتی ہیں۔“ میں نے آئی او کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ”مقتول کو گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ کیا آپ نے مقتول کی گردن پر سے قاتل کے فنگر پرنٹس اٹھانے کی کوشش کی تھی؟“

”جی کوشش کی تھی......“ وہ بڑی رسان سے بولا۔

”لیکن ایسی کوئی رپورٹ استغاثہ میں کہیں نظر نہیں آ رہی؟“ میں نے چبھتے ہوئے انداز میں کہا۔ ”کہیں عیار قاتل نے استغاثہ کی فائلوں میں سے مذکورہ رپورٹ بھی تو نہیں چرا لی؟“

”ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ میری چوٹ پر تلملاتے ہوئے بولا۔

”پھر کیسی بات ہے؟“ میں نے بے ساختہ پوچھ لیا۔

”وہ دراصل بات یہ ہے کہ مقتول کی گردن پر کسی قسم کے فنگر پرنٹس نہیں پائے گئے تھے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”لگتا ہے، قاتل نے مقتول کی گردن پر کوئی کپڑا وغیرہ رکھ کر اس کا گلا دبایا تھا البتہ......“ وہ ڈرامائی انداز میں رکا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”مقتول کے فلیٹ میں متعدد مقامات پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اس سے ملنے اس فلیٹ پر جایا کرتا تھا۔“

”ملزم اس بات سے انکاری نہیں ہے کہ یہ مقتول کے فلیٹ پر جایا کرتا تھا۔“ میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ”مگر آپ کے بیان کردہ فلسفے سے یہ کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ ملزم ہی نے مقتول کی جان لی ہے۔“

”تو پھر یہ وہاں جاتا ہی کیوں تھا......؟“ وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”پوسٹ مارٹم رپورٹ چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے کہ مقتول کو موت کے گھاٹ اتارنے سے پہلے جنسی تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا اور...... اور...... یہ کہ اپنی موت کے وقت وہ اُمید سے تھی۔“

”اس میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ مقتول کی موت سے قبل اس کے ساتھ زیادتی کی گئی تھی اور یہ کہ وہ اُمید سے بھی تھی۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن اس کے قتل کا الزام میرے موکل کے سر لگانا درست نہیں ہے اور اب آپ کے سب سے اہم سوال کا جواب......!“

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ ایسی نظر سے مجھے تکنے لگا جیسے میں نے کوئی عجیب بات کر دی ہو۔ بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔

”میرا کون سا اہم سوال؟“

”تو پھر یہ وہاں جاتا ہی کیوں تھا؟“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”بتاؤں...... میرا موکل مقتول کے فلیٹ پر کیوں جاتا تھا؟“

”جی بتائیں......!“ وہ ہونقوں کی طرح میرا منہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

تکنے لگا۔

جج بھی گہری سنجیدگی سے مجھے دیکھ رہا تھا جیسے میں کوئی اہم انکشاف کرنے والا ہوں۔ میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

”میرا موکل مقتول ڈاکٹر ناہید سے ملنے اس لیے جاتا تھا کہ یہ اس کا شوہر تھا...... ایک شوہر کو اپنی بیوی سے ملنے سے بھلا کون روک سکتا ہے۔“

”کک...... کیا......؟“ وکیل استغاثہ بھونچکا رہ گیا۔

حاضرینِ عدالت پر بھی سکتہ طاری ہوگیا۔

”بیگ صاحب!“ جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”میں حقیقت بیان کر رہا ہوں جناب عالی!“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ملزم ڈاکٹر عرفان نے پچھلے سال نومبر میں مقتول ڈاکٹر ناہید سے کورٹ میرج کرلی تھی۔ یہ چونکہ پہلے سے شادی شدہ ہے اور اپنی دوسری شادی کو پہلی بیوی سے چھپا کر رکھنا چاہتا تھا اس لیے اس نے دوسری شادی کا باقاعدہ اعلان نہیں کیا تھا۔“

”کیا آپ ثابت کرسکتے ہیں کہ ملزم نے چار ماہ پہلے مقتول سے کورٹ میرج کرلی تھی؟“ جج نے گہری سنجیدگی سے سوال کیا۔

”یس سر!“ میں نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

پھر تمام اہم دستاویزات اپنی فائل سے نکال کر جج کے سامنے میز پر رکھ دیں جن سے ثابت ہوتا تھا کہ چار ماہ پہلے ڈاکٹر عرفان اور ڈاکٹر ناہید نے باقاعدہ کورٹ میرج کی تھی۔“

جج نے مذکورہ کاغذات کا مطالعہ کرنے کے بعد اثبات میں گردن ہلادی تو میں دوبارہ آئی او کی جانب متوجہ ہوگیا۔

”آئی او صاحب! اب آپ کیا کہتے ہیں بیچ اس مسئلے کے۔ کیا کوئی شوہر اپنی بیوی کو اس انداز میں قتل کرسکتا ہے جبکہ چار ماہ پہلے انہوں نے لو میرج کی ہو اور بیوی امید سے بھی ہو......؟“

انکوائری آفیسر کے کچھ بولنے سے پہلے ہی وکیل استغاثہ کی حیرت سے معمور آواز عدالت کے کمرے میں ابھری۔

”اگر ڈاکٹر عرفان نے ڈاکٹر ناہید کو قتل نہیں کیا تو پھر اس کا قاتل کون ہے......؟“

”سبحان اللہ!“ میں نے وکیل مخالف کی لوز بال پر باؤنڈری مارتے ہوئے کہا۔ ”استغاثہ کے ٹھیکے دار آپ ہیں اور سوال مجھ سے کر رہے ہیں کہ مقتول کو کس نے قتل کردیا......

میں نے گزشتہ پیشی پر آپ کی مدد کرنے کی ایک کوشش کی تھی لیکن شاید آپ نے میرے خلوص کی قدر نہیں کی۔“

”کیسی مدد؟“ وہ بے ساختہ بولا۔

”صفدر عباسی کا فوٹو......!“ میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہوگیا۔ عدالت نے ایک ہفتہ بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کردیا۔

”دی کورٹ از ایڈ جارنڈ......!“

☆☆☆

آئندہ پیشی پر جج نے میرے موکل اور اس کیس کے ملزم ڈاکٹر عرفان کو باعزت بری کردیا میرے چھوڑے ہوئے خطرناک فوٹو کی انگلی پکڑ کر پولیس نے اگلے روز ہی صفدر عباسی نامی اس شخص کو گرفتار کرلیا تھا۔ وہ زیادہ دیر تک پولیس کی تفتیش کا سامنا نہ کرسکا اور اس نے ڈاکٹر ناہید کے قتل کا اقبال کرلیا۔ واقعات کے مطابق۔

کسی زمانے میں ڈاکٹر ناہید پاپوش نگر میں رہا کرتی تھی۔ اسی زمانے میں اس کا صفدر عباسی سے تعلق استوار ہوگیا تھا لیکن بعد میں ناہید نے پٹری بدل کر ڈاکٹر عرفان کو اپنا منظور نظر بنالیا تو یہ بات صفدر عباسی کو بہت بری لگی۔

جب ناہید کو شیخ اسپتال سے برخاست کیا گیا تو صفدر عباسی نے دوبارہ ناہید کے ساتھ ربط ضبط پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن ناہید نے اسے کوئی لفٹ نہ کرائی۔ اس کے نتیجے میں صفدر اسے بلیک میل کرنے لگا۔“ وقوعہ کے روز وہ بلیک میلنگ کا مواد ناہید کے حوالے کرکے اس سے بھاری رقم وصول کرنے آیا تھا اور یہ اس کی چال تھی۔ اس کے ذہن کے اندر جو منصوبہ تھا اس نے اسی کے مطابق عمل کیا اور چپ چاپ اس کے فلیٹ سے نکل گیا۔

مسز عرفان اپنے شوہر کی باعزت رہائی پر بہت خوش تھی۔ جب ہم عدالت کے کمرے سے باہر آئے تو اس نے فرطِ جذبات میں کہا۔

”بیگ صاحب! کوئی چاہے کتنا بھی بڑا بازی گر کیوں نہ ہو۔ اسے بھی مات ہوسکتی ہے۔“

”اس میں تو کسی شک وشبے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔“ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اللہ نے ہر سیر کے لیے سوا سیر پیدا کر رکھا ہے اس لیے ہر انسان کو اپنی کھال میں رہنا چاہیے۔“ وہ زیر لب مسکرانے لگی۔

(تحریر: حُسام بٹ)

آلودگی

ڈاکٹر شیر شاہ سیّد

ماحول کی کثافت کو دھو ڈالنا شاید آسان ہے مگر دلوں کی آلودگی کو صاف کرنے کا عمل ناممکن حد تک کٹھن ہوتا ہے کیونکہ جذبات و احساسات کی جنگ میں معلوم نہیں زندگی شکست کھاتی ہے یا موت... ماحولیاتی کثافت آنے والے وقت میں صاف ہوسکتی ہے مگر دلوں کی آلودگی ہمیشہ جانے والے کل کو اپنے حصار میں قید کرکے ذہنوں میں تازہ رکھتی ہے۔ یہی حال ان مسافروں کا تھا جو حالات کی ستم گری کا شکار ہوگئے تھے۔

گھر سے بے گھر اور بے حال ہونے والے لوگوں کا احوال

میں ہیوسٹن سے نیویارک جارہا تھا۔ ہیوسٹن میں، میں نے ماحولیات کے بارے میں ایک بڑی میٹنگ میں شرکت کی تھی۔ ماحول اور اس کی بڑھتی ہوئی آلودگی کے سلسلے میں دنیا بھر سے ماہرین کو بلایا گیا تھا۔ تین دن تک لوگوں نے اپنے اپنے مقالات کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی کہ دنیا بھر میں رہنے والے اربوں انسانوں نے دنیا کے سمندروں، دریاؤں، پہاڑوں، آبشاروں کو، جھیلوں جنگلوں کو، ندیوں نالوں کو یہاں تک کہ صحراؤں کو اپنی

WWW.PAKSOCIETY.COM

عادتوں اور اپنے عمل سے گندا کرکے رکھ دیا ہے۔ آلودگی بڑھتی جارہی ہے۔ دوسری جانب سورج اور ہمارے درمیان کثافت بھی بڑھ گئی ہے۔ وہاں سردی ہورہی ہے جہاں گرمی ہونی چاہیے، وہاں بارش ہورہی ہے جہاں مٹی اڑنی چاہیے۔ یہ تبدیلیاں فطری طور پر آہستہ آہستہ نہیں ہو رہیں بلکہ یکا یک بڑی تیزی سے ہورہی ہیں اور اگر اسی طرح ہوتی رہیں تو فطرت کا جو حساب کتاب ہے اس کا توازن بگڑ جائے گا بلکہ بگڑ چکا ہے۔ اسے جتنی جلد صحیح کیا جائے اتنا ہی بہتر ہے۔ ماہرین تو صرف اپنی رائے دے سکتے تھے، ان آرا پر عمل کرانا حکومتوں اور سیاسی لوگوں کی ذمے داری ہے اور کوئی بھی ذمے داری پوری کرنے کو تیار نہیں تھا۔

کانفرنس کے بعد ہیوسٹن کے بڑے سے ہوائی اڈے سے ڈیلٹا ائر کے ذریعے مجھے نیویارک کے لاگارڈیا ائرپورٹ پر جانا تھا، جہاں گاڑی کا انتظام تھا جو مجھے کسی ہوٹل لے جائے گی۔ دوسرے دن نیویارک میں ہی ایک اور میٹنگ تھی جس کے بعد میں نے، دو چار روز گھوم کر نیویارک سے ہی لندن ہوتے ہوئے کراچی واپس جانے کا پروگرام بنایا تھا۔

میں زندگی میں پہلی دفعہ جہاز کے فرسٹ کلاس میں بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ جتنی آرام دہ سیٹیں بنی ہوئی ہیں اور جس طرح سے خاطر مدارات ہورہی ہے ان آسائشوں میں سفر کرنے والے کے لیے ان کو چھوڑنا کتنا مشکل ہوتا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ بڑا آدمی، بڑا سیاستدان اور بڑا بے ایمان، ان آسائشوں کو قائم رکھنے کے لیے ہر قسم کے ہتھکنڈے استعمال کرنے سے پیچھے نہیں ہٹتا ہے۔ غریب سے امیر بن جانا تو ہر ایک کو قبول ہے، پر امارت سے غربت نا قابل قبول ہوتی ہے۔ جب تک ٹھنڈے پانی سے نہاتا رہتا ہے تو انسان کو وہی اچھا لگتا ہے لیکن ایک بار ٹھنڈا اور گرم پانی ملا کر نہانے کے بعد صرف ٹھنڈا پانی نا قابل قبول ہوجاتا ہے۔ ٹھنڈے پانی والے حمام سے گرما گرم شاور اور باتھ ٹب کا فاصلہ تو آسانی سے طے ہوجاتا ہے لیکن واپسی کا راستہ کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہوتا ہے۔

میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ لڑکی میرے برابر والی سیٹ پر آکر بیٹھ گئی، گوری چٹی سرخی مائل بال اور سلیقے سے پہنے ہوئے قیمتی امریکی کپڑے اور انداز میں بلا کی بردباری تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ تیس پینتیس سال سے زیادہ عمر نہیں ہوگی اس کی۔

اس نے آتے ہی اپنے بیگ میں سے لیپ ٹاپ نکالا اور اس پر کام کرنے لگی۔ میں تھوڑی دیر سوچتا رہا، نیوز ویک، ٹائمز اور نیویارک ٹائمز کی ورق گردانی کرنے کے بعد اپنے بیگ سے دیوانِ غالب کا دستی ایڈیشن نکال کر پڑھنے لگا۔

مجھے لگا جیسے اس کی نظریں غالب کے دیوان پر جم گئی ہیں، اس سے پہلے کہ میں اس کی طرف توجہ دیتا وہ خود ہی پوچھ بیٹھی کہ تم اردو پڑھ رہے ہو، اس نے انگلش میں سوال کیا تھا۔

”اوہ ہاں، میں پاکستان سے آیا ہوں ایک کانفرنس کے سلسلے میں۔ یہ ہمارا ایک بہت اچھا شاعر ہے، اس کا مجموعہ پڑھ رہا ہوں۔“

”میں جانتی ہوں یہ غالب کا دیوان ہے، میں نے غالب کا فارسی کلام پڑھا ہے، میں افغانی ہوں، فارسی اسپیکنگ افغانی۔“

”اوہ گریٹ مگر آپ افغانی لگتی نہیں ہو۔ بالکل امریکن، سو فیصد امریکن اور آپ کی تو انگلش بھی بالکل امریکن جیسی ہے۔ میرا نام تیمور ہے میں اسلام آباد میں پڑھاتا ہوں۔“

”میرا نام ثریا ہے، ثریا نصیب۔ میں کابل سے آئی ہوں اور اب نیویارک ہی میں کام کرتی ہوں۔ رہا سوال امریکن لگنے کا تو ابھی اگر کابل کے کپڑے پہن لوں تو بالکل افغانی لگوں گی۔ افغانستان میں پشتو اور فارسی بولنے والے سب ہی لوگ یورپین لوگوں کی طرح سرخ و سفید ہیں، یہاں آکر ان کے کپڑے پہن لو تو یہ لوگ ہمیں بھی یہیں کا ہی سمجھتے ہیں۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”آپ کیسے آئے ہیں اسلام آباد سے؟ سرکاری دورے پر آئے ہوں گے؟“ اس نے سوال بھی کیا اور جواب بھی دیا۔

”سرکاری ہی سمجھیں۔ اقوام متحدہ نے ماحولیات اور اس کی آلودگی پر ایک میٹنگ بلائی تھی۔ بس اس میں شریک ہوکر اب نیویارک جارہا ہوں جس کے بعد واپس پاکستان چلا جاؤں گا۔“ پھر میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ آلودگی کس طرح سے ماحول، فضا، ہوا اور پانی کو خراب کررہی ہے۔ اگر اس پر قابو نہیں پایا گیا تو بہت جلد انسان خود اپنے ہاتھوں اپنا شکار ہوجائے گا۔ اس نے بڑی توجہ سے میری بات سنی، مجھے دیکھتی رہی پھر سوال کربیٹھی۔ ”مگر کیا مسئلہ حل ہوسکے گا؟“

”یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ میرا یہ کام بھی نہیں ہے اور نہ ہی میں کوئی سیاستدان ہوں لیکن یہ جانتا ہوں کہ اگر یہ مسئلہ حل

نہیں کیا گیا تو نسل انسانی کو بڑی تباہی کا سامنا کرنا ہوگا۔“ میں نے جواب دیا۔

”نسل انسانی تو مسلسل اپنے آپ کو تباہ کرتی رہی ہے۔ یہ کون سی نئی بات ہوگی؟“ اس نے ذرا طنزیہ انداز میں کہا۔

”مجھ سے بہتر تم سمجھتی ہو اس بات کو، مگر ماحول کی بربادی نے چالیس ملین سال تک زمین پر حکمرانی کرنے والے عظیم الشان ڈائنوسار کی تمام نسلوں کو منٹوں گھنٹوں میں ختم کردیا تھا۔ ماحول کی بربادی تو اپنی ہی بربادی ہوتی ہے۔ انتہائی بے رحم اور سفاک۔ دنیا کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ تہذیبیں، تمدن اور ثقافتیں جنگ وجدل اور قتل عام کے باوجود ختم نہیں ہوسکیں مگر ماحول کی خرابی، بیماریاں اور قدرتی آفات جو بربادی لائیں وہ مستقل بن گئیں۔ انسان کی آپس کی جنگوں میں انسان تو ہار گئے لیکن تہذیبیں تمدن چلتے رہے، مگر ماحول کی بربادی نے سب کچھ برباد کردیا۔“ میں نے اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے سادہ سا جواب دیا تھا۔

جہاز اڑتا رہا اور وہ بہت دیر تک ماحول کی آلودگی سے متعلق سوال کرتی رہی۔ مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ کافی سمجھدار اور پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ میں اس کی معلومات کا معترف بھی ہوگیا اور اس سے متاثر بھی۔

وہ سوال کرتی رہی، میں جواب دیتا رہا۔ ماحول اور اس کی آلودگی سے بات شروع ہوکر اسلام آباد کی زندگی، پاکستان کی سیاست، سیاسی معاملات میں فوجیوں کی دخل اندازی، پاکستان ہندوستان کے تعلقات اور افغانستان کے حالات تک پہنچ گئی تھی۔

اس نے مجھے بتایا کہ وہ نیویارک کی ایک فرم کے کوالٹی کنٹرول کے شعبہ میں کام کرتی ہے، اسی فرم کی ایک برانچ ہیوسٹن میں ہے جہاں کے کام کو دیکھنے گئی تھی اور اب گھر واپس جارہی تھی۔

بہت دلکش شخصیت کی مالک تھی وہ۔ اسے بہت خوب صورت بھی کہا جاسکتا تھا۔ اگر وہ مجھے نہیں بتاتی تو میں اسے امریکن ہی سمجھتا رہتا۔ میں نے سوچا کہ حسن و جمال کے ساتھ قدرت نے اسے ذہانت بھی دی ہے۔ اگر ذہین نہ ہوتی تو امریکا میں بہت سے قابل لوگوں کے درمیان اس طرح جگہ بنا کر کسی ایگزیکٹو پوسٹ پر کام نہیں کرسکتی تھی۔ فرسٹ کلاس میں عام امریکن سفر نہیں کرتا یا تو بہت مالدار ہوتا ہے یا کسی ایگزیکٹو پوسٹ پر ملازم ہوتا ہے۔ عجیب بات تھی کہ اس نے مجھ سے دنیا جہان کے سوالات کر ڈالے مگر مجھے موقع ہی نہیں

تبدیلی

ایک بے وقوف (اسٹیشن ماسٹر سے)
”تین بجے والی ٹرین کب جائے گی؟“
اسٹیشن ماسٹر۔ ”دو بج کر ساٹھ منٹ پر۔“
بے وقوف۔ ”مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ وقت تبدیل ہوا ہوگا۔“

مرسلہ: توصیف احمد، پٹھان کالونی، کراچی

دیا کہ میں بھی اس سے کچھ سوال کرتا، یہ خیال آتے ہی میں فوراً ہی پوچھ بیٹھا ”آپ افغانستان سے کب آئیں؟“

شاید وہ اس سوال کی امید کررہی تھی۔ پھر بھی میں نے اس کے سرخ و سفید چہرے پر رنگ کو آہستہ سے بدلتے ہوئے دیکھا۔ وہ آہستہ سے بولی تھی۔ ”لمبی کہانی ہے تیمور صاحب۔ نہ آپ کے پاس سننے کا وقت ہے اور نہ ہی مجھ میں ہمت ہے۔ یہ تو انسانوں کی آلودگی کی کہانی ہے، آپ آسمانوں، ہواؤں، زمینوں، سمندروں، فضاؤں کی آلودگی کے ماہر ہیں۔“ اس نے ایک اداس مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔

اسی وقت جہاز کے پہیوں نے آہستہ سے لاگارڈیا کے ائرپورٹ کو چوما۔ بات اس کی صحیح تھی وقت تو گزر چکا تھا۔ اب میں لاگارڈیا سے ہوٹل چلا جاؤں گا اور وہ اپنے گھر، پھر کون کہاں ہوگا، کس کو خبر۔

میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ پھر دھیرے سے بولی۔ ”آپ کے ملک نے مجھے دربدر کردیا کہ آج میں نیویارک میں ہوں۔ اپنے وطن، اپنے گھر، اپنے لوگوں اپنے پیاروں سے دور۔ آپ کو سنانے کا فائدہ بھی کیا ہے، آپ اس آلودگی کے ماہر نہیں ہیں جو آلودگی میرے ملک میں آپ لوگوں کی وجہ سے ہوئی۔ میرے ملک کا انسانی ماحول تباہ و برباد ہوگیا۔ محبت کرنے والوں کے دلوں میں نفرت بھر گئی، انسان انسان نہیں رہا، جانور بن گئے سب لوگ، ایسی پستی کا کس نے سوچا تھا۔“ اس نے پھر ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنی آنکھوں میں ابھرتی ہوئی نفرت کو جیسے دبایا تھا۔

مجھ سے کچھ کہا نہیں گیا، جہاز رک چکا تھا، سیٹ بیلٹس کے کھلنے کی آوازیں ابھر رہی تھیں اور لوگ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے کوٹ کی جیب سے اپنا کارڈ

WWW.PAKSOCIETY.COM

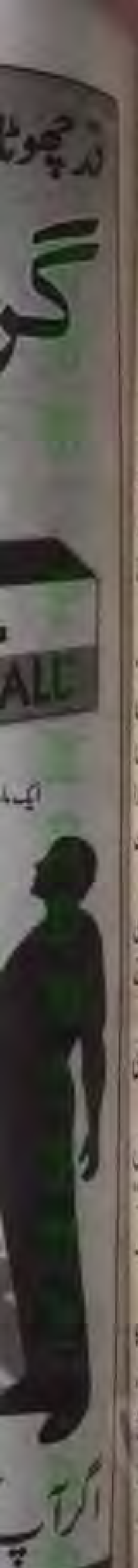

نکال کر اسے دیا۔ "یہ میرا کارڈ ہے، گھر اور موبائل کا نمبر۔ کبھی بھی اسلام آباد میں کوئی کام ہو یا آپ اسلام آباد آؤ تو میرا گھر حاضر ہوگا۔ پاک صاف ستھرا ماحول ہر طرح کی آلودگی سے محفوظ آپ کے لیے۔ آپ کے شوہر اور گھر والوں کے لیے، یقین کرو میرے گھر میں تمہارے لیے کچھ بھی آلودہ نہیں ہوگا۔" میں نے بڑی انکساری اور شاید تھوڑی سی معذرت کے انداز میں کہا تھا۔ ساتھ ہی ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

ائرپورٹ کے باہر مجھے کوئی لینے نہیں آیا۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ لوکل منتظم کے آفس فون کر کے ہوٹل کا پتا کروں کیونکہ نیویارک سے آنے والا دعوت نامہ میں غلطی سے ہوسٹن میں ہی چھوڑ کر آگیا تھا جس پر ہوٹل کا نام اور پتا درج تھا لیکن اس وقت شام کے چھ بجے کون ہوگا آفس میں، یہ سوچتا ہوا میں فون کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ثریا مجھے اپنی طرف آتی نظر آئی۔

"گاڑی نہیں آئی آپ کی؟" اس نے مسکراتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ذرا سا رک کر پھر فوراً ہی بولی۔ "آپ ایسا کریں کہ میرے گھر چلیں، یہاں سے بیس منٹ کی ڈرائیو پر نیوجرسی میں گھر ہے میرا۔ وہیں سے فون وغیرہ کرلیجیے گا۔ اگر کوئی مل گیا تو رات کا کھانا کھا کر میں خود آپ کو چھوڑ دوں گی اور اگر نہیں ملا تو رات میرے گھر رک جائیے گا۔ میرا آفس بھی نیویارک میں ہے۔ میں آپ کو کانفرنس سینٹر پہنچا دوں گی، کیا خیال ہے۔" پھر ہنستے ہوئے بڑے انداز میں اس نے کہا کہ "میرے گھر میں آلودگی نہیں ہے ڈاکٹر صاحب، آپ ہی کے گھر کی طرح ہے۔"

میں نے مزید کچھ سوچنا اور کہنا مناسب نہیں سمجھا اور اس کے ساتھ پارکنگ کی طرف روانہ ہوگیا تھا۔ لاگارڈیا ائرپورٹ کے پارکنگ لاٹ میں اس کی ہلکے نیلے رنگ کی ٹویوٹا کیمری کھڑی تھی۔ ہم نے بوٹ میں اپنا سامان رکھا اور اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

نیوجرسی بھی کیا خوب صورت جگہ ہے، ہرے بھرے اونچے اونچے درخت، خوب صورتی سے کٹے ہوئے، سنوارے ہوئے گھاس کے کشادہ قطعے، باضابطہ بنے ہوئے مکانات، ایسا لگتا ہے جیسے آپ خوب صورت کیلنڈر کے کسی صفحے پر سفر کر رہے ہیں، ہر قدم پر نیا مہینا۔ ہوسٹن کے مقابلے میں یہاں بہت زیادہ سبزہ تھا اور موسم بہت ہی اچھا۔ ہلکی ہلکی بارش نے نیوجرسی کی خوب صورتی میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ وہ مجھے راستے میں لگے ہوئے خوب صورت پیڑوں، جھاڑیوں، سڑکوں اور علاقے کے بارے میں بتا رہی۔ "میں ہائی وے سے لے کر نہیں جا رہی ہوں آپ کو، ہائی وے سے تو کچھ پتا ہی نہیں لگتا ہے، اس سے جلدی آتو سکتے ہیں مگر سفر کرنے کے باوجود ایسا لگتا ہے جیسے فاصلہ نہیں کٹ سکا، یہ چھوٹی سڑکیں گھومتی لہراتی ہوئی، میدانوں جنگلوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی مجھے اچھی لگتی ہیں اور یہ بھی لگتا ہے کہ کچھ سفر بھی طے ہوا۔"

تھوڑی دیر میں اس کا مکان آگیا۔ خوب صورت سا گھر درختوں میں گھرا ہوا، ایک چھوٹی سڑک کے آخر میں۔ فاصلے سے چھ سات مکان ایک نیم دائرے کی شکل میں بنے ہوئے تھے۔ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی اس نے بٹن دبا کر گیراج کا شٹر کھولا اور گاڑی ایک بڑے سے دالان نما گیراج میں داخل ہوگئی۔ وہاں ایک اور گاڑی بھی کھڑی تھی۔

وہ جیسے ہی گاڑی سے اتری دو چھوٹی چھوٹی بچیاں، شاید سات آٹھ سال کی ہوں گی، ماما کہہ کر لپکتی ہوئی اس کی طرف آئی تھیں۔ میرے کانوں میں فارسی کی شیرینی کسی شربت کی طرح اترتی چلی گئی۔ دونوں بچیوں کا چہرہ کھلا ہوا تھا، ثریا کے چہرے کی تراوٹ کو میں نے پہلی دفعہ شدت سے محسوس کیا۔

"ڈاکٹر تیمور، یہ میری بڑی بیٹی ہے بہار اور یہ دوسری بیٹی ہے سوسن اور وہ میری والدہ ہیں نگار خانم۔" اس نے کھڑے کھڑے ہی سب سے میرا تعارف کرا دیا تھا۔

"خوش آمدید۔" اس کی ماں نے بڑی شستہ انگریزی میں مجھے اندر چلنے کو کہا۔

میں اپنا چھوٹا سا سوٹ کیس اٹھا کر گھر میں داخل ہوگیا۔ "آئیں پہلے منہ ہاتھ دھو لیں پھر فون کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ مجھے اشارے سے کمرے کی طرف لے گئی تھی۔ "پھر کھانا کھا کر میں آپ کو چھوڑ دوں گی۔"

میں نے منہ ہاتھ دھویا اور باہر آکر ثریا کو مقامی منتظم کا نمبر نکال کر دیا۔ شام زیادہ ہو چکی تھی، آفس میں کوئی نہیں تھا لیکن ثریا نے پتا کرلیا کہ کل کی میٹنگ مین ہٹن میں واقع میریاٹ کے کانفرنس سینٹر میں تھی، اسی ہوٹل میں میرا انتظام بھی تھا مگر کسی غلط فہمی کی بنا پر ہوٹل کی گاڑی نیویارک کے جان ایف کینیڈی ائرپورٹ پر میرا انتظار کر کے واپس ہوٹل آچکی تھی۔

پھر یہی فیصلہ ہوا کہ میں رات ثریا کے گھر پر گزاروں، صبح ثریا کو بھی مین ہٹن ہی جانا ہے جہاں وہ مجھے چھوڑ دے گی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ چلو اچھا ہوا ثریا سے ملاقات ہوگئی ورنہ خواہ مخواہ مجھے پریشان ہونا پڑتا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

ثریا کی ماں کے پکائے ہوئے افغانی کھانے بہت لذیذ تھے۔ ثریا بھی بہت مہمان نوازی سے کام لے رہی تھی اور دونوں خوب صورت بچیاں ثریا ہی کی طرح جاذب نظر تھیں اور باتوں باتوں میں مجھے پتا چلا کہ بچیوں کا باپ افغانستان کی جنگ میں مارا جاچکا تھا۔

کھانے کے بعد گرم گرم قہوے کے گھونٹ لیتے ہوئے میں ثریا کی ماں سے پوچھ بیٹھا کہ افغانستان سے کیسے نکلے تھے وہ لوگ۔

”آپ کے ملک کی مہربانی سے۔“ دونوں کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ پھر دونوں اکٹھے ہی مسکرائے۔ میں نے ان کے لہجے میں ہلکا سا طنز محسوس کرلیا تھا۔ پھر اس کی ماں نے بتانا شروع کیا جیسے وہ سب کچھ بتانے کے لیے تیار بیٹھی ہوں۔

”ہم لوگ قلعہ فتح اللہ میں رہتے تھے، یہ کابل کا اچھا علاقہ ہے۔ میرا شوہر کابل یونیورسٹی میں فزکس کا پروفیسر تھا۔ اس نے ماسکو کی لومبا یونیورسٹی سے فزکس میں پی ایچ ڈی کیا تھا اور میں محکمۂ خارجہ میں ڈائریکٹر تھی، میں نے بھی کابل یونیورسٹی سے بین الاقوامی تعلقات میں ماسٹرز کی ڈگری لی اور وہیں میری ملاقات نصر امین سے ہوئی تھی۔ وہیں میرے والد نے آکر نصر سے ملاقات کی پھر بزرگوں کی مرضی سے ہماری شادی ہوگئی تھی۔ ثریا سب سے بڑی بیٹی اور باقی دو بیٹے تھے۔ ہم سب لوگ بہت اچھے انداز سے رہتے تھے، وہاں پھر نہ جانے کیا ہوگیا، کیسے ہوگیا، ہاتھیوں کی لڑائی تو تھی ہی امریکا اور روس کی۔ پھر پڑوسی بھی ملا تو کیسا ملا جس نے پڑوسی ہونے کا حق ادا نہ کیا۔ اور آج میں نیویارک میں ہوں۔ اپنے وطن، گھر، در ہر ایک سے دور۔ ظاہر شاہ سے داؤد اور داؤد سے نجیب تک ہمارا ملک روندا گیا، پیسا گیا اور ملکوں کی اس سیاست میں ہمارا سب کچھ ختم ہوگیا۔“

مجھے ان کی یہ تنقید اچھی تو نہیں لگی مگر میں نے اندازہ لگالیا کہ وہ دفتر خارجہ میں کام اچھا کرتی ہوگی۔

”آپ کی بہت سی باتیں درست ہیں، غریب عوام تو کہیں کے بھی ہوں خمیازہ انہیں ہی بھگتنا پڑتا ہے۔ پاکستان میں بھی یہی کچھ ہورہا ہے آپ کو تو پتا ہی ہوگا۔“ میں نے جواب دیا۔

”ہم نے بہت بھگتا ہے۔ جب ایک مخصوص مذہبی گروہ نے کابل پر قبضہ کیا تو پہلی رات ہی میرے شوہر کو گولی ماردی گئی اور میرے دونوں بیٹے نہ جانے کہاں کھو گئے۔ آج تک ان کا پتا نہیں چلا، نہ ان کی لاشیں دریافت ہوئیں۔ اگر زندہ ہیں تو پتا نہیں کہاں ہیں اور اگر مر گئے ہیں تو ان بے نام قبروں میں دفن ہوگئے ہوں گے جن تک ہم کبھی نہیں پہنچ سکیں گے، نہ کوئی فاتحہ درود اور نہ کوئی مزار جہاں ہم فاتحہ پڑھ لیں۔“

ان کی کہانی میں میری دلچسپی بڑھ گئی تھی۔ دونوں بچیاں صوفوں پر ہی سو گئی تھیں۔ میں ثریا سے اس کے شوہر کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ میں نے سوال کیا ہی تھا کہ اس نے کہا ”ذرا ٹھہر جائیں ڈاکٹر صاحب میں انہیں ان کے بستروں پر سلا کر آتی ہوں۔“ اس نے بڑے پیار سے انہیں اٹھایا اور انہیں ان کے کمروں میں سلانے لے گئی۔

”ثریا کو ہم نے ملالے ہائی اسکول میں پڑھایا جس کے بعد کابل یونیورسٹی سے ثریا نے ڈگری کا امتحان پاس کیا۔ اس کے لیے کئی رشتے آئے ہوئے تھے۔ اس کی شادی ہم لوگوں کی مرضی سے ہوئی، دفتر خارجہ میں رمضان صاحب میرے ساتھ ہی کام کرتے تھے۔ حمزہ شریف ان کا بیٹا تھا۔ اس نے بزنس ایڈمنسٹریشن میں ڈگری لی تھی اور اس وقت محکمۂ معاشیات میں کام کررہا تھا مگر مجھے کیا پتا تھا کہ میری یہ بچی اپنی اس بھری پری جوانی میں ہی میری طرح بیوہ ہوجائے گی۔“ ثریا کی ماں نے کہا، ان کی آواز میں بلا کا درد تھا۔

ثریا بھی دوبارہ آکر بیٹھ گئی، وہ ایک گرم گرم قہوے کا فنجان بھر لائی تھی۔ ”جب اس مخصوص گروہ کا قبضہ ہونے والا تھا تو ثریا کے شوہر نے ثریا اور بچیوں کو مزار شریف بھیج دیا۔ ہم لوگوں کا بھی تعلق مزار شریف سے ہے۔ مزار شریف افغانستان کا ثقافتی شہر ہے، وہاں کا کلچر، آداب، روایات سب اپنے آپ میں بہت کچھ لیے ہوئے ہیں۔“ میں نے محسوس کیا کہ ثریا کی ماں کے چہرے پر ایک طرح کا سرخ رنگ پھیل گیا تھا۔ وہ مزار شریف کا ذکر اس طرح سے کررہی تھی جیسے کوئی اپنے بچھڑے ہوئے محبوب کا ذکر کرتا ہے۔

”شہر کا نام مزار شریف کیوں ہے؟ مجھے کچھ پتا نہیں ہے، اس کے بارے میں ذرا بتائیں۔“ میں نے بڑی دلچسپی سے پوچھا۔ کیونکہ حقیقت میں افغانستان کا پڑوسی ہونے کے باوجود مجھے قندھار، ہرات، مزار شریف، جلال آباد کے بارے میں کوئی خاص معلومات نہیں تھیں۔

انہوں نے بڑی حیرانی سے مجھے دیکھا، پھر بتانے لگیں کہ ”مزار شریف دراصل حضرت علیؓ کے مزار کی موجودگی کی وجہ سے مزار شریف کہلاتا ہے اور یہ شہر تو ہر ایک کا شہر تھا۔ ہر مذہب اور فرقے کے لوگ رہتے تھے وہاں پر، اور وہاں کا جشن نوروز، اس کی تقریبات سیکڑوں برس سے ہورہی ہیں۔ میرا سارا بچپن وہیں گزرا ہے۔ میں تمہیں جشن نوروز کے بارے میں بتاتی ہوں۔“ انہوں نے بڑے ایکسائٹمنٹ کے ساتھ کہا تھا۔ ”نوروز دراصل سال نو کا آغاز ہے۔ 21 مارچ سے چالیس دن تک اس کی تقریبات ہوتی ہیں جس میں چھ دفعہ چہار شنبہ آتا ہے اور سات قسم کے کھانے جو حرف ”سین“ سے شروع ہوتے ہیں، پکائے جاتے ہیں۔ سات قسم کے پھل لائے جاتے ہیں، کھائے جاتے ہیں اور چھوٹا بڑا، مرد، عورت، بوڑھا، جوان ہر کوئی مزار شریف پر حاضری دیتا ہے۔ ان چالیس دنوں کے ہر ہفتے میں دو دن صرف عورتیں اور ایک دن صرف مرد آتے ہیں اور باقی دنوں میں سب مل جل کر آتے ہیں۔ خوشیاں مناتے ہیں۔ جشن کا سا سماں ہوتا ہے، وہاں لوگ نئے کپڑے، نئے زیور پہن کر بڑے انداز سے آتے ہیں۔ سارا سال تیاری ہوتی ہے نوروز کا جشن منانے کی۔ گل لالہ کے جشن کا آغاز بھی اسی وقت ہوتا ہے، ہر کوئی رقص کرتا ہے، فارسی لوک گانوں کی دھنوں پر۔

بیا کہ بریم با مزار ملا محمد جان
سیر گل لالہ زار واہ واہ دلبر جان

مگر یہ سب کچھ ختم ہوگیا، اس گروہ نے ختم کردیا، مزار شریف کی سڑکوں، گلیوں میں چن چن کر ایک خاص فرقے کو مار ڈالا گیا۔ کالے حجاب پر پابندی لگادی گئی، لڑکیوں کے اسکول کالج بند کردیے گئے، سنیما گھروں، ریستورانوں کو ختم کردیا گیا، نوروز پر پابندی لگادی گئی۔ صوبہ بلخ میں پہلے بھی بہت کچھ ہوا ہے مگر اس دفعہ تاریخ تمدن، ثقافت، تہذیب علم و ہنر کا جس طرح سے خاتمہ کیا گیا اس کی مثال شاید کبھی نہ ملے۔ اس گروہ نے سب کچھ سیکھا مگر انسان سے محبت نہیں سیکھی۔ برباد ہوگئے ہم لوگ مکمل طور پر برباد۔“ یہ کہہ کر ثریا کی ماں خاموش ہوگئی تھی۔

مجھے پتا تھا کہ افغانستان میں بڑی بربادی ہوئی ہے مگر بربادی سے متاثر ہونے والے کسی خاندان سے میں پہلی دفعہ ملا تھا، وہ بھی..... اپنے وطن سے دور بہت، بہت دور حادثاتی طور پر امریکا میں۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ لوگ ہمارے ملک کے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے یا سوچتے ہیں۔

مجھے ایسا لگا جیسے بہ حیثیت مجرم کسی کٹہرے میں کھڑا کردیا گیا ہوں۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ ثریا نے اپنے بارے میں بتانا شروع کردیا۔ ”میں اپنے شوہر کے ساتھ باغ بالا میں رہتی تھی، یہ ہوٹل انٹرکون کے ساتھ بہت اچھا سا علاقہ ہے۔ حالات خراب ہوتے ہی میرے شوہر نے مجھے مزار شریف بھیج دیا کہ بعد میں وہ میرے پاس آجائے گا۔ میں اپنی بچیوں کے ساتھ اپنی نانی کے گھر اپنی ماں کے پاس ہی پہنچ گئی تھی مگر بہت جلد مزار شریف پر بھی قبضہ ہوگیا اور ساتھ ہی مجھے خبر ملی کہ میرے شوہر کی لاش انٹرکون ہوٹل کے سامنے ملی ہے، اس خبر کے ساتھ ہی میری دنیا اجڑ گئی تھی۔ دو چھوٹی چھوٹی بچیاں، گھر سے باہر نکلنے پر پابندی، سر سے پاؤں تک ایسا پردہ کہ پہن کر الجھن ہوتی تھی، میرا تو جیسے مستقبل کسی اندھیرے میں کھو گیا تھا۔ ایک ایسا کنواں جو صرف گہرا ہی گہرا ہے۔“

”کچھ مہینوں کے بعد اپنی بچیوں سمیت میں اپنے سسرال آگئی تھی۔ یہاں دو مہینے ہی گزرے تھے کہ میرے سسر نے فیصلہ کیا کہ وہ میری شادی اپنے دوسرے بیٹے سے کردیں گے جو مجھے بالکل بھی قبول نہیں تھا۔ میرے شوہر کا چھوٹا بھائی ایک اچھا آدمی تھا، اچھا آدمی ہوگا مگر میں اسے اپنے شوہر کی جگہ نہیں دے سکتی تھی۔ میری زندگی محض دوسروں کے فیصلوں پر نہیں گزر سکتی تھی۔ میرے بھی کچھ خواب تھے۔ میری بھی کوئی منزل تھی۔ میں نے بھی کچھ سوچا تھا۔ مجھے اپنے دیور سے شادی منظور نہیں تھی۔ ایک دن میں اپنے ماں کے گھر جانے کے بہانے وہاں سے نکل کھڑی ہوئی اور اپنی دونوں بچیوں کے ساتھ صبح سے شام تک کا سفر کرکے جلال آباد کے راستے پشاور پہنچ گئی۔ جہاں دو دن اپنے والد کے ایک رشتے دار کے پاس رہ کر اسلام آباد آگئی اور امریکن ایمبیسی میں امریکا کے ویزا کے لیے درخواست دے دی۔ میری ماں کو میرے ماموں کی وجہ سے ویزا مل گیا جو پہلے ہی سے واشنگٹن میں تھے اور مجھے بھی شاید میری ماں کی وجہ سے ویزا مل گیا۔ پھر ہم سب لوگ امریکا آگئے۔ میں نے یہاں کا امتحان پاس کیا اور اب میں یہاں نوکری کررہی ہوں۔ اس مخصوص گروہ سے، اپنے سسرال سے دور دیار غیر میں۔ مکمل طور پر آزاد ہوں۔ اپنی خود مالک، اپنے وجود کو بچائے ہوئے، کوئی مجھے مار نہیں سکتا۔ افغانستان میں بہت آلودگی ہے ڈاکٹر صاحب، دم گھٹتا تھا وہاں پر۔ ماحول میں زہر ہے زہر...... مرکری، آرسنک، لیڈ اور کاربن مونو آکسائڈ سے بھی زیادہ۔“

میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا، اس کی آنکھوں میں چمک تھی اور چہرے پر رونق۔ میں نے سوچا کہ کاش دلوں کے درمیان جو آلودگی ہے اس کو ختم کرنے کے لیے بھی کوئی قانون بنتا، کوئی کانفرنس سیمینار، مذاکرہ، سمپوزیم ہوسکتا، کچھ ایسا ہوتا کہ یہ آلودگی ڈھل جاتی، بہہ جاتی۔ ذہنوں اور دلوں سے نکل کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوجاتی۔ یہ آلودگی تو بڑی زہریلی ہے، زندگی کے ساتھ سب کچھ ختم کردے گی۔ ✸

WWW.PAKSOCIETY.COM

محفلِ شعروسخن

❁ نوروز احمد......لاہور

میرے گناہ، کیا تری رحمت سے بڑھ گئے؟
پھر کیوں مری دعاؤں سے تاثیر کھینچ لی؟

❁ جنید احمد ملک ......گلستان جوہر، کراچی

آج رُوٹھے ہوئے ساجن نے بلایا ہے مجھے
آج تو کچھ بھی عناں گیر نہیں ہو سکتا
ہو نہ ہو یہ کوئی اپنا ہی کھلا ہے مجھ پہ
میرے دشمن کا تو یہ تیر نہیں ہو سکتا

❁ رضیہ عمیر......کراچی

اک اختلاف رائے پر، اس درجہ برہمی
کیوں دوست تو نے ہجر کی شمشیر کھینچ لی؟

❁ ایم کامران خالد......چھب

کبھی عشق کرو اور پھر دیکھو اس آگ میں جلتے رہنے سے
کبھی رنگ خراب نہیں ہوتا، کبھی دل پر آنچ نہیں آتی

❁ قیصر اعوان......ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا

ہم جان سے جائیں گے تو جان جاؤ گے فراز
کہ حاصل کچھ نہیں ہوتا کسی کو آزمانے سے

❁ تفسیر عباس بابر......اوکاڑہ

وقتِ رخصت وہ کسی کا مسموم سا لہجہ!
میرے سینے میں دہکتا ہوا نیزہ اترا
رکھ تو دی بنیاد ترکِ مراسم لیکن!
قلب کے وسط میں فرہاد کا تیشہ اترا

❁ عبدالغفور خان ساغری خٹک......ضلع اٹک

وہ بے وفا نہ تھا بس یونہی بدنام ہوگیا فراز
ہزاروں چاہنے والے تھے کس کس سے وفا کرتا

❁ سید اکبر شاہ......اوگی مانسہرہ

عشق قاتل سے بھی، مقتول سے ہمدردی بھی
یہ بتا کس سے محبت کی جزا مانگے گی
سجدہ خالق کو بھی، ابلیس سے یارانہ بھی
حشر میں کس سے عقیدت کا صلہ مانگے گی؟

❁ حسیب احمد چنائے......الگڈی کرک

وفا کی تلاش تو اکثر بے وفاؤں کو ہوتی ہے
ہم نے دنیا ہی چھوڑ دی کسی کی وفا کے لیے

❁ اظہر حسین پچار......ہزاری، جتوئی

ہر موڑ پہ مل جاتے ہیں دردمند ہزاروں
شاید میری بستی میں اداکار بہت ہیں

❁ عون عباس بابر......اوکاڑہ

ریگِ صحرا پہ تیرا نام لکھا ہے ابھی تک
لوٹ بھی آ کہ درِ امید کھلا ہے ابھی تک
ایک موہوم سی امید کا مایوس چراغ
شبِ ہجر کی دہلیز پہ جلتا ہے ابھی تک

❁ راجا افتخار علی انی......چوآسدن شاہ (موہڑہ)

بھیڑ اتنی تو نہیں تھی شہر کے بازاروں میں
کھونے والے تو نے کچھ دیر تو ڈھونڈا ہوتا

❁ مہرین ناز......حیدرآباد کینٹ

خوابوں میں تیری آس کی چوکھٹ پر کھڑی تھی
جیسے ہی کھلی آنکھ میں کانٹوں پہ پڑی تھی
سوچا تیرے بارے میں تو احساس یہ جاگا
مجھ سے تو تیری چاہ کی خواہش ہی بڑی تھی

❁ رانا نفشی حماد فرہاد، قیصر گل......سینٹرل جیل ساہیوال

وقت خوش خوش کاٹنے کا مشورہ دیتے ہوئے
رو پڑا وہ آپ مجھ کو حوصلہ دیتے ہوئے
میں اسے جب تک نظر آتا رہا تکتا رہا
گیلی آنکھوں اکھڑے لفظوں سے دعا دیتے ہوئے

❁ اعجاز احمد راحیل ......ساہیوال

امرت تیری چاہت کا پیے بن نہ رہا جائے
اگر یہ جرم ہے تو کیے بن نہ رہا جائے
جب جب بھی ذکر ہوا تسکین دل وجاں سرِ بزم
مجھ سے ماہی تیرا نام لیے بن نہ رہا جائے

❁ احتشام احسان......صفدرآباد، ضلع شیخوپورہ

وہ بات کرنے پہ نہیں متفق دوست
اور ہم عید ملنے کی حسرت لیے بیٹھے ہیں

❁ محمد عقیل چٹھہ......حافظ آباد

اس کے لب اور پھر وفا کی قسم
واہ کیا قسم تھی خدا کی قسم

❁ علی ڈوگر......ساہیوال

کس نے بسائے آنکھ میں اشکوں کے قافلے
بے گھر مسافروں کو وطن کون دے گیا؟
تجھ سے تو خیر پل کی مسافت کا ساتھ تھا
میرے بدن کو اتنی تھکن کون دے گیا؟

❁ محمد اقبال......کورنگی، کراچی

پتھروں تمہاری اوقات ہی کیا ہے
اس شخص کا دل اُف توبہ

❁ کائنات مریم......حیدرآباد

اسے کہو، اب تو ملکیت دے دے اپنی
عرصہ بیت گیا محبت کی قسطیں دیتے دیتے

❁ عائشہ ثانی......حیدرآباد

تیری غزل تو نہیں ہوں میں جو ہر وقت ہونٹوں پہ بجی رہوں
میں تو اک مصرعِ درد ہوں مجھے گنگنانے کی ضد نہ کر

❁ محمد زاہد چودھری......چھور کینٹ، ضلع عمرکوٹ

کبھی لوگ تو کبھی بھی اچھے نہیں رہتے
جن سے سچ سیکھا ہو، وہ بھی سچے نہیں رہتے
کیوں ایسا ہے کہ اعتبار کی ٹوٹی دہلیزوں پر
جو بہت ہوں اپنے، اپنے نہیں رہتے

❁ کمال انور......اورنگی ٹاؤن، کراچی

دل تری یاد کے سہارے پر
زندگی کس طرح گزارے پر؟
ہم دل وجان ہار بیٹھے ہیں
حسن کے ایک ہی اشارے پر

❁ دانش عمیر......گلستان جوہر، کراچی

لاکھ دیکھے حسین چہرے تو
ایسی حالت نہیں تھی پہلے تو
اِک نظر دیکھنے پہ یہ عالم
اِک نظر اور دیکھ لیتے تو؟

❁ محمد صفدر معاویہ......خانیوال

حشر میں نہ دینا اے خدا
پھر سزا کوئی زندگی جیسی

❁ رمضان پاشا......گلشن اقبال، کراچی

پتھر مجھے کہتا ہے مرا چاہنے والا
میں موم ہوں اس نے مجھے چھو کر نہیں دیکھا

❁ حاجی محمد زاہد اقبال زرگر......نئی منڈی سکھیکی

کس قیامت کے یہ نامے میرے نام آتے ہیں
خط میں لکھے ہوئے غیروں کے سلام آتے ہیں

❁ مدحت......کراچی

کم ترے ضبط کی قیمت نہیں کرنے والے
ہم تری آنکھ سے ہجرت نہیں کرنے والے
اپنے نزدیک محبت ہے عبادت کی طرح
ہم عبادت کی تجارت نہیں کرنے والے

❁ سعد اللہ......حیدرآباد

اندھیرے میں تھے جب تک زمانہ سازگار تھا
چراغ کیا جلا دیا ہوا ہی اور ہوگئی

❁ فہد اینڈ سعد بخاری......ضلع اٹک

جب سے تیرے خیال کا موسم ہوا ہے دوست
دنیا کی دھوپ چھاؤں سے آگے نکل گیا ہوں میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

❄ احسان سحر......میانوالی
اس کے ہونٹ شعر کی دو سطریں ہو جیسے
اس کی آنکھوں کو ہم غزل لکھتے ہیں

❄ جویریہ ریاض......نیول کالونی ڈالمیاں، کراچی
صدا سلامت رہے وہ دنیا جس میں تم بستے ہو
ہم تیری خاطر ساری دنیا کو دعا دیتے ہیں

❄ محمد اظہر......ملیر، کراچی
مجھے دیکھ کر جو اک نظر میرے سارے درد سمجھ سکے
جو ہو اس قدر چارہ گر مجھے اس نگاہ کی تلاش ہے

❄ رضوان تنولی کریڑوی......اورنگی ٹاؤن، کراچی
سوکھے ہونٹوں سے ہی ہوتی ہیں میٹھی باتیں
پیاس جب بجھ جائے تو لہجے بدل جاتے ہیں

❄ افتخار احمد تارڑ......کوٹ قادر بخش
میرے ہاتھوں کے تراشے ہوئے پتھر کے صنم
آج بت خانوں میں بھگوان بنے بیٹھے ہیں

❄ احمد خان توحیدی......پاکستان اسٹیل کراچی
کاش تیرا گھر میرے گھر کے قریب ہوتا
ملنا تو ناممکن تھا دیکھنا تو نصیب ہوتا

❄ چودھری محمد اسلم......مظفر آباد، آزاد کشمیر
اتنا ہوں تری تیغ کا شرمندۂ احسان
سر میرا، ترے سر کی قسم اٹھ نہیں سکتا

❄ قاضی عرفان احمد عاجز......آڑہ، چکوال
تو نے دیکھی ہی نہیں عشق کے قلندر کی دھمال
پاؤں اگر پتھر پہ بھی پڑ جائے تو دھول اڑا کرتی ہے

❄ محمد اشفاق سیال......شورکوٹ سٹی
سلسلے توڑ گیا، وہ سبھی جاتے جاتے
ورنہ اتنے تو مراسم تھے کہ آتے جاتے

❄ ثمینہ حبیب......مری آباد، کوئٹہ
وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر اب
تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

❄ راجا ثاقب محمود جنجوعہ......پنڈ دادن خان، جہلم
آدم کی کسی رُوپ میں تحقیر نہ کرنا
پھرتا ہے زمانے میں خدا بھیس بدل کے

❄ گلناز خان......کوئٹہ
باندھ لے دوست! گرہ میں یہ مرا فرمایا
کچھ بھی کرلے تو، مگر میر نہیں ہوسکتا

❄ نور العین......فیصل آباد
ہم ہوئے جب سے کہ اس ماہ جبیں سے واقف
پھر جہاں میں نہ ہوئے اور حسیں سے واقف

❄ زینب......حیدر آباد
تیرے دیوانے کی آنکھوں سے جو ٹپکے اشک گرم
کیا تعجب گر لگا دے دامنِ صحرا میں آگ

❄ کاشف عمیر......کراچی
خدا جانے کہ سینے میں مرے کیا رنگ ہے دل کا
نظر آتی ہے کچھ آمیزشِ خوں آج آنسو میں

❄ ذاکر خان......ملتان
قسم کھائی ہے یارو اس نے میرے گھر میں آنے کی
جو تم سے آسکے تو کر کے کچھ تدبیر لے آؤ

❄ زوہیب احمد ملک......کراچی
قفس میں ہے کیا فائدہ شوروغل سے
اسیرو کرو کچھ رہائی کی باتیں

❄ ڈاکٹر ذوالفقار......راولپنڈی
اِک حرفِ محبت نے یہ طوفان اٹھایا
ہم سارے کُتب خانے کو دریا میں ڈبو آئے

❄ قادر بخش......کراچی
ہوگئیں سب باتیں الٹی واہ رے یہ انقلاب
بات تھی جو عیب کی اب وہ ہنر کی بات ہے

❄ شبیر نازش......کراچی
حاکم وقت! ذرا اپنے گریبان میں جھانک
لوگ بے وجہ بغاوت نہیں کرنے والے

کوپن
برائے
شمارہ
دسمبر
2013

مُحفلِ شِعر وسُخن

نام: --
پتا: --

مرغا

شوکت علی ظفر

ویسے تو صید و صیاد کا قصہ بہت پرانا ہو چکا ہے مگر جب جب دہرایا جاتا ہے ایک نیا پہلو نمایاں نظر آتا ہے... یہاں بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال سامنے آئی ... جب سیر کو سوا سیر ملتا ہے تو "سیر" کی حالت بڑی دیدنی ہوتی ہے۔ وہ بھی اپنی جگہ تلملاتا رہ گیا تھا جب گھر آئی لکشمی اسے ٹھکرا کر چلدی تھی۔

"مال مفت دل بے رحم" کی عملی تفسیر

اتوار بازار سے نکلتے ہی دونوں لڑکیوں نے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں تو اچانک ہی ان کے سامنے ایک رکشا آن رکا، دونوں لڑکیوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور بغیر کچھ کہے رکشے میں سوار ہوگئیں۔ رکشے والے نے اسٹارٹ کر کے سامنے لگے شیشے میں انہیں گھورتے ہوئے پوچھا۔ "کہاں جانا ہے؟"

"لیاقت آباد چلو۔" ایک لڑکی نے کہا۔

رکشے والے نے رکشا آگے بڑھا دیا۔ گلستانِ جوہر

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے لیاقت آباد کا راستہ قدرے طویل تھا، اس لیے رکشا ڈرائیور نے اسپیڈ تیز ہی رکھی لیکن ساتھ ہی پیچھے بیٹھی سواریوں کو دیکھنے کے لیے لگے شیشے میں وقفے وقفے سے وہ لڑکیوں کو بھی گھورتا رہا۔ اگرچہ کریمو کو رکشا چلاتے ہوئے کچھ ہی دن ہوئے تھے لیکن اس نے اپنے سابقہ پیشے کو مکمل خیرباد نہیں کہا تھا۔ اس سے پہلے کریمو جیب تراش کر اپنا گزارہ کررہا تھا لیکن جب سے موبائل کلچر عام ہوا تھا اس نے بھی ترقی کرتے ہوئے جیب تراش سے بڑھ کر ایک رہزن کا روپ دھار لیا تھا۔ دن میں تین چار ''مرغے'' ذبح کرنا اس کے لیے عام سی بات تھی۔ ایک بڑا اور چمکتا خنجر دیکھ کر لوگ ویرانے میں گھبرا جاتے اور اپنی جیبوں میں موجود ہر چیز نکال کر کریمو کے ہاتھ پر رکھ دیتے۔ چونکہ زمانہ بہت ہی خراب ہوگیا ہے، کسی کو کسی کا اعتبار نہیں رہا اس لیے کریمو نے بھی اس دھندے میں کسی پارٹنر کا سہارا نہیں لیا بلکہ تن تنہا ہی اپنا شکار کر کے گزربسر کرتا رہا اور ساتھ ہی اس رقم سے کچھ پس انداز کر کے اس نے رکشا لے لیا اور یوں اسے مزید آسانی ہوگئی تھی۔ کیونکہ وہ مسافروں پر نظر رکھتا اور جو مرغا قدرے کمزور اور آسانی سے قابو میں آجانے والا لگتا، کریمو ویرانے میں موقع دیکھ کر رکشا روک کر ڈرائیور سے ڈکیت بن جاتا، اگرچہ ٹیکنالوجی کا دور ہے لیکن کریمو کو اپنے خنجر اور نظر پر مکمل بھروسا تھا اس لیے اس نے پستول رکھنے کا جھنجھٹ ہی نہیں پالا اور اس وقت بھی کریمو نے ایک نظر ان لڑکیوں کو دیکھا اور پھر رکشے کے پائیدان کے نیچے رکھے خنجر پر پاؤں رکھ کر اس کی موجودگی سے خود کو اطمینان دلایا اور ساتھ ہی رکشے کی اسپیڈ بھی کم کردی تاکہ مناسب موقع پر ان لڑکیوں کو بھی لوٹا جاسکے۔ کیونکہ کریمو نے پہلی ہی نظر میں اندازہ کرلیا تھا کہ ان دبلی پتلی لڑکیوں میں سے ایک کے پاس موجود پرس میں یقیناً ایک تگڑی رقم ہوگی۔ وہ بازار سے نکلی تھیں تو سوائے ایک چھوٹے شاپر کے کچھ نہیں تھا، اس کا مطلب تھا کہ انہیں بازار میں اپنے مقصد کی کوئی چیز پسند نہیں آئی تھی اور دوسرا یہ کہ وہ لڑکی کئی مرتبہ اپنے پرس کو بار بار دوپٹے کے نیچے چھپانے کی کوشش کررہی تھی جو تیز ہوا کی وجہ سے ہر مرتبہ اس کے پرس سے ہٹ جاتا۔

کریمو نے پھر ایک مرتبہ نظریں شیشے پر جمادیں، دونوں لڑکیاں بائیس تیئس سال سے زیادہ عمر کی نہ تھیں، دونوں نے مختلف شوخ رنگوں کے پھولدار لان کے سوٹ پہنے ہوئے تھے جبکہ ایک لڑکی نے تو اپنی آنکھوں پر بڑا چشمہ بھی لگا رکھا تھا، وہ شاید خود کو ہیروئن سمجھ رہی ہوگی لیکن چشمے کی وجہ سے وہ کچھ مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔ کریمو یہ دیکھ کر بے اختیار مسکرا اٹھا۔ اتنے میں ایک بھارتی گانا بج اٹھا، کریمو نے سڑک پر اطمینان سے دیکھ کر دوبارہ شیشے پر نظر ڈالی تو چشمے والی لڑکی کے ہاتھ میں قیمتی موبائل تھا اور وہ کسی سے بات کررہی تھی، وہ بھارتی گانا اس کے موبائل کی ٹون تھی۔ ''جی! تھوڑی ہی دیر میں پہنچ جائیں گی......'' پھر خاموشی ہوگئی...... ''وہ بازار میں دیر ہوگئی تھی......'' پھر خاموشی......''ہاں بڑی مشکلوں سے ایک ہی پیس پسند آیا، وہ بھی اتفاقاً خود ہی نظروں کے سامنے آگیا ورنہ آج کا دن تو بیکار ہی جاتا......'' پھر خاموشی...... ''بس صرف چند منٹ، کچھ ہی دیر میں پہنچنے والی ہیں...... بائے!'' کہہ کر اس لڑکی نے فون اپنے پرس میں رکھا جسے کریمو نے بڑے غور سے شیشے میں دیکھ کر اندازہ لگایا کہ وہ کم از کم پندرہ سے بیس ہزار کا سیٹ ہوگا...... پھر کریمو نے حساب کتاب لگانا شروع کیا کہ صبح سے دو ''مرغے'' شکار کرنے سے آٹھ ہزار تین سو اور دو موبائل فون اس کے پاس پہلے سے موجود ہیں اور کچھ ہی دیر میں اس کے پاس یہ نیا فون سیٹ اور ایک موٹی رقم بھی آنے والی تھی۔

کریمو کو اس مرغے پر غصہ آنے لگا جس کے پاس سے صرف دو سو اور کچھ روپے برآمد ہوئے تھے اور ایک موبائل فون جو ہزار، دو ہزار کی مالیت کا بھی نہ ہوگا۔ البتہ دوسرے مرغے پر اسے ہنسی آرہی تھی کہ ابھی اس نے خنجر پوری طرح نکالا بھی نہیں تھا کہ سب کچھ اس کے حوالے کر کے جان چھوڑنے کی التجائیں کررہا تھا...... کریمو اگرچہ شکل سے عام سا ہی دکھائی دیتا تھا لیکن نہ جانے وہ شخص کیوں اسے خونی سمجھ بیٹھا یا پھر وہ لٹیروں سے کافی ڈرا ہوا تھا، بہرحال جو بھی بات تھی کریمو کو زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی تھی۔ کریمو کے ذہن میں اس شخص کا چہرہ گھوم گیا اور ساتھ ہی اس کی منمناہٹ بھی...... کریمو کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل گئی، اس نے بے اختیار شیشے میں دیکھا تو دوسری لڑکی جس نے اپنے پرس کو بار بار چھپانے کی کوشش کی تھی، اسے کھول کر اس میں جھانک رہی تھی۔

''لگتا ہے، رقم کی موجودگی کی تسلی کررہی ہے۔'' کریمو نے سوچا اور پھر اچانک ہی رکشا بڑی سڑک سے ذیلی سڑک کی طرف موڑ دیا۔ رکشا چلاتے ہوئے اسے ایسے راستے زبانی یاد ہوگئے تھے جہاں اکثر سناٹا ہوا کرتا تھا۔ جبکہ اس راستے پر اس کے ذہن میں ایک آئیڈیل جگہ بھی تھی جہاں اس نے ان لڑکیوں کو خنجر دکھا کر لوٹنے کا منصوبہ ذہن میں ترتیب دیا ہوا تھا۔ جونہی رکشا اس ذیلی سڑک پر مڑا، چشمے والی لڑکی نے پوچھا۔ ''اس طرف کہاں؟''

''یہاں سے شارٹ کٹ ہے......'' کریمو نے مختصر کہا اور اس سے پہلے کہ وہ چشمے والی لڑکی کچھ کہتی دوسری نے فوراً ہی کہا۔ ''ٹھیک ہے اسی راستے سے جانے دو۔''

کریمو نے دل ہی دل میں اسے شاباش دی اور رکشا کی اسپیڈ قدرے بڑھادی تاکہ جلد سے جلد شکار کیا جاسکے اور کچھ ہی دیر میں کریمو کا مطلوبہ مقام قریب آرہا تھا، اس نے رکشے کے بغلی شیشوں سے پچھلی جانب دیکھا، اِکا دُکا موٹر سائیکل سوار نظر آئے جو بہت دور تھے، اس کے علاوہ اس سڑک پر کافی دور تک کوئی اور گاڑی نظر نہیں آرہی تھی، موٹر سائیکل والوں کا کریمو کو بالکل خوف نہیں تھا کیونکہ وہ اگر کارروائی کرتا تو وہ یہی سمجھتے ہوئے گزر جاتے کہ شاید کرایہ کا لین دین ہورہا ہے۔ کریمو نے بے فکری سے شیشے میں ایک مرتبہ پھر اپنے شکار پر نظریں دوڑائیں، وہ لڑکی دوبارہ پرس کھول کر نہ صرف اس میں جھانک رہی تھی بلکہ اس کا دایاں ہاتھ بھی پرس میں تھا۔

''چیک کرلو، اچھی طرح چیک کرلو بلکہ آخری بار اس رقم پر ہاتھ پھیرلو، یہ کچھ ہی دیر میں میرے پاس آنے والی ہے۔'' کریمو دل ہی دل میں مسکرایا اور اچانک ہی اس کا پاؤں بریک پر دباؤ بڑھاتا گیا اور رکشا اچانک رک گیا۔ اسے توقع تھی کہ لڑکیاں اس سے اچانک رکشا رکنے کی وجہ دریافت کریں گی اور پھر اس کے ہاتھ میں چمکتا خنجر دیکھ کر خوف سے کانپ جائیں گی، لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا، کریمو نے جھٹ سے خنجر نکال کر جونہی پیچھے کی جانب رخ کیا تو اسے حیرت کا ایک جھٹکا لگا، اس کی دونوں آنکھوں کے عین درمیان ماتھے پر ٹی ٹی پستول کی ٹھنڈک محسوس ہوئی۔ چشمے والی لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''زیادہ ہوشیاری مت دکھانا، ورنہ تمہاری کھوپڑی میں سوراخ ہوتے دیر نہیں لگے گی...... لاؤ شرافت سے یہ خنجر مجھے دو اور جو کچھ بھی تمہارے پاس ہے نکال دو۔''

''میرے پاس اور کچھ نہیں ہے......'' کریمو نے بامزاحمت خنجر لڑکی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا، اس نے پہلے مزاحمت کرنے کا سوچا تھا لیکن پھر یہ سوچ کر رہ گیا کہ لڑکی اگر اناڑی ہوئی تو گھبراہٹ میں گولی چلادے گی اور جس جگہ پستول رکھی ہوئی تھی وہاں سے اس کا بھیجا باہر آتے دیر نہ لگتی لہٰذا اس نے مناسب یہی سمجھا کہ فی الحال ان کی بات مان لینے میں ہی عافیت ہے۔

''بکواس مت کرو کہ تمہارے پاس کچھ نہیں، جلدی نکالو جو کچھ بھی ہے۔'' وہ دبلی پتلی لڑکی جو اسے شیشے میں آسان شکار دکھائی دیتی رہی تھی اب کسی شیرنی کی طرح غراتے ہوتے ہوئے بولی۔ ''اگر تم نے دوبارہ منہ کھولنے کی زحمت کی تو پھر مجھے بھی اپنی انگلی کو زحمت دینا پڑے گی، جلد کرو......'' کریمو نے دل میں سوچا، وہ دو ہزار روپے والا موبائل جو اس نے صبح ہی لوٹا تھا وہ دے دے اور رقم بچالے، اس لیے اس نے جیب سے وہ موبائل نکال کر ان کے سامنے کردیا۔ لڑکی دوبارہ غرائی۔ ''جلدی! رقم بھی نکالو ورنہ......''

کریمو کو سخت غصہ آیا، وہ لڑکی تو پھیلتی ہی جارہی تھی، اس نے فیصلہ کرلیا کہ آج آر پار ہو ہی جائے، یہ دو لڑکیاں اس کا کیا کرلیں گی، اس نے اپنے فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کا سوچا ہی تھا کہ اچانک کسی نے اس کی کمر پر زوردار مکا جڑ دیا، اسے گھومنے کی مہلت ہی نہ ملی، وہ کراہ کر رہ گیا، لڑکی کی غراہٹ میں اضافہ ہوگیا...... ''تمہارے پاس چند لمحے ہیں، جلدی کرو۔'' کریمو کو اپنی موت سامنے نظر آئی تو وہ لگنے والی ضرب کا درد بھول کر اٹین شن ہوگیا، تب اسے معلوم ہوا کہ اس کے رکشے کے قریب ہی ایک موٹر سائیکل بھی کھڑی ہے اور اس پر سوار لڑکے نے ہی اس کی کمر پر ضرب لگائی ہے، کریمو نے بہتر یہی سمجھا کہ جو کچھ ہے نکال کر دے دے اور پھر چند لمحوں میں اس نے دیکھا کہ دونوں لڑکیاں اس موٹر سائیکل سوار لڑکے کے ساتھ بیٹھ کر یہ جاوہ جا...... کریمو نے سوچا، رکشے پر ان کا پیچھا کرے لیکن پھر یہ سوچ کر اسے رک جانا پڑا کہ اس چشمے والی کارٹون سی لڑکی نے کہا تھا، اگر پیچھے آنے کی کوشش کی تو وہ دور دوسری موٹر سائیکل پر سوار دو لڑکے اسے گولی مارنے میں دیر نہیں کریں گے...... کریمو ان لڑکوں کو دیکھ کر خاموشی سے رکشے میں بیٹھا رہا، کچھ ہی دیر میں وہ لڑکے بھی روانہ ہوگئے۔ سڑک سنسان تھی، کریمو نے رکشا اسٹارٹ کیا اور بے اختیار لڑکیوں کو دیکھنے کے لیے عقب نما شیشے میں دیکھا لیکن پچھلی سیٹیں خالی تھیں، اس کی نظر سامنے لگے دوسرے عکس نما شیشے پر پڑی تو اسے وہ ''مرغا'' نظر آرہا تھا، جسے ابھی ابھی دو دبلی پتلی لڑکیاں اپنے ساتھیوں کی مدد سے لوٹ کر موٹر سائیکل پر جاچکی تھیں......!!

WWW.PAKSOCIETY.COM

اگرچہ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ انسان مسافر... زندگی مسافت... اور اعمال زادِ سفر ہوتے ہیں، مسافت کتنی ہی طویل کیوں نہ ہوجائے مسافر کو کہیں نہ کہیں ایک آخری پڑاؤ ڈالنا ہی پڑتا ہے اور جہاں پیروں تلے رستے سمٹ جائیں... قدم آگے بڑھنے سے انکاری ہوجائیں... اور جب دل میں کسی نئے جہاں کی دریافت اور تسخیر کی خواہش بھی نہ رہے تو پھر منزل ملے نہ ملے، کہیں نہ کہیں خیمہ زن ہونا ہی پڑتا ہے۔ خواہ خاموش فضاؤں میں کتنے ہی طوفان چھپے ہوں... دریا کی روانی کتنی ہی کہانیوں کو بہالے جائے... اوران کہانیوں کے کتنے ہی کردار مسافر کے تعاقب میں رہیں... مگردنیا کی اس بھیڑمیں مسافر خود اپنی ہی تلاش میں کہیں گم ہوجاتا ہے... کبھی مل جانے کا گمان کبھی کھو دینے کا غم... بس سودوزیاں کے اسی احساس تلے سوختہ جذبات میں تلاطم برپا دینے والے واقعات اور معاشرتی سرد رویّوں پر مشتمل حیرت انگیز انکشافات کا یہ طویل سلسلہ اب یہیں رک جانے کو ہے کیونکہ... منزل ملے نہ ملے مسافر کو ایک آخری بار کہیں نہ کہیں تو پڑاؤ ڈالنا ہی پڑتا ہے... سو اس ... آخری پڑاؤ کی روداد حاضر ہے۔

آخری قسط

گل وگلزار سے راہ پرخار تک

ایک مسافر بے نوا کی

رودادِ حیات

ناصر ملک

مسافر

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

زندگی کے سفر پر ہم سب مسافر راہ کی کٹھنائیوں سے بے خبر رواں دواں رہتے ہیں۔ میرا نام شہریار ہے پیار سے شہرا کہتے ہیں۔ میرا گھرانا عالی نسب غریب خاندان تھا جو چار افراد، میں، والد امام دین عرف سوہنا خان، والدہ رضیہ بی بی عرف رجو اور چھوٹی بہن پروین پر مشتمل تھا اور جنوبی پنجاب کے نور پور میں مقیم تھا جب میری عمر پانچ برس تھی ایک روز میرے والدین کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا جس کے بعد میرے چچا چراغ دین اور چچی نے ہمیں اپنا لیا اور اپنے تین بچوں ہی کی طرح ہماری تربیت کی۔ گاؤں میں پھوپی کبریٰ بھی رہتی تھی جنھوں نے بچپن ہی میں اپنی بیٹی غزالہ سے میرا رشتہ طے کر دیا تھا۔ میں نے ملتان سے گریجویشن کیا اور اسی دوران ایک سیاسی پارٹی کے اسٹوڈنٹ ونگ میں ایک اہم عہدے پر فائز رہا اور ہتھیاروں کے استعمال اور دیگر علوم میں مہارت حاصل کی۔ پھر واپس آ گیا۔ گاؤں کے دوستوں میں امیر نواز بھی شامل تھا جو کہ گاؤں کے نمبردار حیات خان کا بیٹا تھا۔ میں ان کے حساب کی منشی گیری اور دیگر چھوٹے موٹے کام کر دیا کرتا تھا۔ میرا دوسرا دوست اللہ بخش لوہار کا بیٹا خالد عرف کھالا تھا جو تعلیم یافتہ تو نہ تھا لیکن حیات خان کی ... چلاتا تھا، جبکہ تیسرے دوست ڈاکٹر منصور علی شاہ عرف شاہ جی تھے جو گاؤں کے سرکاری اسپتال میں ڈاکٹر کی حیثیت سے تعینات تھے۔ وہ ایک سلجھے ہوئے مخلص، لیکن نڈر مگر کچھ قنوطی انسان تھے۔ میں ان سے عملی تربیت بھی حاصل کر رہا تھا۔ خالد عرف کھالا سردار حیدر خان کی بیٹی اسما کے یکطرفہ عشق میں مبتلا تھا، میں نے اسے سمجھایا لیکن وہ اپنی روش پر قائم رہا۔ گاؤں کے بڑوں میں نمبردار حیات خان کے علاوہ اس کا کزن وریام خان اور اس کا بھائی سردار ... خان بھی تھا جو سب سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ وریام خان کی بیٹی کی شادی کے موقع پر سردار حیدر خان کی بیٹی اسما کی طبیعت خراب ہوئی تو ہرکارہ ڈاکٹر شاہ جی کو بلانے کے لیے دوڑایا گیا لیکن اس نے آنے سے انکار کر دیا وریام خان چونکہ ایک مختلف مزاج شخص تھا اس لیے اس نے انتقامی کارروائی کے ذریعے شاہ جی ...

WWW.PAKSOCIETY.COM

پھانسنے کی کوشش کی مگر میں نے اور کھالانے اسے ناکام بنا دیا۔ شاہ جی کے خلاف ہونے والی سازش سے آگاہ کرنے کے لیے حیدر خان کی بیٹی صدف نے ایک رقعہ مجھے کھالے کی بہن خالدہ کے ہاتھ بھیجا تھا۔ اسی باعث خالدہ نے جو کہ ابھی جوانی کی خطرناک عمر سے گزر رہی تھی، غلط تاثر لے لیا اور ایک دن بہانے سے اپنے گھر بلا کر مجھ سے اظہار الفت کرنا چاہا اور مجھ سے لپٹنا چاہتی تھی کہ میں پیچھے کی جانب گرا تو پیچھے رکھے صندوق کی نوک میری ریڑھ کی ہڈی میں چبھی اور میرا سارا جسم مفلوج ہو گیا۔ اسی دوران کھالا بھی وہاں پہنچ گیا، غلط فہمی میں اس نے مجھے مارنا چاہا مگر حقیقت کا احساس ہوا تو وہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ اسی دوران میں گاؤں میں موجود سائیں جیت کے مزار پر مشکوک لوگوں کی آمد اور سرگرمیوں کے بارے میں سردار بخت خان نے ہم لوگوں کو مطلع کیا۔ سائیں کا بیٹا دل جیت شاہ اس آستانے پر بیٹھا کرتا تھا۔ یہ معاملات جاری تھے کہ کھالے نے بتایا کہ اسما نے اسے شہر میں ایک مشہور پارک میں بلایا ہے۔ میں پریشان تو ہوا لیکن اس کے ساتھ جانے پر رضامند ہو گیا۔ اسما سے ملاقات کے دوران لمبے بالوں والا نوجوان وہاں آ گیا اور ان دونوں کے درمیان کسی بات پر لڑائی شروع ہو گئی۔ معاملہ خون خرابے تک پہنچ گیا۔ اسی دوران کھالے کے ہاتھوں اس نوجوان سوبی کا قتل ہو گیا۔ کھالا تو بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا لیکن میں پولیس کے ہاتھ لگ گیا اور تھانے پہنچا دیا گیا جہاں میری ملاقات مخصوص لب ولہجہ رکھنے والے امیر شاہ عرف میرو شاہ سے ہوئی جس نے مجھے حوصلہ دیا کہ اس کی میڈم مجھے چھڑوا لے گی اور ہوا بھی یہی، میڈم شکیلہ نے مجھے چھڑوا لیا اور میں اس کے ٹھکانے پر پہنچ گیا میڈم شکیلہ توقع کے برعکس نہایت خوبصورت اور نوجوان لڑکی تھی لیکن اس کا اثر ورسوخ بہت تھا۔ میں نے اسے اپنی تمام روداد سے آگاہ کیا۔ اس نے مجھے بھرپور مدد کی یقین دہانی کرائی۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ شامل ہونے کی پیشکش کی۔ یہاں سے فارغ ہو کر نور پور پہنچا تو ایک سانحہ میرا منتظر تھا۔ چاچی نے روتے ہوئے بتایا کہ پروین غائب ہے۔ میں میڈم شکیلہ کے پاس پہنچا اور اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔ میڈم کی راہنمائی میں، میں نے دل جیت سے بازپرس کی۔ ایک خون ریز لڑائی میں اسے دردناک موت سے ہمکنار کیا۔ دل جیت کے انکشاف کے مطابق پروین حیدر خان کے قبضے میں تھی۔ میری کارکردگی سے میڈم بہت خوش تھی اور مجھ پر غیر معمولی طور پر مہربان بھی۔ ایک دن میڈم کے اڈے پر میں نے ایک کمرے میں اسما کو بے ہوش پڑے دیکھا جو سردار حیدر خان کی بیٹی تھی۔ پھر میڈم نے مجھے تفصیل سے آگاہ کیا، اسی دوران اس کے اڈے پر حملہ ہوا۔ اس وقت وہ کمپیوٹر روم میں تھی اور مختلف اسکرینز پر مناظر کو دیکھ رہی تھی کہ ایک منظر میں حملہ آور پر ہماری نظر پڑی۔ وہ میرا جگری دوست کھالا تھا جو استاد ہلو کے گینگ کے ساتھ میڈم کے ٹھکانے میں داخل ہوا تھا لیکن میڈم نے خاص حکمت عملی کے تحت بازی پلٹ دی اور کھالا اس کی قید میں آ گیا۔ میڈم نے حیدر خان کی بیٹی اسما کو اغوا کرا لیا تھا اور اس کے عوض پروین کا مطالبہ کیا۔ اسما نے مجھے پہچان لیا اور مجھے غیرت دلانے کی کوشش کی لیکن میں مجبور تھا۔ اسی دوران میرے ایما پر میڈم نے کھالے کی مجھ سے ملاقات کرا دی لیکن کھالا اسما کو قید میں دیکھ کر آپے سے باہر ہو گیا۔ آخر کار طے یہ ہوا کہ ہم براہ راست حیدر خان کے ڈیرے پر پروین کے حصول کے لیے دھاوا بولیں گے۔ ہماری ٹیم کا سربراہ پیا نامی ایک تجربے کار شخص تھا۔ راستے میں ہمیں زخمی حالت میں وحید ملا۔ وحید کے ذریعے معلومات کے مطابق دل جیت کے آستانے پر ان دونوں بہن بھائیوں کو بے ہوشی کی حالت میں اغوا کر کے ڈیرے پر لایا گیا تھا لیکن قید کے دوران وحید کو تشدد کر کے مردہ جان کر پھینک دیا گیا جبکہ کسی نامعلوم فرد نے ہماری آمد سے قبل ڈیرے پر پہنچ کر وہاں موجود افراد کو ہلاک کر کے پروین، عاشی اور ایک مرد جو غالباً امیر نواز تھا، اپنے ساتھ لے گیا لہٰذا ہم یہاں سے خالی ہاتھ واپس آئے۔ اس دوران ہمارے گھر پر نامعلوم افراد ہمارے گھر کو جلانے پہنچ چکے تھے۔ ایک خونی کارروائی کے دوران ہم نے ان پر غلبہ حاصل کیا۔ میں اپنی بہنوں کو لے کر اپنی گاڑی تک پہنچا اور پیا کا انتظار کرنے لگا مگر وہ چاچا اور چاچی کو لانے میں ناکام رہا۔ البتہ موجو کو لے آیا۔ ہم اس جزوی کامیابی کے بعد واپس پہنچے جہاں ملتان کی حدود میں ہمارے لیے رہائش کا بندوبست کیا گیا تھا۔ کھالا بہروپ بدل کر نور پور سے یہ معلومات لے کر آیا کہ میرے گھر میں خون خرابے کی ذمے داری مجھ پر ڈال دی گئی تھی جائداد کی خاطر، بخت خان پھوپی اور غزالہ کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اسی دوران چند نامعلوم حملہ آوروں نے فارم ہاؤس پر حملہ کر دیا۔ ایک خونریز مقابلے کے بعد ہم انہیں ہلاک کرنے میں کامیاب ہوئے۔ یہاں سے فارغ ہو کر ہم اپنے ٹھکانے پر پہنچے۔ کھالا میرا ساتھ چھوڑ گیا۔ میڈم شکیلہ نے مجھے اسما کو اس کے خریدار، حیدر خان کے سرپرست میاں دلبر حسین کے سپرد کر کے رقم وصول کرنے کی ذمے داری دی اور ایک شخص کو میرے ساتھ کر دیا۔ ہم اسما کو لے کر جب دلبر حسین کے گرگے رنگو قسائی کے اڈے پر پہنچے تو اسے دیکھ کر میں بھونچکا رہ گیا۔ وہی تو میرے ماں باپ کا قاتل تھا لیکن میں نے انتقام کو دوسرے وقت کے لیے چھوڑ دیا اور کئی رکاوٹوں کو عبور کرتے ہوئے رقم لے کر میڈم کے پاس پہنچ گیا۔ میڈم بہت خوش تھی۔ اس نے رنگو قسائی کے سلسلے میں میری مدد کا وعدہ کیا۔ وہاں سے واپسی پر اچانک مجھے اغوا کر لیا گیا۔ مجھے اغوا کرنے والا ہمارے ہاتھوں مارے جانے والے سوبی کا دوست زور آور تھا۔ بعدازاں معلوم ہوا کہ وہ حیدر خان سے میرا سودا کر چکا تھا، کئی خونریز معرکوں اور آنکھ مچولی کے بعد میں اس کی قید سے رہا ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ رہائی کے بعد ڈرامائی طور پر میری ملاقات عاشی کے عاشق شاہد سے ہو گئی اور میں اس کی مدد پر آمادہ ہو گیا۔ جب گھر پہنچا تو شاہدہ نے مجھے کاغذات کا ایک پلندہ دیا جو میں اپنے گھر سے اٹھا لایا تھا۔ جو درحقیقت چاچا کی جائداد کی فروخت کے کاغذات تھے۔ خریدنے والے کا نام پڑھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ نام میرے والد کی زمین ہتھیانے والے کے بیٹے کا تھا یعنی کہ میرے گھرانے کی تباہی کی کہانی دہرائی گئی تھی۔ بہرحال میں نے شکر ادا کر کے وہ کاغذات سنبھالے اور میرو سے رابطہ کیا۔ میڈم کو ایک گمنام کال موصول ہوئی جس کے بعد اس نے روانگی کی تیاری شروع کر دی میں نے ضد کر کے میڈم کے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا۔ ہم ایک مکان میں پہنچے۔ جہاں ایک بوڑھا بندھا ہوا تھا۔ اس کا رویہ میڈم کے ساتھ نفرت انگیز تھا جو میرے لیے باعث حیرت تھا۔ میڈم نے اس سے ایک خاتون اور لڑکی کا پوچھا وہیں ایک خونریز معرکہ ہوا اور پیرو ماچھی غنڈے کا کردار سامنے آیا۔ اس پر بہ مشکل قابو پا کر میڈم کی طرف متوجہ ہوا۔ جو ہماری دسترس سے دور نکل گیا تھا۔ میڈم کی حالت کافی خراب تھی۔ راستے میں ایک مقامی ڈسپنسری میں میڈم کو دکھایا وہاں ڈاکٹر عالیہ اور اس کے شوہر صدیق سے ملاقات ہوئی جنہوں نے طبی امداد کے ساتھ ہماری مہمان نوازی بھی کی۔ میڈم کو ہمدرد پا کر عالیہ نے اسے ایک مظلوم لڑکی کینیڈا پلٹ نگینہ کی کہانی سنائی جو اپنے چچا وڈیرا انور روز بھٹی اور رفاقت بھٹی کے ظلم کا شکار تھی پناہ کی درخواست پر میڈم نے ساتھ دیا اور نگینہ کو اپنے بنگلے پر لے آئی۔ پھر ہم میڈم کی ماں اور بھائی سیمو کی تلاش پر روانہ ہوئے۔ ہم دریا پار کرنے کے لیے گاڑی کو کشتی پر سوار کرا رہے تھے کہ پیرو ماچھی نے ہمیں للکارا جو دریا پار سے واپس آ چکا تھا اور ملاح دینا کے کیبن میں سو گیا تھا۔ میڈم نے اپنے روایتی انداز میں اسے زچ کیا اور ایک خونی لڑائی میں ہم اس

کو پانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق میڈم کے عزیزوں کو سردار یارن خان نے اغوا کرایا تھا۔ میرے لیے یہ انکشاف ہی تھا کہ یارن خان میڈم کا عاشق تھا کیونکہ میں اسے ایک تارک الدنیا شخص سمجھتا تھا۔ میڈم نے مجھے نور پور جا کر یارن خان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی ذمے داری سونپی، میاں جی نے پھیری لگا کر سامان بیچنے والے پٹھان گلاب خان کا گیٹ اپ دیا اور میں اس سوانگ میں نور پور پہنچا کھالا مجھے پہچان گیا۔ وہیں میری ملاقات غزالہ سے ہوئی۔ جو مجھے پہچان نہ سکی۔ ایک رات میں یارن خان کی حویلی میں داخل ہوا۔ وہاں خوفناک بل ٹیریر کتوں سے میرا سامنا ہوا لیکن میں ان پر بہ مشکل تمام قابو پانے میں کامیاب رہا اور اس کوشش میں زخمی ہو گیا۔ وہیں ایک بندے سے میری مڈبھیڑ ہوئی اور مقابلے کے بعد اس نے مجھے زیر کر کے چاقو سے فیصلہ کن ضرب لگانا چاہی تو ایک نسوانی چیخ سنائی دی جسے میں لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ وہ آواز خانزادی کی تھی۔ پرویز پر قابو پانے کے بعد میں نے تہ خانے کا دہانہ تلاش کیا۔ تہ خانے میں برکت مسیح سے مڈبھیڑ ہوئی اس سے سخت تگ ودو کے بعد یرغمال بنا کر ماں جی اور سیمو کے بارے میں دریافت کیا اس کے مطابق وہ دونوں آغا نورن کے پاس تھے۔ یارن خان کے سلسلے میں ناکامی ہوئی وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا باہر پولیس نے گھیرا ڈال لیا تھا یہاں برکت میرے کام آیا میں خانزادی کو لے کر ایک سرنگ کے ذریعے باہر آ گیا۔ خان زادی کو میں نے کھالے کے حوالے کیا اور ماں اور سیمو کی تلاش میں نورن آغا کے ٹھکانے پر پہنچا۔ اسے بے ہوش کر کے ان دونوں کو ساتھ لے کر میڈم کے پاس پہنچا مگر میڈم میری توقع کے برخلاف ناراض تھی۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی لیکن میڈم نے اپنے رویے کی وضاحت کی۔ اور ساتھ یہ خوش خبری بھی سنائی کہ میرے ماں باپ کے قاتل رنگو قسائی کو اس نے اٹھوا لیا تھا۔ کھالے نے بتایا کہ حیدر خان سخت پریشان ہے اور مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں نے میڈم سے مشورہ کر کے اس ہوٹل میں ملاقات طے کر لی۔ حیدر خان یارن کی بیٹی کو اٹھوا لینا چاہتا تھا۔ میں نے میڈم کی مرضی کے مطابق دو کروڑ میں سودا طے کیا۔ اسی ہوٹل کے کمرے میں میڈم میری منتظر تھی۔ پھر سنگین و رنگین لمحات کے دوران میڈم شکیلہ نے اپنے ماضی کے اوراق سے پردہ اٹھایا کہ وہ ایک امیرزادی کی ناجائز اولاد تھی اور ایک چوکی پر دریا میں بہتی ہوئی مچھیرے گامن کے پاس پہنچی اور اس نے اسے اپنی بیٹی بنا کر رکھ لیا۔ امیرزادی کو بھی اس کا علم ہو گیا اور اس نے اس کی تعلیم کی خواہش کا اظہار کیا۔ گامن نے اسے اسکول میں داخل کرایا اور اس کو چندو ہی کے نام سے پکارنے لگا۔ جوان ہونے پر میر ظفر حیات کے بیٹے عمر حیات نے اس سے چھیڑ چھاڑ کی کوشش کی جس کی شکایت اس کے باپ سے کی گئی جس کے بدلے میں گامن کو فائر کر کے زخمی کر دیا۔ مجبوراً چندو اس کے ساتھ جانے پر راضی ہو گئی جہاں اس نے اسے مارا پیٹا پھر شرمندہ ہوا اور اسے واپس چھوڑ گیا لیکن اب گامن اور اس کا گھرانا چندو سے سخت ناراض تھا۔ عمر حیات نے اسے اپنانے کا عہد کیا اور اسے کورٹ میرج کے لیے ساتھ لے گیا اور دونوں شادی کی پلاننگ کر رہے تھے کہ عمر حیات کی ماں اپنی بیٹیوں کے ساتھ آ دھمکی۔ یہاں کچھ جذباتی اتار چڑھاؤ کے بعد اس کی ماں ان دونوں کی شادی پر راضی ہو گئی اس شرط کے ساتھ کہ پہلے چندو اپنی تعلیم مکمل کرے گی حویلی میں رہ کر۔ حویلی میں آ کر اس نے تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا اور میٹرک میں بورڈ میں تیسری پوزیشن حاصل کی۔ اس دوران عمر حیات کا ماموں رضوان ان کے ہاں آیا جو گوشہ نشین اور دین دار شخص تھا۔ اس نے چندو کے مستقبل کے بارے میں تشویش ناک اور حیرت انگیز پیش گوئیاں کیں۔ پھر ایک غلط فہمی کے نتیجے میں عمر حیات نے چندو پر تشدد کیا اور اسے گھر سے نکال دیا۔ جب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو وہ اسے لینے آیا لیکن چندو نے انکار کر دیا اسی دوران ملک افراسیاب کی گاڑی وہاں سے گزری جو کہ ایک بدمعاش اور عیاش آدمی تھا اس نے عمر حیات کو گولی مار دی اور چندو کو زخمی حالت میں اٹھا کر اپنے ڈیرے پر لے آیا جہاں اس کے گرگوں نے چندو کو یارن خان کے ہاتھ فروخت کرنے کا پلان بنا لیا اور رات کی تاریکی میں شراب کے نشے میں اس کے پاس پہنچ گئے۔ جانو اور لالو نے باری باری اسے پامال کیا اور پھر سنوار کر یارن خان کے کارندے رنگو کے حوالے کرنے کی کوشش کی، اسی دوران جانو نے لالچ میں لالو کو قتل کر دیا لیکن رنگو جو لالو کا دوست تھا اسے بھی جان سے مار دیا۔ یارن خان کے بعد حیدر خان کے پاس سے ہوتے ہوئے چندو میاں دلبر حسین کے پاس پہنچی سب نے اس کے ساتھ ایک ہی سلوک کیا جس کے باعث وہ حاملہ ہو گئی، دلبر حسین نے اسے اپنے نوکر مظہر کے حوالے کر دیا۔ وہاں فرار کی کوشش کے بعد مظہر کو چندو نے قتل کر دیا۔ یہاں ڈاکٹر شاہ جی نے اس کی مدد کی اور اس کے بچے کو اپنا نام دینے کے لیے پناہ کے ساتھ ہی شادی پر بھی تیار ہو گیا۔ لیکن صرف کاغذی حد تک۔ اسی دوران اس کے بیٹی پیدا ہوئی جسے ڈاکٹر نے چندو کی مرضی سے اپنے دوست کے حوالے کر دیا پھر پلان کے مطابق اس کو طلاق دے کر نرسنگ ہاسٹل میں داخل کر دیا۔ جہاں اس کی ملاقات جوزفین سے ہوئی جس نے اسے جمال گیلانی کے متعلق بتایا جو مالدار آدمی تھا اور قریب المرگ تھا لیکن شادی کرنا چاہتا تھا۔ چندو کی اجمل گیلانی سے شادی کے بعد ساری جائداد اس کے نام منتقل ہو جاتی ہے لیکن اس کے انتقال کے بعد عمر حیات کی بڑی بہن خفیہ پولیس کو لے کر آ جاتی ہے اور اپنے بھائی عمر حیات کے قتل کے الزام میں چندو کو گرفتار کراتی ہے جہاں انسپکٹر بدر واسے بے عزت کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ اسے قتل کر کے نکل جاتی ہے اور مشکلات سے گزرتی ہوئی اجمل گیلانی کا گینگ سنبھال لیتی ہے اور چندو سے شکیلہ بننے کی کہانی ختم ہوتی ہے۔ پھر میڈم رنگو قسائی کو میرے حوالے کر دیتی ہے۔ ایک سنسنی خیز مقابلے کے بعد رنگو مات کھا جاتا ہے اور مجھے میرے باپ کے قتل اور قاتلوں کے متعلق بتاتا ہے۔ میرے ماں باپ کو یارن خان نے حیدر خان اور میاں دلبر کے تعاون سے قتل کروایا تھا اس انکشاف کے بعد میں نے رنگو قسائی کو جہنم واصل کیا۔ میڈم نے مجھے نگینہ کے ہمراہ نوروز بھٹی اور اس کے خاندان کی تباہی کی ذمے داری سونپی۔ ایک خونریز معرکے کے بعد نوروز کے بیٹوں کو ہلاک کرنے میں کامیاب ہوئی۔ اسی دوران نگینہ شدید زخمی ہو گئی میں اسے زخمی حالت میں کسی اسپتال میں لے جا رہا تھا پولیس تعاقب کر رہی تھی کہ ایک صحت مرکز کے دروازے پر میری اس سے ملاقات ہو گئی۔ وہ ڈاکٹر میری گمشدہ بہن پروین۔ اس نے مجھے مختصراً بتایا کہ وہ کس طرح یہاں تک پہنچی اور یہ بھی کہ وہ یہاں امیر نواز کے ساتھ ہے اور ڈاکٹر شاہ جی جو یہاں کا منتظم ہے اس نے ان دونوں کی شادی کرا دی ہے۔ ڈاکٹر شاہ جی نے نگینہ کو دیکھا اور ابتدائی طبی امداد دی اور ہماری پولیس سے گلو خلاصی کرائی اور نگینہ کو اسپتال منتقل کرنے کی ہدایت کی۔ میں نے میڈم سے رابطہ کیا اور نگینہ کو اس کے اسپتال پہنچا دیا گیا۔ پھر میں نے میڈم سے اجازت لی اور پچھلے گیٹ اپ میں نور پور پہنچا۔ وہاں کھالے سے مل کر غزالہ سے ملاقات کا بندوبست کیا لیکن ہماری ملاقات جاری تھی کہ دروازہ ٹوٹنے کا دھماکا ہوا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

WWW.PAKSOCIETY.COM

میرا استفسار عبث اور بے محل تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے بخشو لوہار کے کمرے کی چھت کو سہارا دینے والا شہتیر حائل تھا جس کی وجہ سے مجھے دروازہ توڑنے والے کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ گردن سے نچلا آدھا دھڑ نظر آ رہا تھا۔ اس نے دیہاتی طرز کی قمیص اور سفید شلوار پہن رکھی تھی۔ جثے کے اعتبار سے خاصا لحیم شحیم معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ڈبل کے گن کی نال میری جانب اٹھی ہوئی تھی اور گن بردار کے سنگین عزائم کا پتا دے رہی تھی۔

حیرت اور خوف کا ابتدائی مرحلہ گزر گیا تو مجھے غزالہ کی موجودگی کے باعث رونما ہونے والی خطرناکی کا احساس ہوا۔ میں نے غزالہ کو دیکھا اور آنکھوں سے کمرے سے نکل جانے کا اشارہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی میں سرعت سے دائیں طرف ایک قدم بڑھ گیا۔ اس سے یہ ہوا کہ غزالہ میری آڑ میں رہتے ہوئے کمرے سے نکل سکتی تھی۔ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر مجھے احساس ہو گیا کہ وہ جوں کی توں کھڑی تھی۔ خوف اور پریشانی کے سبب اس میں قدم اُٹھانے کی سکت نہیں رہی تھی۔

میں نے قدرے دھیمے مگر درشت لہجے میں کہا۔

''غزالہ! نکل جاؤ یہاں سے......''

ایسے ہی وقت میں ٹوٹے ہوئے دروازے کے باہر کئی افراد دکھائی دیے۔ گن بردار کا چہرہ بھی دکھائی دے گیا کیونکہ وہ دروازہ عبور کرنے کے لیے قدرے جھک آیا تھا۔ اس کا چہرہ پتھرایا ہوا تھا اور آنکھوں میں تیز سرخی موجزن تھی۔ اس قماش کے لوگ بہت سنگ دل ہوتے ہیں۔ میں نے ایک بار پھر غزالہ کو کمرے سے جانے کا حکم دیا۔ کمرے میں داخل ہونے والے تنومند حملہ آور کی وجہ سے میں غزالہ کی طرف دیکھنے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا مگر میرے کان اس کے قدموں کی چاپ پر لگے ہوئے تھے۔ ایسے ہی وقت میں گن بردار کے حلق سے غراتی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔

''اے کم ذات! ایدھر ای کھڑی رہ...... نی تاں گولی مار دیاں گا!''

اس کا لہجہ ٹھیٹھ پنجابی تھا۔ یہ طے تھا کہ وہ اس علاقے کا رہنے والا نہیں تھا۔ اسی اثنا میں غزالہ نے زقند بھری اور بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ اس کا محفوظ ہونا میرے لیے طمانیت بخش امر تھا۔ میرے مقابل نے دانت کچکچائے، گن کی نال کا رُخ کمرے کے اندرونی دروازے کی طرف کیا مگر پھر فوراً ہی نال کا رُخ میری جانب کر دیا۔ میں نے اس لمحے سے فائدہ اُٹھانا چاہا تھا مگر اس کی چابک دستی نے مجھے روک دیا۔

وہ مجھ پر نظریں مرکوز رکھ کر پنجابی لب و لہجے میں بولا۔

''ہاتھ سر سے بلند کر لو جوان!''

میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اسی اثنا میں باہر آواز گونجی۔ ''ایں بے غیرت کوں باہر کھن آ......''

(اس بے غیرت کو باہر لے آؤ)

جونہی یہ شناسا سا آواز میرے کانوں میں پڑی، یک بارگی میرے اعصاب جھنجھنا اُٹھے۔ یارن خان کی پاٹ دار آواز مجھے لمحے بھر کا مغالطہ بھی نہیں دے سکتی تھی۔ باہر کھڑے کئی افراد میں ایک وہ بھی تھا جو ابھی تک دکھائی نہیں دیا تھا۔

''اوئے بشیرے! ادھر سے جاؤ اور کھالے کو میرے پاس بلا لاؤ۔ وہ بے غیرت دلال گھر میں دبکا بیٹھا ہوگا۔'' یارن خان کی کڑک دار آواز سنائی دی۔ ''کنجر کے پتر نے گھر کو کوٹھا بنا رکھا ہے۔ دلالی کرتا ہے...... اسے بھی آج دیکھ ہی لیتا ہوں۔''

اس دوران لحیم جثے والا شخص مستعدی سے گھوم کر میرے پہلو میں پہنچ گیا۔ گن کی نال میری پسلیوں میں چبھو کر خشمگیں آنکھوں سے باہر چلنے کا اشارہ کرنے لگا۔ اس نے ابھی تک کسی غلطی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا ورنہ میں اس پر حملہ کرنے میں ایک پل کی تاخیر نہ کرتا۔ ناچار، اس کے دھکیلنے پر پہلو کے بل چلتا ہوا ٹوٹے ہوئے دروازے تک پہنچا۔ ایک نظر دیکھنے پر ہی پتا چل گیا کہ یارن خان اپنے لاؤ لشکر سمیت باہر موجود تھا۔ اس کے پرانے نمک خوار تو میرے ہاتھوں واصلِ جہنم ہو چکے تھے اس لیے آج نئے چہرے دکھائی دے رہے تھے۔ سڑک کے پار، شیرے قسائی کے گھر کی جانب، نور پور کے چند شناسا چہرے بھی جو تماشا دکھائی دیے۔

یارن خان کے پہلو میں تین گن بردار باڈی گارڈ کھڑے تھے، جنہوں نے مجھے فی الفور اپنے نرغے میں لے لیا۔ مجھے بخشو لوہار کی دکان سے گن پوائنٹ پر باہر لانے والے نے مشاقی سے میری تلاشی لی اور جو ہاتھ لگا، نکال لیا۔

یارن خان نے گہری نظروں سے مجھے گھورا۔ ''اوئے کتے کے بچے! تمہاری یہ جرأت کہ تم نور پور میں آ کر دن دیہاڑے ایسی حرکت کرو...... میں تمہارے تھوبڑے کو عبرت کا نشان بنا دوں گا۔ سارا نور پور دیکھے گا اور اپنی آنے والی نسلوں کو بھی تمہارے بھیانک انجام کی کہانی سنائے گا۔ اوئے لے چلو اسے...... حویلی میں......''

بشیرا تیز قدموں سے چلتا ہوا خان کے قریب پہنچا اور

بولا۔ ''خان جی! کھالا گھر میں موجود نہیں ہے۔ حکم دیں تو بخشو کو پکڑ لاؤں؟''

میری حالت دگرگوں تھی۔ میری اور غزالہ کی ملاقات ایک جانکاہ تماشا بن کر نور پور کے سامنے آ گئی تھی۔ اگر میں اپنے اصل روپ میں ہوتا تو صورتِ حال بہتر نہ ہوتے ہوئے بھی اتنی کبیدہ خاطر نہ ہوتی جتنی اَب تب میں ہونے والی تھی۔ میں سب کی نظر میں ایک نووارد پٹھان کے روپ میں تھا جس نے نور پور کی عزت پر ہاتھ ڈال کر بقول یارن خان دن دیہاڑے ناقابلِ معافی جرم کا ارتکاب کیا تھا۔

''اوئے بشیرے! جا اپنے سائیں کو ادھر بلا لا۔ بڑا خان بنا پھرتا ہے۔ مونچھ تلے گندگی کی پوٹ رکھ کر ناک اونچی رکھتا ہے۔''

میں فی الفور سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ سردار بخت خان کی طرف تھا کیونکہ بشیرا بخت خان کا خاص ملازم تھا اور غزالہ اپنی ماں سمیت بخت خان کی حویلی میں اقامت پذیر تھی۔ بشیرے نے ادھر ادھر دیکھا، پھر تیز قدموں سے بخت خان کی حویلی کی طرف بڑھ گیا۔

یارن خان کے اشارے پر مجھے نرغے میں لینے والوں نے خان کی حویلی کی طرف دھکیلنا شروع کر دیا۔ میرا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا اور اس مرگِ مفاجات سے کسی طور نکلنے کی ترکیب سوچ رہا تھا مگر عافیت کی کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ عجیب مشکل میں پھنس گیا تھا۔ اگر میں اپنی اصلیت یارن خان پر آشکار کر دیتا تو اپنی یقینی موت کا سامان کر لیتا۔ اگر خاموش رہ کر بہ دستور اسی روپ میں رہتا تو بھی اس سے خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ وہ غیرت کے نام پر میرا بھرکس نکالنے والا تھا۔ جونہی میں حیات خان کے دارے کے قریب پہنچ کر یارن خان کی حویلی کی طرف مڑا، بخت خان گلی میں بشیرے کے ساتھ کھڑا دکھائی دیا۔ وہ غالباً بشیرے سے اس معاملے کی نوعیت اور جزئیات کے بارے میں دریافت کر رہا تھا اور سنگینی کو بھانپنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ایسے میں کھالے کے گھر سے بخشو لوہار برآمد ہوا۔ خان کے ایک کارندے نے اسے اپنے ساتھ لیا اور ہمارے پیچھے چل پڑا۔ میری وجہ سے کھالے کا گھر بھی زیرِ عتاب آ گیا تھا۔ اس میں کوئی کلام نہیں تھا کہ یارن خان پرلے درجے کا کینہ پرور شخص تھا۔ وہ بے حیائی کو جواز بنا کر کھالے کے خاندان کی تکا بوٹی کر سکتا تھا۔

سلگتے ہوئے ذہن کے ساتھ میں کائیاں گن برداروں کے نرغے میں چلتا ہوا یارن خان کی حویلی میں داخل ہوا۔ یارن خان مجھ سے چند قدم آگے روایتی طمطراق سے چل رہا تھا۔ اس نے ابھی تک پلٹ کر میری جانب نہیں دیکھا تھا اور نہ اس نے یا اس کے کسی کارندے نے مجھے مخاطب کیا تھا۔ حویلی کا دیکھا بھالا کاریڈور عبور کر کے مجھے شاہانہ طرز کے ڈرائنگ روم میں لایا گیا جہاں یارن خان صوفے پر براجمان ہو گیا تھا۔

مجھے وسیع و عریض ڈرائنگ روم کے وسط میں کھڑا کر کے گن بردار چند قدم پیچھے ہٹ گئے۔ ایک سیاہ فام باڈی گارڈ یارن خان کے عقب میں جا کھڑا ہوا اور مجھے نشانے پر لے کر خون آشام نظروں سے گھورنے لگا۔ اس کی مضطرب انگلی گن کے ٹریگر پر کانپ رہی تھی اور مجھے یہ تنبیہ کر رہی تھی کہ میری معمولی سی مشکوک حرکت میرے لیے موت کا سامان پیدا کر دے گی۔ میں نے گردن موڑ کر دوسرے لوگوں کی طرف نہیں دیکھا تھا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ وہ دروازے کے پاس...... اسی حالت میں کھڑے ہوں گے جس پوزیشن میں سیاہ فام گن بردار کھڑا تھا۔

''ہاں بھئی! بول...... تیرا نام کیا ہے؟'' خان کی شعلے اگلتی آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں۔

میں نے چند لمحے سوچا۔ بجا کہ میرا بھیس مجھے کوئی تحفظ یا فائدہ نہیں دے سکتا تھا مگر یہ بھی طے تھا کہ میرا اصل روپ آشکار ہونے پر خان برانگیختہ ہو کر مجھے گولیوں سے بھون ڈالنے کا حکم صادر کر دیتا۔ سرِ دست میں نے اسی بہروپ میں رہنے کا فیصلہ کیا اور کہا۔ ''خان جی! میں گلاب خان ہوں۔''

''کہاں سے آئے ہو؟''

''اُدھر پخور (پشاور) سے......''

''تمہارا کھالے سے کیا تعلق ہے؟''

''کچھ بھی نہیں۔''

''پھر اس نے تمہیں اپنی ورکشاپ میں کیوں گھسنے دیا حرام زادے؟'' یارن خان کی آنکھیں شعلے اگلنے لگیں۔

میں نے کندھے اُچکانے پر اکتفا کیا۔

''اس لڑکی سے تمہاری واقفیت کیسے ہوئی؟''

''کس لڑکی سے؟'' میں نے مصنوعی تعجب سے کہا۔

اسی لمحے میری گدی پر بھاری ہاتھ پڑا۔ دماغ جھنجھنا اُٹھا۔ میرے عقب میں کھڑے ہوئے قوی الجثہ کارندے نے قدم بڑھا کر خاصے زور کا ہاتھ جمایا تھا۔ میں نے سر جھٹکا۔ آنکھوں کے آگے ناچنے والے تاروں سے گلوخلاصی کی۔ قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''خان جی! اَم تمارا دشمن

WWW.PAKSOCIETY.COM

نئیں اے۔ تم اَم سے دشمنی مت کرو ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔''

اس نے میرے الفاظ پر غور کیا اور مجھے بغور دیکھا۔ شاید میری بات کے عقب میں چھپی ہوئی سنگین دھمکی کا دل ہی دل میں جائزہ لیا، سرد لہجے میں بولا۔ ''ورنہ کیا اچھا نہیں ہوگا؟''

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔ ''اَم اکیلا نہیں اے۔ اَمارا گینگ اے جس نے تمارا حویلی دیکھ لیا تو تمارا جینا مشکل کر دے گا۔''

اس کے لبوں پر ایک سفاک مسکراہٹ ابھری۔ میری یہ کوشش ناکام گئی تھی۔ وہ بجائے خوفزدہ ہونے کے، زیادہ خطرناک ہو گیا تھا، بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ میرا جینا پہلے بھی کچھ زیادہ آسان نہیں ہے۔ تمہاری وجہ سے تھوڑا بہت اور مشکل ہو گیا تو کچھ نہیں ہوگا۔ شاباش! اب تمہاری زبان چل پڑے تو تمہارے لیے بہتر ہوگا۔ جو پوچھتا جاؤں، صاف صاف بتاتے جانا۔ ہاں! اس لڑکی سے تمہارا کیا تعلق ہے؟''

''وہ اَم سے استری لینے آیا تھا۔'' میں نے منہ بنا کر کہا۔

''اچھا! بند کمرے میں تم اسے استری دے رہے تھے...... واہ! کیا کہنے تمہارے...... لگتا ہے، تم سیدھی طرح ماننے والوں میں سے نہیں ہو۔'' یارن خان زخمی سانپ کی طرح پھنکارا اور ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے کارندوں سے کچھ کہنا چاہا، مگر کاریڈور میں بھاری قدموں کی چاپ سن کر ٹھٹک کر رک گیا۔ چند لمحوں بعد بخت خان شیرے کے ہمراہ دروازے میں دکھائی دیا۔ وہ اپنی مخصوص شاہانہ چال چلتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور مجھ پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر یارن خان کے پاس چلا گیا۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''خان! اسے جانے دو۔ یہ کوئی غیر نہیں ہے، اپنا بچہ ہے۔ شہرا...... سوہنے بلوچ کا پتر شہریار...... پولیس کی نظروں سے چھپنے کے لیے اس نے یہ سوانگ رچا رکھا ہے۔''

اس کی بات سن کر مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ اس نے مجھے کیسے ایک نظر میں پہچان لیا تھا؟

کم و بیش حیرانی کی یہی کیفیت یارن خان پر طاری ہوئی۔ وہ مجھے تشکیک آمیز نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔ ''مگر بخت خان! یہ شہرا تو نہیں ہے...... ڈاڑھی مونچھ تو نقلی ہو سکتی ہے مگر دیکھو! اس کی تو آنکھیں تک نیلی ہیں۔ نور پور میں شہرے سمیت کسی بھی شخص کی آنکھیں نیلی نہیں ہیں۔''

بخت خان نے مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی شکوک و شبہات کے ڈورے تیرے۔ محتاط انداز میں قدم اُٹھاتا ہوا میرے پاس آیا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہایت سرد لہجے میں بولا۔ ''پیچو کتھاں اے؟''

(پیچو کہاں ہے؟)

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میکوں پتا کائنی خان جی!''

(مجھے علم نہیں ہے خان جی!)

اس کے لبوں پر گہری مسکراہٹ ابھری۔ پلٹا۔ یارن خان سے مخاطب ہوا۔ ''خان! یہ شہرا ہی ہے۔ اس نے آنکھوں میں کچھ ڈال رکھا ہے۔''

میں اس گھڑی ایک دم فراموش کر بیٹھا تھا کہ میں نے اس سے یا کسی سے بھی سرائیکی زبان میں بات نہیں کرنا تھی۔ اسے جواب دیتے ہوئے مجھ سے ایک نہیں، تین غلطیاں سرزد ہوئی تھیں۔ ایک تو میں نے آواز نہیں بدلی تھی، دوسری غلطی یہ کی تھی کہ میرا لہجہ سرائیکی تھا اور تیسرا مجھ سے اس فاش غلطی کا ارتکاب ہوا تھا کہ میں نے سوال کی نوعیت کو سمجھے بغیر پیچو کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کر دیا تھا۔ اصولی طور پر مجھے اس حیرت کا اظہار کرنا چاہیے تھا کہ پیچو کون ہے اور میں پیچو کو نہیں جانتا۔

یارن خان نے کہا۔ ''ٹھیک ہے بخت خان! تم جاؤ۔ میں اسے چھوڑ دوں گا۔''

بخت خان نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں خان! میں اسے لے کر جاؤں گا۔ مجھے اس سے بہت کچھ پوچھنا ہے۔ اوئے! یہ بندوقیں نیچی کرو۔ خوامخواہ فلمی سچویشن مت بناؤ۔''

یارن خان نے سرد نظروں سے مجھے اور پھر بخت خان کو گھورا، بولا۔ ''اگر یہ واقعی شہرا ہے تو بھی اسے نور پور میں چوروں کی طرح آنے اور بے غیرتوں کی طرح عزت میں نقب لگانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ یہ ہمارے خاندان کا مجرم ہے۔ اسے سزا ملنی چاہیے۔''

''نہیں خان! یہ کسی اور سے نہیں، اپنی منگیتر سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ بخشو لوہار کی دکان میں اسی سے مل رہا تھا۔ بخشو یا اس کے پتر کمالے کا کوئی قصور نہیں ہے۔ انہیں اس کی اصلیت کا علم تھا۔ اس لیے انہوں نے اس ملاقات کی اجازت دے دی۔''

''تمہیں اس سارے ڈرامے کا کیسے پتا چلا ہے؟'' یارن خان کے لہجے میں تشکیک بھری ہوئی تھی۔

''اس کی منگیتر غزالہ مائی سے...... تمہارے ادھر آتے ہی وہ بھاگ کر میرے پاس پہنچی اور اس نے مجھے یہ ساری رام کہانی سنائی۔ اچھا! میں چلتا ہوں۔ چلو بھئی شہرے میاں! ذرا تم سے حساب کتاب کر لوں۔''

مجھے ساتھ چلنے کا اشارہ کر کے بخت خان نے کمرے سے نکلنا چاہا۔ یارن خان نے اپنے کارندوں کو اشارہ کیا۔ گری ہوئی بندوقیں اُٹھ گئیں۔ پہلے میں نشانے پر تھا۔ اب میرے ساتھ ساتھ بخت خان بھی نشانے کی زد میں تھا۔ بخت خان نے کارندوں کو غصہ بھری نظروں سے دیکھا پھر پلٹ کر یارن خان سے مخاطب ہوا۔ ''خان! اپنے بندوں سے کہو، بندوقیں نیچی کر لیں۔''

''نہیں بخت خان! شہرا میرا مجرم ہے۔ یہ میری مرضی سے جائے گا۔ تم مہمان ہو، جانا چاہو تو چلے جاؤ۔ بیٹھنا چاہو تو اپنی حویلی سمجھ کر بیٹھ جاؤ۔ اگر اسے لے جانا چاہو گے تو بندوقیں چل جائیں گی۔ گولی اندھی ہوتی ہے۔ تم جانتے ہی ہو کہ یہ اپنے پرائے کی پہچان نہیں رکھتی۔''

یارن خان کے لہجے میں بلا کی سفاکی رچی ہوئی تھی۔ بخت خان کی تیوری چڑھ گئی۔ ہاتھ ہولے ہولے لرزنے لگے، بولا۔ ''تم اچھا نہیں کر رہے ہو خان! ہمارے درمیان پیدا ہونے والی دوستی ابھی اتنی پرانی نہیں ہوئی کہ ان رویوں کو برداشت کر سکے۔''

''بھی تو کہتا ہوں کہ خاموشی سے چلے جاؤ۔ باہر جا کر کسی کو یہ نہ بتانا کہ یہ الو کا پٹھا شہریار ہے۔ اس حرام زادی کو بھی کہہ دینا کہ اس سے ملنے والا اس کا منگیتر نہیں، واقعتاً کوئی اجنبی ہے جو اسے دھوکا دے رہا تھا۔''

''نہیں خان! میں اسے لے کر ہی جاؤں گا۔''

یارن خان نے منہ بنایا۔ ہاتھ کا اشارہ کیا۔ اس کے عقب میں کھڑا ہوا سیاہ فام باڈی گارڈ بجلی کی سی تیزی سے صوفے کے باہر آیا۔ گن کی نال بخت خان کی پسلیوں میں چبھوتے ہوئے غرایا۔ ''چلو باہر!''

ایک نال میری کمر میں چبھ گئی۔ میں نے ایک طویل سانس لی۔ بخت خان کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں میں تشویش کے ڈورے تیر رہے تھے۔ اس نے دبنگ لہجے میں کہا۔ ''یارن خان! تم دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر لے رہے ہو۔ یہ ذہن میں رکھ لو تم ایک قدم بھی نور پور میں نہیں چل سکو گے۔ رہی بات شہرے کی، تو میں اسے لے کر ہی جاؤں گا۔ تم میں جرأت ہے تو اس کے ساتھ مجھے بھی گولی مار دو۔''

موت کے شعلے اگلنے پر مائل بندوقوں کے سائے میں کھڑا ہونے کے باوجود بخت خان کی بے خوفی اور دلیری میرے لیے بڑی تعجب خیز تھی۔ میں اسے بزدلوں کی حد تک شریف اور پرامن شخص سمجھتا تھا۔ اس کے اٹل رویے نے یارن خان کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ وہ چند لمحے کھڑا بخت خان کو گھورتا رہا، پھر کندھے اُچکا کر بولا۔ ''آخر تم اس لونڈے کے لیے اتنے سنجیدہ کیوں ہو رہے ہو بخت خان؟''

''یہی سوال میں بھی کر سکتا ہوں کہ تم اس بے ضرر انسان کو مارنے اور سزا دینے پر کیوں تلے ہوئے ہو؟'' بخت خان کے لہجے میں غیر معمولی خنکی عود کر آئی تھی۔

یارن خان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہاتھ کے اشارے سے اپنے کارندوں کو گنیں نیچی کرنے کا حکم صادر کرتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا۔ پہلو میں صوفے تھپتھپا کر بولا۔ ''ٹھیک ہے بخت خان! تمہیں ناراض نہیں کیا جا سکتا۔ ادھر آؤ۔ بیٹھو۔ اوئے! تم بھی ادھر صوفے پر بیٹھ جاؤ۔''

مؤخر الذکر حکم میرے لیے تھا۔

بخت خان نے 'شکریہ' کہا اور جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ یارن خان نے کچھ دیر بیٹھنے کا اصرار کیا۔ جب بخت خان اس کے پہلو میں بیٹھ گیا تو اس نے اپنے گن برداروں کو کمرے سے جانے کا حکم دیا۔ پنجابی لب و لہجے والے کارندے کو مخاطب کر کے بولا۔ ''شیر دل! مہمانوں کے لیے پانی وانی کا بندوبست کرو۔''

بخت خان کی دلیرانہ ضد کی وجہ سے یارن خان کی کایا پلٹ گئی تھی۔ یارن خان کے شکست خوردہ رویے کو دیکھنے کے باوجود بخت خان کے چہرے پر تشکیک اور تذبذب کے آثار ثبت تھے۔ اس نے مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا، بولا۔ ''خان! تم نے الیکشن لڑنا ہے۔ بارہا کہہ چکا ہوں کہ تمہارا مقابلہ گھاگ سیاست دان سے ہوگا۔ حیدر خان تم سے بڑا نہیں ہے مگر اس کا سیاسی قد کاٹھ تم سے کہیں بڑا ہے۔ ویسے بھی سیاست کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ جو اسے اپنے بس میں لے لیتا ہے، وہ کسی کے بس میں نہیں رہتا۔ تمہیں سمجھاتا رہتا ہوں مگر تم سمجھنے کے بجائے بار بار غلطی کرنے پر مائل ہو جاتے ہو۔ سردار حیدر خان کو دیکھو۔ وہ سب کچھ کرتا ہے مگر بہ ظاہر کچھ نہیں کرتا۔ وہ سیکڑوں گلے کاٹتا ہے، پیٹ بھر کر خون پیتا ہے مگر اس کے ہاتھ اور آستینیں صاف رہتی ہیں۔ وقت آنے پر معصوم بن کر عوام کے سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔''

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا بخت خان!'' یارن خان نے اسے گہری نظروں سے گھورا۔ ''کھل کر کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟...... کیا سمجھانا چاہتے ہو؟''

''یہی دیکھو! پورے نور پور کو علم ہو گیا ہے کہ پٹھان کے روپ میں نور پور آنے والا اور اپنی منگیتر سے ملنے والا کوئی اور نہیں، بلکہ سوہنے بلوچ کا پتر شہریار ہے۔ غزالہ اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

کی پھوپی زاد ہے۔ بچپن سے دونوں کی منگنی ہوئی ہے۔ اس رشتے کو بھی پورا نور پور جانتا ہے۔ تم اسے مارو گے، اس قصے کو اچھالو گے تو نور پور والے تمہیں برا کہیں گے۔ ظالم کہیں گے۔ منہ پر نہیں پیٹھ پیچھے۔ اور تمہیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ووٹ ہمیشہ پیٹھ پیچھے کھڑے ہو کر ڈالا جاتا ہے۔''

اس نے سمجھ جانے کے سے انداز میں سر ہلایا، بولا۔ ''خیر! اب تو تمہاری ضد پر میں نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ دل نہیں مانتا مگر میں نے تمہاری بات مان لی ہے۔ اب یہ قصہ ختم سمجھو۔ ہاں! اس سے کچھ پوچھ گچھ تو کر لینے دو۔''

بخت خان کے چہرے پر اطمینان کی ہلکی سی لہر ابھری۔ سر ہلا کر تن آسان بیٹھ گیا۔ گویا اس نے خان کو تفتیش کی اجازت دے دی تھی۔

''ہاں بھئی شہرے میاں! آج کل کن فضاؤں میں اڑ رہے ہو؟ اور یہ پولیس سے چھپنے چھپانے کا کیا سلسلہ ہے؟''

میں نے بخت خان کی طرف دیکھا اور یارن خان کے سوال کا جواب نہ دیا۔ اس نے اپنا سوال الفاظ بدل کر دہرایا۔ میں نے کہا۔ ''خان جی! میری قسمت مجھے اس کوٹھڑی میں ڈال چکی ہے جہاں سے جنازے نکلتے ہیں مگر واپسی کی کوئی صورت نہیں نکلتی۔''

''یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔''

''میرے پاس کسی بھی سوال کا جواب نہیں ہے۔'' میں نے اپنے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے کہا۔

یارن خان کی آنکھوں میں خشونت کا ایک ذرا عکس لہرایا، چہرے پر ناپسندیدگی کے آثار ہویدا ہوئے مگر لمحہ بھر میں اس نے خود پر قابو پالیا اور دھیمی آواز میں بخت سے باتیں کرنے لگا۔ دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو مجھ سے متعلق نہیں تھی بلکہ انہوں نے سیاست کو موضوعِ سخن بنالیا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں یوں محسوس ہونے لگا جیسے یہاں کوئی بھی سنگین سرگرمی وقوع پذیر نہیں ہوئی تھی۔ کوئی دس منٹ بعد شیر دل کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا کندھا خالی تھا۔ وہ اپنی ڈبل کے گن کہیں رکھ آیا تھا۔ اس نے ہاتھوں میں ٹرے پکڑی ہوئی تھی جس میں مشروب کے بھرے تین گلاس رکھے ہوئے تھے۔ اس نے بڑے ادب سے مشروب سرو کیا اور اجازت پا کر کمرے سے رخصت ہو گیا۔

بخت خان نے توصیفی انداز میں کہا۔ ''خاصا تگڑا گھوڑا ہے۔''

''ہاں! ساتھ میں خاصا اڑیل اور منہ زور بھی ہے۔ سیدھی راہ پر چلانے کے لیے ہر وقت شانٹا ہاتھ میں رکھنا پڑتا ہے۔''

''لگام مضبوط ہاتھوں میں ہو تو اڑیل سے اڑیل شہ زور ناک کی سیدھ میں چلتا ہے۔''

''ظاہر ہے، جہاں گرفت کمزور ہوئی، گھوڑے نے زمین پر گرا کر چت کر دیا۔ یہ ساری باتیں ذہن میں رکھنا پڑتی ہیں۔ تم ان باریکیوں کو کیا جانو، تم نے گھوڑے رکھے، زین پر بیٹھے اور نہ ہی شہ سواری کے مزے لوٹے......''

''ہاں خان! تم ٹھیک کہتے ہو۔'' بخت خان نے طویل سانس لی اور مشروب کا گلاس اٹھالیا۔

''بخت خان! اس لونڈے نے میرے بڑے قیمتی بندوں کو ٹھکانے لگایا ہے۔ اس کے کھاتے میں بہت سے جرم لکھے ہوئے ہیں مگر کیا کروں؟ تم اسے لے جانے پر ضد کر بیٹھے ہو ورنہ یہ ایسا بے ضرر شخص نہیں ہے کہ میرے ہاتھ لگنے کے باوجود زندہ واپس چلا جائے۔'' یارن خان نے مجھے گہری نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

بخت خان نے کندھے اچکائے، کہا۔ ''کہا ناں! دماغ کو ٹھنڈا رکھا کرو۔ گرم دماغ میں ہوا کے گرم جھونکے چلتے ہیں جو نتھنوں سے خارج ہونے لگتے ہیں اور نادانستگی میں مونچھوں کو جلا دیتے ہیں۔''

مشروب بڑا مزیدار تھا۔ میں نے بخت خان کی تقلید میں گھونٹ گھونٹ حلق سے اتارا جبکہ یارن خان نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔ طبیعت نے مزہ لیا مگر دل ابھی سواد سے پوری طرح سرشار نہیں ہوا تھا کہ ہوش اڑنے لگے۔ عجیب طرح کا بھاری پن رگ و پے میں سرایت کرنے لگا۔ ابھی اپنی اس کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ سر چکرانے لگا۔ ڈرائنگ روم میں پڑا ہوا فرنیچر آنکھوں میں دھندلانے لگا۔ میں نے سر جھٹک کر یارن خان کی طرف دیکھا تو اس کے سراپے نے کئی سائے اگل دیے۔ بخت خان پیشانی سہلاتا ہوا پھٹی پھٹی آنکھوں سے کھلے دروازے کے باہر دیکھ رہا تھا۔ اس کے ذہن کی غلام گردشوں میں بھی مشروب کا نشہ بھر گیا تھا۔ یارن خان کی دھوکا دہی کا احساس ہوتے ہی میں نے ایک جھٹکے سے کھڑا ہونا چاہا مگر بدن اپنا آپ سہارنے کی طاقت کھو بیٹھا تھا اور میں کمر کے بل صوفے میں گر گیا۔

بخت خان کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''خان! تم نے اچھا نہیں کیا۔ میں بچہ نہیں ہوں......''

بصارت کی طرح میری سماعت بھی چکرا کر رہ گئی۔ بخت خان کی شکوہ بار آواز کہیں تحلیل ہو گئی۔ ایسے میں میری پلکوں پر بوجھ پڑنے لگا، خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا پایا اور

WWW.PAKSOCIETY.COM

پھر چند ہی لمحوں میں غنودگی کی غیر معمولی طاقتور یلغار نے مجھے دنیا و مافیہا سے غافل کر دیا۔ میرا آخری احساس یہی تھا کہ ہم دونوں سے یارن خان کی معنی خیز مفاہمت کو شکست سمجھنے کی غلطی سرزد ہوئی تھی جس کا خمیازہ بھگتنا ناگزیر تھا۔

میڈم شکیلہ جیسی مردم شناس عورت یارن خان کو شیش ناگ اور نہایت خطرناک دشمن قرار دیتی تھی تو بلاوجہ نہیں تھا۔ وہ اسے میری نسبت زیادہ بہتر طور پر جانتی تھی۔ اگر بخت خان میرے اور یارن خان کے بیچ حائل نہ ہوتا تو میں کبھی اس پر اعتماد نہ کرتا مگر اب بھروسا کرنے کے بعد یہ دیکھا تھا کہ یارن خان اپنی شکست کے تضحیک آمیز لمحوں سے بھی کامیابی کا راستہ نکالنے کا ہنر جانتا ہے۔

بے ہوشی اور نیند کا استغراق موت کے خاندان سے تعلق رکھنے والی کیفیات ہوتی ہیں۔ میں بے ہوشی کے عالم میں کب تک اور کہاں پڑا رہا، معلوم نہیں ہوا۔ آنکھ کھلی تو خود کو قدیم ساخت کے کمرے میں پایا۔ کئی منٹوں تک میرے ذہن پر دبیز دھند سی چھائی رہی اور مجھے اپنی سدھ بدھ سنبھالنے میں خاصی توانائیاں صرف کرنا پڑیں۔ منظر کشائی ہوئی تو مجھے وہ کمرا مانوس سا لگا مگر ذہن پر خاصا زور دینے کے باوجود یاد نہ آیا کہ اس پرانی طرز کے کشادہ کمرے کو میں نے پہلے کہاں اور کن حالات میں دیکھا تھا۔ شکستہ پلستر والی دیواریں، جن میں کہیں کہیں اینٹیں جھانک کر سیلن آلود ماحول تخلیق کر رہی تھیں، چوبی چھت اور بوسیدہ سا فرش......

کچھ دیر تک یہ احساس کچوکے لگاتا رہا کہ میں پہلی مرتبہ یہاں نہیں پہنچا ہوں مگر پہلے کب آیا تھا؟ یہ یاد نہیں آ رہا تھا۔

ناچار میں نے سر جھٹک کر اس خیال سے دامن چھڑایا کیونکہ یہ اتنی اہم بات نہیں تھی۔ اہم بات یہ تھی کہ میں زندہ تھا اور مجھے اس قید سے چھٹکارا حاصل کرنا تھا۔ ابھی تک اس موئے شربت کا اثر تھکن اور سستی کی صورت میں رگ و پے پر طاری تھا۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا۔ بخت خان کو میرے پاس موجود ہونا چاہیے تھا کیونکہ ہم دونوں اکٹھے بے ہوش ہوئے تھے۔ اسے کمرے میں نہ پا کر میں نے سوچا کہ اسے مجھ سے علیحدہ رکھا گیا ہوگا۔ یہ بھی سوچا کہ اسے مجھ سے الگ کرنے کے بعد چھوڑ دیا گیا ہوگا یا اسپتال پہنچا دیا گیا ہوگا۔ شک کا ایک کوندا میرے ذہن میں لپکا کہ یارن خان اور بخت خان، دونوں مجھے قابو کرنے کی سازش میں برابر کے شریک بھی ہو سکتے ہیں۔ مگر پھر بخت خان کا میری تائید میں روا رکھا جانے والا جارحانہ رویہ، اس کا فی الفور میرے پیچھے آنا اور گنوں کے سائے تلے اصرار کرنا یاد آیا......

میں بڑبڑا اٹھا۔ ”نہیں، نہیں...... بخت خان دوغلا بندہ نہیں ہے۔ وہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔“

میں نے فرش پر ہتھیلیاں ٹکا کر اٹھنا چاہا تو اس روح فرسا حقیقت کا انکشاف ہوا کہ مجھے اتنی بے دردی سے باندھ کر اس فرش پر لا پھینکا گیا تھا کہ میں آسانی سے اٹھ کر بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔

میں آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا دیوار کے قریب آیا اور بڑی تگ و دو کے بعد دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھنے میں کامیاب ہوا۔ اب مجھے اپنے جسم پر لپٹی ہوئی موٹے کڑوں والی آہنی زنجیر دکھائی دینے لگی۔ اس قسم کی زنجیروں سے دیہاتوں میں بھینسوں اور اڑیل بیلوں کو باندھا جاتا ہے۔ یہ کم و بیش دس میٹر لمبی تھی۔ میرے پاؤں، ٹانگیں اور بازو دوہرے کر کے باندھے گئے تھے اور بہ غور دیکھنے پر کہیں قفل یا کلپ لاک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ زنجیر کا تالا میری پشت پر تھا جس تک رسائی فی الوقت ممکن نہیں تھی۔ میں نے ہاتھوں پیروں کو اس فولادی جکڑن سے نکالنے کی رسمی سی کوشش کی مگر ذرہ بھر کامیابی نہیں ہوئی تو ایک طویل سانس لے کر اپنے مختل حواس مجتمع کرنے لگا۔ برق رفتاری سے سوچنے لگا کہ اس قید خانے سے نجات کیسے حاصل کی جائے۔

میں یہ اندازہ قائم نہیں کر سکتا تھا کہ اس ماحول میں وقت کا کوئی احساس نہیں تھا البتہ یہ علم ہو رہا تھا کہ کمرے کے باہر دن کا اجالا پھیلا ہوا ہے کیونکہ میری عقبی دیوار میں ایستادہ دروازے اور چوبی کھڑکی کی درزوں سے چھن کر آنے والی روشنی کی بدولت کمرے کے در و دیوار واضح نظر آ رہے تھے۔ لگتا تھا کہ دروازہ باہر سے بند تھا۔ اگر کھلا ہوا بھی ہوتا تو میں کوئی فائدہ اٹھانے کی حالت میں نہیں تھا۔ جب تک اس وزنی زنجیر سے گلوخلاصی نہ کر لیتا، میں یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ ایسے ہی وقت میں غیر معمولی بھوک کے احساس نے خبردار کر دیا کہ میں کم سے کم بارہ چودہ گھنٹے بے ہوشی کی حالت میں پڑا رہا تھا۔ میری بے ہوشی کا دورانیہ میرے اندازے سے زیادہ طویل بھی ہو سکتا تھا۔

آدھا گھنٹا گزر گیا۔ اطراف میں سناٹا طاری تھا۔ میں نے کان لگا کر آواز سننے کی کوشش کی مگر یوں لگا جیسے میں کسی بہت بڑے ویکیوم میں آن پہنچا ہوں جہاں میرے سوا بندہ نہ بندے کی ذات موجود تھی۔ کہیں دو چار کتے بھونکے، پرندے چہچہائے تو زندگی کا یقین ہوا اور پتا چلا کہ میں کسی

دیہاتی یا جنگلی علاقے میں پڑا ہوں۔

بھوک لمحہ بہ لمحہ بڑھتی گئی۔ دو گھنٹے گزرنے کے بعد بھوک کی بدولت میرے سر میں درد ہونے لگا۔ اس دوران میری کھوئی ہوئی دماغی قوتیں لوٹ آئیں اور میں نے اس کال کوٹھری کو پہچان لیا۔ یہ سردار حیدر خان کی حویلی تھی جو دریائے سندھ کے کنارے پر بیلے والے جنگل میں واقع تھی۔ جب میں پروین کی تلاش میں پیاجی اور کھالے کے ہمراہ اس حویلی میں آیا تھا تو اسی کمرے میں چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں اور فرش پر چوڑیوں کے ٹکڑے اور سگریٹوں کے ٹوٹے بکھرے ہوئے تھے۔ جوں جوں میں اپنی یادداشت پر زور دیتا گیا، میرا یقین واثق ہوتا گیا۔

قسمت مجھے پھر اس جگہ پر لے آئی تھی جہاں میں ایک مرتبہ خون اور آگ کا کھیل، کھیل چکا تھا۔ ایک وہ وقت بھی تھا جب میں یہاں بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا اور حیدر خان اپنی پاٹ دار فرعونیت بھری آواز میں مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ ”بتا اوئے بھٹنی کے بچے! خانزادی کہاں ہے؟“

قدرت نے مجھے ایک وہ وقت بھی دکھایا تھا کہ علاقے کا سب سے طاقت ور سورما ملتان کے فائیو اسٹار ہوٹل میں مجھ سے معافی مانگ رہا تھا اور خاندانی مراسم جتا رہا تھا۔ اپنی بیٹی کی بازیابی پر میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے بڑے شاطرانہ انداز میں یارن خان کی بیٹی عافیہ خان کو اغوا کر کے خانزادی اسما پر ٹوٹنے والی قیامت جیسی نئی قیامت توڑنا چاہتا تھا۔ پھر میری خواہش کے برعکس، میڈم شکیلہ کے حکم پر میرے اور اس کے درمیان سودے بازی ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے خاندان کی بیٹی کو اغوا کر کے اس کو ہوس ناک تحویل میں دینے کے لیے دو کروڑ روپے میں سودا طے کیا تھا اور آدھی رقم حسب وعدہ دس دنوں میں ادا کر دی تھی۔ چونکہ ایسے کاموں میں عموی طور پر کوئی وقت مقرر نہیں کیا جاتا، ایک دو ماہ اوپر نیچے بھی ہو جاتے ہیں، اس لیے ابھی تک وہ معاملہ بیچ میں ہی لٹکا ہوا تھا۔

ایک موہوم سی توقع پیش نظر تھی کہ میری اس حویلی میں موجودگی کا حیدر خان کو علم نہ ہو یا اسے یہ تو علم ہو کہ یارن خان نے کوئی مغوی یہاں رکھوایا ہے مگر اسے یہ پتا نہ ہو کہ مغوی کون ہے۔ یہ بھی بعید نہیں تھا کہ اسے بخوبی میرے بارے میں سب کچھ معلوم ہو اور وہ مجھے زیر کر کے میڈم شکیلہ سے نہ صرف اپنی رقم واپس حاصل کرنا چاہتا ہو بلکہ سود سمیت وصول کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔

یہ سوچ بڑی کربناک تھی کہ حیدر خان ایک ہی وقت میں مجھے عافیہ خان کو اغوا کرنے کی بھاری سپاری دے چکا تھا اور دوسری طرف اس کے باپ سردار یارن خان سے محبت کی اس حد تک پینگیں بڑھا رہا تھا کہ اسے اپنے دشمنوں کو حویلی میں رکھنے کی اجازت دیتا تھا۔ میڈم ٹھیک کہتی تھی۔ واقعی، یارن خان، حیدر خان اور میاں دلبر حسین...... تینوں بڑے کھلاڑی تھے۔ بڑے کھیل کھیلنے کے عادی تھے جنہیں سمجھنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ ایک دوسرے کے دشمن تھے مگر مفاد کی بساط پر ایسے ملا کرتے تھے جیسے ان کے بیچ سے ہوا کا گزر بھی ممکن نہ ہو۔

بہرحال، میری شامت آنے والی تھی۔ میں چکی کے دو پاٹوں میں بری طرح پھنس چکا تھا۔ دونوں سورمے یک جان ہو گئے تھے۔ یہ خواہش دعا بن کر میرے لبوں پر آن چپکی کہ میڈم شکیلہ کو مجھ پر ٹوٹنے والی قیامت کی کسی نہ کسی طرح خبر ہو جائے اور وہ ان دونوں پر برق بلا بن کر کوند جائے۔ میری یہاں سے رہائی کی ایک یہی صورت ممکن تھی ورنہ تو میں خاصا مایوس اور دل گرفتہ ہو گیا تھا۔

میری بدقسمتی تھی کہ یارن خان کے ذریعے پھر اپنے خون کے پیاسے سردار حیدر خان کے چنگل میں آن پھنسا تھا۔ میں نے اس ڈیل کے بارے میں سوچا جو میرے توسط سے میڈم شکیلہ اور سردار حیدر خان کے درمیان طے پائی تھی۔ کیا یہ ڈیلنگ مجھے یہاں مدد دے سکتی تھی؟

میں سوچوں کے تانے بانے بننے میں وقت گزار رہا تھا۔ بھوک اور پیاس کے احساس کو تھپک رہا تھا۔ جب درزوں سے چھن کر آنے والی روشنی مدھم ہو گئی تو ماحول میں ہل چل سی پیدا ہوئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے کئی افراد ایک ساتھ حویلی میں آن داخل ہوئے تھے۔ کواڑوں کے کھلنے کی آوازیں، قدموں کی بھاری چاپ اور ملی جلی آوازیں میرے کانوں میں پڑیں۔ تب تک مارے پیاس اور بھوک کے میرے حلق میں کانٹے چبھنے لگے تھے۔ میں نے کچھ دیر انتظار کیا۔ جب کوئی اس طرف نہ آیا تو میں بلند آواز میں چیخا۔ ”اوئے! مجھے پیاس لگی ہے۔ پانی پلاؤ۔“

چند منٹ ردعمل کا انتظار کیا۔ جواب ندارد پا کر پھر حلق کے بل چیخا۔ دوسری کوشش رائگاں نہیں گئی۔ چند لمحوں بعد دروازے کی کنڈی کھلنے کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ دروازہ کھلتے ہی یکے بعد دیگرے دو اشخاص کمرے میں داخل ہوئے۔ استاد بلو کو پہچاننے میں مجھے لمحہ بھر سے زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ اس کے عقب میں گہرے نیلے رنگ کی ڈھیلی ڈھالی قمیص میں ریاض ملغانی تھا۔ استاد بلو خالی ہاتھ

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھا جبکہ ریاض ملغانی کے بائیں کندھے پر سیون ایم ایم لٹک رہی تھی اور دائیں ہاتھ میں اڑتیس بور کا سلور سیڈ پستول دبا ہوا تھا۔ ان دونوں کو دیکھ کر میری رہی سہی توانائی بھی جواب دے گئی۔ استاد بلو میرے قریب فرش پر پیروں کے بل بیٹھ گیا۔ مجھے سرد نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔ ''جوان! میں سمجھتا ہوں کہ تم بہت بہادر آدمی ہو مگر...... بہادر آدمی مصیبت کے وقت ایسے چیخ و پکار نہیں کیا کرتے۔ پہاڑ کا سا حوصلہ سینے میں پال رکھتے ہیں، ایسے وقت کے لیے۔''

اس کے پیچھے ریاض ملغانی چوکس انداز میں کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ اس کا انداز خاصا جارحانہ تھا۔ وہ اپنے طور و اطوار سے میری معمولی سی مشکوک حرکت پر گولی مار دینے کا ارادہ ظاہر کر رہا تھا۔

استاد بلو کی افسرانہ تراش خراش اور سرد مہری بہ دستور قائم تھی۔ اس کی بھاری آواز میں نفرت کا کھردرا پن اپنی پوری شدت سے موجود تھا۔ میں نے پانی مانگا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ملغانی کو پانی لانے کا حکم دیا، بولا۔ ''شہر یار! آخر تم نے رنگو قسائی کا دھڑن تختہ کر ہی دیا۔ ہیں؟''

میں اس کے سوال کا مقصد نہ بھانپ سکا۔ اس لیے مبہم انداز میں بولا۔ ''نہیں! اسے اس کی وحشیانہ حرکات لے ڈوبیں۔''

''کیا مطلب؟''

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''ظاہر ہے ہمارے دھندے میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ مارا ماری میں مارنے والا بھی کام آ سکتا ہے۔ یہ بات تم اچھی طرح جانتے ہو۔''

''ہوں......'' اس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ ''تمہارا میک اَپ کس نے کیا تھا؟''

میں چونکا۔ مجھے ہوش میں آنے کے بعد اپنے حلیے کا قطعی طور پر خیال نہیں رہا تھا۔ ہاتھ اٹھا کر چہرے پر پھیرنا چاہا مگر زنجیریں آڑے آ گئیں۔ میں نے کہا۔ ''میک اَپ؟ کیا مطلب؟ میں کچھ سمجھا نہیں۔''

اس کے لبوں پر زہر خند مسکراہٹ تیری، بولا۔ ''تمہاری بے ہوشی کے دوران میں نے تمہارا میک اَپ صاف کرایا تھا۔ نقلی ڈاڑھی مونچھوں اور لینز سے تمہاری جان چھڑوا دی گئی ہے، اس لیے زیادہ بننے کی ضرورت نہیں۔''

میں نے کندھے اُچکائے۔ ''اوہ! مگر یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ میک اَپ کا سامان بازار سے عام مل جاتا ہے۔ میں نے......''

''بکواس مت کرو۔ یہ عام میک اَپ نہیں تھا۔ کیا اس لونڈے پیاجی نے میک اَپ کا کورس کر رکھا ہے؟'' اس نے ڈانٹ کر پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''ہم بھی تے یہ کورس کر رکھا ہے۔''

''سامان کہاں سے لیتے ہو؟''

''میڈم مہیا کرتی ہے۔ اسے علم ہوگا کہ یہ کس مارکیٹ سے ملتا ہے۔'' میں نے منہ بنا کر کہا۔

اس نے میری تھوڑی پر چٹکی بھری۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہایت سرد لہجے میں کہا۔ ''اگر تم تعاون نہیں کرو گے تو میں تمہارے ساتھ بہت برا سلوک کروں گا۔ سمجھے؟''

میں نے اپنے خوف پر بہ دقت تمام بے پروائی کا پردہ ڈالا اور کہا۔ ''استاد! بچوں جیسی باتیں مت کرو۔ میں تعاون کروں نہ کروں تم لوگوں نے وہی کچھ میرے ساتھ کرنا ہے جو تم لوگ طے کر چکے ہو۔''

اس کے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ تیر گئی، بولا۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ تمہیں یہاں کیوں لایا گیا ہے؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا، کہا۔ ''اور نہ ہی میں جاننا چاہتا ہوں۔ تم سے اگر ممکن ہو تو میری زنجیریں کھول دو۔ یہاں تمہارے بہت سے گرگے موجود ہیں، اسلحے سمیت۔ ان کی موجودگی میں، میں یہاں سے بھاگ نہیں سکتا۔ اس لیے ڈرو مت اور مجھے آسان کر دو۔''

اس کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی، بولا۔ ''میں کوئی رسک نہیں لے سکتا۔ ابھی تو میں نے تمہاری 'میڈم' سے رابطہ کرنا ہے۔ اسے یہ خوش خبری سنانی ہے کہ تم میرے مہمان ہو۔''

اس نے 'میڈم' لفظ پر خصوصی زور دیا تھا۔ ملغانی سلور کے گلاس میں پانی بھر لایا۔ استاد بلو نے اس سے گلاس لیا اور میرے لبوں سے لگا دیا۔ میری ران پر بائیں ہتھیلی ٹکا کر بولا۔ ''شہر یار! تم نے سردار حیدر خان کو چکمہ دیا۔ ایک کروڑ روپے اینٹھ لیے۔ ہمارے دھندے میں ایسی دھوکا بازی نہیں ہوتی۔ تم نے دھوکا دہی کی۔ کیوں؟''

میں نے گلاس خالی کر دیا۔ ''میں نے خان کو چکمہ نہیں دیا تھا۔ سودا طے پا چکا تھا۔ پروجیکٹ پر کام ہو رہا تھا۔ جلد اسے خوش خبری ملنا تھی۔ اگر میں یارن خان کے ہاتھ نہ لگتا تو اب تک 'اوکے' کی رپورٹ خان تک پہنچ جاتی۔''

وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ ''اوکے کی رپورٹ! ہونہہ...... میں نے کئی بار تمہاری حرام زادی میڈم سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر اس نے ہر کال بزی کر دی۔ اب تم

نئی کہانی سنا کر مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ جوان میرا نام استاد بلو ہے۔ میں تم جیسے سیکڑوں لونڈے پال پوس کر جوان کر چکا ہوں۔ مجھے چکر نہ دو۔ سیدھی سیدھی بات کرو۔ خان کو دھوکا کیوں دیا تم نے؟''

میں نے کہا۔ ''کہا تو ہے کہ ہم نے دھوکا نہیں دیا۔ میں خان کے کام کے سلسلے میں ہی نور پور آیا تھا۔ یارن خان کی ٹوہ لے رہا تھا۔ بدقسمتی ہاتھ دکھا گئی اور میں سردار بخت خان کی وجہ سے دھوکا کھا گیا۔ یارن خان نے نشہ آور دوا پلا کر مجھے بے دست و پا کر دیا ورنہ صورتِ حال یہ نہ ہوتی۔''

از خود جھوٹ میرے لبوں پر بڑے یقین کے ساتھ چل گیا تھا۔

اس کی آنکھوں میں ایک ذرا تشکیک ابھری پھر ایک دم معدوم ہو گئی، بولا۔ ''بہر حال جو بھی ہوا، برا ہوا۔ اب اس کا انجام اس سے بھی برا ہونے والا ہے۔ تم اپنی جیون کہانی کا تو 'دی اینڈ' ہی سمجھو۔ اس حرافہ کا ناپ تول بھی کر لیا گیا ہے۔ جلد ہی تم اسے یہاں پاؤ گے۔ اور ہاں! ایک اچھی خبر تمہارے لیے...... تم چاہو گے کہ مرنے سے قبل اپنے پیاروں کی ایک آدھ جھلک دیکھ سکو۔ ہے نا؟...... میں نے تمہارا بھلا کرنے کی ایک کوشش کی ہے اور دو چار بندے نور پور روانہ کر دیے گئے ہیں۔ آج رات یا کل تمہاری منگیتر یہاں پہنچ جائے گی۔ زندگی کے باقی لمحات تم اس کے ساتھ عیش و عشرت کے ساتھ گزارو گے۔ کیا خیال ہے اچھی خبر ہے ناں؟''

اس نے اتنے عام سے انداز میں کہا تھا کہ مجھے چند لمحوں تک اس کی کہی ہوئی بات کا یقین ہی نہ آیا۔ جب اس کے لہجے کے ٹھہراؤ اور چہرے کے سنگین تاثرات نے مجھے یقین دلایا تو میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے ایک جھٹکے سے دیوار کی ٹیک چھوڑ دی۔ اس جوش میں میرا بایاں ہاتھ لڑھک گیا اور میرا وجود کہنی کے بل فرش پر ٹک گیا۔ میں دانت کچکچا کر بولا۔ ''استاد! جنگ ہماری ہے۔ ہمارے گھر والوں کی نہیں ہے۔ ہمارے خاندانوں کی نہیں ہے۔ اگر تم لوگوں نے میرے گھر والوں پر ہاتھ ڈالا تو میں تم میں سے کسی ایک شخص کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

اس پر میری غضب ناکی کا رائی بھر اثر نہ ہوا۔ مسکرا کر بولا۔ ''ابھی بچے ہو۔ بالکل ہی کچے ہو۔ نہیں جانتے ہو کہ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ ویسے بھی یہ کام میں تمہاری زندگی کے آخری لمحات کو یادگار کرنے کے لیے کر رہا ہوں ورنہ مجھے اس سے کیا لینا دینا ہے۔ ہے ناں! ابھی غصہ کر رہے ہو۔ عجیب احمق ہو۔''

اگر میرے ہاتھ آزاد ہوتے تو میں بغیر کوئی لمحہ ضائع کیے اس کا جبڑا توڑ دیتا۔ اس کی آنکھیں نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیتا۔

وہ میری برانگیختہ کیفیت سے مزہ لیتے ہوئے بولا۔ ''ناں بابا! اتنا غصہ ٹھیک نہیں۔ خون جلتا ہے اور اگر جسم کا خون ہی جل جائے تو انسان کسی کام کا نہیں رہتا۔ بس دو چار دن...... پھر ایک شاندار جشن...... پھر ساری کہانی ختم!''

وہ ہاتھ لہراتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ پلٹ کر ملغانی سے بولا۔ ''اسے کھانا کھلاؤ۔ اگر پینے کا شوق رکھتا ہے تو جی بھر کر پلاؤ۔ آخر ہمارا مہمان ہے ناں......''

وہ کمرے سے نکلنے لگا۔ میں نے آواز دے کر روکا تو رک کر مجھے استفہامی نظروں سے گھورنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''مجھے واش روم جانا ہے۔''

اس کی آنکھوں کا تاثر ایک دم بدل گیا۔ برا سا منہ بنا کر بولا۔ ''اس کمرے کو واش روم سمجھو۔ جب تک زندہ ہو، یہی تمہاری کل دنیا ہے۔ تمہارا اپنا کیا دھرا تمہارے سامنے آتا رہے گا تو تمہارا دل خوش رہے گا۔ کیوں ملغانی؟''

ملغانی نے فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ تضحیک بھری آنکھوں سے مجھے دیکھا، کہا۔ ''استاد ٹھیک کہتا ہے۔ جو گل کھلانا ہے، یہیں کھلا لو۔ پر استاد! یہ تو کام خراب کر دے گا۔ اگر سردار صاحب یا سردار یارن خان اس سے ملنے کے لیے ادھر آ نکلے تو ہم مشکل میں پڑ جائیں گے۔ انہیں مجبوراً ناک پر ہاتھ رکھ کر اس سے آخری ملاقات کرنا پڑے گی۔ میری مانو تو تھوڑی سی رعایت دے دو۔''

استاد بلو نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلا کر اجازت دے دی۔ ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ایک لمبا تڑنگا شخص ایک چپاتی اور تھوڑا سا سالن لے کر آ گیا۔ اس نے چند بڑے بڑے لقمے میرے منہ میں ٹھونسے اور پانی کا گلاس میرے لبوں سے لگایا۔

میں نے کہا۔ ''یار! ہاتھ تھوڑا ہلکا رکھو۔''

اس نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔ ''کیوں؟ رشتے میں میرے سالے لگتے ہو کیا؟''

مجھے تاؤ تو بہت آیا مگر کچھ کرنے یا کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ مجبوراً کڑوا گھونٹ پی گیا۔ وہ شکل سے خاصا ڈراؤنا لگتا تھا۔ حلیہ چھٹے ہوئے بدمعاشوں جیسا تھا۔ چہرہ زخموں کے نشانات سے بھرا ہوا تھا۔ دائیں کان کی لو کٹ کر عجیب شکل اختیار کر گئی تھی۔ میں نے اسے پہلے نہیں دیکھا تھا۔

میں نے کہا۔ ''چائے بھی لے آؤ۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس نے کھڑے ہو کر ایک زوردار دولتی میری پسلیوں پر جھاڑی اور غرا کر کہا۔ ”بھوتنی کے...... چائے بھی لے آؤ...... واہ! تم یہاں باپ کے ولیمے پر آئے ہو جو تمہاری خاطر مدارت کروں۔“

”اوئے! تم مجھے جانتے نہیں......“

اس نے میری بات کاٹ دی۔ ”ہاں! نہیں جانتا۔ تمہارا باپ ڈی سی ہے ناں جو تمہیں ہر کوئی جانتا ہو۔ آرام سے پڑے رہو ورنہ باچھیں چیر کر کانوں سے لگا دوں گا۔ جتنا زیادہ بھونکو گے، اتنی زیادہ مار پڑے گی۔“ اس نے دو تین سنسنی خیز مغلظات بکیں اور پیر پٹختا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

رات ابتدائی دورانیے میں محوِ سفر تھی جب مجھے ٹوائلٹ جانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ میری چیخ و پکار پر وہی بدنما شخص آن وارد ہوا۔ بے سبب میرے گھٹنے پر ٹھوکر رسید کر کے غرایا۔ ”کیا تکلیف ہے تمہیں؟ کیوں بھونک رہے ہو؟“

گھٹنے پر خاصی چوٹ آئی۔ بہ دقت سسکی لبوں پر روکی، کہا۔ ”ابے الو کے پٹھے! میں بھونک نہیں رہا، بلا رہا تھا۔ مجھے واش روم جانا ہے۔“

اس نے استہزائیہ انداز میں ہاتھ نچایا۔ ”واش روم! اوئے بھوتنی کے...... سیدھی طرح بول ناں کہ تم نے لیٹرین کی سیر کرنی ہے۔ چلو اُٹھو...... تمہیں تمہارا امیکا دکھا لاؤں۔“

اس کے ساتھ ہی اس نے میری ران پر ٹھوکر ماری۔ اس نے موٹے سول والی نوروزی چپل پہن رکھی تھی جس کی ٹو پتھر کی طرح لگتی تھی۔ میں نے بھڑک کر کہا۔ ”اوئے کتے کے بچے! تم پاگل ہو کہ ہر وقت گدھے کی طرح دولتیاں جھاڑتے رہتے ہو۔ میں بندھا ہوا ہوں ورنہ تمہارا ایسا علاج کر دیتا کہ زندگی بھر دم ٹیڑھی نہ کر سکتے۔ مجھے اُٹھا کر باہر لے جاؤ۔“

اس نے بھنا کر دو تین مرتبہ پھر اپنے گدھے پن کا ثبوت دیا جسے میں نے اپنی جان و تن پر قبول کیا۔ اس اہم ترین شغل سے فراغت پانے کے بعد اس نے کچھ دیر تک کھڑے ہو کر سوچا اور کچھ کہے بنا واپس چلا گیا۔ اپنے ایک ساتھی کو پکڑ لایا۔ شاید مجھے اُٹھا کر صحن کے پار واقع لیٹرین تک لے جانا چاہتا تھا۔ اس کا ساتھی خاصا پستہ قامت واقع ہوا تھا۔ شاید پست حوصلہ بھی تھا، بولا۔ ”یار جیدے! یہ گدھی کا بچہ ہم سے کہاں اُٹھایا جائے گا۔ دیکھو تو گند بلا کھا کھا کر کتنا پھٹ گیا ہے۔ حرام مال تن پر ایسے ہی لگتا ہے نا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے پر اب اسے وہاں پہنچانا بھی تو ہے۔ استاد کا حکم ہے ورنہ یہیں پڑا گند مارتا رہے گا۔“ جیدے نے مجھ پر نگاہِ برہم ڈال کر اپنی مجبوری بیان کی۔ ساتھ میں عادت کے مطابق دو چار گالیاں بھی اچھال دیں۔

پستہ قامت مجھے اُٹھا کر لے جانے کے حق میں بالکل نہیں تھا۔ بولا۔ ”اس حالت میں یہ گدھی کا بچہ لیٹرین میں کیسے بیٹھے گا اور کیسے......“

’گدھی کا بچہ‘ کہنا اس کے اندازِ گفتگو کا حصہ تھا۔ تبھی بات بات پر اسی اعزاز سے مجھے نواز رہا تھا۔ اس نے میری حقیقی مجبوری بڑے تضحیک آمیز انداز میں بیان کی۔ جیدا سمجھ گیا، بولا۔ ”پھر کیا کریں؟“

”استاد چلا گیا ہے۔ ملغانی ادھر ہی ہے۔ اس سے جا کر پوچھتے ہیں۔ چلو!“

دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے کمرے سے نکل گئے اور تھوڑی دیر بعد ملغانی کو ساتھ لے آئے۔ اس نے تنقیدی نظروں سے میرا جائزہ لیا۔ سوچ میں پڑ گیا۔ مجھے واش روم میں جانے کے لیے آزاد ہاتھوں کی ضرورت تھی۔ وہ میرے ہاتھوں کو آزاد کرنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ مجھ پر جھک کر اس نے آہنی زنجیر کی مضبوطی کا اندازہ کیا، پھر بولا۔ ”پیروں کی زنجیر تھوڑی ڈھیلی کر دو اور ایک ہاتھ کھول دو۔ زنجیر کو گردن میں اس طرح بل دے کر تالا لگا دو۔ پھر اس سرے کو کھڑکی کی سلاخوں سے باندھ کر تالا لگا دینا۔“

اس نے ہاتھوں کے اشارے سے نئی بندشوں کی ترتیب سمجھائی اور کہا۔ ”اس کی بھولی شکل پر مت جانا۔ یہ سالا بہت خطرناک ہے۔ اکھ ہٹیسو تاں ہک ادھے دا سر گھن ویسی۔“

(اس پر سے توجہ ہٹاؤ گے تو یہ ایک آدھ بندے کا سر لے جائے گا)

”ملغانی! تم کچھ زیادہ ہی ڈرنے لگے ہو مجھ سے۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

وہ میری توقع کے برعکس مسکرایا، بولا۔ ”ہاں یار! اس دھندے میں پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ کہیں ڈرنا پڑتا ہے تو کہیں ڈرانا۔“

مجھے مایوسی ہوئی۔ اگر وہ بھڑک اُٹھتا تو اس سے غلطی کی توقع بھی کی جا سکتی تھی۔ میں نے کندھے اچکائے اور جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ ملغانی کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ان دونوں نے میرا دایاں ہاتھ آزاد کر دیا، پیروں کی زنجیر بھی قدرے ڈھیلی کر دی مگر مجموعی طور پر مجھے پہلے سے زیادہ بے بس کر دیا۔ موقع کی نزاکت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کار موہوم کو بھی غنیمت جانتے ہوئے میں بہ دقت اٹھا۔

جسم میں خاصی کمزوری آ چکی تھی۔ سر کا درد ننھے ننھے دھماکوں کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ ملغانی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ استہزائیہ مسکراہٹ سے نوازا، کہا۔ ”شہرے خان! انسان پر برا بھلا، ہر کسی وقت آتا رہتا ہے۔ آخری وقت بھی آ ہی جاتا ہے۔ سمجھو! تم پر بھی آ گیا ہے۔ ہم سے تعاون کرو گے تو ممکن ہے سر پر آئی ہوئی موت کی گھڑیاں ٹل جائیں۔ میں اور استاد کوشش کریں گے کہ تمہیں سردار حیدر خان کے غیظ و غضب سے بچا لیں۔ اسے سمجھانے کی کوشش کریں گے۔ ممکن ہے، وہ مان جائے اور یہ بھی ممکن ہے، وہ ہماری بات کو کسی کھاتے میں نہ ڈالے اور تمہیں ’صفر‘ کرنے کا حکم جاری کر دے۔“

میں چلتے چلتے رُک گیا۔ اسے دیکھ کر گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”ملغانی! تم جانتے ہو کہ میں کافی عرصے سے زندگی اور موت کا کھیل کھیلتا چلا آ رہا ہوں۔ تمہاری دھمکیاں میرا بال بیکا نہیں کر سکتیں۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ میڈم شکیلہ مجھے کتنی اہمیت دیتی ہے۔ وہ اپنے عام سے کارندے کے لیے خون کی ندیاں بہا سکتی ہے تو میری خاطر بلاشبہ تمہارے پورے گروپ کو خاک میں ملا دے گی۔ میں دھمکی نہیں دے رہا ہوں، بلکہ تمہیں تمہاری حماقت کے نتائج سے قبل از وقت آگاہ کر رہا ہوں۔ استاد بلو اور اپنے بے غیرت آقاؤں تک میرا یہ پیغام پہنچا دینا۔“

اس کا چہرہ ایک لمحے کو متغیر ہوا مگر اس نے سنبھلنے میں دیر نہیں کی۔ سر ہلا کر بولا۔ ”تمہاری میڈم جو بھی کر سکتی ہو گی، ضرور کر گزرے گی میں جانتا ہوں مگر کیا تمہاری لاش میں زندگی کا صور پھونک لے گی؟...... نہیں...... یہی بات میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ سمجھ جاؤ تو بہتر ہے ورنہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔“

میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور گن برداروں کی معیت میں صحن میں آ گیا۔ اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ماحول میں جھینگروں اور کتوں کی آوازیں اسرار پیدا کر رہی تھیں۔ مغربی سمت بنے ہوئے کمروں کے آگے وسیع برآمدہ تھا۔ برآمدے کے آگے دو چار پائیوں پر تین چار افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ خاموش تھے۔ شاید موج میلا کر کے تھک گئے تھے کیونکہ کمرے سے نکلتے ہی چرس اور شراب کی ناگوار بو میرے نتھنوں سے ٹکرائی تھی۔ ایک گن بردار چوکنا پوزیشن لیے میرے بائیں پہلو میں چل رہا تھا جبکہ دوسرا گن کی نال میری پشت سے لگائے مجھے باتھ روم کی طرف دھکیل رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”یہاں کتنے افراد رہتے ہیں؟“

بائیں ہاتھ چلنے والے نے غلیظ گالی دی اور خاموش رہنے کا حکم دیا۔ میں خون کا گھونٹ حلق میں اتار کر باتھ روم میں گھس گیا۔ اس دیہاتی طرز کے سالخوردہ ٹوائلٹ میں میرا کچھ زیادہ وقت صرف ہو گیا تو دروازے پر جیدے کی غراتی ہوئی آواز ابھری۔ ”کتے کے بچے! یہاں بستر لگا کر لم لیٹ ہو گیا ہے کیا؟“

ٹوائلٹ کا دروازہ بند نہیں تھا۔ محض بھڑا ہوا تھا مگر مجھے یقین تھا کہ وہ اندر نہیں آئے گا۔ اس لیے میں نے فی الفور اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔ ”ابے خنزیر کی اولاد! دبکا کھڑا رہ نہیں تو......“

وہ بھڑک اٹھا۔ ”کیا نہیں تو...... کیا کر لے گا تو حرام زادے......“

اس کی گندی زبان نان اسٹاپ چل پڑی۔ اس کے ساتھی نے اسے ڈانٹ کر خاموش کرایا۔ میں جب ٹوائلٹ سے نکلا، وہ کینہ توز نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اس نے گن کی نال میری پسلیوں میں چبھونی چاہی تو میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ چند لمحوں تک ہم آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے رہے، پھر اس کے ساتھی کے دخل در معقولات پر سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ جب مجھے کھڑکی کی سلاخوں سے باندھ دیا گیا تو پیچ و تاب کھاتے ہوئے جیدے نے گن کا بٹ میری ران پر دے مارا۔ درد کی تیز لہر میرے بدن میں سرایت کر گئی۔ وہ دانت پیس کر بولا۔ ”جی تو چاہتا ہے کہ تمہیں ایک سانس بھی نہ لینے دوں اور تمہاری چھاتی چھلنی کر دوں مگر مجبوری ہے۔ بڑے خان کا حکم ماننا پڑتا ہے۔“

”تیرے...... ساتھ تیرے بڑے خان کی بھی......“ میں نے جبڑا بھینچ کر نہایت سرد آواز میں اپنے اندر کی آگ کو اس پر اگل دیا۔ اس نے میرے کندھے پر نظریں جماتے ہوئے گن ہوا میں بلند کی مگر اس کے ساتھی نے اس کی گن تھام لی۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے باز رہنے کی نصیحت کی پھر بازو سے پکڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ کمرے کے باہر ان کے درمیان چھڑنے والی بحث باقاعدہ جھگڑے کی صورت اختیار کر گئی تو میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اپنی توجہ ان کی فضول گفتگو سے ہٹا لی۔

میں میڈم شکیلہ کے روکنے کے باوجود غزالہ کے شوقِ دیدار میں بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ اس تک اس افتادِ نو کی خبر پہنچانے کا کوئی ذریعہ بھی نہیں تھا۔ مایوسی...... جان لیوا مایوسی...... میرے پیچھے ایسا کوئی کلیو نہیں رہا تھا جس کا کونہ پکڑ کر میڈم، میرو شاہ یا پیا جی مجھ تک پہنچ

WWW.PAKSOCIETY.COM

پاتے۔ یارن خان نے کھالے اور اس کے گھر والوں سے کیا سلوک کیا تھا، یہ خبر بھی نہیں تھی۔ بخت خان زندہ تھا، مردہ یا یارن خان کے پہلو میں بیٹھا ہنس کھیل رہا تھا...... اس بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ استاد ببلو نے غزالہ کے پیچھے اپنے کارندے بھیج دیے تھے۔ وہ بے خبری میں ماری جانے والی تھی۔ چونکہ عام، سادہ لوح اور دیہاتی لڑکی تھی، خبر رکھتی تو بھی استاد ببلو اور یارن خان جیسے کمینوں کے سامنے کوئی وقعت نہیں رکھتی تھی۔ ادھر ملتان میں میرے گھر والے یقیناً میرے لیے بہت پریشان ہوں گے۔ ان کی حفاظت کے لیے فوجی اختر جیسا تجربہ کار شخص موجود تھا مگر میرا اغیاب گھر والوں کا داخلی دکھ اور اضطراب تھا جس کا مداوا میرے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا تھا۔

یعنی میں ہر طرف سے مصائب اور خطرات میں گھر چکا تھا۔ مجھ سے متعلقہ کوئی فرد بھی محفوظ نہیں رہا تھا۔ میرا ایک ہاتھ اور ایک ٹانگ آزاد تھی۔ بہ آسانی اُٹھ بیٹھ سکتا تھا۔ میں نے زنجیر کو مختلف جگہوں سے ہلا جلا کر دیکھا۔ کھڑکی کی سلاخوں سے آکٹوپس کی طرح لپٹی زنجیر کے بل چیک کیے۔ مایوسی ہوئی۔ پرانی طرز کی کھڑکی میں نصب موٹی آہنی سلاخیں اس طرح چوکھٹ میں گڑی ہوئی تھیں کہ ان کے نکلنے کا امکان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ایسے ہی وقت میں، جب میں سلاخوں اور زنجیر کا معائنہ کر رہا تھا، میرے عین سامنے اندھیرے میں استاد ببلو کا چہرہ لہرا گیا۔ اس نے سلاخوں کو تھاما اور ہنس کر بولا۔ ”شہر یار! یہ سلاخیں، یہ زنجیر...... یہ ٹوٹنے والی نہیں ہیں۔ مفت میں اپنے آپ کو اُوکھ میں مت ڈالو۔“

میں نے کہا۔ ”استاد! تم کام کی بات بھی تو کر سکتے ہو مجھ سے۔“

”مثلاً؟“ وہ چونکا۔

”ہم جس دور میں سانسیں لے رہے ہیں، اس میں ہر کام کی قیمت ہوتی ہے۔ ہر عمل کی اجرت ہوتی ہے۔ اگر قتل کی سپاری لی جا سکتی ہے تو زندگی کا سودا بھی کیا جا سکتا ہے۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ یہاں سے نکل کر اپنی دنیا میں جانا چاہتا ہوں۔ زندگی اور آزادی کی قیمت چکانے کو تیار ہوں۔ کیا خیال ہے؟“ میں نے مدبرانہ لہجے میں کہا۔

اس کے چہرے پر ایک دم سنجیدگی عود کر آئی۔ مخصوص سرد آواز میں بولا۔ ”تم نے ٹھیک کہا ہے۔ موت کی طرح زندگی کا سودا بھی ہو سکتا ہے۔ مگر یہاں نہیں...... بالکل نہیں...... تمہاری زندگی کا سودا نہیں ہو سکتا کیونکہ سردار حیدر خان تمہیں زندگی دینے والے سے زندگی چھین لے گا۔“

میں نے کہا۔ ”کیا تم اس سے اتنا ڈرتے ہو؟“

”ہاں...... تم سچ بولو نہ بولو تم بھی اس سے ڈر رہے ہو۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں تو...... میں اس کے سے کیوں ڈروں گا؟“

”ہاں...... کہنا اور ثابت کرنا دو مختلف عمل ہیں۔ اگر تم اس سے ڈرتے نہیں ہو تو پھر مجھ سے آزادی کیوں خرید رہے ہو؟...... وہ آئے گا۔ تم اس سے بغیر سودا کیے اپنی آزادی چھین لینا۔ بس!“

میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ وہ چالاک ذہن انسان تھا۔ آسانی سے پھسلن پر پاؤں رکھنے والا نہیں تھا۔ میں نے پینترا بدلا۔ ”تم مجھے یہاں سے نکالو میں تمہیں سردار حیدر خان کے چنگل سے نکال دوں گا۔“

”اور لے جا کر اپنی میڈم کے چنگل میں ڈال دو گے۔ ہے نا؟“ اس کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ تیر گئی۔

”نہیں...... یہ تمہاری مرضی پر موقوف ہوگا۔“

”تو کیا تم یہ خیال کر رہے ہو کہ میں یہاں اپنی مرضی کے بغیر رہ رہا ہوں؟“ اس نے ہاتھ لہرایا۔ ”نہیں میری جان! نہ تو یہ غلامی ہے اور نہ شوق کی چوڑیاں میں نے کلائیوں میں پہن رکھی ہیں۔ یہ ایک ایگریمنٹ کا نتیجہ ہے۔ ویسا ہی ایگریمنٹ، جیسا تم نے اپنی میڈم سے کر رکھا ہے...... اگر تم اسے چھوڑنا چاہو تو وہ تمہیں روکنے کی کوشش نہیں کرے گی۔ ایسے ہی، میں جس دن یہاں سے جانا چاہوں گا، خان مجھے نہیں روک سکے گا۔ مگر میں کہاں جاؤں گا؟...... جیل میں...... پھانسی گھاٹ پر...... یا کوڑے کے ڈھیر پر لاش کی صورت...... نہیں شہر یار! فضول باتیں نہ کرو۔ جو کام ہم نہیں کر سکتے، اسے کرنے کی کوشش کریں گے تو اپنا پنڈا (جسم) تھکائیں گے۔ خود کو زخمی کریں گے۔“

ایسے میں دور سے ملغانی نے پکارا۔ استاد ببلو نے ہاتھ کے اشارے سے ’صبر کرو‘ کا جواب اچھالا اور میری طرف متوجہ ہو گیا۔ ”تم دلیر آدمی ہو، اس لیے مجھے تم سے ہمدردی ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے اپنی زندگی سے دشمنی ہے۔“

میں نے ایک طویل سانس پھیپھڑوں میں اتاری، ورنا بدلا۔ پوچھا۔ ”کیا تم مجھے یہ بتا سکتے ہو کہ یارن خان اور سردار حیدر خان میرے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتے ہیں؟“

اس نے کھڑکی کی سلاخیں چھوڑ دیں۔ ایڑیوں پر گھوم، ہاتھ پشت پر باندھ کر ٹہلتا ہوا چند قدم دور گیا۔ پھر لوٹ آیا۔ بولا۔ ”رنگو قسائی کے تمہارے ہاتھوں قتل کے بعد تمہارے تینوں دشمن تمہارے خوف سے یک جا ہو گئے ہیں۔ پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ بال کی کھال نکالنا جانتے ہیں۔ تانے بنے کا ہنر جانتے ہیں۔ تینوں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تمہاری بہادرانہ حرکات کا سبب تمہارے سینے میں پلنے والا انتقام ہے۔ انتقام کی آگ بھیڑ کو بھیڑیا بنا دیتی ہے۔ تم بلی سے شیر بن کر میدان میں آن نکلے ہو۔ شیر آدم خور ہو جائے تو اسے گولی مارنا پڑتی ہے۔ سمجھے؟“

میرے جسم نے بے اختیار جھرجھری لی، کہا۔ ”میرے انتقام سے ان تینوں کو کیا ڈر لاحق ہے؟“

وہ ہنسا۔ اس کی ہنسی بہت زہر خند تھی، بولا۔ ”بھولے ہو یا مجھے بے وقوف سمجھتے ہو۔ اگر تمہیں اپنے والدین اور خاندان کے لوگوں کے حقیقی قاتلوں کا علم ہے تو کیا ان قاتلوں کو اپنی حیثیت کا علم نہیں ہوگا؟ کیا تم انہیں اتنا ہی بے وقوف سمجھتے ہو کہ انہیں اپنی طرف بڑھتی ہوئی موت دکھائی نہیں دیتی ہوگی؟...... شہر یار! یہ طے پا چکا ہے کہ اگر تم زندہ رہتے ہو تو ایک نہ ایک دن تینوں سورماؤں کی گردنیں ماپو گے اس لیے تینوں بڑوں نے تمہارا کانٹا نکالنے کا فیصلہ کیا ہے۔ پھر اس محاذ پر متحد ہو گئے۔“

”تیسرا سورما کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔ مجھے احساس ہوا کہ میرا گلا خشک ہو رہا تھا۔

”میاں دلبر حسین...... جانتے ہو اسے؟“

”نام سنا ہے۔“

”اس کا نام ہی کافی ہے۔ وہ ان تینوں سے بھی بڑا ہے۔“

”تم نے کچھ دیر پہلے کہا تھا کہ تمہیں مجھ سے ہمدردی ہے۔“

”ہاں تو......“ وہ چونکا۔

”اس ہمدردی کے ناتے تم میرے لیے کیا کر سکتے ہو؟“

”تمہیں اچھا کھلا پلا سکتا ہوں۔ ممکنہ حد تک آسان رکھ سکتا ہوں۔ بس!“

”کیا میرے لیے بے ضرر سی پیغام رسانی کر سکتے ہو؟“

اس نے فوراً اپنا سر نفی میں ہلا دیا۔ کچھ توقف کے بعد بولا۔ ”نہیں...... مجھے علم ہے کہ تمہاری بے ضرر سی پیغام رسانی تمہارے گروپ کو یہاں مدعو کرنے کا سبب ثابت ہو گی۔ اس لیے پیشگی معذرت۔“

اس کے لہجے کی خنکی میں از حد کمی واقع ہو گئی تھی۔ وہ مجھ سے بڑے دوستانہ ماحول میں محو کلام تھا۔ میں نے دریافت کیا۔ ”تم ملتان کب گئے تھے؟“

”میں کل گیا تھا۔ دو گھنٹے وہاں رہا پھر لوٹ آیا۔ خیریت؟“

”میڈم کی کوئی خبر دے سکتے ہو؟“

”نہیں...... میروشاہ سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ اپنی موج میں تھا۔ مفت کے چند مشورے عطا کر کے رخصت ہو گیا۔“

”تم لوگ میری منگیتر کو یہاں کیوں لانا چاہتے ہو؟“

”اس سوال کا جواب نہ ہی مانگو تو بہتر ہے۔“

”کیوں؟“ میرا دل دھک سے رہ گیا۔

”رات بھر سو نہیں سکو گے۔“ اس کے لہجے کی سرد مہری نے مجھے سر سے پاؤں تک دہلا دیا۔

”مجھ میں سننے کا حوصلہ ہے۔ بتاؤ۔“

”ٹھیک ہے...... ایسے ہی سہی۔ تم نے اپنی زندگی میں دو چار پنجابی فلمیں تو ضرور دیکھ رکھی ہوں گی۔ کسی بھی مار دھاڑ والی فلم کا ڈراپ سین ذہن میں لاؤ۔ ہاں؟ اب تمہیں میرے کہے ہوئے جملوں کی زیادہ بہتر طور پر سمجھ آئے گی۔ تینوں خانزادے یہاں ایک جشن منانا چاہتے ہیں۔ تینوں شراب پئیں گے۔ موج مستی کریں گے۔ ہم سب لوگ حویلی کی چھت پر اسلحہ تھام کر پہرے داری کا فریضہ سرانجام دیں گے۔ تمہیں صحن میں عین پنجابی فلم کے ہیرو کی طرح زنجیروں سے باندھ کر لٹکا دیا جائے گا۔ تمہیں دکھانے کے لیے تمہاری منگیتر کے حسن کی پذیرائی کی جائے گی۔ اس کی جوانی کے ماپ تول کا کام کیا جائے گا۔ تمہیں مرنے سے پہلے ایسی اذیت دی جائے گی کہ تمہاری روح تک تھراتی رہے۔ پھر تم دونوں کو...... شیت...... شیت!“

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا مگر اپنی گردن پر مخصوص انداز میں انگلی پھیر کر مجھے سمجھا دیا کہ ہم دونوں کی گردن کشی کر دی جائے گی۔

خوف کی لہر میرے پورے بدن کو بے جان کر گئی۔ استاد ببلو میری طرف سے کوئی ردِ عمل نہ پا کر ٹہلتا ہوا ملغانی کی طرف چلا گیا۔

میری آنکھوں کے سامنے کئی پنجابی فلمیں گھوم گئیں۔ ان لوگوں سے بعید نہیں تھا کہ اس لاقانونیت میں لتھڑے ہوئے ماحول میں ویسی ہی بے غیرتی کی داستانیں رقم کرنے بیٹھ جائیں۔ اس علاقے میں عام حالات میں پولیس کسی واقعے یا حادثے کے مقام پر پہنچنے میں ڈیڑھ دو گھنٹے لگا دیتی ہے۔ اس بیلے میں ہونے والے خونریز جشن کی اول تو پولیس تک خبر ہی نہیں پہنچے گی، اور دوم اگر اطلاع پہنچ بھی گئی تو نہیں ’جھاسے توبہ کرنے تک‘ ہمارا تیا پانچہ ہو چکا ہوگا۔ ضلع بھر کی پولیس سردار حیدر خان اور یارن خان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

میرے دل ودماغ میں آندھیاں چلنے لگیں۔ ہتھیلیاں سلگ اُٹھیں۔ سلاخوں کو تھامے رکھنا محال ہو گیا تو میں نڈھال انداز میں دیوار کی جڑ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ نصف گھنٹے بعد میرے سامنے چائے کا پیالہ رکھ دیا گیا جسے میں نے بے دھیانی کے عالم میں اُٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔

رات ڈھلنے لگی۔ استاد بجلو نے درست کہا تھا۔ نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور جا کھڑی ہوئی۔ غزالہ کا چہرہ بار بار آنکھوں کے سامنے لہرا جاتا۔ مجھے اپنی زندگی کے تفکر کا تردد نہ رہا بلکہ غزالہ کو اغوا کر کے یہاں لائے جانے اور میری موجودگی میں اس کی عصمت دری کا احتمال آگ بن کر رگ و پے اور دل ودماغ کو جہنم کدہ بنانے لگا۔ یارن خان نے جس طریقے سے بخت خان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر مجھے یہاں پہنچا دیا تھا، اس سے بعید نہیں تھا کہ وہ بخت خان کی حویلی میں پناہ گزیں غزالہ کو بھی مکھن سے بال کی طرح نکال لائے۔ حیدر خان اور میاں دلیر حسین اس سے بڑے کمینے تھے۔ ان سے خیر کے سوا ہر توقع کی جا سکتی تھی۔ مجھے احساس تھا کہ ان کے نزدیک غزالہ کوئی ایسی حسین لڑکی نہیں تھی وہ محض مجھے ایذا پہنچا کر اپنی سفلی اور انتقامی طبیعت کو پرسہ دینا چاہتے تھے۔

رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ ہر کھٹکے پر دل بیٹھ جاتا۔ مبادا کہ غزالہ کو اغوا کرنے والے اسے لے آئے ہوں۔ صبح کی کرنوں نے جہان پر چھائے اندھیرے کو باطل کر دیا مگر میری قسمت پر طاری اندھیرے اس سے نہ چھٹ سکے۔ مجھے ناشتا کرایا گیا، ٹوائلٹ کی سیر کرائی گئی اور گالیوں کے پر ہنگام شور میں کوئی دس بارہ مرتبہ 'کوئی حرکت' نہ کرنے کی تنبیہ کی گئی۔ اس دوران جیدے دولتی باز کی خواہ مخواہ کی دو چار دولتیاں مجھے اپنے تن بدن پر وصول کرنا پڑیں۔ چونکہ میرا دھیان جان لیوا اندیشوں کی طرف مبذول تھا، اس لیے بقول ملغانی، میری بہادری کے غبارے سے ہوا نکل چکی تھی۔ اس نے بہت حد تک درست کہا تھا کہ میرے اوسان خطا ہوئے جا رہے تھے۔

پھر سہ پہر میں جب دو چھٹے ہوئے بدمعاشوں نے چیختی چلاتی غزالہ کو کمرے کے وسط میں لا پٹخا تو میری رہی سہی سکت بھی جواب دے گئی۔ میں اتنے زور سے چیخا کہ یوں لگا جیسے میرے پھیپھڑے پسلیاں پھاڑ کر باہر آ گئے ہوں۔ میں نے سردار حیدر خان اور یارن خان کو اپنی پوری آواز کے ساتھ گالیاں دیں جبکہ استاد بجلو اور ملغانی کو برے نتائج کی دھمکیاں دیں۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کیا کچھ کہا کس کس کو مخاطب کر کے گالیاں دیں۔ شور سن کر ملغانی بھاگا چلا آیا۔ اس کے پیچھے پیچھے دولتیاں مارنے والا جیدا بھی کمرے میں داخل ہوا۔ ملغانی نے میرے منہ پر ہاتھ رکھا۔ ڈپٹ کر بولا۔ "بکواس نہ کر کتے کے پلے...... جان سے مار دوں گا اگر ایک لفظ بھی منہ سے نکالا۔"

شاید وہ بھول گیا تھا کہ میرا ایک ہاتھ آزاد تھا۔ میں اپنے حواس میں نہیں تھا کہ سوچ بچار کرتا۔ میں نے نہایت برق رفتاری سے ہاتھ بڑھایا اور ملغانی کی گردن دبوچ لی۔ میری گرفت اتنی سخت تھی کہ میری انگلیاں اس کے نرخرے میں کھب گئیں۔ آن واحد میں اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر آ گئیں۔ بھنچی بھنچی آواز میں بولا۔ "چھچھ...... چھوڑ...... دو...... دو......"

میں حلق کے بل چیخا۔ اپنی انگلیوں میں بدن کی تمام قوت پروتے ہوئے ملغانی کے بہت قریب ہو گیا۔ ایسے ہی وقت میں غزالہ کو لانے والوں میں سے ایک کی نگاہ ملغانی کے چہرے پر پڑ گئی۔ اسے سنگینی کا احساس ہو گیا۔ گالیاں دیتا ہوا تیزی سے میری طرف بڑھا۔ میں نے اس کی غفلت اور بڑھی ہوئی خود اعتمادی سے فائدہ اُٹھایا اور پاؤں کی بھرپور ٹھوکر اس کی رانوں کے بیچ رسید کی۔ وہ 'اوغ' کی کریہہ آواز نکالتا ہوا زمیں بوس ہو گیا۔ جیدے نے خون آشام نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے گن کی نال میری کنپٹی پر رکھ دی۔ "استاد ملغانی کو چھوڑ دو ورنہ......"

میں نے اسے جواب دینے کے بجائے دانت کچکچائے۔ ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ انگلیاں کچھ اور کھب گئیں۔ غزالہ کو دیکھا۔ وہ چیخ رہی تھی۔ آزاد ہونے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ اسے یہاں لانے والا ایک شخص رانوں کے بیچ اپنے دونوں ہاتھ گھسیڑے آہستہ آہستہ اٹھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ فرطِ تکلیف سے سرخ ہو گیا تھا۔ دوسرا اغوا کار غزالہ کی بانہیں مروڑ کر اس کی پشت پر باندھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ اس کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔

ملغانی نے بہتیری کوشش کی کہ میری گرفت سے نکل جائے۔ اس کے دونوں ہاتھ میری کلائی سے چپکے ہوئے تھے۔ وہ جان میں مجھ سے کمزور تھا اس لیے اپنی گردن پوری قوت صرف کرنے کے باوجود میرے ہاتھ سے نہ چھڑا سکا۔ ایسے ہی وقت میں میری کنپٹی پر گن رکھنے والے شخص نے گولی چلانے کے بجائے گن ہٹائی، نال سے پکڑ کر ہوا میں بلند کی اور پوری قوت سے گن کا چوبی بٹ میرے سر میں دے مارا۔ یوں لگا جیسے میرے سر کے عقبی حصے پر بم پھٹ پڑا ہو یا میری

کھوپڑی کسی بم کی طرح بلاسٹ ہو گئی ہو۔ زوردار دھماکے کے ساتھ میرا ذہن بھک سے اُڑ گیا۔ میری تمام تر سوچیں اسی نکتے پر رک گئیں کہ میں نے ملغانی کی گردن پکڑی ہوئی ہے جسے میں نے مرتے دم تک نہیں چھوڑنا۔

مجھے اس بات کا ہلکا سا احساس ہوا کہ اس کم بخت نے اس جان لیوا وار کے بعد اپنا ہاتھ نہیں روکا تھا بلکہ میرے کندھے، بازو اور کمر پر ان گنت وار کیے تھے جن کے نتیجے میں میرا چہرہ خون سے تر ہو گیا۔ آنکھوں کے آگے خون ہی خون دکھائی دیا۔ چند لمحے، یا شاید چند منٹ میں اپنے پیروں کھڑا رہا، پھر بے سدھ ہو کر گر گیا یا کسی طرف لڑھک گیا۔ مجھے بڑی یاد ہے کہ میں نے احساس کی آخری گھڑی تک ملغانی کی گردن نہیں چھوڑی تھی۔

نجانے کس پہر میں میرے سر میں درد کی کٹیلی لہر جاگی اور مجھے بیدار کر گئی۔ میں کافی دیر تک خالی الذہنی کی سی کیفیت میں پڑا رہا۔ اس دوران میں نے بے ساختہ طور پر اپنی آنکھیں کھولنا چاہیں مگر میری انتہائی کوششیں بھی ناکام رہیں۔ یاد آیا کہ سر سے نکلنے والا خون آنکھوں تک چلا آیا تھا۔ اب جم گیا تھا یا جمنے کو تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ اٹھا کر آنکھوں تک لانا چاہا۔ ناکام رہا۔ چند لمحوں میں ہی مجھے محسوس ہو گیا کہ میں نہ صرف اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں بلکہ پورے جسم کے کسی بھی حصے کو حرکت نہیں دے پا رہا تھا۔ منہ کھولنے کی کوشش کی تو جما ہوا خون رکاوٹ بن گیا۔ میں محض 'اوں آں' کی آواز نکال کر خاموش ہو گیا۔ یہ خیال بڑا روح فرسا تھا کہ میرا دھڑ کام نہیں کر رہا تھا۔ سر میں ہلکے ہلکے دھماکے ہو رہے تھے جن کے نتیجے میں پیدا ہونے والی درد کی لہریں برداشت کی حد سے باہر تھیں۔ میں درد سے لڑتے لڑتے ہار گیا اور پھر گہری نیند یا بے ہوشی میں چلا گیا۔ زخم کے باعث درد کی لہریں اتنی تکلیف رساں تھیں کہ اگر میں بے ہوش نہ ہوتا تو یقیناً تکلیف سے مر گیا ہوتا۔

درد کی ہی کسی لہر نے پھر مجھے ہوش کی وادی میں لا پھینکا۔ میں نے سر کو حرکت دینے کی کوشش کی۔ سر میں جنبش پیدا ہوئی یا نہیں میرے حلق سے تکلیف کے مارے چیخ نکل گئی۔ میں اتنے زور سے چیخا تھا کہ میرے ہونٹوں، مونچھوں اور داڑھی کے بالوں میں سوکھے ہوئے خون کی پپڑی ٹوٹ گئی۔ منہ کھل گیا۔ میں پھر چیخا۔ "غزالہ...... غزالہ......"

جواب میں غزالہ کی آواز سنائی نہیں دی۔ بلکہ ایک بھرائی ہوئی سرد آواز کانوں میں پڑی۔ "غزالہ کے بچے! میں ہوں تمہارا باپ...... کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟"

مجھے اس کی آواز کسی پھٹے ہوئے ڈرم سے نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اپنے ذہن پر تھوڑا زور دیا۔ اس کی آواز کو پہچاننے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ استاد بجلو تھا۔ میں نے کہا۔ "تم لوگوں نے اچھا نہیں کیا استاد...... میں تم لوگوں کو چن چن کر اپنے ہاتھوں جہنم میں ڈالوں گا۔"

اس کی کھردری ہنسی میرے کانوں میں پڑی۔ "اب تم شاید ساری عمر اپنے پیروں پر کھڑے بھی نہیں رہ پاؤ گے شہریار! تمہیں کہا تھا ناں کہ ہمارے ساتھ تعاون کرو شاید زندہ بچ جاؤ۔ تم نے مستی دکھائی۔ اب اپنا برا انجام دیکھنے کے لیے آنکھیں کھول رکھو۔"

میں نے اس کی آواز سے اندازہ قائم کیا کہ وہ میرے آزاد ہاتھ کی طرف بیٹھا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑنا چاہا مگر ایک آہ میرے حلق سے نکل گئی۔ میری پوری کوشش کے باوجود میرے ہاتھ میں یا بازو میں ننھی سی حرکت بھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔

وہ بولا۔ "تم نے ملغانی کو مار دیا...... آہ! بڑا جی دار جگر تھا میرا۔ سوروں کو پچھاڑتا رہا مگر نہ جانے کیوں ایک بندھے ہوئے کتے کے ہاتھوں مر گیا...... تم نے میرا بڑا نقصان کیا ہے۔ کاش! موت سے بڑی بھی کوئی سزا دنیا میں ہوتی تو تمہیں وہ سزا دے کر اپنا کلیجا ٹھنڈا کر لیتا اور...... اور...... خیر...... تمہیں زمانے کے لیے عبرت بناؤں گا تو دل میں ٹھنڈ پیدا ہو گی۔" اس کی آواز میں روایتی خشکی کے ساتھ دکھ کی گہری لہریں موجزن تھیں۔

ملغانی کی موت کا سن کر دل میں طمانیت کی لہر دوڑی۔ میں نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی مگر جمے ہوئے خون کی بدولت پلکوں میں جنبش پیدا نہ ہو سکی۔ ایسے میں سر کی ٹیسوں میں اضافہ ہو گیا۔ برداشت کرنے کے لیے ہونٹ بھینچے، دانت کچکچائے مگر بے اختیار میرے حلق سے تیز چیخیں برآمد ہونے لگیں۔

ایسے میں غزالہ کی پھٹی پھٹی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ "خدا کیتے میڈے شہرے کو اسپتال گھن و نجو نی تاں ایہ مرویسی...... تہا کوں پیدا کرن آلے دا واسطہ!"

(خدا کے لیے میرے شہرے کو اسپتال لے جاؤ ورنہ یہ مر جائے گا۔ تجھے پیدا کرنے والے کا واسطہ)

اس کی آواز میں اس کے دکھ کا تمام تر نوحہ چھپا ہوا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ کافی دیر سے مسلسل چیختی چلی آ رہی تھی جس کی وجہ سے اس کا گلا بیٹھ گیا تھا اور آواز مردوں کی طرح بھاری ہو گئی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

استاد بلو نے اسے ڈانٹا۔ ایک اور بھاری آواز بھی سنائی دی۔ وہ جو کوئی بھی تھا، غلیظ گالیاں بکتے ہوئے اسے خاموش رہنے کا حکم دے رہا تھا مگر وہ شاید کسی کی بات سن ہی نہیں رہی تھی بلکہ یہی جملہ بار بار ادا کیے جا رہی تھی۔ پھر ایک زوردار طمانچے کی آواز سنائی دی۔ میرے ذہن کو ایک اور جھٹکا لگا۔ اپنی تکلیف بھول گیا۔ حلق کے بل چیخا۔ ”بلو! ملغانی ریت تیکوں وِی موت گھن ویسی...... میں کیں کوں نہ چھڑیساں...... ہک ہک کوں چن کے مریساں بھاڑی دی اولاد!“

(بلو! ملغانی کی طرح تم بھی موت کا شکار ہو گے۔ میں کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔ چن چن کر تم لوگوں کو ماروں گا)

استاد بلو نے میرے چہرے پر زوردار چانٹا رسید کیا۔ میں جس تکلیف سے نبرد آزما تھا، اس کے مقابلے میں یہ بہت معمولی چوٹ تھی۔ میں نے سر جھٹکا۔ اپنی تکلیف میں اضافہ کر بیٹھا۔ سر میں دھماکے ہونے لگے جنہوں نے غزالہ کی آواز دبا دی تھی یا وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ میرے دشمنوں سے یہ بھی تو بعید نہیں تھا کہ اس کے منہ پر ٹیپ چپکا دی گئی ہو۔

استاد بلو نے غزالہ کو تھپڑ مارنے والے یا کمرے میں موجود کسی اور شخص کو مخاطب کیا۔ ”اوئے کرمے! ادھر آ...... اس کی آنکھوں پر پانی ڈال...... یہ خون صاف کر دے تاکہ یہ اپنا انجام دیکھنے کے قابل ہو جائے۔ وہ چوہا کمپاؤڈر ابھی تک نہیں آیا۔ نجانے کہاں مر گیا ہے۔“

چند لمحوں بعد میرے چہرے پر پانی کے چند چھینٹے پڑے۔ میں نے پلکوں کو حرکت دی مگر ناکام رہا۔ چند چھینٹے مارنے کے بعد کرمے نے ایک کھردرے کپڑے سے میری آنکھیں صاف کیں۔ یہ عمل بھی نہایت تکلیف دہ ثابت ہوا۔ رگڑ کر خون صاف کرنے کے مرحلے میں سر دائیں بائیں حرکت کرتا تو موت کا فرشتہ دکھائی دینے لگتا۔ آنکھیں کھلنے تک میری سکت دم توڑ گئی تھی۔ میں خالی الذہنی کی جان کنی میں پڑا لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ اس دوران استاد بلو نے مجھے کیا کہا، میرے ساتھ کیا کیا، مجھے معلوم نہ ہوا۔ جب کافی دیر بعد میرے اوسان بحال ہوئے تو وہ جا چکا تھا۔ میں نے دو تین بار اُسے پکارا مگر جواب نہ ملا۔ غزالہ کو آواز دی تو جواب میں ’غوں غوں‘ کی آواز سنائی دی۔

جب کھلی آنکھوں میں چھت کا گھومتا ہوا منظر ٹھہرا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں چاروں شانے چت فرش پر پڑا تھا۔ میری آنکھیں چھت کے چوبی شہتیر اور کڑیوں پر ثبت تھیں۔ میں نے سر کو حرکت دے کر غزالہ کو دیکھنے کی کوشش کی مگر سوائے ناقابلِ برداشت تکلیف کے کچھ حاصل نہ ہوا۔ وہ دکھائی دی نہ اطراف کی دیواریں...... لاچارگی کے سامنے ہتھیار ڈال کر میں نے اپنے جسم کے مختلف اعضا کو حرکت دینے کی کوشش کی مگر یہ دیکھ کر میری سانس سینے میں اٹک گئی کہ گردن کے نیچے والا تمام دھڑ بے جان اور مفلوج ہو چکا تھا۔

میں نصف گھنٹے کے قریب ایک بے نتیجہ جنگ لڑتا رہا۔ بے بسی کے احساس سے میری آنکھیں بھر آئیں۔ کمرے میں قدموں کی چاپ ابھری۔ ایک سے زیادہ آدمی اندر آئے تھے۔ استاد بلو کی آواز سنائی دی۔ ”اس کا زخم دیکھو اور صفائی کر کے پٹی کر دو۔“

میں سمجھ گیا کہ وہ کمپاؤڈر کو لے کر آیا تھا۔ میں نے کہا۔ ”جانے دو استاد! جب مجھے مرنا ہی ہے تو پھر یہ تکلف کیوں کر رہے ہو۔ ڈریسنگ کی تکلیف نہ دو مجھے۔“

اس کا فرعونی قہقہہ میرے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح پڑا۔ ”نہیں جانی! تمہیں ابھی بہت کچھ دیکھنا ہے۔ بڑے خان کا حکم ہے کہ کھیل کی آخری بازی تک تمہاری آنکھیں کھلی رہیں اور تمہارا دماغ پوری صلاحیت کے ساتھ کام کرتا رہے۔“

اسی لمحے مجھے نوکیلی مونچھوں والے جواں سال کمپاؤڈر کا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ جھک کر میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ شاید اس نے میری نبض بھی چیک کی تھی۔ وہ پختہ کار ہنر مند نہیں تھا۔ میری حالت دیکھ کر ڈر گیا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت اور سراسیمگی پھیل گئی تھی۔ تھوک نگل کر بولا۔ ”صاحب! اس کو نشتر اسپتال لے جانا پڑے گا۔ زخم بہت گہرا ہے۔“

”اسے کہیں نہیں جانا۔ تم اپنا کام کرو اور چلتے بنو۔“ بلو نے قدرے سختی سے کہا۔

میں نے کہا۔ ”ڈرو مت خون صاف کر کے پٹی کر دو۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ اس دوران اس نے کوئی چیز میری کلائی پر ماری۔ پوچھا۔ ”میں نے کیا کیا ہے؟“

میں نے آنکھوں سے ’نہیں‘ کا اشارہ کیا۔ اس نے پھر کسی عضو پر ٹھوکر ماری۔ پوچھا۔ میرے انکار پر اس نے کہا۔ ”پیروں کو حرکت دو۔“

میں نے کہا۔ ”فضول کوشش مت کرو۔ جو کہہ رہا ہوں وہی کرو۔ میرا تمام دھڑ سن ہو چکا ہے۔ مفلوج ہو چکا ہے۔“

میری بات سن کر استاد بلو جلدی سے مجھ پر جھکا۔ ”تم سچ کہہ رہے ہو؟“

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ کمپاؤڈر نے کسی کی اجازت سے مجھے پہلو کے بل لٹایا اور نہ جانے میرے زخم کے ساتھ کیا سلوک کیا صفائی کی بھی، یا نہیں، البتہ پٹی باندھ دی۔ فارغ ہو کر استاد بلو سے مخاطب ہوا۔ ”لگتا ہے اس کے بازو کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی ہے۔ یہ دیکھیں ٹیڑھا ہو رہا ہے۔ ہاں! اس کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔“

بات کرنے کے دوران اس نے شاید میرا بازو ہلا جلا کر دیکھا تھا اس لیے اپنی تشکیک آمیز رائے پر فیصلہ کن نتیجہ چپکا دیا تھا۔ استاد بلو نے کہا۔ ”تو ٹھیک ہے...... اگر ممکن ہے تو اس کے بازو کی ہڈی کو سیدھا کر کے پٹی باندھ دو۔“

کمپاؤڈر میرے پہلو میں بیٹھا اپنے ہنر کو آزماتا رہا۔ کافی دیر بعد اس نے اپنے کام کے خاتمے کا اعلان کر دیا اور استاد بلو کے کسی کارندے کی معیت میں کمرے سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد استاد بلو نے مجھے اپنے ہاتھوں سے پانی پلایا۔ اُٹھا کر بٹھانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا تو اس نے کرمے کو آواز دے کر پاس بلا لیا۔ دونوں نے مل کر مجھے اُٹھایا اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بٹھا دیا۔ درد کی ناقابلِ برداشت ٹیسوں میں کچھ کمی آئی تو میں نے اپنے عین سامنے والی دیوار کی جڑ میں غزالہ کو گٹھڑی کی صورت میں پڑے دیکھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بے دردی سے باندھے گئے تھے۔ منہ پر کپڑا بندھا ہوا تھا۔ لامحالہ طور پر اس کے منہ میں کپڑے کا گولا بھی ٹھونسا گیا ہو گا۔ میں نے کراہتے ہوئے استاد بلو سے کہا۔ ”اس کا منہ کھول دو۔“

اس نے لیت و لعل سے کام نہیں لیا بلکہ ہاتھ کے اشارے سے کرمے کو غزالہ کی طرف بھیج دیا۔ وہ کپڑا کھولنے لگا۔ استاد بلو نے جستی گلاس کا پیندا میرے ٹخنوں پر دو چار مرتبہ مارا اور میرے تاثرات میں تبدیلی کا جائزہ لیا۔ تاسف بھرے لہجے میں بولا۔ ”یار! تم تو واقعی اپاہج ہو گئے ہو۔ ٹوائلٹ کیسے جاؤ گے؟“

یہ مجھ پر پڑنے والی مصیبت کے مقابلے میں بہت معمولی واقعہ تھا۔ میں نے آنکھیں موند لیں، پوچھا۔ ”ملغانی واقعتاً مر گیا ہے؟“

وہ سانپ کی طرح پھنکارا۔ ”تو کیا میں نے بکواس کی تم سے؟“

غزالہ کی زبان بندی ختم ہو گئی تو وہ پھر دریدہ آواز میں چلانے لگی۔ ”شہرے! شہرے! توں ہوش وچ تاں ہیں؟“ (شہرے! کیا تم ہوش میں ہو؟)

میرا دل بھر آیا۔ اس کی حالتِ زار دیکھنا میرے بس سے باہر تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”ہاں! تم فکر نہ کرو۔ اوپر والا ہماری مدد کرے گا۔“

”یہ کون لوگ ہیں اور ہماری ان سے کیا دشمنی ہے؟ انہوں نے تمہیں کیوں مارا ہے؟“ وہ پاگلوں کے سے انداز میں مجھ سے دریافت کرنے لگی۔

میں نے اس کی بات نظر انداز کی، بلو سے پوچھا۔ ”استاد! میں کتنی دیر بے ہوش رہا ہوں؟“

”لگ بھگ چوبیں گھنٹے...... کل سہ پہر سے اب تک......“ استاد بلو شاید اپنے دیرینہ رفیق ملغانی کی موت سے دلبرداشتہ تھا یا کوئی اور بات تھی اپنے مخصوص انداز سے خاصا ہٹا ہوا اور منتشر ذہن معلوم ہو رہا تھا، بولا۔ ”میں نے اپنے طور پر پروگرام بنایا تھا کہ خانزادوں کو سمجھا بجھا کر تمہاری جان بخشی کرا دوں گا۔ تمہاری منگیتر کے ساتھ بھی کچھ ایسا ویسا نہیں ہونے دوں گا مگر تمہاری حماقت نے نہ صرف ریاض ملغانی جیسے قیمتی آدمی کو موت کے گھاٹ سلا دیا بلکہ اپنا تیا پانچہ بھی کرا لیا۔ اب تمہارے لیے کچھ نہیں کیا جا سکتا۔“

میں نے اسے بہ نظر احتیاط دیکھا، کہا۔ ”استاد! سچ بتاؤ کیا تم نے ابھی جو کہا ہے، اس میں کوئی صداقت بھی ہے؟“

اس نے کہا۔ ”بالکل ہے! میں نے کہا تھا ناں کہ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ میں تمہاری مدد کرنا چاہتا تھا مگر تم نے اپنے پیروں پر آپ کلہاڑی مار لی ہے اور ہاں! تمہاری ناگفتہ بہ حالتِ زار کے سبب دو چار دن بعد منعقد ہونے والا جشن آج رات منایا جا رہا ہے۔ ابھی چار بجے ہیں۔ آٹھ بجے، جب رات شروع ہو گی، تب تمہاری بربادی کا کھلا تماشا بھی شروع ہو جائے گا۔“

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں وقتی طور پر بھول گیا تھا مجھے کس قیامت کے دہانے پر لا کھڑا کیا گیا تھا۔ میں نے منت آمیز لہجے میں کہا۔ ”استاد! مجھے اپنی زندگی کی پروا نہیں ہے۔ میں مرنے کے لیے ہی پیدا ہوا تھا۔ ہر انسان کی طرح۔ مگر خدا کے لیے...... مجھ پر ایک احسان کر دو۔ اسے یہاں سے فرار کرا دو۔ نور پور پہنچا دو۔ میں اس کی ذات پر اٹھنے والی انگلی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہ صرف مجھے بلکہ یارن خان اور حیدر خان کو بھی اس بات پر یقین ہے کہ تمہیں اپنے زخموں کے مقابلے میں اس لڑکی سے چھیڑ چھاڑ کا دُکھ زیادہ ہو گا۔“

”کاش! میرے بدن میں سکت ہوتی تو میں تمہارے پاؤں بھی پکڑ لیتا۔ تمہاری منت سماجت کر لیتا۔ خدا کے لیے اسے یہاں سے نکال دو۔“ میری آواز بھرا گئی۔

”نہیں جانی! ڈور کا یہ سرا میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں ایسا نہیں کرسکتا۔ بڑا خان ریاض ملغانی کی ناگہانی موت پر بہت مشتعل ہے۔ وہ میری کوئی غلطی یا کوتاہی برداشت نہیں کرے گا۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔''

''کسی طرح میڈم شکیلہ کو ہی اطلاع کردو۔''

وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا، بولا۔ ''تاکہ اپنی موت کا سامان اپنے ہاتھوں کرلوں۔''

''نہیں...... میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔''

اس کی مسکراہٹ میں زہر گھل گیا۔ ''تم اب شاہ زور نہیں رہے، اپاہج گھوڑے بن چکے ہو جسے اس کا مالک بھی گولی مارنے پر مجبور ہوتا ہے۔''

میں نے اتنی زور سے آنکھیں بھینچیں کہ سر کے عقبی حصے میں درد کی کٹیلی لہر جاگ اٹھی۔ رکے ہوئے آنسو نکل پڑے جنہیں استاد ببلو نے بڑی نرمی سے پونچھ ڈالا، کہا۔ ''جانی! یوں نہیں...... مصیبتیں مردوں پر آتی ہیں اور مرد بہادری اور سینہ زوری سے مقابلہ کرتے ہیں۔ رونا عورتوں کا کام ہے۔ اپنی بے داغ بریوا سٹوری پر بزدلی کے آنسوؤں کے داغ مت لگاؤ۔''

میرے بدن کی تمام تر شکستگی میری آواز میں بھر آئی۔ ''استاد! انسان کی غیرت پاش پاش ہوجائے تو اس میں اور لاچار عورت میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ اگر تم لوگوں نے اسے نہ اُٹھایا ہوتا، میری آنکھوں کے سامنے نہ لایا گیا ہوتا تو دیکھتے...... میں ہنس کر موت کو گلے لگاتا۔ آنسو تو کیا، میرے لہجے میں ہلکی سی نقاہت بھی نہ اترتی...... اب بھی آزمانا چاہو تو آزمالو۔ اسے واپس بھیج دو اور میری مردانگی کا امتحان لو۔ 'اف' تک نہیں کروں گا خواہ میرے جسم کے ہزاروں ٹکڑے ہوجائیں۔''

اس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ نیم آزردگی سے مسکرایا، بولا۔ ''ہاں! تم ٹھیک کہتے ہو۔ میرو شاہ بڑا آدمی ہے، گرو اُستاد ہے۔ اس کے ہاتھ کا چنڈا ہوا (تربیت دیا ہوا) شخص عام نہیں ہوتا۔ میں جانتا ہوں۔ تمہیں اور پیا جی کو بھی...... اور ہاں شہرے! تم جس دکھ سے آج رات گزرنے والے ہو، میں اس دکھ سے اپنے لڑکپن میں گزرا تھا۔ تب سے آج تک...... میں کسی ایک لمحے میں بھی چین کی سانس نہیں لے پایا۔ خون سے کھیلتا ہوں مگر تنہائی میں اپنے آنسوؤں سے ہار جاتا ہوں۔ وہی انتقام زمانے سے لیتا آرہا ہوں۔ مگر...... چاہتے ہوئے بھی تمہیں اس عذاب سے نکال نہیں سکتا۔ خان آج تک میری بھی مانتا آیا ہے مگر میں جانتا ہوں کہ وہ اس معاملے میں میری ایک نہیں سنے گا۔''

''تم کوشش تو کردیکھو!'' میں نے دردآمیز لہجے میں کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھ سے کھانے پینے کے بارے میں پوچھا۔ میں نے انکار کردیا۔ وہ غزالہ پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال کر کمرے سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے غزالہ کو دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کیے مردوں کی طرح پڑی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ سوجا ہوا تھا۔ ایک گال پر انگلیوں کے نشان ثبت تھے۔ بال کھلے ہوئے، لباس دو تین جگہوں سے پھٹا ہوا تھا جبکہ جسم گٹھڑی کی صورت فرش پر پڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے پکارا۔ اس نے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''شہرے! اَب کیا ہوگا؟''

میں جانتا تھا کہ ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے مگر مجھ میں بتانے کی ہمت نہیں تھی۔ میں نے کہا۔ ''سوہنے رب سے دعا کرو۔''

''مجھے نہیں لگتا کہ یہ ہمیں زندہ چھوڑدیں گے۔''

''کہاناں! دعا کرو۔''

''تمہیں بڑی بے دردی سے ان کمینوں نے مارا ہے...... میری نظروں کے سامنے...... ہائے! ان بے غیرتوں کے ہاتھ ٹوٹ جائیں...... مگر شہرے! تم میں اتنی طاقت کہاں سے آگئی کہ سب مل کر بھی تمہارے ہاتھ سے اس کی گردن نہ چھڑا سکے۔ تم بے ہوش ہوگئے، پھر بھی... اور جب انہوں نے تمہارا ہاتھ ہٹالیا، تب وہ مرچکا تھا۔ ہائے! مجھے بخار ہوگیا ہے شہرے...... میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے...... تمہیں بھی بہت درد ہوگا سر میں۔ ہے نا؟''

سرائیکی میں بڑے بے ربط انداز میں بولے چلی جارہی تھی۔ مجھے بولنے کا موقع نہیں دے رہی تھی۔ کافی دیر تک بے لاگ بولتی رہی۔ پھر شاید تھک گئی، بولی۔ ''تم بول کیوں نہیں رہے؟ کیا ہوا ہے؟''

میں نے اسے دلاسا دیا۔ خود پر قابو پانے کا کہا۔ پوچھا۔ ''تمہیں ان لوگوں نے کیسے اغوا کیا؟''

اس نے بتایا کہ وہ بخت خان کے گھر سے نکل کر حیات خان کے گھر جارہی تھی۔ حیات خان کی بیوی نے اسے کسی کام سے بلایا تھا۔ جونہی گلی میں نکلی، سردار بہرام خان کے دارے کے باہر کھڑی ہوئی سرخ رنگ کی کار اسٹارٹ ہوکر اس کے برابر میں آگئی۔ دو آدمی برق رفتاری سے نکلے جنہوں نے اسے آناً فاناً دبوچ کر کار میں ڈال لیا۔ جب تک وہ معاملے کو سمجھتی، کار نور پور حیات خان کے دارے کا موڑ مڑ کر بخشو لوہار کی دکان عبور کرچکی تھی۔ اسے چیخنے چلانے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اسے نور پور سے نکال کر سیدھا یہاں لا پھینکا گیا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا تمہیں کار میں ڈالتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا؟''

''گلی خالی نہیں تھی۔ اکا دکا لوگ آجا رہے تھے۔ میں اس طرف دھیان ہی نہیں دے پائی کہ کسی نے مجھے اغوا ہوتے ہوئے دیکھا تھا یا نہیں۔'' اس نے بتایا۔

میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ بخت خان تب سے غائب تھا، جب سے مجھے یارن خان کی حویلی سے لینے کے لیے گیا تھا۔ اس کے گھر والے بہت پریشان تھے۔ بخت خان کی بیوی یارن خان کے پاس خود چل کر گئی تھی۔ اس نے اپنے خان کے بارے میں پوچھا تو جواب ملا کہ وہ شہر یار کو اپنے ساتھ لے کر اس کی حویلی سے چلا گیا تھا۔ کہاں؟ اس سوال کا جواب یارن خان نے لاعلمی کی صورت میں دیا تھا۔ بخت خان کی بیوی نے تھانے میں رپٹ درج کرادی۔ پولیس آئی۔ یارن خان کی حویلی کی تلاشی لینے گئی۔ کچھ نہ ملا۔ ادھر اُدھر گاڑیاں دوڑائی گئیں۔ نور پور والوں اور پولیس کے اہلکاروں کو نہ بخت خان ملا اور نہ میں ہی...... نہ انہوں نے بخت خان کی بیوی کے ایما اور اصرار پر یارن خان کے خلاف پرچہ درج کیا۔ اس نے مجبوراً عدالت کا رخ کرلیا تھا۔

میں نے کھالے اور بخشو لوہار کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا کہ یارن خان نے انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر، دوبارہ ایسا نہ کرنے کا وعدہ لے کر چھوڑ دیا تھا۔ وہ 'جان بچی سو لاکھوں پائے' کا ورد کرتے ہوئے گھر پہنچ گئے تھے۔ غزالہ نے منت سماجت کرکے کھالے کو میری تلاش پر روانہ کردیا تھا۔ کھالا لوٹ کر نور پور نہیں گیا تھا۔ بے چارہ مجھے تلاش کرتا پھرتا ہوگا۔ اچانک امید کا ایک دیا میری آنکھوں کے سامنے روشن ہوگیا۔ کھالا اگر میری تلاش میں نکلا تھا تو مایوس ہوکر میڈم شکیلہ کے پاس ضرور پہنچا ہوگا۔ میڈم کو اگر بھنک پڑ گئی کہ میں مصیبت میں ہوں، یارن خان کی قید میں ہوں تو وہ بجلی کی سی تیزی سے میرا سراغ لگا کر مجھ تک پہنچ جائے گی۔ میں جب سے یہاں مقید تھا، یہ پہلی امید کی کرن تھی۔

غزالہ اور میرے بیچ ایک چارپائی کا فاصلہ حائل تھا۔ میں نے اُسے بغور دیکھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے مگر وہ مجھ تک پہنچ سکتی تھی۔ میں نے اُسے اپنے پاس بلایا۔ وہ چند لمحے خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ پھر میری طرف کروٹیں لینے لگی۔ وہ کھڑی نہیں ہوسکتی تھی نہ بیٹھ سکتی تھی مگر گھسٹ کر یا کروٹیں بدل کر مجھ تک پہنچ سکتی تھی۔ اب تک یہ خیال نہ اُسے آیا تھا، نہ مجھے۔ جب وہ میرے قریب پہنچی تو اس نے سسکتے ہوئے اپنا چہرہ میرے گھٹنوں پر ڈال دیا۔ میں نے اس کے ہاتھوں کی رسیاں دیکھیں۔ اسے کہا۔ ''اپنے ہاتھ میرے منہ تک لانے کی کوشش کرو۔''

اس نے اپنے عقب میں بندھے ہوئے ہاتھ بڑی تگ و دو کے بعد میرے لبوں تک پہنچائے۔ دانتوں سے گرہیں کھولنا مشکل کام تھا مگر میں نے اپنی تکلیف برداشت کرتے ہوئے اس کے ہاتھوں کی مشکیں کھول دیں۔ اس نے اپنے بازو پھیلائے۔ مجھ سے لپٹ گئی۔ ہچکیاں لیتے ہوئے رونے لگی۔ میں نے کہا۔ ''رو کر میرا حوصلہ پست نہ کرو بلکہ اپنے پیروں کی رسیاں کھول دو۔''

وہ چونک کر اُٹھ بیٹھی۔ پیروں کی رسیاں کھولنے کے بعد پنڈلیاں سہلانے لگی۔ پھر ایک جھٹکے سے میری طرف آئی۔ میرا بازو تھام کر دیوانہ وار چومنے لگی۔ دیوار تھام کر کھڑی ہوئی اور میرے سر کا زخم دیکھنے لگی۔ پوچھنے لگی۔ ''تم کیا کہہ رہے تھے کہ تمہارا جسم مفلوج ہے۔ سچ؟''

میں نے ہولے سے سر ہلایا، کہا۔ ''کمپاؤڈر کہہ رہا تھا کہ میرے بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ ہڈی ٹوٹنے سے بہت درد ہوتا ہے مگر مجھے احساس تک نہیں ہورہا۔''

کہنے کو میں نے یہ سب کہہ تو دیا مگر اندر سے دہل کر رہ گیا۔ یقیناً میرے دماغ میں کوئی خطرناک چوٹ آئی تھی جس سے میرے حرام مغز نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ میں نے ڈاکٹر منور علی شاہ سے سن رکھا تھا کہ حرام مغز یا ریڑھ کی ہڈی کے اوپر والے حصے کے نظام میں گڑبڑ کی وجہ سے انسان کا دھڑ مفلوج ہوجاتا ہے۔ کم و بیش یہی کیفیت منکا ٹوٹ جانے سے پیدا ہوتی ہے۔ ڈاکٹر شاہ جی نے تو یہ بھی بتایا تھا کہ ایسے مریض مر جاتے ہیں۔ بچ جانے والوں کی تعداد محض دس بارہ فیصد ہوتی ہے۔ دماغی چوٹ کا علاج بہت مہنگا ہوتا ہے۔ مجھے پوری طرح احساس تھا کہ میں بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہوگیا تھا۔ یہاں سے بچ نکلنے کی صورت میں بھی زندگی کے محض دس فیصد امکانات میرے پاس تھے اگر کسی جدید ترین اسپتال تک پہنچ جاتا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ زندگی کی بقیہ غیر معینہ مسافت میں بیڈ پر چت لیٹے ہوئے گزار دیتا۔ ایک لمحے کو میرا ذہن تاریکی کی دبیز چادر میں لپٹ گیا۔ میں نے اپنا سر جھٹکا۔ اپنے آپ کو سنبھالا اور کہا۔ ''غزالہ! مجھے یقین ہے کہ ہم اس مصیبت سے زندہ و سلامت نکل جائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

گے۔ پریشان ہونے کے بجائے تم حوصلہ رکھو اور مجھے بھی حوصلے میں رکھنے کی کوشش کرو۔"

وہ گھٹنوں میں سر ڈال کر سسکنے لگی۔ وہ ایسے ناساعد حالات سے زندگی بھر نہیں گزری تھی اس لیے اپنے آپ کو سنبھالنے کے لائق نہیں تھی۔ میں نے اسے کچھ دیر رونے دیا۔ جب غبارِ جاں تحلیل ہوگیا تو گم صم بیٹھ کر میری ٹانگیں دبانے لگی۔ اس نے میرے پیروں کے تلوے اور ہتھیلیوں کو سہلایا۔ اپنی قمیص کے پلو سے میرے چہرے پر جمے ہوئے خون کو صاف کرنے کی کوشش کی۔ میری نشان دہی پر اس نے میرے جسم سے لپٹی زنجیروں کو ہلا جلا کر دیکھا۔ کھولنے کی اپنی سی کوشش کی مگر بھاری قفل اس سے نہ ٹوٹنے والے تھے اور نہ کھلنے والے تھے۔ کمرے کی دیوار میں موجود الماری میں سلور کا جگ اور گلاس دھرا تھا۔ اس نے پانی پیا، مجھے بھی پلایا اور تھک کر میری گود میں سر رکھ کر پہلو کے بل لیٹ گئی۔ وہ جاگ رہی تھی مگر اس کی آنکھیں بند تھیں۔ لب لرز رہے تھے۔ دل ہی دل میں کوئی وظیفہ کر رہی تھی یا اپنے خدائے بزرگ و برتر سے اپنی اور میری سلامتی کی دعا مانگ رہی تھی۔ میں اسے یک ٹک دیکھتا رہا۔ بہت زیادہ نقاہت کا اثر تھا، دماغی کمزوری لاحق تھی یا کچھ اور تھا میری آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہونے لگیں۔ ذہن پر غنودگی چھانے لگی۔ میں نے نیند سے دامن چھڑانا چاہا مگر ناکام رہا اور چند لمحوں میں ہی دنیا و مافیہا سے غافل ہوگیا۔ سچ کہتے ہیں کہ نیند تو سولی گھاٹ پر بھی آجاتی ہے۔

وقت اپنی سرمست چال سے ناک کی سیدھ میں گامزن تھا۔

☆☆☆

میری آنکھ دروازے کی پرانی طرز کی بھاری کنڈی طاق پر گرنے کی آواز سے کھلی۔ میں چند لمحوں تک خالی خالی نظروں سے سامنے والی دیوار کو گھورتا رہا۔ جھولی میں غزالہ کا چہرہ دکھائی دیا تو تمام پچھلی صورتحال دل و دماغ پر آشکار ہوگئی۔ وہ جاگ رہی تھی اور مجھے خالی خالی آنکھوں سے دیکھے جا رہی تھی۔

دروازہ استاد بیلو نے کھولا تھا۔ وہ میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ننھا سا پستول دبا ہوا تھا۔ غزالہ کو میری گود میں آزاد پڑا دیکھ کر اس کی آنکھوں میں حیرانی رچ گئی۔ پھر اس کی نظریں فرش پر بکھری ہوئی رسی پر پڑیں۔ زیرِ لب کچھ بڑبڑایا پھر مجھے مخاطب کر کے بولا۔ "کیا حال ہے جوان؟"

میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ ہونٹ بھاری بھاری محسوس ہو رہے تھے۔ شاید آنکھوں کے اردگرد کا ماس سوجن پکڑ گیا تھا کیونکہ آنکھیں بھی صحیح طور پر کھل نہیں رہی تھیں۔ میں نے 'ٹھیک ہوں' کہا۔ میرے عقب میں کھلی کھڑکی کے راستے مختلف آوازیں کمرے میں پہنچ رہی تھیں۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ شاید آٹھ بج چکے تھے۔ میرا مقتل سجایا جا رہا تھا یا سج چکا تھا اور میرا انتظار کیا جا رہا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" استاد بیلو کی بھاری مگر سرد آواز میرے کانوں میں پڑی۔ "تمہارے شایانِ شان انتظامات کرنے میں کچھ دیر ہوگئی ہے۔ آٹھ بجے محفل سجانے کا ارادہ تھا، نو بج گئے، ابھی دو چار کام باقی ہیں۔ پھر تمہارے طلب گاروں کو مدعو کیا جائے گا۔"

میرے دل و دماغ میں وحشت بھر گئی۔ آنکھیں سلگ اٹھیں۔ میں نے اپنی پوری توانائی صرف کر کے اپنا ہاتھ اٹھا کر غزالہ پر رکھنا چاہا، شاید اسے تھام کر محفوظ کرنا چاہتا تھا مگر میرے اعصاب میں رائی بھر تحریک پیدا نہیں ہوئی۔ میں نے ہونٹ بھینچ لیے، کہا۔ "استاد! بہت برا...... بہت ہی برا کر رہے ہو تم لوگ۔"

اس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا، لبوں پر زہریلی مسکراہٹ سجائی اور کہا۔ "رنگو قسائی نے بھی یہی ڈائیلاگ مارا ہوگا تم سے...... اس کنجری میڈم سے زندگی کی بھیک مانگی ہوگی...... مگر تم لوگوں کو اس پر ذرا ترس نہ آیا ہوگا نہ ہی تمہیں اپنے انجام کی فکر لاحق ہوتی ہوگی۔ ہے نا؟ آج بھی وہی منظر سجا ہے۔ تم ہمیں ہمارے انجام سے خبردار کرو، منت سماجت کرو...... کچھ نہیں ہونے والا۔ تمہاری منگیتر کو تماشا بننا ہے، سو بن کر رہے گی۔ تمہیں مرنا ہے سو تم مر کر ہی یہاں سے نکلو گے۔ کل ہمارے ساتھ بھی یہی ہوگا۔ ہم نے کون سی نیکیاں کی ہیں کون سی اچھائیاں برتی ہیں دنیا کے ساتھ...... ہمیں کیوں یہ توقع ہو کہ ہمارے جنازے پڑھائے جائیں گے، ہماری میتوں پر ماؤں بہنوں کے بین ہوں گے؟...... اپنی کاشت کی ہوئی فصل ہم بھی کاٹیں گے جس طرح تمہیں آج کاٹنی ہے۔"

اس کی بے تاثر آواز میں موت کے کئی خونیں اشتہار مخفی تھے۔ میں نے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔ یہ ارادہ کرلیا کہ اس سے خیر کی خیرات نہیں مانگوں گا۔ اس گھڑی میں نے اپنے آپ کو اتنا بے بس محسوس کیا تھا جتنا زندگی کے کسی لمحے میں کبھی نہیں کیا تھا۔

میرے بدن سے لپٹی ہوئی آہنی زنجیر بے معانی تھی۔

اگر وہ کھول بھی دی جاتی تو میں ایک ملی میٹر حرکت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں سنگ دلی سے یہ طے کر چکا تھا کہ مجھے لگنے والی سر کی چوٹ کا نتیجہ میری موت کی صورت نکلنے والا ہے۔ کل مروں یا آج...... اس سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں۔ البتہ میرا دل بار بار غزالہ کے ساتھ ہونے والی متوقع درندگی سے کانپ اٹھتا تھا۔ یہ خیال ہی بڑا لرزہ خیز تھا کہ اسے میری آنکھوں کے سامنے درندے اپنی ہوس کی آگ بجھانے کے لیے تختۂ مشق بنائیں گے۔

استاد بیلو نے اپنے ایک کارندے کو بلا کر کھانا اور چائے لانے کا حکم دیا۔ چند لمحوں میں کارندہ چنگیک، دو پیالے اور بڑی سی چنگیر میں کھانا رکھ کر لے آیا۔ استاد بیلو کے اشارے پر اس نے تمام چیزیں غزالہ کے سامنے رکھ دیں اور الٹے قدموں چلتا ہوا دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ استاد کی بھاری آواز سنائی دی۔ "اے لڑکی! خود بھی کھاؤ اور اپنے یار کو بھی اپنے ہاتھوں سے آخری کھانا کھلا دو۔"

خالی پیٹ ہونے کے باوجود مجھے کھانے کی احتیاج نہ تھی۔ غزالہ کو بھی طلب نہیں تھی مگر استاد بیلو کے اصرار پر ہم نے چند لقمے زہر مار کیے۔ پانی پیا اور چائے کا ایک ایک پیالہ شکم میں اتارا۔ اس دوران وہ میرے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ میرے پاس اس کی کسی بات کا جواب نہیں تھا کیونکہ میرے ذہن میں جھکڑ چل رہے تھے۔ سائیں سائیں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ دل ہی دل میں کسی انہونی کے رونما ہونے کی دعا کیے جا رہا تھا۔ انہونی وقوع پذیر نہیں ہوئی بلکہ پستول انگلی میں گھماتے ہوئے استاد بیلو کھڑا ہوگیا۔ اس نے آنکھوں سے کھانا لانے والے دبلے پتلے کارندے کو کوئی حکم دیا۔ اس نے رُخ پھیر کر صحن میں کھڑے ہوئے اپنے ساتھیوں کو آواز دی۔ کرما اور دولتیاں جھاڑنے والا جیدا چند لمحوں بعد کمرے میں کھڑے تھے۔

استاد بیلو نے کہا۔ "اس لڑکی کو اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے جاؤ۔ اسے خاقت تیار کردو۔"

غزالہ کا رنگ سپید ہوگیا، ہکلا کر بولی۔ "دشش...... نہ...... نہ..."

کاٹو تو بدن میں لہو نہیں کے مصداق میری حالت دگرگوں ہوگئی۔ آنکھیں ساکت ہوگئیں۔ آن کی آن میں دونوں نے غزالہ کو بازوؤں سے پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے کمرے سے باہر لے گئے۔ وہ بلند آواز میں چیخ چیخ کر مجھے پکارتی جا رہی تھی۔ یہاں اس کا میرے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ میں بھی لٹنے اور نہ ہونے کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ استاد بیلو کی طرف دیکھا۔ شاید میری آنکھوں نے اس سے کوئی سوال کیا تھا، وہ بولا۔ "اس کے لیے خان کے حکم پر نئے ملبوسات وغیرہ منگوائے گئے ہیں۔ آج کی رات یہ وہ سب کچھ پہنے گی جس کے اس نے زندگی بھر خواب بھی نہیں دیکھے ہوں گے۔"

اس کے لہجے میں چھپی ہوئی سفاکی اور بے رحمی میری روح میں سرد لہر بن کر اتر گئی اور میرا سر بے جان انداز میں ایک کندھے پر آن گرا۔ یوں لگا جیسے میرے جسم کے ساتھ ساتھ میری روح نے بھی میرا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ مجھ پر ایک ترحم آمیز نگاہ ڈال کر استاد بیلو بھی کمرے سے نکل گیا۔ اس کا جانا یا کمرے میں رکنا میرے نزدیک بے معانی ہو کر رہ گیا۔ کھڑکی کے راستے سے گزر کر آتی ہوئی مختلف آوازیں ہتھوڑوں کی طرح میرے ذہن پر ضربیں لگا رہی تھیں۔ میں چاہتا تھا کہ وہ کھڑکی بند ہوجائے مگر اذیت ناک جہنم کا وہ در بند ہونے کے لیے نہیں کھولا گیا تھا۔ درد جب حد سے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے مگر میرے سینے میں جاگنے والا درد برداشت کی ہر حد عبور کرنے کے بعد بتدریج عذاب رساں ہوتا جا رہا تھا۔

شاید نصف گھنٹا بیت گیا...... یا کچھ زیادہ وقت گزر گیا۔ میرے سر کو جھٹکا سا لگا۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔ دیکھا۔ میری بغلوں میں دو آدمی ہاتھ ڈال کر مجھے کھڑا کر رہے تھے۔ ایک میرے عین سامنے گن تھامے کھڑا تھا۔ اس کی گن کی نال کا رخ میرے سینے کی طرف تھا۔ میں ان سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ مجھے کیوں اٹھا رہے ہیں؟ کہاں لے کر جانا چاہتے ہیں؟ مگر میری زبان میرے جسم کی طرح گنگ ہوگئی۔ مجھے اٹھانے والے دونوں تنومند، جسیم اور قوی الجثہ انسان تھے۔ چہروں سے چھٹے ہوئے بدمعاش ظاہر ہوتے تھے۔ مجھے اٹھا کر کھڑا کرنے اور چلانے کے انداز میں گھسیٹ کر صحن میں لانے میں انہیں زیادہ وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ کمرے کی دنیا تاریک اور نیم تاریک تھی۔ صحن کا منظر روشن تھا۔ مغربی کمروں کے سامنے بنے ہوئے برآمدے کے باہر تھڑے پر پانچ چھ چارپائیاں اس ترتیب سے بچھائی گئی تھیں کہ ان کے بیچ پندرہ ضرب پندرہ فٹ جگہ خالی پڑی ہوئی تھی جس پر سرخ اور پیلی لائنوں والی دری بچھی ہوئی تھی۔ اس خالی قطعے کے عین درمیان میں ایک تین چار فٹ لپیٹ والی غیر تراشیدہ لکڑی زمین میں گڑی ہوئی تھی۔ اس کی بلندی آٹھ دس فٹ رہی تھی۔ دونوں اطراف میں برآمدے کے ستونوں کے ساتھ ایل پی جی گیس پر چلنے

WWW.PAKSOCIETY.COM

والے مینٹل لیمپ روشن تھے جن کی مخصوص 'شوں شوں' کی آواز سناٹے کا قلب چیر رہی تھی۔

حویلی کے مین گیٹ کی طرف والے کھلے حصے میں شاید کھانا پک رہا تھا کیونکہ ماحول میں گوشت بھننے کی مہک رچی ہوئی تھی۔ آگ کی لپٹیں اپنے عکس برآمدے کے اوپر والے حصے پر نقش ونگار کی صورت چھوڑ رہی تھیں۔ صحن میں آٹھ دس اسلحہ بردار محافظوں یا اشتہاری مجرموں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ ان تمام افراد کو میں نے پہلے ہی باتھ روم آتے جاتے دیکھ رکھا تھا۔ ابھی خانزادوں میں سے کوئی بھی یہاں نہیں پہنچا تھا۔ وہ شاید پہنچنے والے تھے۔ میں نے آنکھیں گھما کر اردگرد دیکھا۔ غزالہ بھی دکھائی نہیں دی۔ وہ ابھی تک اسی کمرے میں تھی جس میں اسے تیار کیا جا رہا تھا۔

میرے دل کی دھڑکن اتنی تیز ہوگئی تھی کہ یوں لگتا تھا جیسے اب تب میں دل سینہ پھاڑ کر باہر نکل آئے گا۔ میں پورے یقین کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا کہ یہ اپنی طرف آنے والی موت کے خوف کا تاثر تھا یا اپنی جان سے زیادہ عزیز غزالہ کے حشر ساماں انجام کا ڈر تھا کہ میرا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا تھا۔ مجھے گھسیٹنے والوں نے مجھے زمین میں گڑی ہوئی کھردری لکڑی تک پہنچایا۔ دو اور آدمی قریب آگئے۔ انہوں نے مجھے اس طریقے سے لکڑی کے ساتھ باندھا کہ میں سیدھا کھڑا ہوگیا۔ اس طرح میری گردن پر اضافی بوجھ پڑ رہا تھا اور سر کا درد جو گزشتہ دو تین گھنٹوں سے خوابیدہ تھا، بیدار ہوگیا تھا مگر مجھے باندھنے والوں کو مطلق پروا نہیں تھی۔ میری نبض کے ساتھ ساتھ دھماکے ہونے لگے۔ استاد بلو قریب آیا۔ میرا جائزہ لیا۔ ٹخنے پر بوٹ کی ٹھوکریں مارتے ہوئے میرا بے تاثر چہرہ دیکھا پھر مطمئن ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ ''کرمے! اوئے جیدے! دیکھو تو...... کھانے میں کتنی دیر ہے؟''

''بس تیار ہی سمجھو استاد!'' کرمے نے ایک چارپائی کے آگے چوبی میز رکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا خیال ہے میزوں پر دارو سجا دیا جائے؟''

استاد بلو نے سر کی حرکت سے اجازت دی۔ کرما اپنے ساتھ دو آدمیوں کو لے کر حویلی کی سیڑھیوں کے ملحقہ کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد پانچ سات شراب کی بوتلوں اور برف کے ٹکڑوں سے بھری چھوٹی اسٹیل کی بالٹیوں کے جلو میں نمودار ہوا۔ اس نے بڑے مشاقانہ انداز میں چارپائیوں کے سامنے رکھی گئی میزوں پر پینے کے لوازمات سجا دیے اور ستائش طلب نظروں سے استاد بلو کی طرف دیکھا۔ استاد نے کہا۔ ''شاباش! میرا خیال ہے خان صاحب اب تب میں پہنچنے والے ہیں۔ وہ تمہارا کام دیکھ کر یقیناً خوش ہوں گے۔''

چند منٹ بعد حویلی کے اوپر نظر آتے ہوئے درختوں کے سروں پر لہراتی ہوئی روشنی دکھائی دی۔ کوئی کار یا گاڑی اس طرف آ رہی تھی۔ وہ حیدر خان، یارن خان اور میاں دلبر حسین میں سے کوئی ہوسکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ تینوں ایک ہی گاڑی میں ادھر آنے کے لیے نکلے ہوں۔ چونکہ میری توقعات ہر گزرتے لمحے کے ساتھ دم توڑ چکی تھیں اس لیے میرے دل میں یہ خوش گمانی پیدا نہیں ہوئی کہ آنے والی گاڑی پولیس یا میڈم شکیلہ کی بھی ہوسکتی ہے جو حویلی کے مین گیٹ تک پہنچ آئی تھی۔ ہارن کی آواز پر استاد بلو تیز تیز قدموں سے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

ایک ایک لمحہ صدیوں کی طرح گزر رہا تھا۔ جونہی میں نے سردار حیدر خان کو یارن خان اور میاں دلبر حسین کے درمیان فرعونی چال چل کر اپنی جانب آتے دیکھا، میرے رونگٹے رونگٹے میں انگارے بھر گئے۔ حیدر خان نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا میرے سامنے پہنچا۔ فاتحانہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر ثبت تھی۔ آنکھیں بھی فتح کی چمک سے معمور تھیں۔ میاں دلبر حسین میرے عین سامنے چارپائی پر براجمان ہوگیا۔ میں نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اب تک اس کا محض نام سن رکھا تھا۔ وہ گہرے سانولے رنگ کا شخص تھا۔ توند نکلی ہوئی تھی۔ اس نے ہلکے آسمانی رنگ کا کاٹن کا شاندار سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں ہیروں کی انگوٹھیاں جگمگا رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں مجھ پر مرتکز تھیں۔ یارن خان میرے دائیں ہاتھ پر بچھی چارپائی پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ایک کارندے کو بلایا، لائٹ پیگ تیار کرنے کا حکم دیا اور پاؤں ہلاتے ہوئے حویلی کا جائزہ لینے لگا۔

حیدر خان کوئی منٹ بھر مجھے گھورتا رہا پھر بولا۔ ''اٹھ پہاڑ تلے آوے تاں اُوکوں اپنی اوقات دا پتا لگدائے......''

(اونٹ پہاڑ تلے آن کھڑا ہو تو اسے اپنی قامت کا اندازہ ہوتا ہے)

میرا دل غیر معتدل تھا۔ حلق سوکھ کر کانٹا بن گیا تھا۔ تھوک نگل کر کہا۔ ''تم احسان فراموش شخص ہو حیدر خان! تمہارے اور میرے درمیان کچھ اور معاملات طے پا چکے تھے۔ اس کے باوجود تم نے یہ کمینی حرکت کی ہے۔ اس کا نتیجہ تمہاری توقع سے کہیں زیادہ بھیانک نکلے گا۔''

اس کے لبوں پر تیرتی ہوئی مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی، بولا۔ ''ہاں! میں یارن خان کی بیٹی کو تمہارے ہاتھوں اغوا کرانا چاہتا تھا۔ اس کے لیے میں نے ایک کروڑ روپے کی رقم بھی تمہاری میڈم کو بھیج دی تھی۔ یہی کہنا چاہتے ہو ناں؟...... یارن خان...... کیا تم نے یہ معاملہ سن رکھا ہے؟''

میری توقع کے بالکل اُلٹ یارن خان نے قہقہہ لگا کر حیدر خان کی تائید کر دی، میں نے کہا۔ ''نہیں...... اس سودے بازی سے پہلے بھی ہمارے درمیان بہت سی باتیں ہوئی تھیں۔ تم نے مجھے خاندان کا سرمایہ قرار دیا تھا اور میری طرف صلح کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ میں اس عہد پر قائم رہا جبکہ تم مکر گئے ہو۔''

میری آواز دم بہ دم مدھم ہوتی گئی۔ نقاہت، اندیشے اور خوف نے میرے اندر ڈیرا جما لیا تھا۔ جو منظر میری آنکھوں کے سامنے کھلا ہوا تھا، وہ جان لیوا تھا۔ غیرت پاش موت اپنا خوفناک دہانہ کھولے میری طرف بڑھ رہی تھی اور میں بے بسی سے سوائے دیکھنے کے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

حیدر خان سنجیدہ ہوگیا۔ مجھ پر کڑی نگاہیں مرتکز کرتے ہوئے بولا۔ ''میں خاندانی رئیس ہوں۔ بادشاہ ہوں۔ بلوچوں کا تاج ہوں۔ تم گندی نالی کے غلیظ کیڑے ہو۔ ہوٹل میں چند لمحے میرے سامنے بیٹھنے کا موقع پا کر تم نے خود کو بہت اونچا تصور کر لیا تھا۔ ہے نا؟ وہ لونڈیا...... کیا نام ہے اس کا؟...... ہاں...... شکیلہ میڈم......'' اس نے بڑے استہزائیہ انداز میں 'میڈم' کا لفظ ادا کیا، چند قدم ٹہل کر مجھ سے دور میاں دلبر کی طرف گیا پھر پلٹ کر میرے قریب آ گیا۔ ''وہ اپنے آپ کو مہارانی خیال کرنے لگی ہے۔ تم بھی اس کے دم پر اتراتے تھے۔ اونچا بولتے تھے۔ اونچا اُڑتے تھے۔ آج اسے آواز دو۔ اسے بلاؤ۔ میں دیکھتا ہوں وہ کیسے تمہیں چھڑانے کے لیے یہاں آتی ہے......''

میں نے جی کڑا کیا۔ ''ٹھیک ہے حیدر خان! آج تم جو کچھ کہہ سکتے ہو۔ سننا میری مجبوری ہے مگر یہ سچ ہے کہ تم جس عورت پر ہنس رہے ہو، وہ عورت تمہارے جیسے چھوٹے خانزادوں کو پیروں تلے مسلتے ہوئے چلتی ہے۔ اگر تم میں ہمت ہے تو مجھے ایک موبائل فون لا دو۔ میں اسے بتاتا ہوں کہ مجھے حیدر خان نے یہاں رکھا ہوا ہے اور وہ تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ پھر میں کیا، تم کیا، پوری دنیا دیکھ لے گی کہ تم پہاڑ ہو یا اس پہاڑ کے سامنے محض بکری ہو...... بزدل ہوتے ہو۔ ہاں! کرو ہمت......''

اس کے لبوں پر بڑی مکروہ مسکراہٹ تیر گئی۔ اس نے میری بات پر مشتعل ہونے کے بجائے مزہ لیا، تالی بجا کر کہا۔ ''یہ تو بچگانا ترکیب ہے جو تم آخری داؤ کے طور پر آزما رہے ہو۔ خیر...... سوہنا بلوچ بڑا اڑیل گھوڑا تھا۔ اپنی ضد میں اپنا خاندان گل کروا بیٹھا۔ آج اس کی نشانی بھی صفحۂ ہستی سے مٹنے والی ہے۔ تمہیں استاد بلو نے آج کا شیڈول تو سمجھا دیا ہوگا۔ ہے ناں؟...... ابھی ہم موج مستی کریں گے۔ پئیں پلائیں گے۔ تمہاری لونڈی سے اٹھکیلیاں کریں گے۔ دیکھیں گے اس نے جوانی کو کیسے سنبھال رکھا ہے۔''

میں نے اتنی سختی سے اپنے ہونٹ بھینچے کہ میرے دانت ہونٹ میں گڑ گئے۔ ضبط آخری مراحل میں تھا۔ میں نے کہا۔ ''حیدر خان! تمہاری عافیت اسی میں ہے کہ اس خباثت سے باز آجاؤ۔ مجھے اور میری منگیتر کو یہاں سے جانے دو۔ ورنہ تمہارے خاندان کو اس ظلم کی قیمت چکانا پڑے گی۔ میری میڈم کو علم ہوگیا ہے کہ مجھے تم تینوں نے اغوا کیا ہے۔ جلد یا بدیر وہ تمہاری گردن ماپنے پہنچ جائے گی۔''

اس پر میری دھمکی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ میاں دلبر حسین بھی توجہ سے میری باتیں سن رہا تھا۔ اس نے فلک شگاف نعرہ لگایا۔ بلند آواز میں بولا۔ ''یارن خان! ایک پیگ ادھر بھیجو...... مزہ آگیا کل کے پدے کی لاف زنی سن کر۔ حیدر خان کے دانے مک گئے ہیں۔ بوڑھا ہوگیا ہے تبھی تو ٹخنے برابر کتے کے پلے کی دھمکیاں سن رہا ہے۔''

حیدر خان میاں دلبر کے ریمارکس پر تڑپ اُٹھا۔ تاؤ کھا کر پلٹا۔ کرمے سے مخاطب ہوا۔ ''اوئے کھوتے دی نسل! سندا کائنی پیا...... اِہ ٹیری دا بچہ میکوں دھمکیاں ڈیندا کھڑائے......''

(گدھے کی اولاد! سن نہیں رہے ہو کہ یہ چڑیا کا بچہ مجھے دھمکیاں دے رہا ہے)

وہ برق رفتاری سے میری طرف آیا۔ ایسے میں استاد بلو نے اسے آواز دے کر روک لیا۔ ''اوئے کرمے! رُک جا۔''

کرما چابی کے کھلونے کی طرح رک گیا تو بلو نے سردار حیدر خان کے قریب آ کر کہا۔ ''خان جی! آپ کو یاد نہیں رہا۔ میں نے بتایا تھا کہ اس کا دھڑ، سر کی چوٹ کی وجہ سے مفلوج ہو گیا ہے۔ اس کی چمڑی ادھیڑ دی جائے، جوڑ جوڑ کھول دیا جائے یا اس کے ساتھ کوئی بھی سلوک کیا جائے اسے کانٹا چبھنے کے برابر بھی تکلیف نہیں ہوگی۔ اسے ہم صرف وہی تکلیف دے سکتے ہیں جو آپ نے سوچ رکھی ہے۔''

حیدر خان نے غصہ بھری نگاہوں سے مجھے دیکھا اور

WWW.PAKSOCIETY.COM

چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ''اوہ...... دل چس تاں کھڑ بچ گئی اے ناں...... خیر! تم اس کی حور بانو کو میدان میں لے آؤ۔ کھانے میں کتنی دیر ہے؟''

''کھانا تیار ہے خان جی۔ لگواؤں؟'' کرمے نے ہاتھ سینے پر رکھ کر تابعداری سے کہا۔

''ٹھیک ہے...... لے آؤ...... اُس ناری کو بھی لے آؤ...... شراب، شباب اور کباب...... دیکھ شہرے میرے نصیب......''

استاد بلو نے برآمدے میں اسٹیچو کی طرح کھڑے پہرے داروں کو ہاتھ کا اشارہ کیا۔ ان میں سے دو کمرے کی طرف بھاگے۔ چند لمحوں بعد غزالہ کو دونوں کلائیوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے دری پر لے آئے۔ اس گھڑی میرا جی چاہا کہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔ آسمان ٹوٹ پڑے یا کم سے کم آسمانی بجلی مجھ پر آن گرے۔ ماں باپ کے قتل، پنو کے اغوا، چاچا اور چاچی کے بے بسی سے کمرے میں جلتے ہوئے لاشے...... میں نے زندگی میں کیا کچھ نہیں دیکھا تھا مگر یہ سانحہ ان سے کہیں زیادہ جانکاہ تھا۔ میری غیرت کا جنازہ میرے سامنے تھا جسے کسی بھی لمحے کندھا دیا جانے والا تھا۔ میری عزت اس حال میں میرے سامنے تھی کہ اس کا آدھا تن ننگا تھا جبکہ آدھے تن پر صرف دو جالیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ استاد بلو اور اس کے کارندوں نے بے حیائی کی انتہا کر دی تھی۔ وہ چند لمحے گٹھڑی سی بنی دری پر پڑی رہی۔ حیدر خان نے ایک تنومند سیاہ فام پہرے دار کو بلایا۔ ''دادو! اِڈے مر...... ایں شودھی کو کھڑا تا کر چا۔''

(دادو! ادھر آؤ، اس بے چاری کو کھڑا کر دو)

دادو کم و بیش سات فٹ قامت کا پہلوانوں کا سا ٹھوس جسم رکھنے والا شخص تھا۔ اس نے گھٹنوں تک آتا ہوا جانگیہ زیب تن کیا ہوا تھا۔ بالائی بدن ننگا تھا جس پر اس نے تیل مل رکھا تھا۔ مینٹل لیمپوں کی روشنی میں اس کا سیاہ کسرتی بدن چمک رہا تھا۔ وہ سرعت سے دری پر آیا اور اس نے گردن سے پکڑ کر غزالہ کو کھڑا کر دیا۔ وہ حلق کے بل چیخی۔ اس نے حیدر خان اور یارن خان کو ایک ہی سانس میں ان گنت گالیاں دیں۔ جونہی دادو نے اس کی گردن چھوڑی، وہ تڑپ کر پلٹی اور بھاگتی ہوئی مجھ سے چمٹ گئی۔ اس کے بدن کا لمس مجھے محسوس نہیں ہوا مگر مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ یوں لگا جیسے میں اپنے حواس کھو بیٹھا ہوں۔ وہ مجھ سے لپٹی لپٹی اونچی آواز میں رونے لگی۔ اس کے منہ سے کف بہہ رہا تھا۔ آنکھیں سرخ تھیں۔ میرے حلق سے پھٹی پھٹی سی آواز نکلی۔ ''شالا تیکوں موت آوے نجے!''

(خدا کرے کہ تمہیں موت آ جائے)

حیدر خان کی سلگتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''دیکھ دلبر حسین! تم نے ایسا منظر زندگی میں نہیں دیکھا ہوگا۔ مرنے سے پہلے پریمی جوڑا بغل گیر ہو رہا ہے اور ایک دوسرے کو موت کی بددعائیں دے رہا ہے۔ اوئے دادو! انہیں کچھ کھلا پلا۔ چل ذرا موج مستی کرا۔''

دادو میری آنکھوں سے اوجھل تھا۔ خان کا حکم سن کر منٹ بھر بعد میرے سامنے آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا چکن پیس اور شراب کی بوتل دبی ہوئی تھی۔ اس نے جنگلی انداز میں غزالہ کو بالوں سے پکڑ کر مجھ سے علیحدہ کیا اور اس کے ہاتھ میں بوتل اور پیس تھما کر بولا۔ ''آپ وی کھاتے اپنے یار کوں وی کھوا چا۔''

(خود بھی کھاؤ اور اپنے یار کو بھی کھلا دو)

غزالہ اس پر بھوکی بلی کی طرح جھپٹی۔ اس نے ہاتھ مار کر بوتل نیچے گرا دی اور ناخنوں سے سیاہ فام کا چہرہ بری طرح نوچ ڈالا۔ وہ سسکاری لے کر پیچھے ہٹا۔ اس دوران غزالہ نے دری پر لڑھکنے والی بوتل اٹھائی۔ جب تک دادو اس کا ارادہ بھانپتا، اس نے پوری قوت سے بوتل اس کے سر میں دے ماری۔ سر کھل گیا۔ بھل بھل کرتا خون تالو سے نکل کر چمکتے ہوئے چہرے پر پھیلنے لگا۔ اسی اثنا میں حیدر خان اور میاں دلبر حسین نے زور سے تالی بجائی اور 'واہ واہ' کے ستائشی نعرے لگائے۔

غزالہ اچھل کر دادو سے کچھ دور ہوئی۔ وہ حیدر خان کی طرف جانا چاہتی تھی مگر دادو نے اس کے بال پکڑ لیے۔ اس کے بدن کو خطرناک جھٹکا لگا۔ کمر کے بل دری پر گری مگر اس نے اٹھنے اور پوری قوت سے بوتل حیدر خان کو مارنے میں لحہ بھر کی تاخیر نہیں کی۔ اس کا نشانہ بڑا صادق رہا۔ بوتل ہوا میں اُڑتی ہوئی چشم زدن میں حیدر خان کی ناک پر اتنی قوت سے لگی کہ اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا اور اس کے حلق سے تیز چیخ نکل گئی۔ جونہی اس نے سر اُٹھایا، اس کی پچکی ہوئی ناک سے خون کا فوارا اُبل پڑا۔

استاد بلو سمیت تین چار کارندے حیدر خان کی طرف دوڑے جبکہ دادو نے غزالہ کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ وہ بری طرح قابو میں آئی تھی۔ دادو کی آہنی گرفت سے نکلنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کی بانہیں بھی آزاد نہیں تھیں۔ اس نے چیختے ہوئے دادو کی ابھری ہوئی چھاتی پر اپنے دانت گاڑ دیے۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوا تو اس نے منہ کھول کر دوسری جگہ کاٹ لیا۔ وہ ناخنوں سے اس کا نچلا دھڑ

اور دانتوں سے چھاتی چیرتی پھاڑتی رہی مگر اس دیو قامت پہاڑ پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بڑے احمقانہ انداز میں سر اوپر اُٹھائے قہقہے لگا رہا تھا۔ اس کے سر سے نکلتا ہوا بھل بھل کرتا خون غزالہ کے کندھوں کو سرخ کرتا جاتا تھا۔ میں نے فرطِ اشتعال سے چیخنے کی کوشش کی مگر میری آواز میرے حلق میں ہی دم توڑ گئی۔

بوتل کی ناگہانی چوٹ نے حیدر خان کا ستیاناس کر کے رکھ دیا تھا۔ استاد بلو اور کرما اسے بازوؤں سے تھام کر اندر لے گئے۔ میاں دلبر حسین اور یارن خان نے اس واقعے کا نوٹس سنجیدگی سے نہیں لیا تھا بلکہ زیر لب مسکرا رہے تھے۔ یارن خان نے کمانڈ سنبھالی اور حکم دے کر کھانا منگوا لیا۔ ایک ملازم نے اس کے سامنے بڑی سی ٹرے لا رکھی جس میں بھنا ہوا سالم مرغ رکھا تھا۔ ایسی ہی ایک ٹرے میاں دلبر حسین کے سامنے بھی رکھ دی گئی۔ دونوں نے تھوڑا کھایا، تھوڑا پینے پلانے کا شغل کیا پھر یارن خان نے ایک کھلی ہوئی بوتل کھانا سرو کرنے والے کی طرف اچھال دی۔ 'چاند رانی کو بھی پلاؤ۔ ہمارے ہوتے ہوئے وہ اس نعمت سے محروم کیوں رہے؟''

میں زور سے چلایا۔ ''کتے کے بچے......''

میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر میری آواز پھٹ گئی۔ دل بھی گویا پھٹنے کو آ گیا۔ ملازم نے چھلکتی ہوئی بوتل ہوا میں کیچ کی اور غزالہ کی طرف بڑھا۔ غزالہ نے ادھر ادھر گردن گھمائی مگر بے سود...... ملازم نے بوتل اس کے منہ میں ٹھونس دی۔ غزالہ نے زور کی پھونک ماری۔ منہ میں گرنے والی شراب باہر بہہ گئی۔ دادو نے ڈانٹا۔ ''اوئے حرام زادے! اس کی ناک بند کرو۔''

ملازم نے پھر بوتل منہ میں ٹھونسی اور ساتھ میں چٹکی سے اس کی ناک بند کر دی۔ غزالہ دو سورماؤں کے بیچ ہاتھ پاؤں مارتی رہی مگر اس کی تمام تر مزاحمت اکارت گئی۔ آدھی بوتل اس کے حلق میں اُتر گئی۔ جونہی بوتل اس کے منہ سے نکالی گئی اس نے زور کی قے کی۔ اس کا پیٹ اور دادو کے ہاتھ غلاظت سے لتھڑ گئے۔ اس نے پھر قے کی۔ وہ ہانپتی جاتی تھی اور معدہ الٹتی جاتی تھی۔ دادو نے کہا۔ ''دوسری بوتل لے آؤ۔ یہ ایسے نہیں مانے گی۔''

وہ سردار حیدر خان کی میز سے نئی بوتل اُٹھا لایا، کھولی۔ اپنا عمل دہرایا۔ اس مرتبہ کوشش کے باوجود غزالہ قے نہ کر سکی۔ مچھلی کی طرح تڑپتی رہی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس پر وحشت سوار تھی جس میں تھکن اور نقاہت کی وجہ سے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کمی پیدا ہو رہی تھی۔

یارن خان کے حکم پر ملازم اس کے منہ میں بھنا ہوا گوشت اور شراب ٹھونس رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی مزاحمت دم توڑ گئی۔ اس کے ہاتھ پیر رک گئے۔ بدن کا ماس بھی شاید پتھر ہونے لگا تھا۔ ایسے میں حیدر خان استاد بلو کی معیت میں کمرے سے ڈریسنگ کروا کر نکلا اور اپنی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ استاد کا سہارا لے کر بیٹھا اور جھومتا رہا۔ استاد بلو نے اسے شراب پلائی، ایک چکن پیس کھلایا۔ کچھ سنبھلا مگر پوری طرح نہیں۔ اس کی ناک پر پٹی بندھی ہوئی تھی جس نے مونچھوں سمیت اس کا آدھا چہرہ چھپا لیا تھا۔

میاں دلبر نے پوچھا۔ ''ہڈی بچ گئی؟''

حیدر خان نے نفی میں سر ہلایا۔

بلو نے کہا۔ ''نہیں صاحب! ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ یہاں سے فارغ ہو کر انہیں اسپتال لے جانا پڑے گا یا ڈاکٹر کو اٹھا لانا پڑے گا۔''

حیدر خان نے ہاتھ ہوا میں لہرایا۔ ہولے سے کچھ کہا۔ بلو نے سنا۔ اس نے بلند آواز میں دادو سے کہا۔ ''ہاں بھئی شیر جوان! اپنا کام دکھاؤ......''

دادو شاید اسی حکم کا منتظر تھا۔ اس نے آنِ واحد میں اپنی بانہیں کھول دیں۔ غزالہ اس سے رگڑ کھاتی ہوئی نیچے گر گئی۔ دادو اس پر جھکا اور اس کے سینے پر بندھا ہوا جالی نما کپڑا کھول دیا۔ میں نے پوری سختی سے اپنی آنکھیں بند کر لیں لیکن آنکھوں کے راستے گزر کر آنے والے دہکتے انگاروں کو دماغ تک پہنچنے سے نہ روک سکا۔ چند لمحوں میں کیا ہوا، میں نے نہیں دیکھا مگر میری روح پر کاری زخموں کی طرح ثبت ہو گیا۔ دادو کی آواز سنی۔ ''خان جی! ہرنی شکار کے لیے تیار ہے...... آ جائیں!''

''یارن خان! ادھر آؤ...... شہر میں برائیلر ملتا ہے۔ وہی کھاتے آئے ہو آج تک۔ آج دیسی مرغی کا ذائقہ چکھو۔ آنکھیں کھل جائیں گی۔'' حیدر خان کی مکروہ آواز میرے کانوں میں پڑی۔ جی چاہا کہ یہی لمحہ میری زندگی کا آخری ثابت ہو مگر نہ جانے قدرت مجھے کیا دکھانا چاہتی تھی، مجھ سے کیا سلوک کروانا چاہتی تھی کہ میں نہ تو مر رہا تھا اور نہ ہی بے ہوش ہو رہا تھا۔ شاید اس لمحے میری یہی دونوں خواہشیں زندگی کا حاصل تھیں جو تشنہ رہیں۔

اچانک میرے چہرے پر زور کا تھپڑ پڑا۔ تھپڑ سے کہیں زیادہ تکلیف میرے سر کو لگنے والے جھٹکے سے ہوئی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں نے بے ساختہ آنکھیں کھول لیں۔ کریما سامنے کھڑا تھا۔ غرا کر بولا۔ ”آنکھیں بند کرو گے تو یہی سلوک کروں گا۔ اس سے بھی برا کروں گا۔ آنکھیں کھول کر اپنی غیرت کی بربادی کا تماشا دیکھو۔“

میرے سامنے یارن خان کھڑا تھا۔ اس نے غزالہ کی کمر میں بازو حمائل کر رکھا تھا جبکہ غزالہ کی دونوں آنکھیں بند تھیں۔ چہرہ بے تاثر تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ مر چکی تھی۔ محض سانس کی ڈور کا اس سے رشتہ ٹوٹنا باقی تھا۔ میں اس کی عریانی دیکھ نہیں سکا تو میں نے پھر آنکھیں بند کرلیں۔ کریمے نے میرے زخم پر چپت رسید کردی۔ یہ تکلیف تھپڑ کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تکلیف سے کہیں زیادہ اور ڈراؤنی تھی۔ میرے حلق سے تیز چیخ نکل گئی جسے میں نے روکنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ میں نے پھر آنکھیں بند کرلیں۔ کریمے نے کھلوا دیں۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا۔ شاید میں چاہتا تھا کہ تکلیف کے سبب بے ہوش ہوجاؤں مگر قسمت میرا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ جب چوتھی مرتبہ اس نے چپت ماری، میں نے یارن خان کو خالص حیوانی انداز میں دیکھا۔

ایسے ہی لمحے جب میرے دل کی گہرائیوں سے موت کی دعا نکلی، فضا فائر کی خوفناک آواز سے تھرا اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی میرے حلق سے تیز چیخ نکل گئی کیونکہ میں نے غزالہ کے سینے سے خون کا فوارا اُبلتے دیکھ لیا تھا۔ گھٹنوں کے بل کھڑی تھی۔ منہ سے کوئی آواز نکالے بغیر لہرا کر اُوندھے منہ زمین پر گر گئی۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ ایک کے بعد دوسرا، تیسرا پھر ان گنت فائر ہوئے۔ ایس ایم جی کے برسٹ کی 'ٹریٹ ریٹ' نے فضا کو تھرا دیا مگر میں گویا اس ماحول سے یکسر بے نیاز ہو چکا تھا۔ میری آنکھیں کھلی رہیں مگر سوائے غزالہ کے سینے سے نکلنے والے سرخ چشمے کے کوئی شے دکھائی نہیں دی۔ گویا وہی ایک منظر آخری ثابت ہوا جو میری نظروں میں ثبت ہو گیا تھا۔

چند لمحے...... یا فقط چند منٹ...... پھر یہ منظر بھی میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور مجھ سے اپنا سر سہارنا مشکل ہو گیا۔ شاید میری دعا قبول ہو گئی تھی۔ میں بے ہوش ہو رہا تھا...... یا مر رہا تھا...... علم نہیں مگر میرے ذہن میں چلنے والے تیز جھکڑ اچانک رک گئے۔

☆☆☆

انسان سو جائے، بے ہوش ہو جائے یا مر جائے...... وقت کا گھوڑا دلکی چال چلتا رہتا ہے۔ ایک لمحے میں سونے والا انسان دوسرے لمحے میں بیدار ہو جاتا ہے مگر طے نہیں کر پاتا کہ وہ کتنی دیر سویا رہا۔ جب مجھے ایک تیز چمکدار عمودی لکیر آسمان سے اُتر کر زمین کی طرف آتی دکھائی دی، تب میں بھی اپنے آپ پر بیتتے ہوئے زمانے کو حدود و قیود میں لانے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ جونہی وہ چمکدار مہین لکیر زمین پر اُتری، ایک ننھا سا دھماکا ہوا۔ میں یہ بھی طے نہیں کر پایا تھا کہ یہ دھماکا کہاں ہوا تھا۔ میرے سامنے یا میرے سر میں۔ اس کی خوفناک آواز سے میرے سر میں درد کی ٹیس ابھری۔ میں نے اسی لمحے آنکھیں کھول دی تھیں...... یا شاید اس وقت جب مجھے دھیمی رفتار سے گھومتا ہوا سیلنگ فین دکھائی دیا تھا۔ میں کافی دیر تک اس کے پروں کو دیکھتا رہا۔ خالی الذہنی کی یہ کیفیت کافی دیر تک مجھ پر طاری رہی پھر سماعت بھی ایک دم بیدار ہو گئی۔ میرے کانوں میں کئی آوازیں پڑنے لگیں جن کا کوئی عنوان نہیں تھا۔

مجھ پر اذیت طاری ہو گئی۔ اُٹھنا چاہا تو ناکام رہا۔ بولنا چاہا تو زبان تالو سے چپک گئی۔ ہاتھ ہلانا چاہا تو غیر معمولی نقاہت نے مجھے اپنی تحویل میں لے لیا۔ میں نے پھر آنکھیں بند کرلیں۔ آہستہ آہستہ میرے کانوں میں پڑنے والی آوازیں واضح ہونے لگیں۔ ایک آواز نے مجھے پھر آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ کوئی میرا نام لے کر مجھے پکار رہا تھا۔ آنکھیں کھولنے کا حکم دے رہا تھا۔ بولنے والے ہلتے ہوئے لب میرے سامنے تھے۔ چند لمحے گومگو کی کیفیت چھائی رہی۔ پھر دھند چھٹ گئی۔ مجھ پر جھکا ہوا چہرہ چندو ماہی کا تھا۔ میری میڈم شکیلہ کا تھا۔ وہ بار بار کہہ رہی تھی۔ ”شہریار! مجھے پہچانو...... میں کون ہوں؟“

”تم...... تم...... تو...... آپ مم...... میڈم......!“ میں نے بہت زور سے کہا تھا مگر شاید یہ میری غلط فہمی تھی۔ میری آواز خاصی کمزور تھی۔ اسے سننے میں تھوڑی دقت ہوئی۔ وہ ایک جھٹکے سے سیدھی ہوئی۔ چیختی ہوئی آواز میں بولی۔ ”تھینکس گاڈ! ڈاکٹر...... اس نے مجھے پہچان لیا ہے......“

ایک مرد مجھ پر جھک آیا۔ اس نے مجھ سے میرا نام پوچھا۔ میں نے بتایا۔ اس نے مجھ سے متعلق کئی سوالات کیے جن کے جوابات نے اسے اور میڈم کو خوش کر دیا۔ دوسری آوازیں بھی میری سماعت سے ٹکرانے لگیں۔ فرزانہ اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے مجھ پر جھک گئی۔ اس نے مجھ سے کچھ پوچھا۔ میں نے مسکرانے کی کوشش کی مگر میرے ہونٹوں میں درد اُٹھا۔ ہونٹوں نے شاید تھوڑی بہت حرکت بھی کی تھی۔ وہ مطمئن ہو گئی تو شانو آن جھکی۔ اس نے میرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں بھر لیا۔ روتے ہوئے مجھے چومنے

لگی۔ موجو نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ جب تینوں کو تسلی ہو گئی تو انہیں ڈاکٹر نے کمرے سے باہر نکال دیا۔ پھر اس نے مجھے اپنا ہاتھ ہلانے کا حکم دیا۔ میں نے ہاتھ ہلایا۔ ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلا دیا۔ پھر پیروں اور جسم کو حرکت دینے کا حکم دیا۔ میں نے حکم کی تعمیل کی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے اپنے جسم میں کامیاب حرکت پیدا کر لی تھی مگر ڈاکٹر کا مایوس چہرہ دیکھ کر میرا دل بھی بجھ سا گیا۔ میں نے ایک طویل سانس لی اور آنکھیں بند کرلیں۔ مجھے شاید کوئی نشہ آور دوا دی گئی تھی یا ابھی نقاہت کا اثر باقی تھا، چند لمحوں میں ہی اپنے آپ کو بیدار رکھنے کی پوری کوشش کرتے کرتے سو گیا۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو رات کا کوئی پہر چل رہا تھا۔ کمرے میں سرخ بلب روشن تھا۔ پنکھا بند تھا۔ چہار سو سکوت طاری تھا۔ میں نے سر کو جنبش دیے بغیر ممکنہ حد تک کمرے کا جائزہ لیا۔ وہ کسی جدید طرز کے اسپتال کا وی آئی پی روم تھا جس میں بھینی بھینی خوشبو اپنے جلو میں ائر کنڈیشنر کی ٹھنڈک لیے زندگی کا احساس بخش رہی تھی۔ میرے دائیں ہاتھ پر ڈرپ اسٹینڈ میں ڈرپ چل رہی تھی جو قطرہ قطرہ میری رگوں میں اتر رہی تھی۔ میں نے اپنے ذہن پر زور دیا۔ گزشتہ واقعات کی کڑیاں ملانے کی کوشش کی جس میں بہت حد تک کامیاب رہا۔ غزالہ سے ملنے کا ارادہ لیے ملتان سے نکلنے کی گھڑی سے لے کر اس کے سینے میں ہونے والے سوراخ کے منظر تک سارے واقعات میری آنکھوں میں گھوم گئے۔ دل میں عجیب طرح کا حبس بھر گیا۔ جی چاہا کہ میں زور زور سے روؤں۔ میں نے جی کی بات مان لی۔ آنکھیں بھیگ گئیں۔ لبوں سے سسکیاں نکلیں پھر میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ کافی دیر تک روتا رہا۔ حلق خشک ہو گیا۔ زوروں کی پیاس لگی۔ کسی کے ادھر آنے کا انتظار کرنے لگا۔

ہاں...... میں زندگی کی دعائیں مانگتا رہا تھا...... پھر غیبی مدد کے لیے خدا کو پکارتا رہا اور بعد میں موت کا طلبگار رہا۔ مجھے سب کچھ مل گیا مگر ترتیب گڑبڑا گئی۔ میں نے وہ موت تو اپنے لیے خدا سے مانگی تھی جس نے غزالہ کو چاٹ لیا تھا۔ غیبی مدد اس کی زندگی اور سلامتی کے لیے مانگی تھی۔ ہاں! قدرت اپنے فیصلوں پر عمل کرتی ہے۔ خوب رونے سے دل ہلکا ہو گیا۔ دکھ کا تسلط کچھ کمزور ہو گیا۔ میں غیبی مدد کی صورت میں عین موقع پر پہنچنے والی میڈم شکیلہ اور اس تمام تر فلمی سچویشن کے بارے میں سوچنے لگا جس نے میری زندگی تاریک کر دی تھی۔ غزالہ کو کس نے گولی ماری تھی؟ کیا ان کمینوں کے کسی ہرکارے نے یا سردار حیدر خان نے؟...... میں نے اپنی یادداشت پر زور دیا۔ وہاں موجود کسی شخص نے فائر کرنے کی پوزیشن نہیں لے رکھی تھی۔ تو کیا اسے میڈم یا میرے گروپ کے کسی شخص کی گولی لگی تھی؟...... اس صورت میں یہی امکان قوی تھا کہ نشانہ لینے والے نے سیاہ فام دادو کا نشانہ لیا ہوگا یا یارن خان کا، جو خطا ہوا اور اُن میں سے کسی کو لگنے کے بجائے گولی غزالہ کی چھاتی میں پیوست ہو گئی۔ بھلے غزالہ مر گئی تھی میڈم نے اسے درندگی کا شکار ہونے سے تو بچا لیا تھا۔ اگر اس کے ساتھ وہ کچھ ہو جاتا جو استاد ببلو نے مجھے معنی خیز انداز میں بتایا تھا تو شاید میں زندہ رہنے کے باوجود زندہ نہ رہ پاتا۔ اب بھی اس کے ساتھ کچھ کم نہیں ہوا تھا۔ کیا اتنا بڑا بوجھ اُٹھا کر جیا جا سکتا تھا؟...... میرا دماغ سلگتی ہوئی سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

میں دوسری مرتبہ ہوش میں آیا تھا۔ پہلی مرتبہ کی سدھ مندی خواب کی صورت میں ذہن میں جاگزیں تھی۔ نجانے میں کس اسپتال کے کمرے میں کتنی دیر سے چت لیٹا ہوا تھا۔ ایسے ہی وقت میں جب میں بہ آواز بلند کسی کو پکارنے کا ارادہ کر رہا تھا، ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ دروازہ کھلا۔ ایک نرس دروازے میں دکھائی دی۔ وہ سست روی سے چلتے ہوئے ڈرپ اسٹینڈ کے پاس آن کھڑی ہوئی۔ مجھے جاگتا ہوا پا کر بولی۔ ”آپ کب جاگے؟ گھنٹا بھر پہلے تو میں نے اس کمرے کا راؤنڈ کیا تھا۔ تب آپ سو رہے تھے۔“

میں نے جواب دیا۔ ”ابھی جاگا ہوں۔ کیا وقت ہوا ہے؟“

”ساڑھے تین بجے ہیں۔“ اس نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈال کر کہا۔ ”کہیں درد تو نہیں ہو رہا؟“

میں نے انکار میں سر ہلایا اور پوچھا۔ ”رات کے؟“

”یس سر!“ اس نے میری پیشنٹ کیبنٹ سے میری فائل اُٹھائی۔ چند لمحے ورق گردانی کرتی رہی، پھر بولی۔ ”آپ کو صبح سات بجے دوا دی جانی ہے۔ بھوک یا پیاس تو نہیں لگی؟“

میں نے کہا۔ ”جی......“

اس نے کیبنٹ میں ہاتھ مارا۔ جوس کا ایک ڈبا اُٹھایا۔ اس میں اسٹرا ڈال کر میرے لبوں سے لگا دیا۔ میں نے چند گھونٹ بھرے۔ ہلکی سی کھانسی آئی۔ سر کے عقبی حصے میں درد کی لہر پیدا ہوئی جو دو تین سیکنڈ بعد آپوں آپ ختم ہو گئی۔ وہ جلدی سے میرے بیڈ کی پائنتی کی طرف گئی۔ لیور گھماتے ہوئے میرا سرا اونچا کرنے کے بعد بولی۔ ”کوئی تکلیف؟“

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ اس نے باقی ماندہ جوس

WWW.PAKSOCIETY.COM

مجھے پلایا۔ جاتے ہوئے مستفسر ہوئی، ”میرا نام زاہدہ ہے۔ میں نائٹ ڈیوٹی پر ہوں۔ ہر رات کو آپ سے ملاقات ہوا کرے گی۔ کوشش کروں گی کہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہو۔“

میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

”کوئی اور ضرورت؟“

میں نے جواب دیے بغیر آنکھیں بند کرلیں۔ وہ بولی۔ ”اوکے! میں میڈم کو آپ کے ہوش میں آنے کی اطلاع کردیتی ہوں۔ وہ شاید جاگ ہی رہی ہوں گی۔“

میں نے جلدی سے کہا۔ ”یہ کون سا اسپتال ہے سسٹر؟“

”آپ یہ سوال میڈم صاحبہ سے کیجیے گا۔“

”اور میری حالت کیسی ہے؟ کیا میں اپنے پیروں پر کبھی چل سکوں گا؟“ میرے دل میں کسک کی طرح جاگزیں ہونے والی آس نے میری زبان کو آلۂ کار بنالیا۔

”میں نہیں جانتی سر!“ وہ نفی میں سر ہلا کر بولی۔ ”علی الصباح ڈاکٹر صاحب ہی آپ کو بتاسکیں گے۔“

”کون ڈاکٹر صاحب؟“

”ڈاکٹر ظہور اختر صاحب۔“ اس نے بتایا۔ ”گڈ لک۔ ٹیک کیئر!“

مجھے کوئی دلاسا دیے بغیر دبلی پتلی نرس، زاہدہ، اپنے عقب میں دروازہ بند کرگئی۔

کمرا خالی ہوگیا۔ باہر کا ماحول گنگ ہوا تو اندر کی دنیا آباد ہوگئی۔ غزالہ کا آخری سراپا آنکھوں میں پڑاجما کر بیٹھ گیا۔ دل میں دکھ کا دبیز دھواں بھر گیا۔ وہ میری محبت تھی۔ اس محبت کا آغاز اس لمحے میں ہوا تھا جب مجھے لفظ ’محبت‘ لکھنا نہیں آتا تھا۔ اس کے مفہوم کا علم نہیں تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ محبت کیا ہوتی ہے۔ مجھے تو یہ سمجھ بھی نہیں آیا کرتی تھی کہ اسے دیکھنے کی طلب میں اس قدر بے تاب کیوں ہو جاتا ہوں یا اسے دیکھ لینے سے مجھے کیا حاصل ہوجاتا تھا۔

میڈم شکیلہ کا آتشیں حسن بھی اس کے عشق کی برف کو پگھلا نہیں پایا تھا۔ چند ماہ ہی کے پرکیف لمس کی جان افزا حدت بھی میرے ذہن کے دریں خانوں سے غزالہ کے نقوش محو نہیں کرپائی تھی مگر تقدیر کے ایک ہی وار نے اسے مجھ سے لامحدود فاصلے پر جا پھینکا تھا۔ اس نے کوئی ایسا جرم نہیں کیا تھا جس کی پاداش میں اسے ناقابلِ برداشت مراحل سے گزر کر موت کو گلے لگانا پڑتا۔ اس کے بدن کی تمام تر پاکیزگی کو شراب کی غلاظت سے داغدار کیا گیا تھا مگر ایک اندھی گولی نے اس کی روح کے تقدس کو پامال ہونے سے بچالیا تھا۔ بجا کہ وہ درندگی سے بچ گئی تھی مگر میری دنیا سے بڑے بھیانک انداز میں نکال بھی دی گئی تھی۔

میرے بے سدھ ہونے کے بعد کیا وقوع پذیر ہوا؟ ان سب سوالوں کے جواب مجھے میڈم سے ہی مل سکتے تھے۔ اس لیے مجھے پوری شدت سے اس کی آمد کا انتظار تھا۔ نرس نے اسے میری بیداری کی اطلاع دینے کا ارادہ ظاہر کیا تھا مگر لگتا تھا کہ وہ اپنے ارادے کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچاسکی۔ رات گزر گئی تھی۔ میرے اطراف میں چہل پہل کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق نو دس بجے کا وقت تھا جب نفیس حلیے والا ڈاکٹر ظہور اختر پانچ سات آدمیوں کے جلوس کی شکل میں کمرے میں داخل ہوا۔ وہ لبوں پر مسکراہٹ سجائے میرے قریب آن کھڑا ہوا۔ ”ہیلو ینگ مین! انی پرابلم؟“

میں نے جواب میں مسکرانے کی کوشش کی۔ ”نو سر! کیا میرا آپریشن ہوا ہے؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”یس! مگر مائنر سرجری ہوئی ہے۔ کسی نوکدار چیز کی چوٹ نے ہڈی توڑ دی تھی۔ تھوڑا سا خون جم گیا تھا۔ بہرحال! میں بہت خوش ہوں کہ تم اس وقت بہت اچھی حالت میں ہو۔“

”میں کتنی دیر سے یہاں ہوں؟“

”آج تیسرا دن ہے۔ ایک دن تمہیں آئی سی یو میں رکھا گیا تھا۔ کیا تم نے اپنے ہاتھ پیر ہلانے کی کوشش کی؟“

”نہیں سر......“ میں نے کہا۔ ”کوشش کروں؟“

”یس...... یس......“ اس کے لبوں سے نکلا۔ میں اپنے اعصاب میں حرکت پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگا جبکہ اس نے میری پیشنٹ فائل اٹھالی۔ اپنے اسسٹنٹ سے مخاطب ہوا۔ ”ایم آر آئی اور سی ٹی اسکین رپورٹ لاؤ۔“

اسسٹنٹ ’یس سر‘ کہہ کر روم سے نکل گیا۔ ڈاکٹر کے اشارے پر ایک آدمی پورٹیبل ایکس رے پلانٹ دھکیلتا ہوا میرے بیڈ کے پاس آیا۔ پیشہ ورانہ انداز میں پلانٹ کو میرے سر کے قریب ترین پوائنٹ پر نصب کرکے ایکسرے لینے لگا۔ اس کی معاونت ایک فربہ اندام نرس کررہی تھی جو میرے سر کو مختلف زاویوں پر حرکت دے رہی تھی۔

میرا طبی معائنہ کرنے کے بعد ڈاکٹر نے کہا۔ ”شہریار! کیا تم نے اپنے جسم میں حرکت محسوس کی؟“

میں نے قدرے مایوسی سے کہا۔ ”نہیں سر! لیکن میں نے جب اپنی داہنی ٹانگ کو حرکت دینا چاہی تو مجھے عجب طرح کی گھبراہٹ محسوس ہونے لگی۔ یوں کہ دل بیٹھ رہا ہو یا قے آنے والی ہو۔“

وہ مسکرایا۔ ”یہ اچھی علامت ہے۔ شاید تمہارے نوٹس میں نہیں ہے کہ تمہاری داہنی ٹانگ کا تین جگہوں سے آپریشن ہوا ہے۔ تین گولیاں لگی تھیں۔ ایک گولی نے ران کی ہڈی کو چھوا جبکہ دو ماس میں پھنس گئیں۔“

”اوہ......“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”تمہارے بازو کی ہڈی ٹوٹی ہوئی تھی۔ اسے ڈاکٹر فرہاد نے دیکھا تھا۔ اس نے ہڈی اپنی جگہ پر بٹھا کر ڈریسنگ کردی ہے۔ اسے توقع ہے کہ آپریشن کے بغیر کام چل جائے گا۔“

میرے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔ ”اللہ کرے!“

کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد میں مستفسر ہوا۔ ”کیا میں کبھی اپنے پیروں پر چل سکوں گا؟“

ڈاکٹر سوچ میں پڑگیا۔ اس کی خاموشی کا لمحہ لمحہ میرے دماغ پر گرزوں کی صورت لگ رہا تھا۔ توقف کے بعد بولا۔ ”مسٹر شہریار! مجھے یقین ہے کہ تم دو چار ماہ میں مکمل طور پر فٹ ہوجاؤ گے۔ آپریشن میں کوئی پیچیدگی پیدا نہیں ہوئی۔ میرے خیال میں تمہارے جسم کو بہتر گھنٹوں میں سگنل دینا شروع کردینے چاہیے تھے مگر کسی وجہ سے ایسا نہیں ہوا۔ اب تمہاری قوت ارادی اور قوتِ مزاحمت پر موقوف ہے۔ تم چاہو تو جلد ری کور کرسکتے ہو۔ اگر تم ہمت کا مظاہرہ نہیں کروگے تو بیڈ تمہاری جان نہیں چھوڑے گا۔“

”مجھے کیا کرنا ہوگا سر؟“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب! میں جلد از جلد اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہتا ہوں۔“

”یہ باتیں تمہیں ڈاکٹر امجد صاحب سمجھادیں گے۔ تمہارے لیے ایک آدھ دن میں فزیوتھراپسٹ کا انتظام کردیا جائے گا۔ فی الحال تمہارے لیے یہی ایڈوائز ہے کہ تم اپنے ذہن پر زیادہ بوجھ نہ دو۔ ٹینشن نہ لو اور زیادہ سے زیادہ پرسکون رہنے کی کوشش کرو۔ از اِٹ اوکے؟“

”یس سر! آئی ول ٹرائی مائی بیسٹ تو سروائیو......“

”اسے ناشتا کرواکر معمول کی میڈیسن دے دیجیے۔“ ڈاکٹر نے میری فائل کیبنٹ پر رکھتے ہوئے میرا بلڈ پریشر نوٹ کرنے والی نرس سے کہا اور روم سے نکل گیا۔ ماسوائے نرس کے، بھی لوگ اس کے پیچھے کمرے سے نکل گئے۔ جونہی نرس مجھے جوس پلانے اور میڈیکیٹ کرنے سے فارغ ہوئی، میں نے استفسار کیا۔ ”میڈم شکیلہ کہاں ہیں؟“

اس نے تعجب سے کہا۔ ”میڈم شکیلہ؟ آئی ڈونٹ نو سر!“

”اوکے...... میرا کوئی اٹینڈنٹ اسپتال میں موجود ہے؟“

”یس سر! کئی لوگ ویٹنگ روم میں بیٹھے ہیں۔“ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب کے راؤنڈ کے بعد میں آپ کی فیملی کو کمرے میں بھیج دوں گی۔“

”اگر مجھے واش روم جانا ہوا تو......؟“ میں نے کافی دیر سے ذہن میں پیدا ہونے والے اندیشے کا اظہار کیا۔

”آپ کو فی الحال واش روم جانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی کیونکہ آپ کو کیتھیٹر پاس کیا گیا ہے۔“ وہ مسکرا کر بولی۔ ”اب آپ ایزی فیل کریں۔ چاہیں تو سو جائیں۔ چاہیں تو جاگتے رہیں مگر ذہن پر قطعاً زور نہ دیں۔ اوکے سر؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کے جانے کے بعد میڈم کا انتظار کرنے لگا۔ وہ نہیں آئی مگر گھنٹا بھر کے بعد میرے کمرے میں میلا لگ گیا۔ میروشاہ کے ساتھ گروپ کے چار آدمی عیادت کے لیے آئے جنہوں نے پھلوں کے بڑے بڑے شاپر اٹھا رکھے تھے۔ انہوں نے مزاج پرسی کے بعد میرے لیے دعا کی اور دیوار کے ساتھ نصب شدہ بنچ پر بیٹھ گئے۔ ان کی آنکھوں میں میرے لیے محبت اور ہمدردی کے دریا موجزن تھے۔

میروشاہ پان چباتے ہوئے میرے قریب آیا۔ چند لمحے مجھے گھورتا رہا پھر آنکھیں ڈبڈبا کر پیٹھ کرکے کھڑا ہوگیا۔ ”لاڈے میاں! ماڑے کو یہ سوچ تو جندگی بھر نہ آوت کہ اپنے غنچے کو ایس حال میں دیکھت...... ناں بابا...... ماڑے کو یہ نہ دیکھن مانگت ہے......“

اس کی آواز گلوگیر تھی۔ وہ رو رہا تھا۔ مجھے تعجب سا ہوا۔ اس دھندے میں جذبات کا کیا عمل دخل تھا؟

میں نے کہا۔ ”شاہ جی! غم نہ کرو۔ میں جلد ٹھیک ہوجاؤں گا۔“

وہ پلٹا۔ مجھ پر جھکا۔ پان کی سرخی سے لتھڑے ہونٹوں سے اس نے چٹاک چٹاک بوسوں کی بارش کردی۔ پھر میرا چہرہ ہاتھوں میں بھر کر بولا۔ ”غنچے! تیرے کو بھی غم نہ کرت...... تینوں مردود...... سالے...... کٹیش کٹیش...... ختم شد۔ ماڑے لاڈوں نے جان پر کھیل کر استاد ببلو کی ایسی کی تیسی کردیوت...... اِٹ سے اِٹ بجادیوت۔ سالا ملغانی بچ جاوت پر کا ہے کو...... میروشاہ کی نجر سے جمین (زمین) کے سات پردوں کا راج (راز) کھل جاوت ہے۔“

میں نے جلدی سے کہا۔ ”نہیں شاہ جی! وہ کتا بھی مر چکا ہے۔ میرے ہاتھوں سے۔“ میں نے جب اس کے استفسار پر ملغانی کے انجام کا ماجرا سنایا تو روتی آنکھوں ہنسنے لگا۔ چڑیا کی طرح پھدکنے لگا۔ ’چٹاک چٹاک‘ بوسوں

WWW.PAKSOCIETY.COM

کی بارش کرنے لگا۔ ''جیوے ماڑا شیر...... ببر شیر......''

میرے دلچسپی لینے پر اس نے معرکے کی تفصیلات اپنے مخصوص انداز میں بیان کیں۔

وہ اپنے معمول کی سرگرمیوں میں مشغول تھا جب اسے فون پر میڈم نے فوری طور پر گروپ کو تیار کرنے کا حکم دیا۔ یہ پہلا مشن تھا جس میں گروپ کے سولہ افراد نے حصہ لیا تھا۔ سبھی لوگ جدید اسلحہ سے لیس تھے۔ پانچ افراد کے جتھے کی کمانڈ میڈم شکیلہ خود کر رہی تھی جبکہ میرو شاہ سمیت تو افراد کو پیا جی لیڈ کر رہا تھا۔ راستے میں میڈم نے میرو شاہ کو بتایا کہ وہ سب شہر یار کو حیدر خان کی بیلے والی حویلی سے نکالنے جا رہے ہیں۔ میرو شاہ کے استفسار پر میڈم نے اسے نہیں بتایا تھا کہ اسے میری اس حویلی میں مقید ہونے کی اطلاع کا ذریعہ کیا تھا۔ وہ تین گاڑیوں میں دریائی راستے سے حویلی تک پہنچے تھے۔ قریب پہنچ کر میڈم نے حکم دیا۔ ''پیا! یہ ذہن میں رکھو کہ یہاں بیس، تیس یا اس سے بھی زیادہ کی تعداد میں مسلح افراد ہو سکتے ہیں۔ ظاہر ہے وہ بالکل غافل نہیں ہوں گے۔ ہم نہیں جانتے کہ شہر یار یہاں کس حال میں ہے مگر یہ طے ہے کہ اسے زندہ نکالنا ہے۔ باقی تمام افراد کو موت کی نیند سلانا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ آج یہ قضیہ ختم ہی ہو جائے تو بہتر ہے۔''

پیا جی نے دریافت کیا۔ ''کیا یہاں حیدر خان کی موجودگی متوقع ہے؟''

میڈم مسکرائی اور ایس ایم گن میں بلٹ بیلٹ نصب کرتے ہوئے بولی۔ ''متوقع؟...... نہیں پیا! یہاں نہ صرف حیدر خان کی موجودگی یقینی ہے بلکہ میری اطلاعات کے مطابق سردار یارن خان اور میاں دلبر حسین بھی حویلی میں موجود ہیں۔''

سخی محمد نے جلدی سے کہا۔ ''پیا جی! یہ تو کلائمکس اسٹوری کا ٹرننگ پوائنٹ ہے۔ ہے ناں؟''

پیا جی نے اسے خفگی بھری نظروں سے گھورا، ڈانٹا۔ ''میڈم کی موجودگی کا خیال کر لیا کرو ناں یار...... یہ موقع ایسی بکواس کا نہیں ہے۔''

میڈم نے کہا۔ ''نہیں پیا جی! سخی محمد کو ایزی فیل کر لینے دو۔ تم اپنے لیے کوئی بھی لائن آف ایکشن منتخب کرو میں بس یہی چاہتی ہوں کہ اس حویلی کی اینٹ سے اینٹ بج جائے۔''

''ایک بات ماڑی بھی جہن (ذہن) میں رکھ لیوت کہ سالا کتا عاشق بھیٹر معشوق بھی جرور (ضرور) ایدھر ای ہووت۔'' میرو شاہ نے ہاتھ نچایا۔

''کون؟'' میڈم پلٹی۔ ''میرو شاہ! سیدھی طرح بات کیا کرو نا!''

''او ہو! بس نام کی مہارانی ہووت ہو نا۔ ماڑے کو سالے استاد بلو اور ملغانی خچیر (خنزیر) کا خطرہ دیکھت ہے۔'' میرو شاہ نے ناک بھوں چڑھا کر کہا اور ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

میڈم شکیلہ کی پیشانی پر چند سلوٹیں نمودار ہوئیں۔ چند لمحے سوچنے کے بعد کندھے اچکا کر بولی۔ ''نو پرابلم! آج ان کی بھی آخری رات ہوگی۔''

میڈم نے حویلی کے مشرقی جبکہ پیا جی نے پچھواڑے یعنی مغربی طرف سے ہلا بول دیا۔ پیا جی کی پیش بینی کامیاب رہی۔ اس نے براہ راست حملہ کرنے کے بجائے درختوں پر چڑھ کر پہلے جائزہ لینے کو ترجیح دی تھی جس کی وجہ سے اسے پتا چل گیا کہ تین آدمی حویلی کی چھت پر پہرا دے رہے تھے۔ جس وقت میڈم نے ٹاہلی کے بلند درخت کی چوٹی پر بیٹھ کر یارن خان کا نشانہ لیا اور فائر کیا، عین اسی وقت پیا جی اور سخی محمد نے چھت پر ٹہلتے ہوئے تینوں سور ماؤں کی چھاتیاں چھلنی کر دیں۔ اس کے بعد گھمسان کا رن پڑا۔ ہاتھ کو ہاتھ آری کرتا رہا اور سانسیں لیتے جسموں کو موت کا ایندھن بناتا رہا۔

زیادہ فاصلے کی بدولت یا عین لمحے ہاتھ ہل جانے کی وجہ سے میڈم کا نشانہ خطا ہو گیا اور گولی بجائے یارن خان کو لگنے کے، غزالہ کو جا لگی۔ میڈم کو علم نہیں تھا کہ وہ غزالہ تھی۔ اس نے یہی سمجھ رکھا تھا کہ وہ کوئی کال گرل تھی جسے اس فلمی سچویشن میں جان ڈالنے کے لیے حیدر خان نے شہر سے منگوا رکھا تھا۔ میرے دل نے پورے وثوق سے گواہی دی۔ 'اگر میڈم کو غزالہ کا علم ہوتا تو وہ کوئی اور طریقہ کر لیتی، خطرے پر خطرہ مول لے لیتی مگر یارن خان پر یوں گولی چلانے کا رسک نہ لیتی۔'

یہ دوطرفہ فائرنگ کوئی آٹھ دس منٹ چلی پھر گنیں خاموش ہو گئیں۔ پیا جی نے چھت پر چڑھ کر جائزہ لیا اور 'اوکے' کا سگنل نشر کر دیا۔ جونہی وہ اگلی منڈیر پر آیا، صحن میں پڑے ہوئے ایک زخمی نے اس پر گن کا دہانہ کھول دیا۔ شارٹ گن کے برسٹ نے پیا جی کے کسرتی بدن کو جالی بنا کر رکھ دیا۔ وہ چیخے بغیر چھت سے فرش پر آن گرا۔ میڈم شکیلہ یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اس نے گولیوں کے دو بیلٹ صحن میں آڑے ترچھے پڑے ہوؤں پر خالی کر دیے۔ جب مشن پایۂ تکمیل کو پہنچا، تب پتا چلا کہ پیا جی کے علاوہ

عمران عرف مانا جٹ اور ظفر اقبال یعنی میرو شاہ کا لاڈا بھگڑی جوابی فائرنگ کا شکار ہو گئے تھے۔ دونوں کی روحیں قفس عنصری کو الوداع کہہ چکی تھیں۔ حویلی میں موجود تمام افراد کام آ چکے تھے۔ کسی کو فرار ہونے کا موقع ملا تھا نہ چھپنے کا۔ میرو شاہ نے حویلی کا چپا چپا چھان مارا۔ وہ ملغانی کی لاش ڈھونڈ رہا تھا۔ نہ ملی تو ایک ذرا پریشان ہو گیا۔ وہ ابھی کچھ دیر اور وہاں رہ کر اسے تلاش کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس کے خیال میں ملغانی کہیں چھپا ہوا تھا۔ وہ کسی بھی لمحے غافل پاکر نقصان پہنچا سکتا تھا۔ میڈم کے درشت حکم پر اسے طوعاً و کرہاً واپسی کا قصد کرنا پڑا۔ مجھے اور ان تینوں کی لاشیں گاڑیوں میں ڈال کر ملتان کی طرف ہنگامی کوچ کیا گیا۔

سخی محمد اسی گاڑی میں تھا، جس میں مجھے رکھا گیا تھا۔ اس نے میڈم کو فون پر بتایا کہ میری حالت بہت خراب ہے۔ دماغ کی چوٹ لگی ہے۔ ٹانگ میں گولیاں لگی ہیں اور بازو فریکچرڈ ہے۔ بعید نہیں کہ بے ہوشی کے عالم میں ہی دنیا سے 'اڑنچھو' ہو جاؤں۔ میڈم نے اسے حکم دیا کہ وہ مجھے بجائے کوٹھی پر لے جانے کے 'میڈی کمپلیکس' میں لے جائے۔ سخی محمد مجھے اسپتال لے آیا جہاں ڈاکٹر ظہور اختر نے میرا معائنہ کیا۔ چونکہ اسپتال میں نیورو سرجن تعینات نہیں تھا، اس لیے ہنگامی بنیادوں پر ایک مشہور پرائیویٹ اسپتال سے ماہر ڈاکٹر کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اس نے صبح ساڑھے چار بجے میرا آپریشن کیا۔

پیا جی کی ہلاکت کی خبر نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ اس کی حیثیت گروپ میں ریڑھ کی ہڈی کی سی تھی۔ وہ نہ صرف بہت دلیر، بلکہ چالاک اور وفادار انسان تھا۔ میڈم شکیلہ اس کی صلاحیتوں پر اندھا اعتماد کرتی تھی۔ اس نے مجھے زندگی کے بھیانک راستوں پر پر اعتماد انداز میں چلنے کا سبق سکھایا تھا۔ اس کی تربیت نے مجھ جیسے دیہاتی اور کمزور انسان کو شہ زور بنا دیا تھا۔ میرے دل میں حبس بھر گیا۔ آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ مانا جٹ اور جفری بھی کچھ کم نہیں تھے۔ مانا جٹ بہت زندہ دل اور مزاحیہ طبیعت رکھنے والا انسان تھا۔ وہ نہایت اعصاب شکن سچویشنز میں بھی مذاق کرنے اور ماحول کو بدلنے سے نہیں چوکتا تھا۔ جفری میرو شاہ کا خاص لاڈا تھا۔ ہر وقت میرو شاہ کے گن گاتا رہتا تھا۔

میرو شاہ نے پہلے اپنی، پھر میری آنکھیں پونچھیں، بولا۔ ''ماڑا غنچہ ہووت تھا سراجا...... پیا...... ہائے! جمانہ سچ بولت کہ گولی بڑی جالم اور بے نجری (بے نظری) ہووت۔ جالم نہ تو لاڈے کو دیکھت، نہ غنچے کو۔''

وہ بھی کوئی گھنٹا بھر میرے کمرے میں رہے۔ ان کے جانے کے بعد فرزانہ، شبانہ اور موجو آ گئے۔ ان کے عقب میں فوجی اختر کمرے میں داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی مجھے میرو شاہ کے وہ ریمارکس یاد آ گئے جو اس نے فوجی اختر کو مجھ سے متعارف کراتے ہوئے ادا کیے تھے۔ ''یہ گھوڑا...... فوجی اختر...... ایک دم تھارو پریڈ گھوڑا ہووے کیونکہ یہ فوج سے بگٹٹ بھاگ کر میرے پاس آوت ہے۔ اب یہ ماڑے غنچے کا نوکر بھی ہے اور اس گھر کا رکھا بھی......''

☆☆☆

پھر ان چاروں افراد اور اسپتال کے اسٹاف کے علاوہ میں نے دس دنوں تک کسی کی شکل نہیں دیکھی۔ فوجی اختر ہر صبح دس بجے تینوں کو میرے کمرے میں لے آتا، وہ گھنٹا بھر مجھ سے باتیں کرتے پھر واپس چلے جاتے۔ شانو چاہتی تھی کہ وہ شب و روز یہاں رہے مگر ڈاکٹرز اس کی اجازت نہیں دیتے تھے جس کی وجہ سے وہ ہر روز گیلی آنکھیں لیے چلی جاتی۔ میں میڈم شکیلہ کا منتظر تھا۔ چاہتا تھا کہ اسے کہوں کہ وہ پروین، امیر نواز اور ڈاکٹر منور علی شاہ کو یہاں لے آئے۔ میں انہیں ایک نظر دیکھ لینا چاہتا تھا کیونکہ ہر گزرتے دن کے ساتھ میری مایوسی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب خوشخبری دیتے کہ میری امپروومنٹ کی رفتار بہت اچھی ہے مگر میں مطمئن نہیں ہو پا رہا تھا کیونکہ ابھی تک میرے جسم کے کسی عضو میں حرکت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ میں لیکوئڈ فوڈ اور یورن بیگ کے سہارے زندہ تھا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے اب میری بقیہ زندگی اسی بیڈ پر ہی گزرنے والی تھی۔

میری خواہش پر ڈاکٹر صاحب نے میری آنکھوں کے سامنے دیوار پر اکیس انچ کا ایل سی ڈی ٹی وی نصب کرانے کا حکم دے دیا تھا۔ ٹی وی نے ایک دو دنوں تک میری توجہ بٹائی مگر پھر میرا دل اس اسکرین سے بھر گیا۔ خاموشی اچھی لگنے لگی۔

بیلے والی حویلی میں وقوع پذیر ہونے والی واردات معمول کا واقعہ نہیں تھا۔ میرو شاہ کے بقول وہ حویلی میں تئیس لاشیں چھوڑ آئے تھے۔ اس پسماندہ علاقے میں اسلحے کا یوں بے دریغ استعمال، تئیس لاشوں کا ملنا جن میں یارن خان، حیدر خان اور میاں دلبر حسین جیسی قدآور شخصیات بھی شامل ہوں...... اور ایک برہنہ بدن لڑکی کا بے روح جسد...... یہ ایسا واقعہ نہیں تھا کہ بہ آسانی ہضم کر لیا جاتا۔ یقیناً علاقے کیا، صوبے بھر میں تھرتھلی مچ گئی ہوگی۔ وسیع پیمانے پر پولیس اور انتظامی محکمے حرکت میں آ چکے ہوں

WWW.PAKSOCIETY.COM

گے۔ ملزموں کی تلاش میں دھرتی کا چپا چپا چھان مارا گیا ہو گا۔ مقامی پولیس جتنی بھی گئی گزری تھی، بھلے صدی بھر پرانے خطوط پر چلنے والی تھی، وہ کھوج لگا سکتی تھی کہ ان تیس افراد کو کس نے کیڑوں مکوڑوں کی طرح مسل کر رکھ دیا ہے۔ میڈم شکیلہ اور میرو شاہ ایسے بھی گم نام یا وی وی آئی پیز نہیں تھے کہ ان تک رسائی ممکن نہیں تھی۔ مجھے اس کمرے کے باہر کے حالات کا علم نہیں تھا۔ خبر دینے والوں نے مجھ سے اچانک ناتا توڑ لیا تھا۔ جن لوگوں نے ناتا بحال رکھا تھا، ان کے پاس مجھے بتانے کے لیے کوئی کارآمد بات نہیں تھی۔ ڈاکٹر ظہور اختر ہی وہ واحد شخص تھا جس سے میں اس موضوع پر بات کر سکتا تھا۔

ڈاکٹر ظہور اختر میڈم کے اس جدید طرز کے اسپتال 'میڈی کمپلیکس' کو چلاتا تھا۔ یہ اسپتال شہر کی مصروف شاہراہ پر واقع تھا۔ دیکھنے میں زیادہ بڑا نہیں تھا مگر یہاں جدید آلات اور سرجری کی قابلِ ذکر سہولیات موجود تھیں۔ ڈاکٹر ظہور اختر کی زیرِ نگرانی چار ڈاکٹر اور چھ نرسوں کے علاوہ پانچ سات دفتری اہلکار وہاں کام کرتے تھے۔ یہ بھی میڈم کے گینگ کے افراد تھے۔ میں یہاں بالکل محفوظ تھا۔ جانتا تھا کہ میرا تعاقب کرنے والے یا تلاش کرنے والے یہاں تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ سی ون اور سی ٹو کی طرح اس اسپتال کے نیچے بھی کوئی دنیا آباد ہو سکتی تھی۔ بعید نہیں تھا کہ مجھے جس روم میں رکھا گیا تھا، یہ بیس منٹ میں واقع ہو یا نہایت خفیہ کمرا ہو۔

تحفظ کے مکمل احساس کے باوجود میں پریشان ہو جاتا تھا۔ جس دن پہلی مرتبہ میرے بائیں ہاتھ کی بڑی انگلی میں حرکت پیدا ہوئی اور اس کی تصدیق شانو نے بھی کر دی تو میرے اندر طمانیت اور خوشی کی بہت توانا لہر دوڑ گئی۔ شام کو جب میں نے ڈاکٹر ظہور اختر کو خوشی خوشی یہ اطلاع دی، اس کی فرمائش پر انگلی کو حرکت دی تو اس کے لبوں پر جاندار مسکراہٹ تیر گئی۔ اس نے باقاعدہ طور پر مجھے مبارک باد دی اور کہا۔ "اب میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ تم آنے والے وقت میں بھرپور انداز میں اپنا جسم ری کور کر لو گے۔ میں ابھی ڈاکٹر نعیم عاطف سے وقت لیتا ہوں اور اسے وزٹ کی دعوت دیتا ہوں۔"

وہ میرا معائنہ کرنے آیا تھا مگر اس خوشخبری کے زیرِ اثر فی الفور پلٹنے لگا۔ میں نے آواز دے کر روکا، کہا۔ "کیا میڈم صاحبہ سے رابطہ ہو سکتا ہے؟"

اس نے جھٹ سے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں ڈیئر! میڈم نے مجھے سختی سے منع کر رکھا ہے۔ وہ بہت بزی ہیں۔"

مجھے دکھ ہوا۔ وہ اتنی بزی تھی کہ مجھ سے نہ صرف بے پروا ہو گئی تھی بلکہ فون پر رابطہ کرنے سے بھی گریزاں تھی۔ میں نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! فون پر تو بات ہو سکتی ہے ناں؟"

"نہیں...... انہوں نے اپنے سابقہ تمام نمبر بند کر دیے ہیں۔ نئے باڈی یولز خریدے ہیں۔" ڈاکٹر ظہور صاحب نے بتایا۔ "مگر تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تمہاری طرف سے غافل نہیں ہیں۔ مجھ سے گاہے بگاہے تمہاری امپروومنٹ کے بارے پوچھتی رہتی ہیں۔"

میں میرو شاہ یا سخی محمد کے بارے پوچھنا چاہتا تھا مگر خاموش رہا۔ ڈاکٹر چلا گیا۔ کوئی گھنٹا بھر کے بعد نیورو سرجن کو لے کر دوبارہ میرے کمرے میں پہنچ گیا۔ اس نے محتاط معائنے کے بعد یہ انکشاف کیا کہ نہ صرف میرے ہاتھ کی دو انگلیاں حرکت کرنے لگی ہیں بلکہ دایاں ہاتھ بھی کانپنے لگا ہے۔ اس کے نزدیک یہ بہت خوش آئند پیش رفت تھی۔ اس نے ڈاکٹر ظہور اختر کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور خوش مزاجی سے کہا۔ "آپ کا مریض کامیاب صحت مند ماحول بنا رہا ہے۔"

اس نے ادویات میں کچھ ردوبدل کیا۔ فزیو تھراپسٹ کے لیے نئے نوٹس دیے اور ڈاکٹر ظہور اختر کی معیت میں باتیں کرتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ مجھے امید کی مضبوط کرن دے گیا۔

مجھے اسپتال میں پندھرواں دن تھا جب ایک رات گیارہ بجے میڈم شکیلہ نے مجھے گہری نیند سے بیدار کیا۔ وہ میرے پہلو میں، بیڈ پر بیٹھی میرا گال تھپتھپا رہی تھی۔ پکار رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی میں نے بے ساختہ اُٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی۔ کوشش کامیاب نہیں ہوئی مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں آج نہ سہی، کسی نہ کسی دن اُٹھ کر بیٹھنے کے لائق ضرور ہو جاؤں گا۔ وہ مجھے بغور دیکھ رہی تھی۔ میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "ٹیک اِٹ ایزی...... آئی ایم ہیئر...... کہو! کیسی طبیعت ہے؟"

مجھے اس کا نچلا دھڑ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شوخ سرخ اور خاصی چست شرٹ اور ٹائی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے شانوں اور کمر پر پھیلے ہوئے بالوں کے اوپر سفید رنگ کا ہیٹ اس کی جاذبیت کو چار چاند لگا رہا تھا۔ بھینی بھینی خوشبو نے میرے کمرے کی فضا کو اپنی تحویل میں لے رکھا تھا۔ چمکتا ہوا چہرہ دل کی دھڑکنوں کو روکنے اور اچانک تیز کرنے کے ہنر سے آراستہ تھا۔ میں نہ جانے کتنی دیر تک اسے یک ٹک گھورتا رہا۔ اس نے بھی میری محویت کو توڑنے کی کوشش نہیں کی۔

میں نے کہا۔ "میڈم! میں نے آپ کی عدم آمد کو بڑی شدت سے محسوس کیا ہے۔"

اس نے میرے گلے کا جواب دیا۔ "جہاں مجھے پہنچنا چاہیے، وہاں پہنچ جاتی ہوں۔ تم نے بیلے والی حویلی میں میری کمی محسوس کی تھی یا نہیں میں تمہاری تلاش میں پہنچ گئی تھی۔ ہے ناں عجیب بات؟"

میں نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں میڈم! اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ وہاں بھی میرے دل میں یہی خواہش سانسیں لیتی رہی کہ آپ کو کسی نہ کسی طرح مجھ پر ٹوٹنے والی قیامت کی خبر ہو جائے۔"

"اور مجھے خبر ہو گئی۔ یہی اچھی بات ہے۔ اسی کے بارے میں سوچو گے تو خوش رہو گے۔" وہ مسکرائی۔ "میں نے تمہیں روکا تھا ناں...... غزالہ سے ملنے مت جاؤ۔ تم میرا حکم ٹال کر چلے گئے۔ اس کا انجام بہت برا ہوا۔ لیکن خیر! ایک لحاظ سے بہت اچھا ہوا کہ میرے اور تمہارے بھی دشمن مجھے ایک چھت کے نیچے مل گئے اور میں نے انہیں پچھاڑ دیا۔ تمہارے لیے اچھی بات یہ ہے کہ تم نے اپنے ہاتھوں انہیں جہنم رسید نہیں کیا مگر اپنے دشمنوں کو بے بسی سے تڑپتے اور ذلیل ہوتے دیکھ تو لیا۔ ہے ناں؟"

اچانک میری آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ بے وقت چھلکنے والے اشکوں کو پلکوں پر روکا اور آزردگی سے کہا۔ "میڈم! میں نے صرف اپنی غزالہ کے سینے سے خون کا فوارا پھوٹتے دیکھا تھا۔ پھر میری آنکھ کوئی منظر دیکھنے کے لائق نہیں رہی تھی۔"

"واٹ ڈو یو مین؟" اس کے بدن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ششدر انداز میں بولی۔ "وہ مر گئی؟ کب...... نور پور میں؟"

مجھے پوری شدت سے احساس ہوا کہ اس کا تعجب مصنوعی نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ "نہیں میڈم! وہ وہیں تھیں۔ آپ کی چلائی ہوئی پہلی گولی اسے لگی تھی۔ وہ گولی جس پر آپ نے یارن خان کا نام لکھا تھا، وہ پھسل کر میری غزالہ کو لگ گئی۔"

میرے لبوں سے سسکی نکلی۔ اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ عجیب گومگو کی کیفیت میں مبتلا ہو کر بولی۔ "نہیں شہریار! ایسے نہیں...... بہادر انسان زندگی کو بڑی دلیری سے فیس کرتا ہے۔ اوہ میرے خدا! تو کیا وہ...... لڑکی غزالہ تھی؟......" وہ کچھ دیر تک میرے منہ اور اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر خاموش بیٹھی رہی، پھر گویا ہوئی۔ "سچ شہریار! مجھے علم نہیں تھا کہ اسے بھی وہیں رکھا گیا تھا۔ اگر مجھے یہ بھنک مل گئی ہوتی تو میں اتنی بے پروائی سے گولی نہ چلاتی۔ واقعی! میرا نشانہ چوک گیا تھا۔"

وہ چند لمحوں میں خاصی مضمحل اور نڈھال دکھائی دینے لگی تھی۔ میرے لبوں پر رکھا ہوا اس کا ہاتھ ہولے ہولے کانپنے لگا۔ آہستہ آہستہ اس کا لرزتا ہوا ہاتھ میرے پورے چہرے کو سہلانے لگا۔ کہنے لگی۔ "شہریار! کسی بڑے مقصد کے حصول کے لیے انسان کو چھوٹی بڑی قربانیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ بہت کچھ حاصل کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ اور کبھی بہت کچھ کھونے کی روایت اس زمانے میں کامیابی کی ضمانت ہے۔ تم نے اپنے کتنے دشمنوں کو ٹھکانے لگایا؟...... گنو تو دل خوش ہو جائے گا۔ یہ درست ہے کہ غزالہ اتنی غیر اہم نہیں تھی کہ اس کی جدائی کو معمولی خیال کر کے دل سے محو کر دیا جائے مگر یہ حقیقت ہے جس سے مفاہمت کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ اس کا دکھ تمہارے دل میں زندہ ہے۔ یہی اس کا ساتھ ہے جو امر ہے۔ اب دنیا کی کوئی

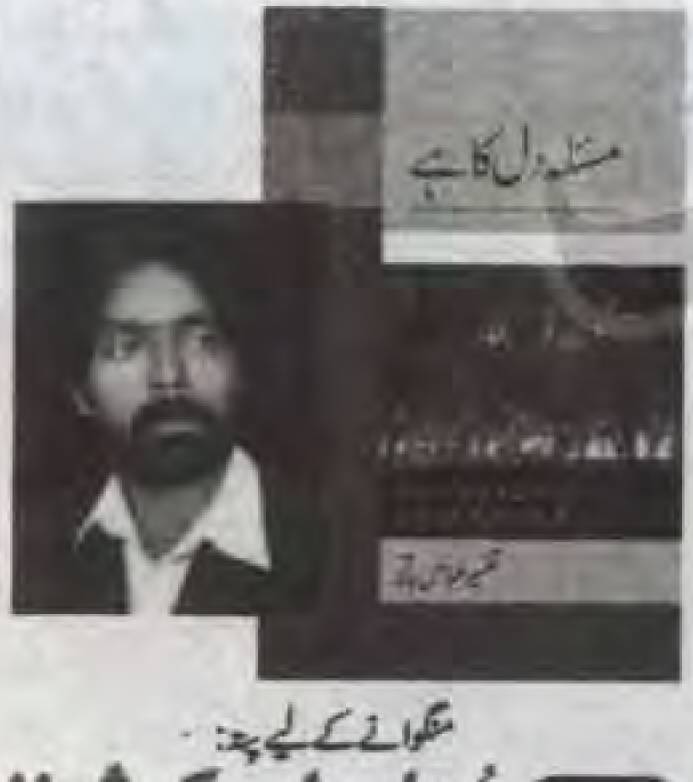

"مسئلہ دل کا ہے" شائع ہو گیا ہے
منگوانے کے لیے پتہ:
دُعا پبلی کیشنز
E-mail: duapublications@yahoo.com
0300-9476417

WWW.PAKSOCIETY.COM

طاقت اسے تم سے جدا نہیں کرسکتی۔"

وہ درست کہہ رہی تھی۔ مجھے سمجھا کر اس کرب کی اذیت سے نکالنے کی کوشش کر رہی تھی جو میرے رگ وپے میں اس طرح سرایت کر گیا تھا کہ کوشش کے باوجود مجھے اپنی گرفت سے آزاد کرنے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے میری آنکھوں پر ہولے سے ہاتھ پھیرا، کہا۔ "تم نے مجھ سے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ میں کس طرح تم تک پہنچنے میں کامیاب ہوئی؟"

میں نے ایک لمبی سانس خارج کی، کہا۔ "آپ بہتر سمجھیں تو بتادیں۔"

"اوکے! میں جب بہتر سمجھوں گی، تمہیں بتادوں گی۔ ابھی کچھ اور بتانے کے ارادے سے آئی ہوں۔ سنو گے؟"

"جی...... کیوں نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"کچھ عرصہ قبل میں اس قتل و غارت سے بھری ہوئی زندگی سے اکتا گئی تھی۔ میں نے کچھ عرصہ قبل، جب تم یہاں نہیں تھے، سوچا تھا کہ میں کب تک ان تاریک راہوں پر چکراتی پھروں گی؟" اس نے نہایت گمبھیر لہجے میں دیوار کی طرف گھورتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ "میرے پاس اتنی دولت ہے کہ میں بغیر کچھ کیے باقی تمام زندگی عیش و عشرت کے ساتھ گزار سکتی ہوں۔ میں دنیا کی ہر آسائش محبت کرنے والے شوہر سمیت خریدنے کی استطاعت رکھتی ہوں۔ پھر میں کیوں یہ خطرات بھری زندگی گزار رہی ہوں؟...... میں نے سوچا تو میرے ذہن نے فی الفور تاویل پیش کر دی کہ مجھے گناہوں کی پوٹلیوں کے بار تلے دبانے والے جب تک زندہ ہیں، میں چین کی سانس سینے میں نہیں اُتار سکوں گی۔ مجھے وہ زندگی نہیں چاہیے جس میں قلق ہی قلق ہوں، کسک ہی کسک ہو اور انتقام کی لپٹیں بھری ہوئی ہوں۔ میری بات سمجھ رہے ہو ناں؟"

میں نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بولی۔ "میں نے ڈاکٹر ظہور اختر سے پوچھا ہے کہ تمہارے سینے میں کوئی وزن اُٹھانے کی سکت ہے اس نے کہا کہ 'ہے'...... میں اپنا سر تمہارے سینے پر رکھنا چاہ رہی ہوں۔ رکھ لوں؟"

اس نے اپنی زندگی کی رام کہانی مجھے ایسی ہی وارفتہ محبت کے سنگ سنائی تھی۔ آج شاید وہ اپنے مستقبل کا خاکہ پیش کرنے جارہی تھی۔ میری اجازت پر اس نے اپنا سر بڑی آہستگی سے میرے سینے پر رکھ دیا۔ دونوں پاؤں بیچ پر لٹکا کر پہلو کے بل لیٹ گئی۔ مجھے اس کے لمس کی لطافت تو نصیب نہ ہوئی مگر یہ احساس ہی بڑا جاں فزا تھا کہ وہ میرے سینے پر سر رکھے لیٹی ہوئی ہے۔ اس نے اپنی آنکھیں بچالی تھیں۔ اس طرح شاید بولنے میں، اپنا دل کھول کر رکھنے میں زیادہ آسانی محسوس کرتی تھی، تبھی دل کھول کر رکھنے لگی۔ "شہریار! میری جان! میں نے تم سے محبت کی ہے۔ جس سے محبت کی جاتی ہے، اس سے کچھ چھپایا نہیں جاتا۔ مجھے اس سے بھی کوئی غرض نہیں کہ تمہیں میری محبت کا یقین ہے یا نہیں...... ہاں! مجھے اپنی محبت کا یقین ہے۔ اسی محبت کے بل پر کہتی ہوں کہ میں اس لامحدود مسافت سے اکتا گئی تھی مگر جب تک میرے دشمن دھرتی کے سینے پر اکڑ کر چل رہے تھے، میں اس اندھی، تاریک اور خون سے لتھڑی ہوئی مسافت سے دامن نہیں چھڑا سکتی تھی۔ کوئی پھولوں بھری روش مجھے تسکینِ قلب نہیں دے سکتی تھی۔ اس لیے دولت اکٹھی کرتی گئی۔ اختیار بڑھاتی گئی۔ پھر تم مل گئے۔ میں نے اپنے مستقبل کا ایک سہانا خواب اپنے سرہانے رکھ لیا۔ جب جی چاہا، خواب اُٹھا کر آنکھوں کے حوالے کر دیا۔ ایک رات کی رانی بن کر اپنے ماضی کے تمام دکھ فضا میں تحلیل کر لیے۔"

میں جانتا تھا کہ اسے بولتے ہوئے ٹوکنا اسے برہم کرتا تھا، اس لیے خاموشی سے سنتا رہا۔ اس نے چند لمبی لمبی سانسیں پھیپھڑوں میں اتاریں اور سلسلۂ کلام جوڑا۔ "تم دیہاتی تھے۔ سادہ لوح۔ مکر و فریب کی دنیا کے آدمی نہیں تھے۔ میں نے تمہیں جو بنانا چاہا، تم بن گئے۔ تمہیں جس ڈھنگ سے آراستہ کرنا چاہا، تم سج گئے۔ موم کے پتلے کی طرح۔ تم گناہ کرتے تھے مگر گناہ کا احساس بھی دل میں رکھتے تھے۔ تمہاری یہ خوبی تو بڑی جان لیوا تھی کہ تم اس حد کو عبور نہیں کرتے تھے جہاں تمہارا اختیار ختم ہو جاتا تھا۔ یعنی تم شجرِ ممنوعہ پر ہاتھ نہیں ڈالتے تھے۔ تم ہر لحاظ سے وہ انسان ہو جس کی تمنا دنیا کی ہر لڑکی کرتی ہے۔" وہ مجھے بڑھا چڑھا کر پیش کر رہی تھی۔ میں سن رہا تھا مگر تخیل نہیں ہو رہا تھا۔

"اور ہاں! تم نے مجھے بہت سہارا دیا۔ میرے سنگھاسن کے زینوں پر میر زادے، ڈاکٹر شاہ جی اور اجمل گیلانی کے بعد تم نے قدم رکھا۔ گویا یہ قدم دل پر رکھا۔ فاتح بن کر تم مجھے مغلوب کرتے گئے اور میں غیر اعلانیہ طور پر تمہاری محبت میں اسیر ہو گئی۔ میں نے میرو شاہ کی اجازت سے اپنے مستقبل کا خاکہ تشکیل دیا جس میں تم اور میں آزاد اور پُرامن فضاؤں میں نغمہ ریز تھے......" اس کی آواز جذبات کے احساسات سے بوجھل ہونے لگی۔ رات کے

اس پہر میں، خاموشی اور تنہائی میں اس کا یوں بولنا میری روح پر ضرب کناں ثابت ہو رہا تھا۔ "شہریار! میں نے طے کر لیا کہ جونہی میں اپنی بربادی کے ذمے داروں سے انتقام لے لوں گی، اس ملک سے دور چلی جاؤں گی۔ یورپ، امریکا یا کہیں دور دراز کی کسی ریاست میں...... اور یہاں سے صرف تبدیل شدہ کرنسی نوٹ اور شہریار کو لے جاؤں گی۔ یہی وہ دن تھے جب پونٹے کے اسپتال میں ہمیں عالیہ کے کوارٹر سے نگینہ ملی تھی۔ اس کے حالات کا علم ہوتے ہی میرے ارادے نے مزید تقویت پکڑ لی۔ میں نے اس کی مدد کا فیصلہ کیا۔ محض یہ سوچ کر کہ وہ مجھے کینیڈا میں منتقل ہونے اور ایڈجسٹ ہونے میں معاونت کرے گی۔ چونکہ وہ کنیڈین سیٹیزن تھی، نیشنلٹی ہولڈر تھی وہ مجھے اور تمہیں بہ آسانی کینیڈا منتقل کر سکتی تھی۔ وہ اسی تکلیف میں تھی جس میں سے میں اور تم گزر رہے تھے۔ میں نے اس کی تکلیف دور کر دی۔ یاد ہے ناں تمہیں؟"

میں نے کہا۔ "جی میڈم! میں بڑے انہماک سے آپ کی باتیں سن رہا ہوں۔"

اس نے میرا بے جان بازو اٹھا کر اپنے سینے پر رکھ لیا۔ ہاتھ کی پشت پر لب رگڑتی رہی۔ اپنے خیالات کو مجتمع کرتی رہی، بولی۔ "اور پھر میں نے ایک طرف تو اپنے دشمنوں کے گرد حلقہ تنگ کرنا شروع کر دیا اور دوسری طرف اپنا سرمایہ نگینہ کی اعانت سے کینیڈا منتقل کرنا شروع کر دیا۔ اس کام میں میرو شاہ نے میری بہت معاونت کی۔ وہ بادشاہ گر انسان ہے۔ چھوٹے وجود میں بڑا ذہن اور بہت بڑا دل رکھتا ہے۔ کاش! مجھے اس سے محبت ہو جاتی...... کاش! کسی خوب صورت جسم میں اس کے جیسا خوب صورت دل اور دماغ سما گیا ہوتا...... مگر نہیں...... نہیں...... قدرت کی ہر تخلیق جداگانہ ہوتی ہے۔ وہ بھی یکتا ہے۔ کوئی اس کے جیسا نہیں۔ وہ کسی کے جیسا نہیں۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی......" وہ بولتے بولتے رک گئی۔ آہستہ سے میرے اور قریب ہو گئی۔ اتنی کہ اس کی سانسیں میرے چہرے پر محسوس ہونے لگیں۔ دل میں عجیب طرح کی ہلچل پیدا ہو گئی۔ خود پر بیتی ہر داستان محو ہونے لگی۔ نئی رقم ہونے لگی۔ وہ ایسی ہی تھی۔ سانس کی ڈور لپیٹ کر جیتے جاگتے بدن کو مردہ کر دیتی تھی۔ ہاں! وہ ایسی ہی تھی۔ جب چاہتی، محبت کا زہر پلا کر مار دیتی پھر محبت کو ہی تریاق بنا کر دوبارہ دنیا میں لے آتی تھی۔

میں خود پر اختیار کھو بیٹھا۔ اسے اور قریب کرنا چاہتا تھا مگر قدرت نہیں رکھتا تھا۔ خود قریب ہو گیا۔ اس کے گداز گال پر ہونٹ سرسراتے ہوئے بولا۔ "میرو شاہ آپ کو مہارانی کہتا ہے بالکل درست کہتا ہے۔ آپ ہمارے دلوں پر راج کرتی ہیں۔"

اس نے میری بات سنی ان سنی کر دی، بولی۔ "پھر اچانک میرے خواب کا طلسم ٹوٹ گیا۔ میں اکیلی رہ گئی۔ میرے روکنے کے باوجود تمہارے قدم غزالہ کی سمت اُٹھ گئے۔ ہائے شہریار! تم کبھی اس دکھ سے گزرے نہیں۔ تم اس کرب سے شناسا نہیں ہوئے۔ اس لیے تمہیں میری اس رات کی بے چینی اور اضطراب کی خبر نہیں ہو سکتی جس رات تم ملتان میں نہیں تھے۔ میں نے خود کو نہایت کمتر اور غزالہ کو بہت خوش بخت تصور کیا۔ جیلس ہو گئی۔ جل کر راکھ ہو گئی...... بری بات تھی ناں؟" اس نے مجھ سے اچانک پوچھا۔ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر بولی۔ "ہاں! بہت بری بات تھی مگر سچ یہی تھا کہ میں حسد کی آگ میں بھڑکی تھی۔ تم چلے گئے۔ اگر نہ جاتے...... مگر کیوں نہ جاتے؟ تمہیں جانا ہی تھا۔ کسی نہ کسی دن مجھے دکھ دینا ہی تھا۔ جب کوشش کے باوجود مجھے قرار نہ آیا تو میں شکست خوردہ ہونے لگی۔ بجھنے لگی۔ ایسے ہی وقت میں مجھے اطلاع ملی کہ تم یارن خان کی دہکائی ہوئی دوزخ میں جا پھنسے ہو۔ چاہتی تو تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دیتی۔ شاید ایسا ہی کرتی مگر دوسری اطلاع بڑی بھرپور اور پُرکشش تھی۔ تمہارے قتل کا تماشا دیکھنے کے لیے تینوں کمینے اکٹھے ہو رہے تھے۔ میں نے ایک آدمی کو سردار حیدر خان کی ٹوہ پر لگا دیا جبکہ زور آور کو مجبور کر کے عافیہ خان کے اغوا کے مشن پر روانہ کر دیا۔ وہ ناکام رہا کیونکہ عافیہ خان تین ماہ کے لیے دبئی گئی ہوئی تھی۔ اس دوران میں میرے مخبر نے مجھے بے حیائی کے جشن کا ہنگامی ٹائم فریم مہیا کر دیا۔"

میرے اندر ٹوٹ پھوٹ ہونے لگی تھی۔ اس کے ہاتھ اور بدن کی حرکات محبت کا اظہار کر رہی تھیں مگر زبان کوئی اور عقدے کھول رہی تھی۔ میں اس تضاد میں بری طرح الجھنے لگا۔

اس نے تھوڑا توقف لیا، بولی۔ "اور پھر جو کچھ ہوا، وہ تمہارے سامنے ہے۔ مجھے بتانے والے نے یہ نہیں بتایا تھا کہ تمہاری غزالہ بھی تمہارے ساتھ ہے ورنہ اتنی بڑی غلطی مجھ سے یا میری ٹیم سے سرزد نہ ہوتی۔ مجھے تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ تم مجھے نیم مردہ حالت میں ملو گے۔ جہاں میری زندگی کی تمام تربے چینیوں کو قرار مل گیا وہاں میرا بہت بڑا نقصان بھی ہوا۔ میرے بہت پیارے لوگ مجھ سے بچھڑ گئے۔ خیر! یہ تو ہوتا ہی ہے۔ زندگی دھوکا دینے والی ہے۔ کسی بھی وقت

WWW.PAKSOCIETY.COM

ساتھ چھوڑ سکتی ہے۔ میں بھی مر سکتی ہوں۔ تم بھی۔ ہمارے ارد گرد رہنے والے سبھی لوگ مرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔" اس کا لہجہ بھرا گیا۔ شاید آنکھوں میں نمی بھی تیر گئی تھی۔ سنبھل کر بولی۔ "اور شہر یار...... میری مسافتوں کا حاصل مجھے مل گیا۔ اب میرے پاس کوئی جواز نہیں رہا تھا اس مارا ماری والی زندگی کا...... بہت سارا پیسا مجھے پولیس کو دینا پڑا تاکہ وہ ہم پر اتنی بڑی واردات کا ملبانہ ڈالیں۔ اگر وہ ہمارے خلاف مقدمہ درج کر دیتے تو میں اور نگینہ پاکستان سے باہر نہ جا سکتے۔ تم بھی آزاد نہ رہ پاتے۔ سمجھ رہے ہو ناں؟"

میرے دل پر ایک پتھر آن پڑا۔ اس نے پاکستان سے جانے والوں میں میرا نام شامل نہیں کیا تھا۔ میں نے بہ وقت تمام کہا۔ "جی میڈم! آپ اپنی بات جاری رکھیے۔"

"اوکے...... جب ڈاکٹر ظہور اختر اور نیورو سرجن نے تمہاری صحت کے بارے میں اطمینان دلایا تو میں اپنے ادھورے کاموں کی تکمیل میں جت گئی۔ میر و شاہ اور سخی محمد نے ہتھیلی پر سرسوں جما دکھائی۔ آدھے صوبے میں بکھرے ہوئے معاملات کو آٹھ دس دنوں میں سمیٹنا ناممکن کام تھا جسے ان دونوں نے رات دن ایک کر کے ممکن بنا دیا۔ تمہیں یہ جان کر بہت خوشی ہوگی کہ میں نے جرائم کی دنیا کو خیر باد کہہ دیا ہے اور صبح چار بجے میں، میر و شاہ اور نگینہ کراچی کے لیے ملتان چھوڑ دیں گے۔ وہاں سے کینیڈا کے لیے پاکستانی دھرتی چھوڑ دیں گے۔ شاید کبھی لوٹ کر نہ آنے کے لیے......"

اس نے مجھے کسی خانے میں فٹ نہیں کیا تھا۔ میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ بہت دھیمے لہجے کا احتجاج میرے لبوں پر رقصاں ہوا۔ "مم...... میں...... میں کہاں جاؤں گا میڈم؟"

وہ ایک دم مجھ سے علیحدہ ہو گئی۔ بیڈ سے اتر کر کھڑی ہوئی اور ہتھیلیاں بیڈ کے میٹرس پر ٹکا کر مجھ پر جھک گئی، بولی۔ "شہر یار! میں نے تم سے محبت کی ہے۔ انمٹ سی۔ تمہیں بہت اونچا لے جانا چاہتی تھی مگر ناکام رہی مگر میں نے تمہارا معقول بندوبست کر دیا ہے۔ جب تک تم بالکل تندرست نہیں ہو گے، یہیں رہو گے۔ یہ اسپتال میں نے ڈاکٹر ظہور اختر کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔ تمہارے مکمل واجبات ایڈوانس ادا کر دیے ہیں۔ تمہاری فیملی اسی مکان میں قیام پذیر رہے گی جس میں رہ رہی ہے۔ فوجی اختر بہ دستور اپنا کام کرتا رہے گا۔ تم اسے ہر ماہ اس کی مقررہ تنخواہ ادا کرتے رہو گے اور ہاں! میں نے تمہاری کزن شانو کے نام کا اکاؤنٹ کھلوا کر اس میں ساڑھے تین کروڑ روپے ٹرانسفر کر دیے ہیں۔ چیک بک اُسے دے دی ہے۔ اس کی ذمے داریاں بھی اسے سمجھا دی ہیں۔ اس رقم سے تم اپنے مستقبل کا خاکہ تیار کرو گے۔ مجھے یقین ہے کہ اچھی زندگی گزارنے کے لائق ہو جاؤ گے۔"

میری سانس پھول گئی۔ الفاظ میرے سینے میں ہی نیزوں کی طرح دھنس گئے۔ وہ بولتی رہی۔ "تم حیران ہو گے کہ میں نے یہ رقم تمہارے اکاؤنٹ میں کیوں نہیں ڈالی؟ ہے ناں؟...... تمہیں علم ہے ناں کہ میں ہر پہلو نظر میں رکھتی ہوں۔ تم ابھی تک دستخط کرنے کے قابل نہیں ہوئے ہو۔ اگر میں تمہارے اکاؤنٹ میں رقم جمع کرا دیتی تو تم اسے اپنے تصرف میں نہیں لا سکتے تھے۔ تم یہ بھی سوچ رہے ہو گے کہ شانو ہی کیوں؟ میں نے اس کا ہی انتخاب کیوں کیا؟...... ڈاکٹر ظہور اختر کے سیکیورٹی کیمرے نے مجھے بتایا کہ شانو تم سے والہانہ محبت کرتی ہے۔ میں نے دو تین فوٹیج دیکھی ہیں جن میں وہ خوابیدہ شہر یار کے پاؤں دباتی ہے، ہاتھ سہلاتی ہے اور شیو زدہ چہرے پر اپنی بے اظہار محبت کی مہریں ثبت کرتی ہے۔ میں نے تمہارے مستقبل کے خالی صفحات پر اس کا نام لکھ دیا ہے۔ اس سے زیادہ موزوں نام میرے ذہن میں نہیں آیا۔ اب قسمت کیا کرتی ہے؟ یہ خدا کو ہی معلوم ہے مگر مجھے یقین ہے کہ وہ میری خواہش پر اپنی عنایت کی بارش برسا دے گا۔"

مجھے سننا محال تھا تو شاید اسے بولنا بھی آسان نہیں تھا۔ بولتے بولتے رک کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگتی تھی۔ "میں نے زور آور کو ایسے اسٹس تحفتاً دے دیے ہیں جنہیں بیچا نہیں جا سکتا تھا۔ وہ محبت کرنے والا اکھڑ مزاج انسان ہے۔ منافق نہیں ہے۔ جو بولتا ہے، وہ دل میں سنبھال رکھتا ہے۔ اسے اپنی جگہ پر گینگ لیڈر بنا کر تمام ساتھیوں کے سامنے دو صورتیں رکھ دیں۔ جرائم کی دنیا چھوڑنے والوں کے لیے ایک ایک کروڑ روپے جبکہ اس دنیا کے لطف کشید کرنے کی خواہش رکھنے والوں کے لیے زور آور کا گروپ اور پچاس لاکھ فی کس...... کچھ میری راہ پر چل نکلے۔ کچھ زور آور سے مل گئے۔ میں بری الذمہ ہو گئی۔ میر و شاہ اپنی مہارانی کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش بھی میں نے پوری کر دی۔ میں صبح کراچی کے لیے فلائی کر جاؤں گی جہاں سے سہ پہر تین بجے اس ملک کو الوداع کہہ جاؤں گی۔ پھر تم سب سے رابطہ منقطع ہو جائے گا۔ شاید فار ایور...... نہیں......

یقیناً فار ایور...... ائر پورٹ تک میڈم شکیلہ سفر کرے گی۔ جہاز میں چندو ماہی سوار ہو گی کیونکہ اس کا دامن قانون کی کتابوں میں پاک ہے۔ اس پر جو مقدمات تھے، وہ نوٹوں سے دھل چکے ہیں۔"

میں خاموش رہا، میری آنکھوں نے سوال کیا۔ "مجھے دوسروں کے مستقبل سے کچھ لینا دینا نہیں میں اپنی بات کرتا ہوں۔ میرا کیا بنے گا؟"

اس نے میری آنکھیں پڑھ لیں۔ مسکرائی۔ تھوڑا اور جھکی۔ میرے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ کر چند لمحے تھمی رہی پھر علیحدہ ہو کر بولی۔ "تم یقیناً شانو کے ساتھ خوش رہو گے۔ جب ٹھیک ہو جاؤ، اس سے شادی کر لینا۔ وہ تب تک انتظار کرے گی۔ ڈاکٹر منور علی شاہ، تمہاری بہن اور بہنوئی تمہیں پانچ سات دنوں تک ملنے آئیں گے۔ ٹھیک ہونے کے بعد تم چاہو تو نور پور میں اپنی زمین کاشت کرو، چاہو تو بیس پچیس ایکڑ اراضی خرید کر شہر یار خان بن جاؤ اور چاہو تو یہ علاقہ، یہ صوبہ، یہ ملک سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں دور نکل جاؤ مگر اپنی شانو کے ساتھ...... ساڑھے تین کروڑ کی رقم تمہیں مضبوط مستقبل دے سکتی ہے۔ اگر کبھی برے حالات سے واسطہ پڑے تو زور آور کو آواز دے لینا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہاری مدد کرے گا اور...... اور...... میری دعائیں تمہارے ساتھ رہیں گی...... ہمیشہ...... مجھے بھولنا تمہارے حق میں بہتر ہو گا، بھول جانا، ورنہ کہیں کے نہیں رہو گے۔"

وہ خاموش ہو گئی۔ گویا اس نے جو کہنا تھا، کہہ دیا تھا۔ مجھے جو سننا تھا، میں سن چکا تھا۔ کافی دیر گزر گئی۔ مجھے پیاس لگی۔ ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اس نے پانی پلا دیا، بولی۔ "تم بالکل خاموش کیوں ہو؟ کچھ پوچھنا چاہو تو پوچھ سکتے ہو؟"

میرے دل سے آہ نکلی۔ "میڈم......"

"نہیں...... میں اب میڈم نہیں، صرف چندو ماہی ہوں۔"

"اوکے...... چندو! کیا آپ...... نہیں...... بلکہ تم کیا واقعی مجھے چھوڑ کر جا رہی ہو؟" مجھے اپنا سوال نہایت اجنبی اور بے محل لگا۔

"ہاں...... اس میں تعجب کیسا؟ تم نے مجھے اور میں نے تمہیں چھوڑ دیا۔ صرف وقت اور مرحلے کا فرق ہے دونوں فیصلوں میں مگر یقیناً پہل تمہاری طرف سے ہوئی ہے۔" اس کا پختہ لہجہ اس کی آنکھوں کے بیان کی تصدیق نہیں کر رہا تھا۔

"مگر میں نے تو تمہیں نہیں چھوڑا۔ میں تو اب بھی تمہارے پاس ہوں۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"نہیں شہر یار! جھوٹ کی ریتیلی زمین پر محبت کا پر شکوہ محل تعمیر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ حقیقت ہے کہ میں اس محبت کی اہل کبھی نہیں رہی جس محبت کی اہلیت تمہاری منگیتر غزالہ کے پاس تھی۔ تم نے میرے پہلو میں رہ کر اسے سوچا۔ میرے چہرے پر اس کا چہرہ سجا کر چوما۔ میں نے غلط نہیں کیا۔ سوچ سمجھ کر تمہیں چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور ترکِ تعلقات کو اچھا موڑ دینے کے لیے اس وقت یہاں ہوں ورنہ میں پابند نہیں تھی کہ تمہیں بتا کر جاتی۔ یہ باتیں تو ڈاکٹر ظہور بھی تم تک پہنچا سکتا تھا۔" اس نے کہا۔

"تمہیں غلط فہمی ہوئی چندو ماہی! میں نے کبھی تم پر غزالہ کو فوقیت نہیں دی۔ اس کی ذات کا حصار اس دن ٹوٹ گیا تھا جس دن تم نے مجھے اپنے ماضی سے آگاہ کیا تھا۔ اس لمحے کے بعد میں نے صرف اور صرف تمہیں چاہا۔ اب معذوری کی حالت میں، آس اور ناامیدی کی سانسیں لیتا ہوا یہ سوچ رہا ہوں کہ شاید...... شاید یہ گھوڑا لنگڑا ہو گیا ہے جسے جنگل میں آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے یا فائر مار دیا جاتا ہے۔" میرا لہجہ بہت شکوہ آمیز اور تلخ ہو گیا تھا۔

وہ ایک قدم اور پیچھے ہٹ گئی۔ دیوار سے پشت ٹکا کر کھڑی ہو گئی اور مجھے یک ٹک دیکھنے لگی، بولی۔ "تمہارے خوبصورت چہرے پر جھوٹ اچھا نہیں لگتا۔ میں نے تمہارا جو امیج بنا رکھا ہے، اسے خراب نہ کرو۔"

"میں جھوٹ نہیں بولتا۔ سچ کہتا ہوں۔ تم میں اتنی ہمت نہیں کہ الزام اپنے سر لے لو۔ تم جانا چاہتی ہو۔ بصد شوق جاؤ۔ میں تمہیں روکنے کی نہ تو قدرت رکھتا ہوں اور نہ ہی میری اتنی اہمیت ہے کہ میرے روکنے سے تم رک جاؤ۔ تم نے میرے لیے جو کچھ کیا، اس کے بارے سے نکلنے کی ہمت بھی مجھ میں زندگی بھر پیدا نہیں ہو گی۔" میں نے خود پر قابو پانے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہا اور جو مجھے نہیں کہنا چاہیے تھا، ایک ہی سانس میں کہہ گیا۔

اس نے میری آنکھوں سے نکلتے آنسو دیکھ لیے۔ تڑپ کر قریب آ گئی۔ ہتھیلیوں سے آنکھوں کے گوشے صاف کرتے ہوئے بولی۔ "آئی لو یو شہر یار...... آئی لو یو۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ ہم دونوں سفر میں تھے۔ ہمیں مجبوراً اس ٹریک میں اکٹھے دوڑنا پڑا جس کی منزل تمہاری اور میری دونوں کی نگاہوں میں ثبت تھی۔ ہمارا ٹارگٹ پورا ہو گیا تو وہ ٹریک ختم ہو گیا۔ کسی ٹریک کے ختم ہونے سے سفر نہیں رکتا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

نیا ٹریک کھلتا ہے۔ اتفاق سے اب کے ہمارے لیے علیحدہ علیحدہ راستے کھلے ہیں۔ تم اپنی راہ چلو۔ مجھے اپنی راہ جانے دو۔ رہی بات تمہارے جھوٹ کی...... تم نے پوچھا تھا کہ مجھ تک تمہارے ناساعد حالات کی خبر کیسے پہنچی...... ہے ناں؟...... اب بتاتی ہوں کیونکہ یہی موزوں وقت ہے۔ مجھے تمہارے پل پل کی رپورٹ ملتی رہی تھی۔ جونہی یہ سلسلہ موقوف ہوا، تمہارا دوست خالد عرف کھالا مجھ تک پہنچ گیا۔ اس سے ایک غلطی سرزد ہوئی۔ اس نے غزالہ کے بارے میں مجھے نہیں بتایا تھا۔ شاید وہ اس کے نورپور سے نکلنے کے بعد اغوا ہوئی تھی۔ خیر...... میں بتا رہی تھی کہ جب تم میری خواہش کے بغیر نورپور جانا چاہتے تھے تو میں نے پپا جی سے کہا تھا کہ میک اَپ کے دوران ایسا کوئی انتظام کر دینا کہ ہمیں تمہاری پل پل کی رپورٹ ملتی رہے۔ اس نے ایک وائس ڈیکٹر تمہاری نقلی ڈاڑھی میں نصب کر دیا۔ اس کی رینج کم تھی۔ اس لیے پپا جی نے مانٹے جٹ کو ریسیور دے کر تمہارے پیچھے روانہ کر دیا۔ وہ مخصوص فاصلے پر رہ کر تمہاری آواز ریکارڈ کرتا رہا۔ پپا جی نے مجھے تمہاری وائس ریکارڈنگ لا تھمائی۔ میں نے سنی۔ میں چاہوں گی کہ تم بھی سن لینا۔ تب جب میں یہاں سے جا چکی ہوں گی۔ تمہارا آئینہ تمہارے جھوٹ کی قلعی تنہائی میں کھولے گا تو شاید تمہارے نزدیک میری حیثیت زیادہ معتبر ہو جائے اور میں تمہاری ندامت دیکھنے کے عذاب سے نہیں گزروں گی۔''

اس نے بنچ پر رکھے ہوئے ہینڈ بیگ کو اٹھا کر کھولا۔ ایک سی ڈی اور ایک ننھا سا سی ڈی پلیئر جس کے ساتھ دو مکعب انچ کا خوبصورت سا سیاہ اسپیکر باکس منسلک تھا، نکال کر پیشنٹ کیبنٹ پر رکھ دیا، بولی۔ ''رات اپنے دامن میں بہت کچھ چھپائے رکھتی ہے۔ کئی مسافروں کو، کئی پوٹلیوں اور کئی راستوں کو...... اس رات کے دامن میں بھی بہت کچھ چھپا ہے۔ میں جا رہی ہوں۔ میرے بعد، جب میری فلائٹ زمین چھوڑے گی، نرس کمرے میں آئے گی اور سی ڈی پلیئر کو آن کر کے تمہارے سینے پر رکھ دے گی۔ تمہیں تنہائی بھی فراہم کر دے گی تاکہ رات کا راز صرف تمہاری ذات تک محدود رہے۔ سننے کے بعد سی ڈی توڑ دینا۔ چاہو تو محفوظ رکھ لینا۔ مجھے ہر دونوں صورتوں میں کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ صبح دم شانو اور اس کے بہن بھائی یہاں آ جائیں گے۔ وہ تمہیں سنبھال لیں گے۔ وہ کمزور ہیں مگر تم کمزور نہیں ہو۔ بہادر بن کر زندگی کے مسائل کو فیس کرو گے تو زندہ رہو گے۔ اپنے خاندان کو بھی زندہ رکھو گے۔

او کے...... اب میں چلتی ہوں۔''

اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ چند لمحے دیکھتی رہی پھر برق رفتاری سے پلٹ کر کمرے سے نکلنے لگی۔ میں نے بے ساختہ آواز دی۔ ''چندو...... میڈم......''

وہ دروازے میں رک گئی۔ پلٹے بغیر گردن موڑ کر بولی۔ ''تو پلیز......''

''پلیز...... ایک منٹ......'' میرے لہجے میں بے بسی عود کر آئی۔ ''کاش کہ میں معذور نہ ہوتا تو اپنے بازوؤں سے روک لیتا۔''

وہ چند لمحے کھڑی مجھے گھورتی رہی پھر پلٹ کر میرے پاس آئی۔ مجھ پر جھکی۔ اس نے میری آنکھوں پر اپنے سرخ تر ہونٹ رکھے، پھر پیشانی پر بوسہ ثبت کیا۔ آخر میں کچھ کہے بغیر اس نے میرے ہونٹوں کو آخری بار سیراب کیا۔ میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''خدا حافظ میرے یار...... میرے شہریار......''

اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ آواز بھرا گئی۔ ایک الم ناک سسکی کو میرا زادِ سفر کر کے اس نے آنکھیں بند کر لیں اور نڈھال سے قدموں سے دروازے کی سمت بڑھ گئی۔ اس مرتبہ اس نے گردن موڑ کر مجھ پر نگاہ ڈالنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ مجھ میں پھر آواز دے کر روک لینے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ اس کا ہیولا کئی منٹوں تک ادھ کھلے دروازے پر ثبت رہا پھر آہستہ آہستہ محو ہونے لگا۔ آخر میں میری غیر معتدل سانسوں اور گھٹتی بڑھتی دھڑکنوں کے سوا کمرے میں کچھ نہ رہا۔

میرے روم میں وال کلاک نہیں تھا۔ مجھے وقت کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے آج تک بخوبی یاد ہے کہ اس وقت میرے دل میں کوئی خواہش نہیں تھی...... بس ایک نہ عبور کیا جا سکنے والا خلا تاحدِ نگاہ پھیلا ہوا تھا۔ اس ویکیوم میں میرا بے وزن وجود بس ادھر اُدھر ہچکولے کھا رہا تھا اور کسی ٹریک، سمت کے تعین اور خواہش کے بغیر بھٹک رہا تھا۔

کافی دیر گزر گئی۔ شاید گھنٹوں نے صدیوں کا روپ دھار لیا تھا۔ جونہی دبلے پتلے بدن والی معصوم چہرہ نرس نے میرا دروازہ کھولا، میرے لبوں سے بے ساختہ برآمد ہوا۔ ''چار بج گئے ہیں؟''

وہ مسکرائی۔ ''جی...... سوا چار کا عمل ہے۔''

اس نے بغیر کچھ کہے سنے چوبی بنچ پر سے سی ڈی پلیئر اُٹھایا۔ میرے سینے پر رکھا اور سوئچ بورڈ میں پلگ لگا کر پلیئر میں سی ڈی ڈالی اور ایک بٹن پش کر کے بولی۔ ''میرا

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں آدھے گھنٹے بعد آؤں گی۔ او کے؟"

میں کوشش کے باوجود کوئی جواب نہ دے سکا تو وہ عجیب سی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔ اپنے پیچھے دروازہ بند کر گئی۔ اس نے میڈم کے حکم کے مطابق مجھے مکمل تنہائی مہیا کر دی تھی۔ میں نے ایک طویل سانس لے کر آنکھیں جھکائیں۔ سیاہ جالی والا ننھا سا اسپیکر دکھائی دیا جس سے 'شوں شوں' کی اونچی نیچی آوازیں نکل رہی تھیں۔ چند لمحوں بعد مجھے اپنی آواز سنائی دی تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔

"تمہیں ایک نظر دیکھنے کے لیے یہ جتن کیا ہے۔ کھالے کا احسان ہے کہ اس نے تم سے ملا دیا۔ غزالہ! کیا تم مجھے یاد کرتی تھیں؟"

غزالہ کی آواز اسپیکر سے برآمد ہوئی۔ "اور میرا کون تھا جسے یاد کرتی۔ تمہارا چھپ کر یہاں آنا اور مجھ سے ملنا ظاہر کرتا ہے کہ تم واپس چلے جاؤ گے۔ ہے ناں؟"

سی ڈی پلیئر کے اسپیکر سے وہ مکالمے پھوٹ رہے تھے جو بخشو لوہار کی دکان میں ہونے والی ملاقات میں غزالہ اور میں نے ادا کیے تھے۔ آواز زیادہ صاف نہیں تھی مگر لفظ لفظ سنا و سمجھا جا رہا تھا۔ میرے دماغ میں جھکڑ سے چلنے لگے۔ میڈم کی آخری گفتگو بہت بڑا سوالیہ نشان بن کر سامنے والی دیوار پر ثبت ہو گئی۔

میں اپنی اور غزالہ کی آوازیں مفہوم سمجھے بغیر سنتا رہا۔ میرا ادا کیا ہوا ایک جملہ جب دو تین مرتبہ دہرایا گیا تو میں چونکا، سنا۔ "میں جس لڑکی کے ہاں ملازمت کرتا ہوں، اس کا حسن دیکھ کر انسان کے چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔ وہ مجھ پر مہربان ہے بلکہ محبت کرتی ہے مجھ سے۔ مگر یقین کرو میں اس کا کچھ بھی نہیں ہوں۔ ہاں ایک دو ضروری کام ہیں جو اس کی معاونت کے بغیر پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتے۔"

کچھ آگے چل کر پھر میرے ایک جملے کو تین مرتبہ دہرایا گیا۔ "ہاں! ابھی میں اسے دھوکے میں رکھتا ہوں۔ جونہی مجھے اس کی ملازمت کی ضرورت نہ رہی، اسے چھوڑ دوں گا۔ پھر میں ہوں گا اور تم...... اور ہماری ایک چھوٹی سی جنت...... بس!"

غزالہ کے کسی جملے کو ہائی لائٹ نہیں کیا گیا تھا۔ اس سی ڈی میں میرے اس جملے کو آخری بار دہرایا گیا۔ "وہ ایسی عورت نہیں ہے کہ لیلیٰ مجنوں والی محبت کرتی پھرے۔ اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک چاہنے والا اس کی راہ میں کھڑا ہے۔ وہ دل داری نہیں کرتی۔ دلوں سے کھیلتی ہے۔ ایک کے بعد دوسرا...... دوسرے کے بعد تیسرا...... کئی عاشق بدلتی ہے۔ کہا ناں! اس کا وہم نہ کرو۔ وہ میری زندگی میں کچھ بھی نہیں ہے۔ محض مالکن ہے میری۔"

سی ڈی ختم ہو گئی۔ اس کا دورانیہ کم و بیش بیس منٹ تھا۔ سیاق و سباق نہیں دیا گیا تھا مگر اسے سمجھنے کے لیے مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

اس نے سچ کہا تھا۔ اس نے اگر محبت کے باب میں تمام تر بے وفائی کے جرائم میرے کھاتے میں ڈال دیے تھے تو غلط نہیں کیا تھا۔ میں بے وفائی کا مرتکب ہوا تھا۔ مجھے وہی سزا ملنی چاہیے تھی، جو مل گئی۔

وہ مسافر بھی۔ میں بھی مسافر تھا۔ دونوں کو ایک جیسے تارگٹس نے ایک ٹریک پر چلا دیا تھا۔ ٹریک ختم...... مسافتوں میں ہمراہی کا راگ بند...... میری آنکھیں ندامت سے جھک گئیں، پھر بند ہو گئیں۔ پلکوں کے دونوں گوشوں سے دو ابلتی ہوئی لکیریں پھوٹ نکلیں۔

میں نہ جانے کتنی دیر اس ٹرانس میں پڑا روتا رہتا مگر نرس کی آمد نے مجھے چونکا دیا۔ وہ میرے قریب آئی۔ پلیئر بند کیا۔ اٹھا کر پیشنٹ کیبنٹ پر رکھا۔ اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی پھر ہمدردی آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے نرمی سے بولی۔ "سر! میڈم صاحب کی فلائٹ کو ٹیک آف کیے آدھا گھنٹا گزر چکا ہے۔"

"پپ...... پانی...... سسٹر!"

اس نے گلاس میں اسٹرا ڈال کر میرے لبوں سے لگایا۔ میں نے دو گھونٹ حلق میں اتارے اور سپاٹ دیوار پر نظریں جمائے لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ زندگی ایک سفر ہے، طویل بھی اور نہایت مختصر بھی...... اور ہم سب مسافر...... کہیں مل گئے، کہیں جدا ہو گئے۔ راستوں کے مزاج پر قربان گاہیں بچی ہیں۔ ہمیں منزلوں کا انتخاب ہمراہ کرتا ہے اور منزلوں کا حصول ہمیں جدا کر دیتا ہے۔ کیا اس روایت سے لڑا جا سکتا ہے؟

نہیں...... کبھی نہیں......

یہ اپنے آپ سے نمٹ نہیں سکی
یہ زندگی کبھی پلٹ نہیں سکی

معاشرتی ناہمواریوں پر مبنی دلوں کی دھڑکن، لہو کی گردش تیز کر دینے والے اس دلچسپ سفر کا آخری پڑاؤ

غفلت سے بند آنکھوں کو کھولنے کا ایک کامیاب نسخہ

کبھی کبھی کاروباری مجبوری کے باعث ایمانداری کے وصف کو بھی کیش کرایا جاتا ہے تاکہ کچھ معاشی آسودگی کا سبب بن سکے... اس نے بھی نادانی میں کچھ ایسا ہی کھیل کھیلا کہ تمام ہوشیاروں کے چھکے چھوٹ گئے۔

ایماندار

ثمر عباس

نیشنل فارمرز بینک کا پریذیڈنٹ مون زیئر بے آؤٹ ایک صبح اپنی سیکریٹری فلی برٹ سے بات کر رہا تھا۔

"فلی برٹ، مجھے بتاؤ۔" اس نے کہا۔ "ہماری پرگنن برانچ میں فلوریٹ نام کا آدمی کون ہے؟"

"فلوریٹ...... کیشئر لیکن وہ اس وقت عارضی طور پر ایکٹنگ منیجر کے طور پر کام کر رہا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا جناب کہ پرانے منیجر باؤنٹر کے انتقال کے بعد ہمیں اب تک کوئی متبادل نہیں مل سکا ہے۔" اس نے کہا۔ "اس دوران فلوریٹ معاملات کو دیکھ رہا ہے...... ویسے بھی وہاں کا نظام وہی چلا رہا ہے۔"

پریذیڈنٹ مون زیئر نے اپنی ڈیسک میں سے ایک لفافہ نکالا۔ "ہوں...... میرا خیال ہے کہ وہ ہمارے ساتھ بددیانتی کا مرتکب ہو رہا ہے۔ مجھے پرگنن سے یہ خط موصول ہوا ہے۔ مجھے تسلیم کرنے میں عار نہیں کہ یہ گمنام ہے، لیکن......" اس نے خط سیکریٹری فلی برٹ کی جانب بڑھا دیا۔ فلی برٹ نے خط پڑھنا شروع کیا۔

"نیشنل فارمرز بینک کے پریذیڈنٹ کے لیے۔

ڈیئر سر، ہم محنتی باڑی کر کے اپنے خون پسینے کی کمائی آپ کے بینک کی پرگنن شاخ میں پس انداز کرتے ہیں، ایک روز آنکھ کھلتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ بینک دیوالیا ہو گیا ہے اور ہم اپنی بچت سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے، اس کے بعد یہ تو ہونا ہی تھا۔ شاید آپ کو پتا نہیں ہے کہ آپ کا کیشئر فلوریٹ کئی ماہ سے غبن کر رہا ہے۔ وہ غبن شدہ رقم کو منتقل کرنے والا ہے۔ جب تک آپ توجہ دیں گے۔ رقم غائب ہو چکی ہو گی۔"

سیکریٹری نے خط پڑھ کر غیر یقینی نظروں سے پریذیڈنٹ کی جانب دیکھا۔

"کل ایک انسپکٹر پرگنن برانچ کی جانب روانہ کر دو۔" پریذیڈنٹ نے ہدایت کی۔ "تاہم خیال رہے کہ انسپکٹر کو ہوشیاری سے کام لینا ہے...... فلوریٹ کو ہراساں نہیں کرنا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ کہانی بے بنیاد ہو۔"

⊛⊛⊛

پرگنن برانچ کا عارضی منیجر فلوریٹ، حیرت اور سراسیمگی کے عالم میں انسپکٹر کو گھور رہا تھا۔

"میرے ریکارڈ اور کتابوں کی جانچ کرنی ہے؟" اس کی آواز

WWW.PAKSOCIETY.COM

گونج دار تھی۔ ”آخر کیوں؟ وہ بھی مہینے کے درمیان میں...... نہ کوئی نوٹیفکیشن، نہ کوئی اطلاع...... یہ خلافِ معمول ہے۔ ایسی کون سی آفت آگئی ہے۔“ فلوریٹ حیران و پریشان تھا۔

انسپکٹر نے معذرت کی۔ ”مسٹر فلوریٹ، کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ ہم وقتاً فوقتاً تمام برانچوں میں ایسا کرتے ہیں، یہ صرف ایک معمول کی کارروائی ہے۔ مجھے زیادہ سے زیادہ ایک آدھ گھنٹا لگے گا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن لوگوں کو پتا چلا تو کیا سوچیں گے...... میں بدنام ہو جاؤں گا۔ عوام سمجھیں گے کہ میں نے کوئی غلط کام کیا ہے۔“

”کسی کو پتا نہیں چلے گا۔“ انسپکٹر نے کہا۔ ”ہاں اگر تم خود بتا دو تو اور بات ہے۔“

⊙⊙⊙

دو روز بعد سیکریٹری فلی برٹ، پریذیڈنٹ کے کمرے میں داخل ہوئی۔ ”سر! انسپکٹر کی رپورٹ کے مطابق ہر چیز ٹھیک حالت میں ہے...... ایک پیسا ادھر ادھر نہیں کیا گیا۔“

”گڈ۔ گمنام خطوط کو زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ شکریہ فلی برٹ۔“

ایک ماہ سے قبل پریذیڈنٹ نے ایک بار پھر خصوصی طور پر سیکریٹری کو طلب کیا۔

”عجیب، نہ سمجھ میں آنے والی بات ہے۔“ وہ بولا۔ ”لیکن مجھے ایک بار پھر مذکورہ برانچ کے علاقے سے دوسرا گمنام خط موصول ہوا ہے۔“ اس نے پرسوچ انداز اختیار کیا۔ ”لکھنے والے کا دعویٰ ہے کہ کتابوں کی جانچ پڑتال ٹھیک طرح سے نہیں کی گئی اور کیشئر نے چالاکی سے انسپکٹر کو بے وقوف بنایا ہے۔ آپ کو اس وقت احساس ہوگا جب تیر کمان سے نکل جائے گا۔ ممکن ہے کہ آپ اس گمنام خط پر توجہ نہ دیں۔ تاہم یہ آپ کی صوابدید ہے......“

”کیا ہمیں ایک بار پھر انکوائری کرنی چاہیے؟“ سیکریٹری نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

پریذیڈنٹ، ڈیسک کو انگلیوں سے بجا رہا تھا۔ ”مجھے پسند نہیں ہے کہ دوبارہ تحقیق کی جائے۔“ وہ رک گیا۔ ”بے شک ہمارے کلائنٹس کی جانب سے ہمارے اوپر بھاری ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ اگر واقعی گڑبڑ ہے...... اور ہم خاموش رہتے ہیں تو بعدازاں یہ ایک پریشان کن اسکینڈل بن جائے گا۔ اس بار انسپکٹر سے کام نہیں چلے گا۔ ہمیں اندیشوں کو بالائے طاق رکھ کر بھرپور چیکنگ کی ضرورت ہے۔ میں یہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے ختم کرنا چاہتا ہوں۔“

سیکریٹری نے اثبات میں سر ہلایا۔

اسی روز بینک کے تین عدد ماہرین پر مشتمل ٹیم، پرپکنن روانہ ہوگئی۔

اس مرتبہ فلوریٹ اشتعال کا مظاہرہ کیے بغیر نہ رہ سکا۔ ”میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آخر مسئلہ کیا ہے؟“

”کچھ خاص نہیں ہے۔“ ان میں سے ایک نے کہا۔

”خاص نہیں ہے، تو کیا بہت خاص ہے۔“ فلوریٹ اچھا خاصا برہم دکھائی دے رہا تھا۔

ایک آدمی اس کے سر پر کھڑا رہا اور باقی دو اپنے کام میں جت گئے۔ اس مرتبہ بہت باریک بینی کا مظاہرہ کیا گیا۔ تمام تفتیش میں چار گھنٹے سے زیادہ صرف ہوئے۔

⊙⊙⊙

ایک ہفتہ بعد......

سیکریٹری نے پریذیڈنٹ کو اطلاع دی۔ ”پرپکنن سے مسٹر فلوریٹ ملنا چاہتے ہیں۔“

اپنی عادت کے برخلاف پریذیڈنٹ کھڑا ہو کر آگے بڑھا اور ہاتھ ملا کر فلوریٹ کا استقبال کیا۔

تاہم فلوریٹ نے زیادہ گرمجوشی کا مظاہرہ نہیں کیا۔

”سر! میں اپنا استعفیٰ دینے آیا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”تمہارا استعفیٰ! کیوں مائی ڈیئر؟ اس کی کیا ضرورت ہے؟“

”سر، ایک ماہ میں میرے ساتھ جو کچھ ہوا...... اور میری ایمانداری پر شک کیا گیا۔ عوام میرے بارے میں ناپسندیدہ باتیں کر رہے ہیں۔ اس سے بڑھ کر مجھے ازحد ذہنی تکلیف پہنچی ہے۔ میری ساکھ ختم ہو چکی ہے۔ میں کوئی نوجوان آدمی نہیں ہوں، میری بیوی بھی ہے......“

پریذیڈنٹ نے خجالت محسوس کی۔ ”میں پوری ذمے داری لیتا ہوں اور تمہاری ساکھ کو صاف ستھرا دیکھنا چاہتا ہوں۔ ایک منٹ صبر کرو......“ وہ کچھ سوچنے لگا پھر بولا۔ ”منیجر کی جگہ ابھی تک خالی پڑی ہے، تم منیجر کی اسامی کی مستقل ذمے داری سنبھال لو۔ تمہارے خلاف قیاس آرائیاں ازخود بند ہو جائیں گی اور تمہاری تنخواہ میں اضافہ ہو جائے گا۔ ہمیں تم جیسے ایماندار منیجر کی ضرورت ہے۔ استعفیٰ پھاڑ کر پھینک دو۔“

فلوریٹ حیرت زدہ رہ گیا۔ ”کیا آپ سنجیدہ ہیں سر؟“

”ارے بھئی، میں واقعی سنجیدہ ہوں۔“ پریذیڈنٹ نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

⊙⊙⊙

پرپکنن میں اپنے گھر میں فلوریٹ آرام دہ حالت میں نیم دراز تھا۔

”بالآخر!“ وہ مسکرایا۔ ”کیا فائدہ خالی ایمانداری کا۔ ایماندار کیشئر کے طور پر پتا نہیں میرے کتنے برس ضائع ہو جاتے۔ بینک والوں کو پتا ہی نہیں چلتا کہ میں کتنا ایماندار ہوں؟“

”اب ان کو پتا چل گیا ہے۔“ بیگم فلوریٹ کا چہرہ دمک رہا تھا۔ وہ شوہر کو تعریفی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”وہ خطوط والا آئیڈیا آخر تمہارے ہی زرخیز ذہن کی پیداوار تھا......“

☆

وہ اسے تقریباً تین چار سال بعد نظر آئی تھی۔ اس نے اسے پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ غلطی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ اس کے خوب صورت نقش و نگار اور چکنی ملائم سفید جلد کو کیسے بھلا سکتا تھا جس کو دیکھ کر اس پر کسی شہزادی کا گمان ہونے لگتا تھا۔ وہ عورت اسی عمارت میں داخل ہو رہی تھی جس سے وہ ایک لمحہ پہلے باہر آیا تھا۔ اس نے سفید اسکرٹ اور گہرے نیلے رنگ کا چست بلاؤز پہن رکھا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ لوگوں کے اس ہجوم میں گم ہوگئی

تلاش

تنویر ریاض

اصل فاتح وہی ہے جو وقت کی بساط پر درست اور فوری چال چل جائے... لیکن اسے تو قسمت بار بار موقعے دے رہی تھی بس ایک وہی نادان تھا یا پست ہمت کہ بار بار رستہ بدل جاتا تھا... آخر کب تک خوش بختی اس کا تعاقب کرتی، بالآخر اس نے بھی کہیں اور بسیرا کر لیا... پھر اچانک اس کی آنکھوں نے وہ منظر دیکھا، جسے دیکھنے کی اسے تاب نہ تھی... جان لیوا حقیقت سامنے آئی تو گویا اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔

دل کی سرگوشیوں کو نظرانداز کرنے والے کم ہمت عاشق کا احوال

WWW.PAKSOCIETY.COM

جو عمارت کے گھومنے والے دروازے سے اندر باہر آجا رہے تھے۔

اس بار اس نے تہیہ کرلیا کہ وہ اس عورت کا پیچھا کرکے اس سے بات کرنے کی کوشش کرے گا، گوکہ اس سے پہلے پوری زندگی میں وہ اس کی چند جھلکیاں ہی دیکھ پایا تھا۔ پہلی بار اس نے اسے اس وقت دیکھا جب اس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی اور وہ بھی بالکل جوان تھی۔ وہ پارک میں سائیکل چلا رہی تھی اور وہ اس کا معصوم حسن دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ اسے جی بھر کر دیکھنے کے لیے اس نے یہ ظاہر کیا جیسے وہ خود بھی کام میں مصروف ہے اور درختوں کے درمیان کھڑے ہوکر اس کا انتظار کرنے لگا کہ وہ کب دوبارہ نظر آتی ہے۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہ لڑکی پارک کا چکر لگا کر دوبارہ اس کی جانب آئی اور اس کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے مسکرا کر دیکھا، اس مسکراہٹ میں دلکشی، پُراسراریت اور اپنایت پنہاں تھی اور یہ پہلا موقع تھا جب کسی نوجوان اور خوب صورت لڑکی نے فریڈرک کو اتنے پیار سے دیکھا ہو، وہ تازہ ہوا کے جھونکے کے مانند اس کے پاس سے گزر گئی۔ فریڈرک کے لیے اس کا تعاقب کرنا ممکن نہیں تھا لہٰذا اس کی تصویر کو ذہن کے خانے میں محفوظ کرلیا۔

وہ اسے ایک یا دو سال بعد دوبارہ نظر آئی۔ اس دوران فریڈرک کی زندگی میں کئی اہم واقعات رونما ہوچکے تھے، اس کی پہلی شادی ناکام ہوگئی تھی اور اس غلطی کا خمیازہ اسے طلاق کی صورت میں بھگتنا پڑا تھا۔ اس کے نتیجے میں وہ اپنے نئے مکان اور پرانی کار سے محروم ہوگیا۔ مکان اس نے قسطوں پر خریدا تھا جبکہ کار پرانی ہونے کے باوجود اس کے لیے بہت کارآمد تھی۔ خوش قسمتی سے ان کے یہاں کوئی بچہ نہیں ہوا تھا ورنہ فریڈرک کو اس کے اخراجات بھی ادا کرنے پڑتے۔ حالانکہ اس کی بیوی کو بچے کی بہت آرزو تھی اور وہ فریڈرک کو اس کے لیے مسلسل آمادہ کرنے کی کوشش کررہی تھی، جب اس کا اصرار حد سے بڑھ گیا تو فریڈرک نے بھی اس بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کردیا لیکن اس سے پہلے ہی ان کے درمیان علیحدگی ہوگئی۔ اس طرح وہ ایک بڑی مصیبت سے بچ گیا۔

وہ کافی ہاؤس میں بیٹھا اپنی گزشتہ زندگی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر کھڑکی سے باہر گئی، اس نے فوراً ہی اسے پہچان لیا۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جنہیں آسانی سے نہیں بھلایا جاسکتا تھا۔ وہ شاندار انداز میں ایک تمکنت کے ساتھ فٹ پاتھ پر چلی جارہی تھی۔ اس کی چال میں وقار اور اعتماد تھا اور یوں لگتا تھا جیسے اسے اندازہ ہوگیا ہو کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے لیکن وہ ایک ادائے بے نیازی سے آگے بڑھتی رہی۔

فریڈرک نے کافی کا بل ادا کیا اور تیزی سے اس عورت کی جانب لپکا جس نے ایک بار پھر نظر آکر اس کے جذبات کو بیدار کردیا تھا جنہیں وہ عرصہ ہوا تھپک تھپک کر سلا چکا تھا۔ بیوی سے علیحدگی کے بعد اس نے عورتوں کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا تھا اور لگتا تھا کہ اب اس کی زندگی میں کبھی کوئی عورت نہیں آئے گی لیکن اس پر نظر پڑتے ہی سب کچھ الٹ پلٹ ہوگیا اور وہ کسی نوعمر عاشق کی طرح اس کے پیچھے چل دیا۔ وہ ایک فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب کررہا تھا تاکہ اسے شبہ نہ ہو۔ اس دوران اس نے محسوس کیا کہ اب وہ دو سال پہلے والی جوان لڑکی نہیں رہی تھی بلکہ اس کی جگہ ایک بھرپور عورت نے لے لی تھی جو نسوانی حسن کے تمام ہتھیاروں سے لیس تھی۔ وہ عمر کے اس حصے میں تھی جہاں اس کی زندگی میں کسی مرد کی موجودگی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یقیناً اس کا بھی کوئی نہ کوئی محبوب یا شوہر ضرور ہوگا۔ اس خیال کے آتے ہی وہ مایوس ہوگیا اور اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس عورت کی ازدواجی حیثیت کے بارے میں کس طرح معلوم کرے۔ اچانک ہی ایک خیال اس کے ذہن میں بجلی کی طرح کوندا۔ انگوٹھی، اگر وہ شادی شدہ ہے یا اس کی منگنی ہوچکی ہے تو ضرور اس کے ہاتھ میں انگوٹھی ہوتی۔ اب اسے اس کے قریب ہوکر وہ انگوٹھی دیکھنا تھی۔

وہ عورت چلتے چلتے اچانک رک گئی اور ایک اسٹور کے باہر کھڑے ہوکر شوکیس میں رکھی ہوئی اشیا کا جائزہ لینے لگی۔ اس نے بھی اپنی رفتار کم کردی اور اسے دیکھنے لگا۔ بلاشبہ وہ اتنی حسین تھی کہ بار بار دیکھنے کے باوجود نظروں کی پیاس نہیں بجھتی تھی۔ اب وہ منتظر تھا کہ وہ عورت اس کی جانب متوجہ ہو۔ اگر وہ ذرا سی بھی حوصلہ افزائی کرتی تو وہ گفتگو میں پہل کرسکتا تھا۔ بالآخر اس کا صبر رنگ لایا اور اس عورت نے گردن گھما کر اسے دیکھ ہی لیا۔ اس کے چہرے پر دھیمی سی دلفریب مسکراہٹ تھی۔ فریڈرک پُرجوش انداز میں آگے بڑھا لیکن اس عورت کے پاس رکے بغیر تیزی سے گزر گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ایسی شاندار عورت سے راہ و رسم بڑھانے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا کیونکہ ابھی پچھلے زخم مندمل نہیں ہوئے تھے اور اسے ابھی موہوم سی امید تھی کہ شاید اس کی بیوی واپس آجائے۔ اس طرح اپنی کم ہمتی اور پریشان خیالی کی وجہ سے وہ کوئی پیش رفت نہ کرسکا۔

کئی سال گزر گئے اور وہ بھول گیا کہ کافی عرصہ پہلے اس نے کسی عورت کو دوبارہ دیکھا تھا۔ ویسے تو وہ روزانہ بے شمار عورتوں کو دیکھتا ہوگا لیکن اس جیسی عورت کبھی کبھار ہی نظر آتی ہے۔ اس دوران وہ بے حد مصروف رہا۔ کاروبار کے سلسلے میں اسے دوسرے ملکوں میں بھی جانا پڑتا تھا۔ اس کا زیادہ تر قیام ایمسٹرڈیم میں رہا۔ جہاں کی رنگینیاں بھی اس کی تنہائی کا مداوا نہ کرسکیں۔ اس نے دل بہلانے کے لیے بیئر کا سہارا لیا اور اس کی شامیں کلبوں اور پارکوں میں گزرنے لگیں۔ اس کے اطراف حسین لڑکیوں کا جمگھٹا لگا رہتا لیکن اس کا دل کہیں نہ لگتا۔

کافی عرصہ ایمسٹرڈیم اور یورپ کے کئی شہروں میں گزارنے کے بعد وہ اپنے آبائی شہر واپس آگیا۔ تنہائی اسے کاٹنے کو دوڑتی تھی لہٰذا دوستوں کے کہنے پر اس نے دوسری شادی کرلی جو کافی عرصہ قائم رہی۔ اس کے دو بچے بھی ہوئے جنہوں نے اس کی زندگی کا رخ ہی بدل دیا۔ اب وہ پہلے کے مقابلے میں اپنے آپ کو زیادہ پُرسکون محسوس کررہا تھا۔ گوکہ اس کے معمولات میں کسی حد تک یکسانیت آگئی تھی لیکن وہ اسے استحکام کی علامت سمجھتا تھا۔ ان کے درمیان اگر چھوٹے موٹے اختلافات ہوئے بھی تو وہ قابلِ توجہ نہ تھے۔ وہ اپنے بچوں کو ایک ڈے کیئر سینٹر میں چھوڑ دیتے جہاں وہ دل کھول کر آزادی کا لطف اٹھاتے گوکہ اس میں ان کی آمدنی کا بڑا حصہ خرچ ہوجاتا لیکن بچوں کی بہتری کے لیے وہ اسے برداشت کررہے تھے۔ اس مرکز کا معیار بہت اونچا تھا اور وہاں پر ان بچوں کی دیکھ بھال بالکل رئیس زادوں کی طرح کی جاتی تھی۔ اس کی بیوی کے اوقات کار بہت طویل تھے اور وہ ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے ایک اعلیٰ انتظامی عہدے پر پہنچ چکی تھی لیکن ایک حادثہ ایسا پیش آیا کہ وہ بلندی پر پہنچ کر منہ کے بل گر پڑی۔ ان کا چھوٹا بیٹا پیدا روسانس بند ہوجانے کی وجہ سے ڈے کیئر سینٹر میں مرگیا۔ ڈاکٹروں کے نزدیک یہ پیدائشی مرض تھا اور وہ اس کا علاج کرنے سے قاصر تھے۔ اس بچے کی موت اچانک اور غیر متوقع طور پر واقع ہوئی۔ اس کی ماں نے اس حادثے کا اتنا اثر لیا کہ وہ فوراً ہی اپنی ملازمت چھوڑنے پر تیار ہوگئی کیونکہ وہ اپنے دوسرے بچے کی زندگی بچانے کے لیے اپنے کیریئر کی قربانی دینے کے لیے تیار تھی۔ اسے شدت سے یہ احساس ستا رہا تھا کہ اگر وہ بچے کو ڈے کیئر سینٹر میں نہ بھیجتی تو یہ حادثہ رونما نہ ہوتا۔ یہ ایک غیر معقول فیصلہ تھا جس کے نتیجے میں میاں بیوی کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوگئی جس کا نتیجہ علیحدگی کی صورت میں نکلا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ وہ اسے سمجھ ہی نہ پائے۔

فریڈرک کو اپنی بیوی سے ہمدردی تھی کیونکہ اس نے ملازمت چھوڑ کر اپنی کامیابی اور ترقی کے خواب کو چکنا چور کردیا تھا۔ پہلے اسے بچے کی جدائی کا صدمہ برداشت کرنا پڑا پھر شوہر سے بھی علیحدگی ہوگئی۔ یہ ٹھیک نہیں تھا لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ زندگی میں ہمیشہ سب کچھ ٹھیک ہی ہوتا ہے۔ کاتبِ تقدیر نے ان کی قسمت میں یہی لکھا تھا چنانچہ انہوں نے اسے تقدیر کا فیصلہ سمجھتے ہوئے قبول کرلیا۔

اس شادی کے ختم ہوجانے کے بعد ایک وقت ایسا آیا جب وہ اس پُراسرار عورت کو اکثر دیکھنے لگا اور اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ قدرت ان کے ملنے کے اسباب پیدا کررہی ہے۔ ایک بار ان کا آمنا سامنا ایک سنیما ہال میں ہوا۔ یہ محض اتفاق ہی تھا کہ وہ بھی وہاں فلم دیکھنے آئی ہوئی تھی۔ لابی میں ان کے درمیان نگاہوں کا تبادلہ ہوا۔ اس عورت کے چہرے پر شناسائی کے رنگ ابھرے اور فریڈرک اسے دیکھ کر یوں شرمانے لگا جیسے اس کے ساتھ پہلی بار ڈیٹ پر آیا ہو۔ دل نے کہا کہ موقع اچھا ہے، آگے بڑھو اور ہمت کرکے حالِ دل کہہ دو لیکن دماغ نے فوراً ہی سرزنش کی۔ کسی بھی عوامی جگہ پر اس طرح کی بات کرنا مناسب نہیں۔ اس کے لیے تو کسی پارک کا پُرسکون گوشہ یا ریستوران کے کیبن کی تنہائی ضروری ہے۔ اس بھیڑ میں اگر اس نے سینڈل اتار لیا تو دو کوڑی کی بھی عزت نہیں رہے گی اور اگر اس نے پولیس کو بلالیا تو عشق کی آگ دھوئیں میں تبدیل ہوکر فضا میں تحلیل ہوجائے گی۔ چنانچہ اپنی کم ہمتی کے سبب اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے اور وہ دور سے ہی اسے دیکھ کر نظروں کی پیاس بجھاتا رہا۔ اس عورت نے ایک نگاہ اس پر ڈالی اور مسکراتے ہوئے سنیما ہال میں چلی گئی۔

کچھ ہی دنوں بعد وہ دوبارہ نظر آئی۔ فریڈرک بس میں سوار ہورہا تھا اور وہ سڑک پار کرکے بس اسٹاپ کی طرف آرہی تھی۔ بس رفتار پکڑ چکی تھی۔ اس لیے اس کا چھلانگ لگانا ممکن نہ تھا۔ اس مرتبہ وہ صرف اس کی ایک جھلک ہی دیکھ پایا لیکن وہ واضح طور پر دیکھ سکتا تھا کہ ہمیشہ کی طرح وہ شاندار اور پُرکشش نظر آرہی تھی وہی وقار، وہی تمکنت اور

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہی دلآویز مسکراہٹ جو اس کی شخصیت کا خاصہ تھیں۔ وہ ہمیشہ تنہا ہی نظر آئی اور اس نے کبھی اس کے ساتھ کسی مرد کو نہیں دیکھا جس سے اس خیال کو تقویت ملتی تھی کہ وہ اکیلی ہے اور اس کا کوئی شوہر یا بوائے فرینڈ نہیں ہے۔ اس جانب سے اطمینان ہو جانے کے بعد وہ اور زیادہ شدت سے اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ اب اس کے شب و روز اسی کے تصور میں گزرتے، جب وہ کام سے واپس آنے کے بعد اپنے چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں بستر پر ستانے کے لیے لیٹتا تو اس کی آنکھوں کے سامنے وہ تمام مناظر گھومنے لگتے جب وہ مختلف اوقات میں مختلف مقامات پر اس سے ٹکرائی تھی۔ وہ بار بار اپنے ذہن کی اسکرین پر اس کیسٹ کو ریوائنڈ کرتا اور بار بار ان مناظر سے لطف اندوز ہوتا۔ وہ پُراسرار عورت بری طرح اس کے حواس پر چھا گئی تھی اور وہ کوشش کے باوجود اس کے تصور سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ یہی عورت اس کی ویران اور تنہا زندگی میں رنگ بکھیر سکتی ہے۔

وہ بہت زیادہ مذہبی نہیں تھا اور نہ ہی باقاعدگی سے ہر اتوار کو گرجا گھر جاتا لیکن اب اسے خدا یاد آنے لگا تھا اور وہ کبھی کبھی سکونِ دل کی خاطر بائبل کا مطالعہ کر لیتا۔ اس کتاب مقدس میں بتایا گیا تھا کہ قدرت نے ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے۔ ہر ذی روح اپنے وقت پر اس دنیا میں آتا اور چلا جاتا ہے۔ اسی طرح وقت سے پہلے فصل بوئی جاتی ہے اور نہ کاٹی جاتی ہے۔ کیا کبھی وہ وقت بھی آئے گا جب وہ عورت بہار کے جھونکے کے مانند اس کی زندگی میں رنگ بکھیر دے گی۔ اس کے خیال میں وہ عورت اس کے لیے لاٹری کا ٹکٹ تھی جس پر بھاری انعام ملنے کی توقع تھی اور وہ اس لاٹری کے کھلنے کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا جبکہ وہ عورت لاٹری کا ٹکٹ نہیں بلکہ ایک ایسا جام تھی جسے اٹھانے کے لیے تھوڑی سی ہمت چاہیے تھی۔

اس دوران ان دونوں کا تین چار مرتبہ سامنا ہوا۔ وہ ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں رہے تھے۔ اس لیے شناسائی کی بدولت بات ہائے ہیلو تک پہنچ گئی، یہی وہ موقع تھا جب فریڈرک کو تھوڑی بہت پیش قدمی کرنا چاہیے تھی لیکن اس بار پھر اس نے بزدلی کا مظاہرہ کیا اور مزید کوئی بات کیے بغیر آگے بڑھ گیا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ راستہ روک کر اس سے کوئی بات کرتا جبکہ اس عورت کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس کی جانب سے کچھ سننے کی منتظر ہے۔ یقیناً اس نے بھی سوچا ہوگا کہ کیسا عجیب شخص ہے جو موقع ملنے کے باوجود بزدلی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔

فریڈرک کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اس عورت سے بات کرنے میں پہل نہیں کر سکتا تاوقتیکہ قدرت ہی اسے کوئی موقع فراہم کر دے۔ اب اس نے عورت کی تنہائی کے بارے میں تصوراتی کہانی گھڑنا شروع کر دی۔ کبھی سوچتا کہ اس کا محبوب کوئی حاسد اور خود غرض شخص رہا ہوگا جس نے اسے کسی ہوٹل یا ساحل پر آنے کی دعوت دی ہوگی اور انکار کرنے پر اس سے قطع تعلق کر لیا ہوگا۔ کبھی خیال آتا کہ مردوں سے دور رہنے کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ نوجوانی میں کسی نے اس کے ساتھ دھوکا کیا ہو اور اسے مردوں سے نفرت ہو گئی ہو۔ اس کے بارے میں ایک تصور یہ بھی تھا کہ غالباً اس کے والدین میں علیحدگی ہو گئی ہو اور اسی وجہ سے وہ بھی مردوں سے تعلق قائم کرتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس کرتی ہو۔

تین چار مواقع ملنے کے بعد یہ سلسلہ اچانک ختم ہو گیا اور وہ عورت کافی عرصہ تک نظر نہ آئی۔ وہ روزانہ اس اُمید پر گھر سے نکلتا کہ آج اس سے ضرور ملاقات ہوگی۔ سنیما ہال، بس اسٹاپ، شاپنگ مال، وہ ہر اس جگہ گیا جہاں اس کے ملنے کا امکان ہو سکتا تھا لیکن وہ کہیں نظر نہیں آئی۔ اس طرح تین سال گزر گئے۔ وہ اُمید کا دامن تھامے اس کی تلاش میں بھٹکتا رہا اور ایک دن اس کا سپنا حقیقت میں بدل ہی گیا۔

وہ ایک کپڑوں کی دکان سے باہر آ رہی تھی اور اس کے ہاتھ میں کئی تھیلے تھے جن میں زنانہ کپڑے اور دیگر اشیا رکھی ہوئی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہموار انداز میں چل رہی تھی جیسے کسی اور ہی دنیا کی مخلوق ہو۔ وہ کافی بدلی بدلی نظر آ رہی تھی۔ اس نے اپنے بالوں کو جدید انداز میں سنوارا ہوا تھا جن کی چمک اور نرمی دیکھ کر اسے مندر میں رکھی ہوئی وہ مورتی یاد آ گئی جس کی تصویر اس نے ایک بروشر میں دیکھی تھی۔ اس نے ہمیشہ کی طرح یہ موقع بھی ضائع کر دیا اور سوچنے لگا کہ وہ اس سے کیا کہے گا۔ یہی کہ ان دونوں کا کئی بار آمنا سامنا ہو چکا ہے اور اسی تعلق کو بنیاد بنا کر وہ شناسائی کا دعویٰ کر سکتا ہے لیکن کیا وہ اس طرح اسے بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو سکتا ہے لیکن وقت بڑا بے رحم ہے ہو سکتا ہے کہ آئندہ ملاقات تک بہت دیر ہو چکی ہو اور جب انہیں بات کرنے کا موقع ملے تب تک وہ بہت بوڑھے ہو چکے ہوں لیکن کیا ایسا موقع پھر کبھی مل سکے گا۔ اس کے امکانات تو تھے لیکن ضروری نہیں کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرائے۔

اسی ادھیڑ بن میں یہ موقع بھی ہاتھ سے نکل گیا اور دو سال مزید گزر گئے۔ اب اس عورت سے ملنے کی امید تقریباً ختم ہو چکی تھی، اس کے باوجود وہ کبھی کبھی سوچتا کہ شاید وقت انہیں ایک بار پھر ملا دے اب تک جو کچھ ہوتا رہا اس میں اس کی کم ہمتی اور وسوسوں کے ساتھ ساتھ قسمت کا بھی دخل تھا اگر قسمت ساتھ دیتی تو وہ اس سے بات کرنے میں پہل کر سکتا تھا۔ گو کہ اس نے دوسری بیوی کو طلاق دینے کے بعد دوبارہ شادی کرنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ اس دوران کچھ عورتوں سے مختصر دورانیہ کا تعلق ضرور قائم ہوا لیکن اب وہ جنسی تسکین کے علاوہ ایک ایسے ساتھی کی ضرورت محسوس کر رہا تھا جو اس کی تنہائی دور کر سکے۔ وہ چالیس کا ہو چکا تھا اور وہ عورت بھی تیس بتیس سے کم نہ ہوگی اور اب وہ بھی پہلے کی طرح تر و تازہ اور پُرکشش نہیں رہی ہوگی لیکن وہ ظاہری خوب صورتی سے زیادہ باطنی خوب صورتی کو ترجیح دیتا تھا اور اسے یقین تھا کہ وہ عورت دل کی بہت اچھی ہوگی۔

لہٰذا جب اس نے ایک بار پھر اسے دیکھا تو فوراً ہی فیصلہ کر لیا کہ اب ٹال مٹول کی گنجائش نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ یہ آخری موقع ہو اور اگر اس بار بھی اس نے اسے ضائع کر دیا تو ساری عمر پچھتاتا رہے گا۔ پہلے ہی بہت وقت ضائع ہو چکا تھا اور اس دوران وہ ایک نوخیز کلی سے بھرپور عورت بن چکی تھی۔ اگر وقت اور گزر گیا تو اس کے حسن اور جوانی کا زوال شروع ہو جائے گا۔ وہ عورت ایک عمارت میں داخل ہوئی اور لفٹ کی طرف بڑھی لیکن اس نے اوپر جانے کے لیے سیڑھیوں کا انتخاب کیا۔ اس طرح وہ اسے بہ آسانی تلاش کر سکتا تھا خواہ وہ کسی بھی منزل پر ہوتی۔

وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس امید پر ہر عورت کو غور سے دیکھ رہا تھا کہ جس کی اسے تلاش ہے وہ نظر آ جائے۔ وہ اپنی سانسوں کو سنبھالتا ہوا سب سے اوپری منزل پر پہنچ گیا جو درحقیقت خالی چھت تھی اور وہاں کوئی کمرا یا دفتر نہیں تھا۔ اس کے ذہن میں ایک ہی خیال آیا کہ وہ عورت ضرور عمارت میں واقع دفاتر میں سے کسی میں چلی گئی ہوگی اور ہر دفتر میں جا کر اسے تلاش کرنا بھوسے کے ڈھیر میں سوئی ڈھونڈنے کے مترادف تھا چنانچہ اس نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ واپس گراؤنڈ فلور پر جائے اور داخلی دروازے پر کھڑے ہو کر اس کا انتظار کرے۔ وہ عورت کبھی نہ کبھی تو عمارت سے باہر نکلے گی۔

اگرچہ اسے اپنے بہت سارے کاروباری معاملات نمٹانا تھے لیکن اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ سب کچھ بھلا کر چند گھنٹے اس عورت کے انتظار کے لیے وقف کر سکتا ہے بلکہ ضرورت پڑی تو وہ سارا دن اس کے انتظار میں عمارت کے دروازے پر کھڑا رہے گا لیکن جب وہ نیچے پہنچا تو اسے خیال آیا کہ ممکن ہے وہ عورت اس وقت عمارت سے باہر چلی گئی ہو جب وہ اسے اوپر کی منزلوں میں تلاش کر رہا تھا۔ تاہم اس نے امید کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا اور اس جاسوس کی طرح دروازے پر کھڑے ہو کر عمارت سے باہر نکلنے والی عورتوں کا جائزہ لینے لگا جو پہلے روز اپنی ڈیوٹی پر آیا ہو۔

تقریباً ایک گھنٹا انتظار کرنے کے بعد اس نے چوکیدار سے پوچھا کہ کیا اس عمارت سے باہر نکلنے کا کوئی اور راستہ بھی ہے۔ اس نے بتایا کہ اس عمارت کا ایک دروازہ بغلی سڑک کی جانب بھی کھلتا ہے۔ یہ سن کر اس عورت کو دیکھنے کی امید پل بھر میں پانی کے بلبلے کی طرح فنا ہو گئی اور وہ سوچنے لگا کہ وہ عورت دوسرے دروازے سے بھی باہر جا سکتی ہے اور اب شاید وہ اسے کبھی نہیں دیکھ سکے گا لیکن وہ اتنی جلدی مایوس ہونے والوں میں سے نہیں تھا۔ اس نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ اگر وہ اس عمارت میں داخل ہوئی تھی اور وہ اسے نہیں دیکھ پایا تو اس کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ عورت اس عمارت میں واقع دفاتر میں سے کسی ایک میں کام کرتی ہو اور شام کو چھٹی ہونے پر ہی دفتر سے باہر آئے یا یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کسی کام سے یہاں آئی ہو اور کسی وجہ سے اسے عمارت میں رکنا پڑ گیا ہو۔

فریڈرک نے عمارت کی لابی میں آویزاں بورڈ پر نظر ڈالی جس پر تمام دفاتر کے نام اور کمرا نمبر وغیرہ درج تھا۔ ان میں ہر طرح کے کاروبار اور پیشوں سے تعلق رکھنے والے لوگ موجود تھے۔ جن میں وکیل، ڈاکٹر، دندان ساز، پراپرٹی ڈیلر، ماہر تعمیرات اور ایک دفتر روزگار بھی تھا۔ اس نے سوچا کہ اس عورت کو تلاش کرنے کا کام کہاں سے شروع کرنا چاہیے۔ مشکل یہ تھی کہ وہ اس عورت کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ اسے تو اس کا نام بھی معلوم نہیں تھا اور نام پتا کے بغیر کسی عورت کو اس کے حلیے کی بنیاد پر تلاش کرنا جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔ ماضی میں کئی ایسے مواقع آئے جب وہ تھوڑی سی ہمت کر کے اس کا نام پوچھ سکتا تھا لیکن اس نے اپنی بزدلی کے سبب یہ موقع ضائع کر دیا۔ اب اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ اگر اس کا نام

WWW.PAKSOCIETY.COM

معلوم ہوتا تو وہ عمارت کے تمام دفتروں میں جا کر اس کا پتا کرسکتا تھا ورنہ ٹیلی فون ڈائریکٹری کے ذریعے بھی اس کے بارے میں معلومات حاصل ہوسکتی تھیں لیکن ایک ایسی ہستی کا کھوج لگانا اس جیسے سست شخص کے لیے انتہائی مشکل کام تھا جس کے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ اسے تو ویسے بھی اپنے معمولات سے ہٹ کر کچھ کرنا انتہائی مشکل مرحلہ لگتا تھا۔ یہ سب کچھ سوچنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ کام کوئی پیشہ ور سراغ رساں ہی کرسکتا ہے۔ اس نے سوچا کہ شاید قسمت اس پر مہربان ہوجائے اور وہ عورت ایک بار پھر کسی جگہ اسے نظر آجائے لیکن فوراً ہی اس نے مایوسی کے عالم میں سر ہلا دیا۔ وہ عورت ماضی میں سات یا آٹھ بار اسے مل چکی تھی اور ضروری نہیں تھا کہ ایسا اتفاق آئندہ بھی پیش آتا رہے۔

اس نے اپنی تحقیقات کا آغاز روزگار فراہم کرنے والی ایجنسی سے کیا اور جلد ہی اسے احساس ہوگیا کہ وہ اس عورت کے بارے میں پوچھتے ہوئے خود کتنا احمق اور مشتبہ لگ رہا تھا۔ سب لوگ حیرت سے اپنی گردنیں موڑ کر اس کی جانب دیکھ رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس شخص کی کیا مدد کرسکتے ہیں جو مطلوبہ عورت کا نام تک نہیں جانتا اور صرف حلیہ بتا کر اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہو۔ اس کی بے تکی باتیں سن کر استقبالیہ پر بیٹھی ہوئی لڑکی کو بھی الجھن ہونے لگی اور وہ بے زاری کے عالم میں بولی۔ ”اے مسٹر! تم اپنا اور ہمارا وقت ضائع کر رہے ہو۔ اس طرح وہ لڑکی تمہیں نہیں مل سکتی۔“

فریڈرک نے اس لڑکی کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی اور ہال میں بیٹھی ہوئی لڑکیوں کا جائزہ لینے لگا جو اپنی اپنی میزوں پر بیٹھی سر جھکائے کام میں مصروف تھیں۔ اسے بہت جلد احساس ہوگیا کہ اس طرح وہ واقعی اپنا وقت ضائع کررہا ہے کیونکہ اس دفتر میں کام کرنے والی تمام عورتیں یونیفارم میں ملبوس تھیں جبکہ گزشتہ روز اس نے جس عورت کو عمارت میں داخل ہوتے دیکھا تھا وہ یونیفارم کے بجائے سادہ کپڑے پہنے ہوئے تھی۔

”یہاں روزانہ کئی لوگ ملازمت کی تلاش میں اپنی سی وی اور تصاویر لے کر آتے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ عورت بھی اسی مقصد کے تحت آئی ہو۔“

یہ سنتے ہی فریڈرک کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا اور اس کے دل میں امید کا دیا روشن ہوگیا۔ کیا ہوا اگر اسے اس عورت کا نام معلوم نہیں وہ اس کی تصویر دیکھ کر بھی اسے پہچان سکتا ہے۔ اسے یقین تھا کہ اس عورت کی تصویر زیادہ پرانی نہیں ہوگی کیونکہ دفتر روزگار والے عموماً امیدواروں سے عام طور پر نئی اور تازہ ترین تصویریں مانگتے ہیں چنانچہ اس نے ہمت کرکے پوچھ ہی لیا۔

”کیا میں ایک دن پہلے آنے والی تصویروں اور سی وی کا ریکارڈ دیکھ سکتا ہوں؟“

”مجھے افسوس ہے کہ اس سلسلے میں ہم تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتے کیونکہ یہ معلومات خفیہ ہیں اور کسی غیر متعلقہ شخص کو نہیں دکھائی جاسکتیں۔“

یہ سن کر فریڈرک کا منہ لٹک گیا اور وہ اسی لٹکے ہوئے چہرے کے ساتھ دفتر سے باہر آگیا، اس نے عمارت کے دوسرے دفتروں میں بھی جھانک کر دیکھا۔ خصوصاً وہاں کام کرنے والی خواتین کا بغور جائزہ لیا لیکن گوہر مقصود ہاتھ نہیں آیا۔ اس نے بوجھل دل کے ساتھ محسوس کیا کہ اس طرح وہ اپنا وقت ہی ضائع کررہا ہے، عمارت کے ہر دفتر میں جا کر وہاں کام کرنے والی خواتین کو دیکھنا اور اپنی مطلوبہ عورت کا حلیہ بیان کرکے اس کا کھوج لگانے کی کوشش محض ایک حماقت ہی تھی۔

دن بھر کی مصروفیت سے فارغ ہوکر وہ اپنے بیڈروم میں آرام کرسی پر کمر ٹکائے کھڑکی سے باہر کا نظارہ کررہا تھا۔ اس عورت کو تلاش کرنے کے بارے میں اس کے دماغ میں مختلف ترکیبیں اور خیالات آرہے تھے لیکن ان سب میں اسے کوئی نہ کوئی کمی محسوس ہورہی تھی پھر اچانک ہی ایک خیال نے اس کے ذہن میں جگہ بنانا شروع کی۔ وہ کرسی پر سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔ اسے یاد آیا کہ جب پولیس کسی مشتبہ شخص کو تلاش کررہی ہو تو اس کے حلیہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایک فرضی خاکہ تیار کیا جاتا ہے جس کی مدد سے وہ مشتبہ شخص تک پہنچ جاتی ہے۔ فریڈرک نے بھی اس عورت کو تلاش کرنے کے لیے یہ نسخہ آزمانے کا فیصلہ کرلیا۔

دوسری صبح وہ اپنے معمول کے مطابق کام پر گیا۔ اس کے انداز سے کسی قسم کی بے صبری یا عجلت کا اظہار نہیں ہورہا تھا۔ البتہ کھانے کے وقفہ کے دوران وہ اس ہوٹل میں نہیں گیا جہاں وہ عموماً لنچ کرنے کے لیے جایا کرتا تھا بلکہ اس کے بجائے اس نے پارک کا رخ کیا جہاں گلیوں میں پھرنے والے مصور موجود ہوتے ہیں جو وہاں سے گزرنے والے راہ گیروں یا پارک میں سیر و تفریح کے لیے آنے والوں کے خاکے بنانے میں ماہر تھے۔ فریڈرک کی نظر ایک لمبے بالوں والے نوجوان آرٹسٹ پر گئی جو کوئلہ کی مدد سے ایک درخت کے تنے پر کوئی ڈرائنگ بنا رہا تھا۔ فریڈرک کو وہ لڑکا اس کام کے لیے بہت موزوں نظر آیا۔ وہ اس نوجوان مصور کے پاس گیا اور اسے بتایا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اس نوجوان مصور نے اپنے سر کے لمبے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا کہ یہ تھوڑا سا پیچیدہ کام ہے لیکن وہ یہ خاکہ بنانے کی کوشش ضرور کرے گا۔

فریڈرک کو اس پراسرار عورت کی تصویر بنانے کے لیے کچھ رقم بہ طور ایڈوانس دینا پڑی اور اس کے بعد آدھے گھنٹے تک وہ اس عورت کے دلکش نقش و نگار کو ذہن کے پردے پر لانے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ چاہ رہا تھا کہ آرٹسٹ کو اس کی شکل و صورت کے بارے میں تفصیل سے آگاہ کرے تاکہ کہیں کوئی کسر نہ رہ جائے۔ اس دوران وہ مصور فریڈرک کے بتائے ہوئے حلیہ کے مطابق خاکہ میں تبدیلیاں کرتا رہا اور جب فریڈرک خاموش ہوا تو نوجوان مصور نے اس کے سامنے اپنی بنائی ہوئی تصویر رکھ دی جو تھوڑی بہت اس عورت سے مل رہی تھی۔ فریڈرک کے پاس اس تصویر کو قبول کرنے کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا۔ وہ مصور کو مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتا تھا کیونکہ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اس عورت کا صحیح حلیہ بیان نہ کرسکا ہو بہرحال کچھ نہ ہونے سے بہتر تھا کہ وہ اس خاکے کی مدد سے اس عورت کو تلاش کرنے کی کوشش کرے۔ وہ مصور کا دل توڑنا نہیں چاہتا تھا لہٰذا اس کی حوصلہ افزائی کے لیے بول پڑا۔ ”تم ایک اچھے فنکار ہو اگر سنجیدگی سے کام کرو تو اچھے خاصے پیسے کما سکتے ہو۔“

”تم پہلے شخص ہو جس نے میرے کام کی تعریف کی ہے۔“ مصور آہ بھرتے ہوئے بولا۔ ”ورنہ لوگ تو منٹوں میں ڈیل کرکے چلے جاتے ہیں۔ میرا قصور صرف یہ ہے کہ عالیشان اسٹوڈیو کے بجائے فٹ پاتھ پر بیٹھ کر تصویریں بناتا ہوں۔ ویسے بائی دی وے۔ پوچھ سکتا ہوں کہ یہ عورت گم ہوگئی ہے یا اس دنیا سے جاچکی ہے۔“

”تمہارے دونوں اندازے غلط ہیں۔“ وہ ایک اداس مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”یہ عورت زندہ ہے اور کبھی کبھار مجھے نظر بھی آجاتی ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ اس سے ایک جذباتی تعلق قائم ہوگیا ہے۔ اسی لیے یہ تصویر بنوائی ہے تاکہ اس کا چہرہ ہر وقت میری نظروں کے سامنے رہے۔“

یہ کہہ کر اس نے تصویر بغل میں دبائی اور اپنے کام پر روانہ ہوگیا۔ اس روز وہ دفتر سے جلدی اٹھ گیا۔ اس نے

دنیا کے کسی بھی گوشے میں، اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 8,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 7,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کردیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہوسکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35895313 فیکس: 35802551

WWW.PAKSOCIETY.COM

سیدھا اس عمارت کا رخ کیا جس میں وہ عورت داخل ہوئی تھی۔ وہ اس عمارت کے ہر کمرے میں گیا اور وہاں موجود لوگوں کو وہ تصویر دکھا کر بس ایک ہی سوال پوچھتا رہا کہ کیا ان میں سے کسی نے اس عورت کو دیکھا ہے لیکن کوئی بھی اس کا صحیح جواب نہ دے سکا۔ کچھ لوگوں نے تو اس کے سوال کا جواب دینا بھی گوارہ نہ کیا اور منہ پھیر کر چل دیے۔ اس نے اپنی خجالت مٹانے کے لیے سوچا کہ شاید وہ لوگ اسے پولیس والا سمجھ رہے ہوں گے۔ اس سے کنی کترا گئے کیونکہ عام طور پر لوگ پولیس والوں سے دور رہنا ہی پسند کرتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے مشتبہ انداز میں سر ہلایا جیسے کہہ رہے ہوں کہ انہوں نے اس عورت کو دیکھا ضرور ہے لیکن اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ انہیں معلوم نہیں کہ وہ عورت کون ہے اور کہاں کام کرتی ہے۔ یہاں تک کہ عمارت کے مرکزی دروازے پر کھڑا ہوا دربان اور صفائی کرنے والا عملہ بھی اس عورت کے بارے میں کوئی اطلاع نہ دے سکا۔ کہا، اگر کوئی تصویر ہوتی تو اسے بہ آسانی شناخت کیا جا سکتا تھا۔ فریڈرک نے اس اسکیچ کو کئی بار غور سے دیکھا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ان لوگوں کا خیال درست تھا۔ اس نے یہ خاکہ اپنے ذہن میں نقش اس عورت کے خدوخال بیان کر کے بنوایا تھا۔ ضروری نہیں کہ اس عورت کی شکل اس خاکہ سے مطابقت رکھتی ہو، یہ کسی اور کا بھی چہرہ ہو سکتا تھا۔

اس کوشش میں ناکامی کے باوجود وہ دلبرداشتہ نہیں ہوا۔ اسے اب بھی اُمید تھی کہ شاید کوئی شخص یہ خاکہ دیکھنے کے بعد اس عورت کے بارے میں کچھ بتا سکے۔ ممکن ہے کہ قسمت یاوری کرے اور وہ عورت ایک بار پھر اس کے سامنے آجائے۔ اس خیال کے آتے ہی اس کا عزم اور پختہ ہو گیا کہ اب وہ کسی قیمت پر بھی اس موقع کو ضائع نہیں کرے گا۔

اس نے اسکیچ کی پلاسٹک کوٹنگ کروالی تاکہ خراب ہونے سے محفوظ رہے۔ اب وہ جہاں بھی جاتا تو ضروری کاغذات کے ساتھ وہ خاکہ بھی اس کی فائل میں موجود ہوتا۔ وہ کاروبار کے سلسلے میں جس شخص سے ملتا تو اسے وہ خاکہ ضرور دکھاتا اور ساتھ ہی وہ مخصوص جملہ بھی اس کی زبان سے پھسل جاتا کہ کیا تم نے اس عورت کو کہیں دیکھا ہے یا اس کے بارے میں کچھ جانتے ہو۔ وہ ان لوگوں سے یہی کہتا کہ یہ عورت اس کی دور پرے کی رشتے دار ہے جو کچھ عرصہ پہلے اچانک غائب ہو گئی تھی۔ اس کی تلاش کے لیے تمام ممکنہ ذرائع استعمال کیے گئے لیکن اس کا کوئی پتا نہیں چل سکا۔ اس کے باوجود خاندان والوں نے اپنی کوشش ترک نہیں کیں اور ہر فرد اپنے طور پر اسے ڈھونڈ رہا ہے۔ اس کے کاروباری دوستوں کا بھی یہی کہنا تھا کہ اگر اسکیچ کے بجائے اس عورت کی کوئی تصویر ہوتی تو زیادہ بہتر تھا بلکہ انہوں نے اس بات پر بھی تعجب کا اظہار کیا کہ خاندان میں کسی بھی فرد کے پاس اس عورت کی تصویر نہیں ہے۔

کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ اس نے یہ سوال ایک سے زیادہ مرتبہ لوگوں کے سامنے دہرایا تو انہیں اس کی دماغی حالت پر شبہ ہونے لگا اور اس کی وجہ سے اسے دوستوں کی محفل میں مذاق کا نشانہ بھی بننا پڑ گیا، کئی لوگوں نے اسے سمجھایا کہ وہ بلاوجہ اپنا وقت اور توانائی ضائع کر رہا ہے اگر وہ عورت اس شہر میں ہوتی تو پہلے کی طرح اسے ایک بار پھر نظر آسکتی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ یہ شہر چھوڑ کر چلی گئی ہے یا پھر اس دنیا میں ہی نہیں ہے۔

ان باتوں کا فریڈرک پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے اپنی تلاش جاری رکھی پھر ایک سودے میں اسے کچھ فالتو پیسے ہاتھ آئے تو اس نے تمام بڑے اخبارات میں تلاش گمشدہ کا اشتہار دینے کا فیصلہ کیا۔ جس کا مضمون کچھ یوں تھا کہ اگر کسی شخص کو اس عورت کے بارے میں علم ہو تو وہ فون پر اس سے رابطہ کر سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اسکیچ بھی اشاعت کے لیے دے دیا۔ اس نے رابطہ کے لیے دفتر کا فون نمبر دیا اور اپنی کرسی سے چپک کر بیٹھ گیا۔ اس طرح اس کے کام کا حرج ہونے لگا کیونکہ اسے اپنے کاروبار کے سلسلے میں مختلف پارٹیوں سے ملنا ہوتا تھا لیکن وہ ایک سیکنڈ کے لیے بھی دفتر سے باہر قدم نہ نکالتا۔ کہیں اس کی غیر موجودگی میں اس عورت کے بارے میں فون پر کوئی اطلاع نہ آجائے۔

ان اشتہارات کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اسے دن بھر میں بے شمار فون آنے لگے لیکن وہ سب جھوٹے اور مسخرے لوگ تھے جو فون پر اس کی بے چینی اور بے تابی سے لطف اندوز ہو رہے تھے، چند ایک نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اگر وہ کچھ رقم بہ طور ایڈوانس دینے کے لیے تیار ہو تو وہ اس عورت کے بارے میں مفید معلومات فراہم کر سکتے ہیں لیکن فریڈرک نے ایسی باتوں پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ کچھ لوگوں نے اسے مختلف پتے لکھوائے اور بڑے وثوق سے کہا کہ وہ عورت ان جگہوں پر مل سکتی ہے اس بار وہ بھی دھوکا کھا گیا اور جذبات میں آکر ان تمام گھروں پر دستک دے ڈالی جن کا پتا ٹیلی فون پر بتایا گیا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایک جگہ اس کا واسطہ ایک نیم پاگل عورت سے پڑ گیا جو دعویٰ کر رہی تھی کہ فریڈرک کے پاس اسی عورت کی تصویر ہے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کوئی ایجنٹ ہے جو کسی تھیٹر ڈرامے میں کام کرنے کے لیے اسے کاسٹ کرنے آیا ہے۔ کچھ لوگوں نے اسے بتایا کہ انہوں نے فلاں جگہ ایسی عورت دیکھی ہے جس کی شکل اس اسکیچ سے ملتی جلتی ہے۔ فریڈرک کو ان لوگوں کے خلوص پر کوئی شک نہیں ہوا۔ وہ اسے ایک اہم آدمی سمجھ رہے تھے جو ایک لاپتا عورت کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ ایک موہوم اُمید کے سہارے وہ ان تمام جگہوں پر گیا جس کی نشاندہی ان لوگوں نے کی تھی لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ جس عورت کی اسے تلاش تھی، وہ کہیں نہیں ملی اور وہ خاکہ بے کار ثابت ہوا۔ وہ اس عورت کی تلاش میں اپنا بہت سا وقت اور پیسا ضائع کر چکا تھا لیکن اس کی تمام کوششیں رائگاں چلی گئیں۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ وہ ہر روز اس امید پر گھر سے باہر نکلتا کہ شاید وہ عورت اسے نظر آجائے لیکن اسے ناامیدی اور مایوسی کے عالم میں گھر واپس آنا پڑتا۔ رفتہ رفتہ وہ اپنے دل کو سمجھانے میں کامیاب ہو گیا کہ اب وہ عورت اسے کبھی نہیں ملے گی۔ اس نے ماضی میں کئی مواقع ضائع کردیے لیکن اب اس نے ذہنی طور پر اپنے آپ کو تیار کرلیا تھا کہ اگر اسے ایک موقع اور مل گیا تو وہ اس سے بات کرنے میں ضرور پہل کرے گا لیکن تقدیر اس سے روٹھ چکی تھی اس لیے وہ موقع اسے نہ مل سکا۔ اس نے بڑی محنت اور لگن سے اس عورت کا جو خاکہ تیار کروایا تھا۔ اب وہ اس کے لیے بے کار ہو چکا تھا لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اسے پھاڑ سکے یا ضائع کردے۔ اس نے وہ خاکہ دراز میں رکھ دیا اور سوچ لیا کہ اب اس عورت سے ملنے یا کوئی رشتہ استوار کرنے کا امکان باقی نہیں رہا۔

وہ اپنی طرف سے یہ باب ختم کر چکا تھا لیکن تقدیر اسے ایک آخری موقع دینے والی تھی جس کے بارے میں وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے نئی کار خریدی اور جب وہ سہ پہر میں ایک مصروف سڑک سے گزر رہا تھا کہ اس کی گاڑی کے بریک فیل ہو گئے۔ بارش ہو رہی تھی اور سامنے کا منظر صاف نہیں تھا۔ اس کی گاڑی نے پھسلنا شروع کیا اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھل پاتا۔ ایک چھوٹی کار لہراتی ہوئی اپنی لین سے نکل کر اس کے بالکل سامنے آگئی۔ اس نے دونوں گاڑیوں کے ٹکرانے کی آواز سنی۔ چھوٹی کار نے دائیں جانب سے اس کی گاڑی کو ٹکر ماری اور وہ لٹو کی طرح گھوم گئی۔ اس ٹکر کے نتیجے میں وہ زخمی ہو گیا اور اسے یوں لگا کہ شاید وہ زندہ نہیں بچے گا۔ اس نے بہ مشکل تمام آنکھیں کھول کر اپنا جائزہ لیا۔ اس کی سیٹ بیلٹ ابھی تک بندھی ہوئی تھی۔ اس نے ایک بار پھر آنکھیں بند کرلیں اور صورت حال پر غور کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ اسے محسوس ہونے لگا کہ حادثے کے نتیجے میں لگنے والے زخم معمولی نوعیت کے تھے اور اس کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اب اسے انتظار تھا کہ کوئی شخص آکر گاڑی سے اسے باہر نکالے۔

تھوڑی ہی دیر بعد اس کے کانوں میں ایمبولینس کے سائرن کی آواز سنائی دی جو تیزی سے جائے حادثہ کی طرف چلی آرہی تھی۔ وہ کچھ دیر یونہی بے حس و حرکت بیٹھا رہا پھر کسی نے اسے گاڑی سے باہر نکالا۔ اس نے دیکھا کہ امدادی عملہ چھوٹی کار کے مسافروں کو اسٹریچر پر ڈال کر ایمبولینس کی طرف جا رہا تھا جبکہ کار پچک کر دھات کے ناکارہ ڈھیر میں تبدیل ہو گئی تھی۔ جب اسٹریچر اس کے پاس سے گزرا تو بجلی بڑے زور سے کڑکی اور اس کی روشنی میں اسے اسٹریچر پر لیٹی ہوئی عورت کا چہرہ صاف نظر آگیا۔ یہ وہی عورت تھی جس کی تلاش میں وہ برسوں سے بھٹک رہا تھا اور جس کے دوبارہ ملنے کے امکانات بالکل ختم ہو گئے تھے۔ وہ تیزی سے اسٹریچر کی طرف بڑھا جسے ایمبولینس میں رکھا جا رہا تھا۔ اس کی بے تابی امدادی عملہ سے چھپی نہ رہ سکی اور ان میں سے ایک نے پوچھ ہی لیا کہ کیا وہ اس عورت کو جانتا ہے تو اس نے سر ہلا کر تصدیق کردی۔

''وہ اور اس کا ساتھی دونوں ہی اس حادثے میں ہلاک ہو چکے ہیں۔'' اس نے ایمبولینس کا پچھلا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

مجمع میں سے دو پولیس والے برآمد ہوئے اور انہوں نے اسے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔

گو کہ وہ زخمی تھا اور ابھی تک اس حادثے سے سنبھل نہیں پایا تھا، اس کے باوجود وہ خاموشی سے ان کے ساتھ چل دیا۔ سارے راستے وہ یہی سوچتا رہا کہ اگر وہ ماضی میں ملنے والے مواقع سے فائدہ اٹھا لیتا تو اسے آخری موقع کا انتظار نہ کرنا پڑتا۔ تقدیر نے اس کے ساتھ کیسا مذاق کیا تھا کہ آخری موقع ملا بھی تو کس انداز میں۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور سر جھکا دیا۔ اس کی تلاش ختم ہو چکی تھی۔

محیطِ عالم

ضیا تسنیم بلگرامی

محبت روپ بدل بدل کر انسانوں کے دلوں میں اترتی ہے اور جہاں قیام پذیر ہوجائے وہاں حالت ہی بدل جاتی ہے اور اگر... خالق و مخلوق کے درمیان یہ تعلق قائم ہوجائے تو عام انسان بھی خاص بن جاتا ہے اور... اس عام انسان نے بھی جب محبت کے تمام تر تقاضے نباہے تو ولی کا مرتبہ اس کا مقدر بن گیا۔

عشقِ حقیقی کا سحر انگیز احوال

مرو کے ایک کھاتے پیتے گھرانے میں عبداللہ نے ہوش سنبھالا تھا۔ ان کے باپ کا نام مبارک تھا۔ عبداللہ نے مروجہ علوم حاصل کیے لیکن مزاج میں استغنا اور بے نیازی اتنی زیادہ تھی کہ مادی اور علمی دولتوں کی حصولیابی نے ان کے دل و دماغ پر کوئی ناقص اثر نہیں ڈالا۔ وہ اپنے آپ کو نہ تو دولت مند کہلانے میں فخر محسوس کرتے تھے اور نہ ہی ایک نمایاں علمی شخصیت ہونے کا کوئی گھمنڈ تھا۔ معلوم نہیں، قدرت کا یہ کون سا اصول ہے کہ خدا جنہیں محبوب رکھتا ہے انہیں ان کے باپ کے سایے

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے بچپن ہی میں محروم کر دیتا ہے۔ عبداللہ کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا۔ باپ کی عدم موجودگی میں ماں نے دونوں ذمے داریاں قبول کر لیں۔ ماں کا خیال تھا کہ ان کا بیٹا عبداللہ جب بڑا ہو جائے گا تو انہیں بڑی بے فکر ہو جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بیٹے کے مشاغل اور روزمرہ کے معمولات ایسے نہیں تھے کہ انہیں محسوس ہی نہ کریں۔ صبح، دوپہر، شام اور رات، عبداللہ کے لیے وقتوں کا یہ پیمانہ ایسا نہیں تھا کہ انسان ان کی ناپ تول میں اپنی عمر گزار دے۔ عبداللہ کسی وقت بھی گھر سے دور کسی ویرانے میں پہنچ سکتے تھے۔ ماں حیرت اور افسوس سے سوچتیں کہ ان کا بیٹا عبداللہ مستقبل میں معلوم نہیں کیا کرے گا؟

اس دن فجر کی نماز پڑھ کر عبداللہ نے گھر سے جو قدم نکالا تو دوپہر تک اس کا کوئی پتا نہ چلا۔ ماں بدحواس ہو گئیں اور انہوں نے عبداللہ کی تلاش میں کئی آدمی چھوڑ دیے۔ دوپہر تک عبداللہ کی کوئی خبر نہ ملی لیکن دوپہر کے بعد ایک دیہاتی بھاگا بھاگا عبداللہ کی ماں کے پاس پہنچا اور اپنی دانست میں ایک عجیب و غریب خبر سنائی۔

''اماں! آپ کا بیٹا خطرے میں ہے۔ میرے ساتھ آیئے اور سوچ سمجھ کر فیصلہ کیجیے کہ ان حالات میں آپ اس کی کیا مدد کر سکتی ہیں۔''

ماں کا دل دھک دھک کرنے لگا، گھبرا کے پوچھا۔ ''آخر میرا بیٹا عبداللہ کہاں ہے؟ وہ کس مصیبت میں مبتلا ہے؟ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔''

دیہاتی نے جواب دیا۔ ''میں کچھ بتانے کے بجائے دکھا دینا چاہتا ہوں، آپ میرے ساتھ تو آیئے۔''

پریشان حال اور حواس باختہ ماں دیہاتی کے پیچھے پیچھے چلنے لگیں، وہ انہیں ایک باغ میں لے گیا۔ وہاں گلاب کے ایک کنج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ذرا اس کنج میں جا کر دیکھیے، آپ کا بیٹا کس حال میں ہے؟''

ماں گھبرائی ہوئی گلابوں کے کنج میں داخل ہوئیں تو انہیں ایک ہوشربا منظر دکھائی دیا۔ ان کا بیٹا اس کنج میں بے خبر سویا ہوا تھا اور پاس ایک طرف پھن اٹھائے ہوئے ایک سانپ بیٹھا تھا۔ عام حالات میں شاید ماں کی ایک خوفناک چیخ نکل جاتی لیکن انہیں دیہاتی کا مشورہ یاد تھا کہ آپ کا بیٹا خطرے میں ہے ذرا سوچ سمجھ کر فیصلہ کیجیے کہ ان حالات میں آپ اس کی کیا مدد کر سکتی ہیں؟ وہ کچھ دیر مبہوت کھڑی یہ خوفناک منظر دیکھتی رہیں۔ عبداللہ کے منہ پر شہد کی مکھیاں بیٹھنے لگیں، ماں گھبرائیں کہ کہیں یہ مکھیاں عبداللہ کو کاٹ نہ لیں، وہ مکھیاں اڑانے کی کوئی ترکیب ابھی سوچ بھی نہ سکی تھیں کہ سانپ نے پودے کی ایک لمبی شاخ لے کر عبداللہ کے منہ پر حرکت دی، مکھیاں اڑ گئیں، ماں کو اطمینان ہو گیا۔

دیہاتی نے پوچھا۔ ''اس موذی سے نجات دلانے کی کیا ترکیب سوچی آپ نے؟''

ماں نے جواب دیا۔ ''کوئی ترکیب نہیں، کیونکہ جس سانپ کو تم موذی سمجھ رہے ہو یہ موذی نہیں ہے، میرے بیٹے کا محافظ ہے۔ کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ ابھی ابھی شہد کی مکھیوں کو میرے بیٹے کے چہرے پر سے اس سانپ نے اڑایا ہے۔''

دیہاتی سمجھا، ماں کو اپنے بیٹے کی طرف سے غضب کا اعتماد ملا ہے، اس نے اپنی راہ لی۔ ماں دیر تک بیٹے کی بیداری کی منتظر رہیں۔

کافی دیر کے بعد عبداللہ کی آنکھ کھلی تو وہ فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ گئے۔ سانپ نے اپنی راہ لی، لیکن اس سانپ کو عبداللہ نہیں دیکھ سکے۔ وہ اٹھ کر کنج سے باہر آئے تو سامنے ماں کو کھڑا دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔ ''ماں! آپ یہاں کہاں؟ خیریت تو ہے؟''

ماں نے پورا قصہ سنا دیا، بولیں۔ ''میں تو خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی لیکن جب میں نے یہ عجیب منظر دیکھا کہ وہ تیرے چہرے سے شہد کی مکھیاں اڑا رہا ہے تو میں مطمئن ہو گئی۔''

عبداللہ نے کہا۔ ''لیکن ماں، میں نے تو اس سانپ کو دیکھا نہیں!''

ماں نے کہا۔ ''اسے تو کیسے دیکھتا کیونکہ وہ تیرے بیدار ہوتے ہی کہیں چلا گیا۔''

دونوں گھر چلے آئے لیکن ماں کو اپنے بیٹے کی عظمت کا علم ہو چکا تھا۔

☆☆☆

عبداللہ نے جوانی کی حد میں قدم رکھا لیکن ابھی تک عبداللہ کے اعمال اور اشغال میں کوئی ایسی بات نہیں ملتی تھی جس سے ان کی عظمت اور بزرگی کا کوئی اندازہ لگایا جا سکتا۔

آپ کے پڑوس میں ایک انتہائی دولت مند شخص رہتا تھا۔ اسے عورتوں کا بڑا شوق تھا۔ کئی حسین بیویوں کے ساتھ ہی منتخب کنیزیں بھی گھر میں رکھ چھوڑی تھیں۔ اپنی نیکی اور اعلیٰ وقری کی وجہ سے عبداللہ کا اس گھر میں آنا جانا رہتا تھا۔ کنیزیں عبداللہ کے سامنے آتی تھیں۔ انہیں ایک کنیز بہت اچھی لگی۔ یہ جب تک کنیزوں میں رہتے، یہی کنیز ان کی توجہ کا مرکز بنی رہتی وہ بات کسی سے بھی کرتے لیکن دھیان اسی کنیز کی طرف رہتا۔ وہ گھر آتے تو خیال میں بھی یہی کنیز ہنستی مسکراتی رہتی۔ خوابوں میں بھی اس کا عمل دخل رہتا۔ یہ ہمہ وقتی دھیان آہستہ آہستہ شدید عشق کی صورت اختیار کر گیا۔ انہوں نے کئی بار یہ ارادہ کیا کہ اس کے روبرو اپنی محبت کا اظہار کر دیں۔ لیکن یہ سوچ کر باز رہے کہ اگر کنیز کے مالک نے ان کی یہ بات سن لی تو اپنے گھر میں ان کا داخلہ بند کر دے گا۔ وہ ایک عرصے تک عشق کی اس خاموش آگ میں سلگتے جھلستے رہے۔

کنیزوں کا مالک اپنے کسی کام سے شہر سے باہر چلا گیا، عبداللہ کے نفس نے سرکشی اختیار کی اور انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے دو ڈھائی سالہ عشق کا اپنی محبوبہ کے روبرو اظہار ضرور کر دیں گے۔ انہیں اس سے کیا کچھ کہنا ہے، اس کی تفصیلات پر غور کرتے ہوئے جب یہ اپنی محبوبہ کے سامنے پہنچے تو زبان گنگ ہو گئی اور منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ یہ دیر تک اس کے سامنے کھڑے اس کی صورت دیکھتے رہے۔ کنیز نے گھبرا کر پوچھا۔ ''کیا بات ہے عبداللہ؟ آج تمہاری آنکھوں میں کسی... جذبے کی شدت کیوں پائی جاتی ہے۔ تم خاموش کیوں ہو؟ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہو؟''

عبداللہ چور سے بن گئے، ایسے چور جس کو چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا گیا ہو، گھبرا کے سر جھکا لیا، بولے۔ ''نہیں، میں تم سے کچھ بھی نہیں کہنا چاہتا۔''

کنیز نے ہنس کر کہا۔ ''عبداللہ! ایک عورت ہوں اور میں مردوں اور نوجوان کے دل کی بات ان کے چہروں سے معلوم کر لیا کرتی ہوں۔ میں تمہارے اندرونی طوفان سے اچھی طرح آگاہ ہوں لیکن میں یہ بھی چاہتی ہوں کہ تم سب کچھ صاف صاف اپنی زبان سے بتا دو۔ اگر نہیں بتاؤ گے تو پچھتاؤ گے۔''

عبداللہ کے جی میں آئی کہ جب یہ عورت ان کے دل کی بے چینی کو محسوس کر ہی چکی ہے تو اسے چھپانے سے فائدہ؟

کنیز نے ہنس کر کچوکا لگایا۔ ''عبداللہ! نوجوانی اور احتیاط! اسے میں پاگل پن سمجھتی ہوں۔''

عبداللہ نے ذرا اٹک اٹک کر کہا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ اس گھر میں، میں اپنا اعتبار کھو دوں!''

''میں یہ کب کہتی ہوں کہ تم اس گھر میں اپنا اعتبار کھو دو، لیکن میں اس تحمل اور ضبط کی بھی قائل نہیں جس کا تمہاری طرف سے خواہ مخواہ اظہار ہو رہا ہے۔''

عبداللہ نے کہا۔ ''تب پھر میں، جو کچھ میرے دل میں ہے صاف صاف کہہ دوں؟''

کنیز نے کہا۔ ''آخر کتنی بار اس کی اجازت دوں؟''

عبداللہ نے کسی قدر پس و پیش سے کہا۔ ''معلوم نہیں کیا بات ہے کہ سوتے جاگتے، کھاتے پیتے، چلتے پھرتے اگر کسی کا تصور قائم رہتا ہے تو وہ تم ہو۔ تمہاری صورت، تمہاری شبیہ ہے۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ اس عارضے کو دوسرے کیا کہیں گے۔''

کنیز نے ہنس کر جواب دیا۔ ''دوسرے ان جذبات کو محبت کہتے ہیں۔ اس کا ایک نام عشق بھی ہے۔'' پھر کسی خیال میں ڈوب کر بے خیالی میں کہا۔ ''تو تم مجھ سے محبت کرنے لگے ہو! خوب!''

عبداللہ نے گھبرا کر کہا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہی ہو کہ میں محبت کرنے لگا ہوں، خود میں نے تو ایسی بات نہیں کہی۔''

کنیز نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تم خوفزدہ کیوں ہو؟ دل کا معاملہ تو ایسا ہے کہ اس پر کسی کا بس ہی نہیں چلتا۔''

عبداللہ نے اٹک اٹک کر کہا۔ ''معلوم نہیں یہ کیسی آگ ہے جو سینے میں ہر وقت فروزاں رہتی ہے۔''

کنیز نے شوخی سے کہا۔ ''اگر تم یہ چاہو کہ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمہاری ہو جاؤں تو اس کے لیے تمہیں اپنے دماغ کو بھی کام میں لانا پڑے گا۔''

عبداللہ نے جلدی پوچھا۔ ''کیا اگر میں خواہش کروں تو تم واقعی میرے ساتھ اور پاس رہنے پر آمادہ ہو جاؤ گی؟''

کنیز نے اسی شوخی سے جواب دیا۔ ''تم زبان تو کھولو اپنی، پھر دیکھو کہ تمہارے لیے کیا کچھ ہو سکتا ہے!''

''اور تم اپنے آقا کو کیا جواب دو گی؟''

''یہ میرا اپنا معاملہ ہے، میں اس سے کیا کہوں گی اور اسے تمہارے لیے کس طرح آمادہ اور راضی کروں گی، یہ میرا

WWW.PAKSOCIETY.COM

مسئلہ ہے۔ تم اس میں اپنا سر کیوں کھپاؤ۔"

عبداللہ چپ ہوگئے۔

عبداللہ کو بہت جلد احساس ہوگیا کہ دوسری کنیزیں ان کی نگرانی کرنے لگی ہیں۔ اس کی تائید ان کی محبوبہ نے بھی کی، اس نے کہا۔ "عبداللہ! ذرا احتیاط سے کام لو، دوسری کنیزیں کوشش کرتی ہیں کہ وہ کسی طرح ہم دونوں کی باتیں سن لیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ اپنے مالک کے لیے جاسوسی کا فرض انجام دے رہی ہیں۔"

عبداللہ کے ہوش و حواس ہی جاتے رہے، کہا۔ "اپنے اس حشر سے میں پہلے ہی واقف ہوگیا تھا۔ لیکن لاکھ کوششوں کے باوجود تیری یاد کو اپنے دل سے نہیں نکال سکا۔ اب تو ہی بتا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

کنیز نے بے بسی سے جواب دیا۔ "میں کیا بتاؤں، میری عقل کام ہی نہیں کر رہی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔"

عبداللہ نے ذرا خفگی سے کہا۔ "میں تو پہلے ہی یہ کہتا تھا کہ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے جتنا ہم دونوں سمجھ بیٹھے ہیں۔ لیکن تو یہ کہہ کر ٹال دیا کرتی تھی کہ یہ میرا اپنا معاملہ ہے میں کیوں فکر کروں۔ اب تو اپنے اس معاملے کو کس طرح انجام کو پہنچائے گی، ذرا میں بھی تو سنوں؟"

کنیز نے افسوس سے جواب دیا۔ "میں تم سے ایک درخواست کر رہی ہوں، خدارا اس پر عمل ضرور کرنا۔"

"کون سی، کیسی درخواست؟"

کنیز نے جواب دیا۔ "میں چاہتی ہوں، تم چند دن میرے پاس بالکل نہ آؤ۔ میں تمہاری عدم موجودگی میں یہ دیکھنا چاہتی ہوں کہ گھر کی دوسری کنیزیں ہم دونوں کی نسبت سے کیسی باتیں کرتی ہیں۔ ان باتوں کی روشنی میں ہم دونوں کوئی قدم اٹھائیں گے۔"

عبداللہ نے کنیز کی بات مان لی اور گھر میں اعتکاف اختیار کیا۔ کئی دن گزر گئے لیکن عبداللہ کنیز کے پاس نہیں گئے۔ ان کا خیال تھا کہ کنیز کے سینے میں جو آتش فرقت بھڑک رہی ہے اس کی تپش اور سوزش اسے مستقل بے قرار رکھے گی اور وہ انہیں بلانے پر مجبور ہوجائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا، کنیز بالکل خاموش رہی۔ یہاں تک کہ ایک دن عبداللہ خود ہی اس بات پر آمادہ ہوگئے کہ کنیز انہیں بلائے یا نہ بلائے، وہ بغیر بلائے ہی اس کے پاس چلے جائیں گے۔ چنانچہ ایک دن علی الصباح یہ اس کنیز کے پاس پہنچ گئے۔ کنیز کو معلوم نہیں کس طرح، عبداللہ کی آمد کا علم ہوگیا تھا، اس نے انہیں دروازے ہی پر روک لیا، گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "عبداللہ! اب بات حد سے آگے نکل گئی ہے۔ ان نازک حالات میں اگر میں تمہارا ساتھ دیتی ہوں تو مجھے ہر وقت دو خوف ستائے رہیں گے۔ ایک خوف تو یہ کہ میرا آقا یہ پسند ہی کیوں کرنے لگا کہ تم اپنی ناپاک خواہشات کے ساتھ اس کے گھر میں آؤ جاؤ۔ جس دن بھی اسے یہ بات معلوم ہوگئی وہ ہم دونوں کو ذلیل اور رسوا کر ڈالے گا اور دوسرا خوف یہ ہے کہ تمہاری ماں مجھے قبول ہی کیوں کرے گی؟"

عبداللہ نے جواب دیا۔ "میں اپنی ماں کو آمادہ کرلوں گا، تو کیوں فکر کرے۔"

کنیز نے پریشانی سے کہا۔ "تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟ میرا آقا بس آنے ہی والا ہے۔ تم خدا کے لیے یہاں سے چلے جاؤ اور اس وقت تک یہاں نہ آنا جب تک میں خود تمہیں نہ بلا بھیجوں!"

کنیز نے عبداللہ کے جواب کا بھی انتظار نہ کیا، انہیں دھکا دے کر باہر کردیا اور اندر سے دروازہ بند کرلیا۔ کنیز کی اس روش بے رخی نے عبداللہ کے دل پر آرے سے چلا دیے تھے۔ ان پر غیرت نے حملہ کردیا اور وہ گھنٹوں اپنی ذلت پر آنسو بہاتے رہے۔

اس رات جب یہ بستر پر گئے تو آدھی رات کے بعد انہیں ایسا محسوس ہوا گویا بستر انہیں دھکا دے کر حکم دے رہا ہے کہ چل نکل، کوئے یار کا رخ کر۔ انہوں نے بستر چھوڑ دیا اور پڑوسی کے مکان کے سامنے کھڑے ہوکر کنیز کی ایک جھلک، دید کا انتظار کرنے لگے۔

رات بالکل تاریک تھی۔ کنیز کا مکان سیاہی کی چادر میں لپٹا خاموش کھڑا تھا۔ مکان کے کسی روزن سے ہلکی ہلکی روشنی چھن رہی تھی۔ ان کے سینے میں بھی ایک آگ روشن تھی، اس کی گرمی کے سہارے یہ ایک درخت سے پشت لگا کر کھڑے

ہوگئے اور کنیز کے تصور میں مگن، مکان پر ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگے۔ اس وقت ان کے دل سے ہوک سی اٹھ رہی تھی اور انہیں کچھ پتا نہ تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور اس کام میں ان کے لیے عزت ہے یا ذلت۔ اسی طرح پوری رات گزار دی، صبح موذن نے اذان کہی تو انہیں ذرا ہوش آیا۔

ماں کئی بار خالی بستر دیکھ کر واپس جا چکی تھیں۔ انہیں حیرت اور پریشانی تھی کہ عبداللہ کچھ بتائے بغیر آخر چلے کہاں گئے؟ فجر کے وقت بیٹے کو گھر میں داخل ہوتے جو دیکھا تو ماں نے انہیں آغوش میں لے لیا اور مضطرب لہجے میں دریافت کیا۔

"بیٹا! تو رات بھر غائب کہاں رہا؟"

عبداللہ کا چہرہ اترا ہوا تھا اور صاف پتا چلتا تھا کہ وہ اپنی زندگی سے بے زار ہیں۔ جب بیٹے نے کوئی جواب نہ دیا۔ تو ماں نے ذرا درشتی سے پوچھا۔ "عبداللہ! تو میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتا، میں تجھ سے کیا پوچھ رہی ہوں؟"

عبداللہ نے جواب دیا۔ "ماں، میں آپ کی بات کا کیا جواب دوں! میں بہت پریشان ہوں آج کل۔"

"تو مجھے بتا اپنی پریشانی، شاید میں اس کا کوئی علاج بتا سکوں!"

وہ اور زیادہ اداس ہوگئے، بولے۔ "ماں! مجھے معلوم نہیں کیا ہوگیا ہے کہ میرا دل ہر وقت ویرانے میں جانا چاہتا ہے۔"

ماں حیرت اور تشویش سے عبداللہ کی صورت دیکھتی رہیں، پھر بولیں۔ "اچھا تو مجھے ایک بات تو بتا۔ یہ کنیز کا کیا چکر ہے کہیں تو سچ مچ اس کی محبت میں گرفتار تو نہیں ہوگیا ہے؟"

عبداللہ سے جھوٹ نہیں بولا گیا، بولے۔ "ماں! میں بالکل مجبور اور بے بس ہوگیا ہوں!"

اس کے بعد وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگے۔

ماں سامنے سے ہٹ گئیں۔ وہ اس موضوع پر مزید کوئی بات کر کے لڑکے کا ہیاؤ نہیں کھولنا چاہتی تھیں۔ عبداللہ نے ہوش میں آکر جب سر اوپر اٹھایا تو ماں کو موجود نہ پاکر بے اختیار رونا شروع کردیا۔ وہ روتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ "اوخدایا! میں کتنا ظالم ہوں کہ میں نے ایک کنیز کی چاہ میں پوری رات برباد کردی۔ میں نے ایک مادی اور فانی شے سے عشق کر کے خود کو کتنا حقیر اور ذلیل کرلیا ہے۔ اگر یہی وقت میں تیری یاد میں گزارتا تو شاید تو مجھے مایوس نہ کرتا۔"

وہ دیر تک بیٹھے آنسو بہاتے رہے آخر وہ یہ فیصلہ کر کے اٹھے کہ اب انہیں کنیز کا خیال نہایت بے دردی سے نکال دینا ہے۔

☆☆☆

عبداللہ نے خود کو خدا کے لیے وقف کردیا۔ انہوں نے دنیا چھوڑ دی۔ مرو میں چاروں طرف یہ شہرہ ہوگیا کہ مبارک کے نوجوان بیٹے عبداللہ نے ایک کنیز کی محبت سے تائب ہوکر خدا سے لو لگا لی ہے اور ان کی عبادت اور ریاضت کا یہ حال ہے کہ بڑے بڑے عابد اور زاہد بھی اس پائے کی ریاضت نہیں کرسکتے۔

کنیز کے دل پر چوٹ سی لگی کہ یہ کیا ہوگیا۔ ایک رات، اندھیرے میں چھپتی چھپاتی وہ عبداللہ کے حجرے کے در پر آکھڑی ہوئی۔ اس نے قدرے تامل کے بعد دروازے پر دستک دی۔ اس وقت آپ تہجد کی نماز پڑھ رہے تھے، سلام پھیرنے کے بعد دریافت کیا۔ "کون؟"

کنیز نے نہایت دلکش لہجے میں کہا۔ "عبداللہ! دروازہ کھولو!"

عبداللہ نے بے رخی سے کہا۔ "اندر آکر کیا کرو گی؟ میں دروازہ نہیں کھولوں گا۔"

کنیز نے خوشامد کا سہارا لیا، بولی۔ "دیکھو، میں پھر یہ کہوں گی کہ تم نے مجھے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔"

"ہوسکتا ہے تیری یہ بات درست ہو لیکن میں اس وقت حجرے سے باہر نہیں نکلوں گا، تجھے جو کچھ کہنا سننا ہے باہر سے کہہ سن لے۔"

کنیز نے غمزدہ انداز میں کہا۔ "کیا تم مجھ سے ناراض ہوگئے؟ خدا کی قسم تم مجھ سے جس کی چاہو قسم لے لو، میں آج بھی تمہی سے محبت کرتی ہوں، تم معلوم نہیں کیوں میری بات پر اعتماد نہیں کر رہے۔"

عبداللہ نے جواب دیا۔ "میں تو بس اتنی سی بات جانتا ہوں کہ اس رات تو نے مجھ پر اگر یہ رحم نہ کیا ہوتا تو شاید میں اپنے اللہ سے بھی نہ رجوع ہوا ہوتا۔ اب تو واپس چلی جا۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

کنیز نے دھمکی دی۔ ''عبداللہ! اگر تم نے دروازہ نہ کھولا تو میں یہیں بیٹھ جاؤں گی اور چیخ چیخ کر روؤں گی، یہاں تک کہ یہاں لوگوں کا مجمع لگ جائے گا اس وقت میں تمہیں ذلیل اور رسوا کر ڈالوں گی۔''

عبداللہ نے ہنس کر کہا۔ ''عورت! میں دنیا سے نہیں ڈرتا، میں اپنے خدا سے ڈرتا ہوں۔ اس وقت بھی میں اسی لیے دروازہ کھول رہا ہوں کہ کہیں خدا یہ نہ سمجھے کہ میں تجھ سے یا تیرے جیسی دوسری عورتوں سے خوفزدہ رہتا ہوں، آ اور بے جھجکی سے میرے روبرو آ کے کھڑی ہو جا اور تجھے قسم ہے کہ اپنے ناز و ادا کے جتنے کرشمے دکھا سکتی ہے، مجھ پر آزما ڈال، میں دیکھوں گا کہ میں ان سے کس طرح گھائل ہوتا ہوں۔''

حجرے کا در کھل گیا۔ کنیز اندر داخل ہو گئی۔ رنگین لباس میں ملبوس کنیز آسمانی حور معلوم ہوتی تھی۔ اس نے اشکبار نظروں سے عبداللہ کی طرف دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''عبداللہ! کیا تم نے مجھے واقعی بھلا دیا؟''

عبداللہ نے جواب دیا۔ ''میرے پاس اس فضول سوال کا کوئی جواب نہیں۔''

کنیز نے کہا۔ ''میں تمہاری جدائی اور مفارقت میں زندہ نہیں رہوں گی۔''

عبداللہ نے جواب دیا۔ ''یقیناً جب گناہ بڑھ جائیں اور نیک بننے کی راہیں بند ہو جائیں تو اس شخص کے لیے زمین کا اوپر نہیں، اندر بہتر ہے۔''

کنیز نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''اب تم اتنے بڑے دیندار ہو گئے ہو کہ تمہارے دل میں انسانی حسن کے لیے کوئی جگہ نہیں رہی۔ کیا تم دنیا سے اس حد تک تعلق منقطع کر لو گے کہ اس کی کسی شے کی تمہیں ضرورت ہی نہ پیش آئے؟''

عبداللہ نے جواب دیا۔ ''میں نے دنیا سے اپنا تعلق منقطع ہی کہاں کیا ہے۔ ہاں اس کی عیاریوں اور مکاریوں سے بچنے کی کوشش ضرور کر رہا ہوں۔ اگر اس کی مدد شامل حال رہی تو میں اپنی کوشش میں کامیاب ضرور ہو جاؤں گا۔ اس کی تائید کے بغیر ہر کام مشکل ہے۔''

کنیز نے پوچھا۔ ''کیا میں واپس جاؤں؟''

عبداللہ نے کہا۔ ''ہاں تو واپس جا اور یہ سمجھ لے کہ وہ عبداللہ جو کبھی اپنے سینے میں تیرے عشق کا چراغ فروزاں رکھتا تھا، وہ مر چکا اب اس کی جگہ دوسرے عبداللہ نے لے لی ہے اور اس عبداللہ کے دل میں جو چراغ روشن ہوا ہے اسے بجھایا نہیں جا سکتا۔''

کنیز کھڑی حسرت سے عبداللہ کو دیکھتی رہی اور پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے واپس چلی گئی۔

☆☆☆

آپ ایک عرصے تک خلوت نشین رہے اور عبادت و ریاضت کی کڑی مشقیں جھیلتے رہے، پھر سیر و سیاحت کا شوق ہوا۔ مرو سے نکل کر مختلف دیار و امصار کی سیر کرتے رہے۔ اب ان میں وہ اوصاف پیدا ہو چکے تھے جو مردان خدا و خود آگاہ کا خاصہ سمجھے جاتے ہیں۔ آپ کو ان دنوں یہ خواہش بہت ستاتی رہتی تھی کہ خدا انہیں اپنا مقبول بندہ بنا لے، اس خواہش کو لیے ہوئے وہ نیشاپور میں داخل ہوئے۔ یہ شدید سردیوں کا موسم تھا، اس کڑے موسم میں آپ نے نیشاپور کے ایک بازار میں کسی شخص کو سردی میں ٹھٹھرتے سکڑتے دیکھا۔ آپ کو اس کی حالت زار پر رحم آ گیا، اس سے پوچھا۔ ''اے شخص! تو کون ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میں اس شہر کے ایک رئیس کا غلام ہوں۔''

آپ نے پوچھا۔ ''کیا تیرے پاس سردیوں سے بچنے کا لباس نہیں ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''کیا تو نے میری بات نہیں سنی؟ میں نے ابھی ابھی تجھے بتایا ہے کہ میں اس شہر کے ایک رئیس کا غلام ہوں اور گرم لباسوں کی اس کے پاس کوئی کمی نہیں ہے۔''

آپ نے کہا۔ ''پھر تو اس سے ایک آدھ پوستین ہی مانگ لے، تاکہ تو سردی کی اذیت سے بچ جائے۔''

غلام نے جھنجلا کر جواب دیا۔ ''تو کیسا نوجوان ہے کہ تیری سمجھ میں میری کوئی بات ہی نہیں آتی۔ پوستین وغیرہ میرے مالک کے پاس ہیں۔ کیا اسے انہیں معلوم کہ یہ شدید سردیوں کا موسم ہے اور اس میں ہر جاندار کو گرمی کی ضرورت ہے۔ کیا میرا مالک یہ نہیں جانتا کہ مجھے گرم لباس کی ضرورت ہے، پوستین کی ضرورت ہے؟ اسے میری یہ بنیادی ضرورت کسی خواہش اور مطالبے کے بغیر ہی پوری کر دینا چاہیے۔ اگر اسے اس کا خود خیال نہیں ہے تو میں بھی درخواست کر کے اپنی بات بیکار نہیں کرنا

چاہتا۔''

عبداللہ کے دل میں ایک تیر سا پیوست ہو گیا۔ غلام نے معرفت کا وہ نکتہ بیان کر دیا تھا جو ابھی تک ان کی فکر و نظر سے اوجھل تھا۔ آپ نے آہستہ سے کہا۔ ''بیشک جب اسے تیری ضرورتوں کا یقینی علم ہے تو اسے زبان سے ادا کرنا فضول اور بے معنی ہے۔''

آپ نے اسی وقت اپنے دل میں سے یہ خواہش نکال دی کہ خدا انہیں مردان خدا و خود آگاہ کی صف میں شامل فرما کے اپنا مقبول بندہ بنا لے۔

آپ حج کے لیے مکہ معظمہ روانہ ہو گئے۔ راستے میں تاخیر ہو گئی اور آپ کو اس احساس نے پریشان کر دیا کہ حج میں صرف چار دن باقی رہ گئے ہیں اور راستہ دس بارہ دن سے زیادہ کا تھا۔ ابھی وہ اسی فکر میں تھے کہ انہیں ایک بڑھیا اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ بڑھیا قریب آ کر بولی۔ ''نوجوان! تو پریشان کیوں ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''بڑی بی! مجھے اپنے حج کے ضائع جانے کا بڑا افسوس ہے۔ حج میں چار دن باقی رہ گئے ہیں، اب میں وہاں کسی طرح بھی نہیں پہنچ سکتا۔''

بڑی بی نے کہا۔ ''تو فکر نہ کر، میں حج کراؤں گی تیرا، آ میرے ساتھ چل۔''

آپ نے حیرت سے کہا۔ ''کیا میں یہ طویل سفر چار دن کے اندر طے کر لوں گا؟''

بڑی بی نے اسے طمینان سے جواب دیا۔ ''تو فکر نہ کر، میرے ساتھ چل۔''

عبداللہ بڑی بی کے ساتھ سفر کرنے لگے۔ یہ دونوں دیر تک سفر کرتے رہے۔ راستے میں دریا آ گیا۔ عبداللہ نے بے بسی سے کہا۔ ''اب اس دریا کو کس طرح عبور کروں گا۔ نہ کشتی ہے نہ پل۔''

بڑی بی نے کہا۔ ''اپنی آنکھیں بند کر لے نوجوان۔''

عبداللہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ بڑی بی اس کا ہاتھ پکڑ کے دریا میں داخل ہو گئیں۔ وہ دونوں آہستہ آہستہ دریا عبور کرنے لگے۔ عبداللہ نے محسوس کیا کہ وہ کمر تک پانی میں سفر کر رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد بڑی بی نے حکم دیا۔ ''اپنی آنکھیں کھول دے نوجوان۔''

عبداللہ نے آنکھیں کھول دیں اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ دریا کو عبور کر چکے ہیں۔ راستے میں کئی دریا آئے اور انہیں اسی طرح عبور کیا گیا اور پھر انہیں یہ محسوس ہونے لگا کہ وہ دونوں اپنی امید اور توقع سے زیادہ سفر طے کر چکے ہیں۔ ہر دریا کو عبور کرنے کے بعد وہ خاصا فاصلہ طے کر چکے تھے۔ یہاں تک کہ ٹھیک چوتھے دن وہ دونوں عرفات کے میدان میں داخل ہو چکے تھے۔ دونوں نے حج کیا۔ عبداللہ نے خدا کا شکر ادا کیا۔

بڑی بی نے عبداللہ سے کہا۔ ''اب تیرا حج ہو چکا، اب کیا ارادے ہیں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''جیسا آپ حکم دیں۔''

بڑی بی نے کہا۔ ''اگر تیرے پاس وقت ہے تو ذرا میرے ساتھ چل، میں تجھے اپنے بیٹے کے پاس لے چلوں۔ اس سے ملاقات کراؤں، امید ہے تو اس سے مل کر بہت خوش ہو گا۔''

آپ نے کہا۔ ''میں آپ کی بات کس طرح ٹال سکتا ہوں۔''

بڑی بی عبداللہ کو ساتھ لے کر ایک جگہ پہنچیں وہاں ایک دبلا پتلا نحیف و نزار نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ اس نقاہت اور کمزوری میں بھی اس کے چہرے سے نور ٹپک رہا تھا۔ بڑی بی نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ہے میرا بیٹا۔ اس سے مل، میں اسی کی خاطر اتنا لمبا سفر طے کر کے آئی ہوں۔''

کمزور نوجوان، ماں کو دیکھتے ہی ان کے قدموں میں گر گیا اور بشاش لہجے میں کہنے لگا۔ ''ماں! میں جانتا ہوں کہ آپ دونوں یہاں کیوں آئے ہیں؟''

آپ نے پوچھا۔ ''بھلا بتا تا تو ہم دونوں یہاں کیوں آئے ہیں۔''

نوجوان نے جواب دیا۔ ''میری تجہیز و تکفین کے لیے!''

بڑی بی نے عبداللہ سے کہا۔ ''کیا تو میرے بیٹے کے چہرے پر کوئی خاص بات محسوس کر رہا ہے؟''

WWW.PAKSOCIETY.COM

عبداللہ نے جواب دیا۔ ''ہاں میں اس کے چہرے پر حیرت انگیز طمانیت اور بشاشت محسوس کررہا ہوں، حالانکہ دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے انسان کو بڑا دکھ اور خوف محسوس ہوتا ہے۔''

نوجوان نے ہنس کر کہا۔ ''لیکن جن کے نامۂ اعمال میں راضی بہ رضائے الٰہی لکھا ہوتا ہے وہ کسی قسم کا خوف یا دکھ نہیں محسوس کرتے۔''

بڑی بی نے کہا۔ ''ہم لوگ مشیت الٰہی پر شاکر رہتے ہیں اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ ہمارے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے اس میں خدا کی طرف سے کسی ظلم و زیادتی کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔''

نوجوان نے ماں سے کہا۔ ''ماں! میں جارہا ہوں، خدا حافظ۔''

بڑی بی نے اٹھ کر بیٹے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور اس نے آخری ہچکی لی اور دنیا سے رخصت ہوگیا۔

دونوں نے اس کی تکفین و تدفین کا کام انجام دیا۔ عبداللہ نے سوچا کہ معلوم نہیں اب بڑی بی انہیں کیا حکم دیں۔ بڑی بی نے خود ہی کہا۔ ''نوجوان! اب تو جاسکتا ہے۔ میں یہیں بیٹے کی قبر کی مجاوری کروں گی۔''

عبداللہ نے دکھ سے پوچھا۔ ''اب آپ سے کب اور کہاں ملاقات ہوگی؟''

بڑی بی نے جواب دیا۔ ''کبھی اور کہیں بھی نہیں۔ یہاں سے ہم دونوں ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے جدا ہوجائیں گے!''

عبداللہ نے بے چینی سے پوچھا۔ ''یہ کیوں؟ آخر ایسا کیوں؟''

بڑی بی نے کہا۔ ''عبداللہ! میں جانتی ہوں کہ تو اگلے سال پھر ادھر آئے گا لیکن اس وقت تک میں اس دنیا سے رخصت ہوچکی ہوں گی۔''

عبداللہ کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

بڑی بی نے اس نمی کو محسوس کرلیا، بولیں۔ ''کیا تو ابھی تک راضی بہ رضائے الٰہی کے نکتے سے واقف نہیں ہوا؟ تو روتا کیوں ہے جا اور میرے بعد میرے حق میں دعائے خیر کرتا رہ۔''

عبداللہ وہاں سے چلے آئے اور اپنے وطن واپس پہنچے۔ یہاں انہوں نے اپنے لیے ایک معمولی پیشہ اختیار کیا۔ آپ نے طے کیا کہ ایک سال تو حج کریں گے، دوسرے سال جہاد میں شریک ہوں گے اور تیسرے سال تجارت کریں گے اور اس سے جو نفع کمائیں گے اسے مستحقین میں تقسیم فرمادیں گے، چنانچہ اس پر آپ نے سختی سے عمل کیا۔

آپ نے حج اور جہاد کے بعد تجارت شروع کی اور اس سے جو نفع کمایا اسے مستحقین اور فقرا میں تقسیم کردیا۔ اس موقع پر آپ نے ایک عجیب سا طریقہ اختیار کیا۔ آپ نے فقرا کے سامنے بہت ساری کھجوریں رکھ دیں اور کہا۔ ''کھجوریں کھا کر گٹھلیاں اپنے سامنے رکھتے جاؤ۔''

جب یہ لوگ کھجوریں کھا چکے تو آپ نے ان کے سامنے رکھی ہوئی گٹھلیاں شمار کیں اور جس کے سامنے جتنی گٹھلیاں رکھی ملیں آپ نے اسے اتنے ہی درہم مرحمت فرمادیے۔

آپ کے گھر میں ایک غلام کام دھندے پر متعین تھا۔ آپ نے اس سے کہہ رکھا تھا کہ اگر تو مجھے اتنی رقم ادا کردے جتنی میں نے تیری خریداری پر خرچ کی ہے تو میں تجھے آزاد کردوں گا۔ یہ غلام گھر کے کاموں سے فرصت پاکر محنت مزدوری کرنے چلا جاتا۔

ایک دن آپ کے پاس قبرستان سے ایک آدمی آیا اور آپ سے پوچھا۔ ''جناب! آپ کا غلام گھر کے کاموں سے فرصت پاکر کہاں چلا جاتا ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں نے اپنے غلام سے یہ وعدہ کررکھا ہے کہ اگر وہ اپنی ادا کی ہوئی قیمت مجھے ادا کردے تو میں اسے آزاد کردوں گا۔ وہ اس رقم کی حصولیابی کے لیے محنت مزدوری کرنے نکل جاتا ہے۔''

اجنبی نے کہا۔ ''حضرت! آپ کا یہ خیال ہی خیال ہے کہ وہ محنت مزدوری کرنے جاتا ہے لیکن میں خوب اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ فرصت پاکر ہر روز قبرستان پہنچ جاتا ہے اور وہاں سے کفن چرا کر اسے فروخت کردیتا ہے۔''

آپ نے چونک کر پوچھا۔ ''کیا یہ تم پورے وثوق سے کہہ رہے ہو؟''

اجنبی نے جواب دیا۔ ''یہ سب کچھ میں پورے وثوق اور اعتماد سے کہہ رہا ہوں!''

''اس کا ثبوت؟''

''اس کا پہلا ثبوت تو یہ ہے کہ آپ ذرا سوچ کر بتائیے کہ آپ کا غلام کیا رات کو بھی گھر کے اندر ہی موجود رہتا ہے؟'' آپ نے غور کیا تو یاد آیا کہ ان کا غلام واقعی رات کو گھر میں موجود نہیں ہوتا۔ کہاں جاتا ہے؟ انہیں کچھ پتا نہ تھا۔ اجنبی کو جواب دیا۔ ''ہاں، مجھے یاد آیا کہ وہ رات کو گھر میں نہیں ہوتا۔''

اجنبی نے کہا۔ ''تب پھر آپ آج کی رات میرے ساتھ زحمت کیجیے۔ میں سارا تماشا دکھادوں گا۔''

آپ نے اس اجنبی کو گھر ہی میں روک لیا۔ رات کو حسب معمول غلام، گھر کے کام دھندوں سے نجات حاصل کرکے باہر نکلا، اسی وقت غلام کے پیچھے اجنبی کے ساتھ آپ بھی چل پڑے۔ غلام واقعی قبرستان کی طرف جارہا تھا۔ آپ کو اس وقت بہت دکھ ہوا۔ انہیں اس وقت یہ غم بہت ستا رہا تھا کہ اب تک غلام نے انہیں جتنی رقم ادا کی تھی وہ ساری کفن چوری کرکے دی گئی تھی۔

غلام قبرستان میں داخل ہوکر ایک قبر کے قریب جا کھڑا ہوا۔ کچھ دیر وہ یوں ہی کھڑا رہا پھر اس نے قبر کے اوپر سے پتھر ہٹایا اور اندر داخل ہوگیا۔ آپ اجنبی کے ساتھ باہر کھڑے غلام کی واپسی کا انتظار کرتے رہے لیکن جب وہ دیر تک باہر نہ نکلا تو آپ نے احتیاط سے اندر جھانک کر دیکھا۔ اندر ایک دیا روشن تھا، آپ نے اس کی روشنی میں دیکھا، غلام نے ٹاٹ کے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ اس کے گلے میں ایک طوق پڑا تھا، وہ عبادت میں مشغول تھا، پھر آپ نے اس کی گریہ وزاری کی آواز سنی۔ آپ کو اپنے شک و شبہ اور سوءِ ظنی پر بے حد افسوس ہوا۔ آپ کو رونا آگیا، اجنبی سے کہا۔ ''تو تو یہ کہتا تھا کہ میرا غلام چوری کرتا ہے، کفن چرا کے فروخت کرتا ہے لیکن اس کے برعکس میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں؟''

اجنبی بھی شرمسار تھا، افسوس کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اسے قبر کے اندر سے نکلتے دیکھا تھا اس لیے یہ خیال ہوا کہ کفن چوری کرتا ہے۔ دلوں کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔''

آپ نے اجنبی سے کہا۔ ''اب تم جاسکتے ہو۔''

اجنبی نے پوچھا۔ ''کیا آپ یہیں ٹھہریں گے؟''

''ہاں۔''

''کب تک؟''

''جب تک یہ قبر کے اندر رہے گا۔ جب یہ باہر نکلے گا تو میں اس سے معافی چاہوں گا۔''

اجنبی چلا گیا۔ غلام اندر نماز پڑھتا رہا اور آپ باہر عبادت میں مشغول رہے۔

فجر کی نماز سے ذرا پہلے غلام قبر سے باہر نکلا۔ آپ نے بھی عبادت بند کی اور اس کے پیچھے پیچھے چل دیے۔ وہ ایک مسجد میں داخل ہوگیا، آپ بھی مسجد میں چلے گئے۔ وہاں دونوں نے الگ الگ صفوں میں کھڑے ہوکر نماز فجر ادا کی۔ لوگ نماز پڑھ کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ آپ غلام سے ذرا دور وہیں موجود رہے۔ غلام نے بارگاہ ایزدی میں الحاح وزاری شروع کردی۔ ''خدایا! میں نے پوری رات حسب معمول تیری یاد میں گزار دی، کیونکہ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ تیرے ذکر سے افضل بھی کوئی چیز ہوسکتی ہے۔ اب میں اپنے مالک کے پاس جاؤں گا وہ مجھ سے درہموں کا مطالبہ کرے گا۔ اب تو ہی بتا کہ میں درہم کہاں سے لاؤں؟''

ابھی اس کی دعا ختم بھی نہ ہوئی تھی اوپر سے ایک نور سا نمودار ہوا۔ اس کا رخ غلام کے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کی طرف تھا۔ یہ نور ہتھیلیوں میں درہموں کی شکل اختیار کرگیا۔ آپ اسی وقت غلام کے قدموں میں گر گئے۔ غلام آپ کو اپنے قدموں میں گرا ہوا دیکھ کر گھبرا گیا، آپ کو قدموں سے اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''حضرت! یہ آپ، آپ یہ کیا کررہے ہیں؟''

آپ نے رقت زدہ لہجے میں فرمایا۔ ''کاش میں ترا غلام ہوتا اور تو میرا آقا۔ میں تجھ سے بہت شرمسار ہوں۔''

غلام نے آپ کو قدموں سے اٹھا کر، خدا سے دعا کی۔ ''اے اللہ، میرا راز فاش ہوچکا ہے اس لیے میں اب اس دنیا میں نہیں رہنا چاہتا۔ تو مجھے اٹھالے۔''

یہ کہتے ہوئے وہ آپ کی آغوش میں گر گیا اور جان دے دی۔ آپ نے اسے اسی ٹاٹ کے لباس میں دفن کردیا۔ اسی

WWW.PAKSOCIETY.COM

رات آپ نے خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے ہیں اور شکایتاً فرما رہے ہیں کہ۔ ''عبداللہ! تو نے میرے دوست کو ٹاٹ کے کفن میں کیوں دفن کیا؟''

آپ نے شرمندگی سے عرض کیا۔ ''حضور ﷺ! آپ کے دوست کو یہی لباس پسند تھا اس لیے اس کے پسندیدہ لباس ہی میں، میں نے دفن کر دیا۔''

☆☆☆

وہ سال آپ کے جہاد کا سال تھا۔ آپ جہاد پر تشریف لے گئے۔ ہنگامۂ کارزار گرم تھا، آپ نہایت جوش وخروش سے جنگ کر رہے تھے کہ نماز کا وقت آ گیا۔ آپ نے اپنے مقابل سپہ سالار سے کہا۔ ''میں نماز پڑھنا چاہتا ہوں کیا تیری جنگی اخلاقیات میں اتنی گنجائش ہے کہ وہ عبادت کے دوران مجھ سے تعرض نہ کرے؟''

مقابل سپہ سالار نے فراخدلی کا ثبوت دیا۔ ''آپ نماز پڑھ لیں، اتنی دیر جنگ رکی رہے گی۔''

آپ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ نماز پڑھی اور ادھر سے فارغ ہو کر آپ نے دوبارہ جنگ شروع کرنے کا اعلان کر دیا۔

کچھ دیر بعد مقابل سپہ سالار آپ کے پاس آیا اور عرض کیا۔ ''حضرت! اب ہماری عبادت کا وقت آ گیا ہے کیا آپ کی جنگی اخلاقیات میں تھوڑی دیر کے وقفے کی گنجائش ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''بالکل، ہم لوگ اس وقت تک اپنے ہاتھ روکے رکھیں گے جب تک آپ دوبارہ جنگ شروع کرنے کا اعلان نہ کریں گے۔''

کفار اپنی عبادت میں مشغول ہو گئے۔ اسی دوران شیطان نے آپ کے دل میں وسوسہ ڈالا۔ ''عبداللہ! فتح حاصل کرنے کا یہ بہترین موقع ہے، اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان غافلوں پر حملہ کر کے شاندار فتح حاصل کی جا سکتی ہے اور اس طرح حق کو باطل سے نجات بھی مل جائے گی۔''

آپ اپنے دشمنوں کے خلاف قدم اٹھانے ہی والے تھے کہ کسی نے کان میں قرآن پاک کی یہ آیت ڈال دی۔ ''اوفوبالعہد ان العھد کان مولا (تم سے قیامت میں عہد شکنی کی باز پرس ہوگی، الہٰذا اپنے ارادے سے باز آجاؤ)''

اس تنبیہ نے آپ کی حالت غیر کر دی۔ رونے لگے مقابل سپہ سالار نے عبادت سے فارغ ہو کر آپ کو روتے جو دیکھا تو اس کا سبب دریافت کیا۔ آپ نے بلا جھجک سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ حریف سپہ سالار کسی سوچ میں پڑ گیا، آپ نے روتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا جنگ کا اعلان کر دیا جائے؟''

حریف سپہ سالار نے کہا۔ ''ابھی نہیں، ذرا ٹھہریے۔''

آپ اس کی شکل دیکھتے رہے، وہ بہت زیادہ فکرمند نظر آ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے آپ سے سوال کیا۔ ''کیا آپ واقعی بدعہدی پر مائل تھے اور آپ کے خدا نے آپ کو اس سے باز رکھا؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ خدا کی تنبیہ نے میرے ہاتھ پکڑ لیے تھے ورنہ میں یہ غلط قدم ضرور اٹھاتا۔''

مقابل سپہ سالار نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ''میں آپ سے جنگ نہیں کروں گا کیونکہ میرے دل میں آپ کے خدا کی تنبیہ کا بڑا اثر ہوا ہے۔ آپ کے خدا نے دشمنوں کی حمایت میں آپ کو یعنی اپنے دوست کو ڈانٹ دیا۔ اس بات نے میرے دل پر بڑا اثر کیا ہے۔ میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔''

وہ اسی وقت مسلمان ہو گیا اور آپ نے یہ جنگ مزید خوں ریزی کے بغیر ہی جیت لی۔

واپسی میں آپ نے ایک گرجے میں کسی پادری کو دیکھا جو حد درجہ عبادت اور مجاہدوں کی وجہ سے بہت کمزور ہو گیا تھا۔ آپ نے اس سے پوچھا۔ ''کیا تو خدا کے راستے سے واقف ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''عبداللہ! تم یہ سوال مجھ سے کر رہے ہو؟ تم تو عارف ہو اور تم خدا کے راستے سے ضرور واقف ہو گے پھر تم نے یہ سوال مجھ سے کیوں کیا؟''

WWW.PAKSOCIETY.COM

آپ نے کہا۔ ''عبادات اور مجاہدوں نے تیری صحت کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے، کیا اب بھی تو خدا کے راستے سے واقف نہیں ہوا؟''

پادری نے عاجزی سے جواب دیا۔ ''عبداللہ! یہ حقیقت ہے کہ میں نے خدا کو اب تک نہیں پہچانا اور اسے نہ پہچاننے کے باوجود اس سے خوفزدہ ہونے کا یہ عالم ہے کہ میں ہر دم سوکھتا چلا جا رہا ہوں اور تم عارف ہونے کے باوجود اس سے خوفزدہ نہیں نظر آتے۔''

پادری کی باتوں نے آپ کو اتنا خوفزدہ کر دیا کہ اس کے بعد کوئی دن بھی ایسا نہ آیا کہ آپ نے اللہ کا خوف نہ محسوس کیا ہو۔

اسی خوفزدگی کی حالت میں لوگ آپ سے ملے تو بڑا تغیر محسوس کیا۔ ملنے والے آپ کی پریشانی کا اصل سبب نہیں جانتے تھے۔ وہ طرح طرح سے دل جوئی اور دل داری کرتے رہے لیکن آپ کو کسی طرح سکون ہی نہ ملتا تھا۔ انہی لوگوں میں ایک آتش پرست بھی آپ کے پاس آیا۔ اس نے حاضرین سے کہا۔

''لوگو! میں نہیں جانتا کہ عبداللہ کیوں پریشان ہیں؟ لیکن میں ایک بات ضرور جانتا ہوں۔ تم میں سے جو لوگ اس پر پہلے ہی سے کاربند ہیں، انہیں اس پر توجہ دینے کی کوئی ضرورت نہیں لیکن جو اس نکتے سے ناواقف یا لاعلم ہیں انہیں اس پر آج ہی سے عملدرآمد شروع کر دینا چاہیے۔''

آپ نے کہا۔ ''تو بولتا ہی رہے گا یا کچھ کہے گا بھی؟''

آتش پرست نے کہا۔ ''دانشور وہ ہے جو اول دن ہی وہ کام انجام دے جس کو نادان تیسرے دن انجام دیتے ہیں۔'' پھر حاضرین سے پوچھا۔ ''کیا تم لوگوں نے میری بات کا مفہوم پا لیا؟''

آپ نے لوگوں سے کہا۔ ''لوگو! اس آتش پرست کے قول کو ہر وقت اور ہمیشہ یاد رکھنا۔ یہ بڑی عظیم نصیحت ہے اور اس نصیحت سے لاعلم رہ کر میں اپنے ماضی کا ماتم کر رہا ہوں۔''

اسی موقعے پر لوگوں نے آپ سے پوچھا۔ ''حضرت! یہ تو بتائیے کون سی عادتیں سودمند ہو سکتی ہیں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''عقل کامل سے متعلقہ عادتیں سودمند ہوتی ہیں۔''

کسی نے کہا۔ ''اگر کسی کے پاس عقل کامل نہ ہو تو؟''

آپ نے کہا۔ ''پھر تو اس کے پاس حسن ادب کا ہونا ضروری ہے۔''

کسی دوسرے نے کہا۔ ''اگر کوئی حسن ادب سے بھی محروم ہو تو؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''تب پھر اسے اتنا شفیق بن جانا چاہیے کہ لوگ اسے اپنا مخلص اور شفیق بھائی سمجھ کر مشورے کیا کریں۔''

کسی اور نے کہا۔ ''اگر یہ بھی ناممکن ہو تو؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''پھر تو اسے سکوت اختیار کر لینا چاہیے کیونکہ سکوت بہت سے عیوب کی پردہ پوشی کرتا ہے۔''

معترض نے کہا۔ ''اگر کوئی اس پر بھی قدرت نہ رکھتا ہو تو؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''تب پھر ایسے شخص کے لیے مرگ ناگہاں بہت سودمند ہے تاکہ لوگ اور وہ خود اپنی نحوست سے چھٹکارا پا جائے۔''

اسی مجلس میں کچھ ایسے لوگ بھی موجود تھے جنہوں نے سکوت اختیار کر رکھا تھا، ان میں سے کسی نے دریافت کیا۔ ''حضرت! یہ تو فرمایئے کہ قلب کا معالجہ کس طرح کیا جائے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''لوگوں سے کنارہ کشی اور قرب الٰہی سے۔''

اس نے وضاحت چاہی۔ ''وہ کس طرح؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''لوگوں سے بچو اور کوشش یہ رہے کہ ان کی امداد و اعانت کے عادی نہ رہو۔ اللہ پر توکل رکھو۔''

کسی نے دریافت کیا۔ ''تواضع کا مفہوم کیا ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''تواضع کا اصل مفہوم یہ ہے کہ تم امراء سے غرور کرو اور فقرا کے ساتھ عاجزی سے پیش آؤ۔'' پھر

ذرا سکوت اختیار کیا اور دوبارہ فرمایا۔ ''لوگو! جو لوگ دنیاوی مراتب میں تم سے برتر ہوں، ان کے ساتھ تم تکبر سے پیش آؤ اور جو تم سے کمتر ہوں ان کے ساتھ عاجزی اور انکساری سے پیش آؤ۔''

کسی نے پھر سوال کیا۔ ''کیا رجا سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''یہ درست ہے لیکن جس رجا میں خوف نہ شامل ہو گا وہ بہت جلد ختم ہو جائے گا۔''

ایک نے کہا۔ ''اور آپ کے نزدیک مراقبے کا کیا مطلب ہے؟''

آپ نے کہا۔ ''مراقبے دو ہوتے ہیں۔ ایک ظاہری دوسرا باطنی۔ دونوں مراقبوں کا مطلب یہ ہے کہ قلب کا خوف دور ہو جائے اور اس کی جگہ سکون لے لے۔''

کسی نے اپنے کسی ساتھی کی شکایت کی۔ ''حضرت! میرا ایک دوست ہے وہ اکثر کسی نہ کسی کی غیبت کیا کرتا ہے آپ اس کے حق میں دعا فرمایئے کہ اس کی یہ عادت قبیحہ چھوٹ جائے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''تو اپنے دوست سے کہہ دے کہ اگر اسے غیبت ہی کرنا ہے تو سب سے پہلے اپنے والدین کی غیبت کر، کیونکہ ان کے گناہ اتنے زیادہ ہیں کہ ان کی اولاد کی نیکیاں ان کے نامۂ اعمال میں لکھی جاتی ہیں۔''

اس دوران ایک شخص شرمسار و پشیمان آپ کے قریب پہنچا اور آہستہ سے کہا۔ ''حضرت! میں ایک ایسے گناہ کا مرتکب ہو گیا ہوں کہ ندامت کی وجہ سے آپ کے سامنے نہیں بیان کر سکتا۔''

آپ نے کہا۔ ''اگر تو سب کے سامنے کہتے ہوئے شرماتا ہے تو چپکے سے میرے کان میں کہہ دے۔''

اس نے کان میں کہا۔ ''حضرت! میں زنا کا ارتکاب کر بیٹھا ہوں۔''

آپ نے کہا۔ ''توبہ ہے میں تو یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ شاید تو نے غیبت کا گناہ کیا ہے کیونکہ زنا کا تعلق تو خدا کے گناہ سے ہے جو توبہ کے بعد معاف بھی ہو سکتا لیکن غیبت بندے کا گناہ ہے جس کو بندہ ہی معاف کرے تو کرے۔''

☆☆☆

آپ کہیں جا رہے تھے کہ سامنے سے ایک سیّد کا گزر ہوا۔ یہ سیّد اپنے افعال کے اعتبار سے رسوائے زمانہ تھا۔ اس نے آپ کو دیکھا تو ذرا تمکنت سے کہا۔ ''میں سیّد ہوں اور اس اعتبار سے تجھ سے کسی طرح بھی کم نہیں ہوں۔''

آپ کو اس کا طرز تخاطب پسند نہیں آیا۔ آپ نے جواب دیا۔ ''بیشک تیرے جدِ اعلیٰ خاتم الانبیا ﷺ تھے اور میرا باپ گمراہ مگر تیرے جدِ اعلیٰ نے جو ترکہ چھوڑا تھا اس کو میں نے حاصل کر لیا اور اس وجہ سے مجھے یہ مرتبہ حاصل ہو گیا اور میرے باپ کی گمراہی تو نے ترکے میں حاصل کر لی اس لیے تو رسوا ہو گیا۔''

سیّد چپ ہو کر ایک طرف چلا گیا۔

اس رات آپ نے خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ آپ سے بہت ناراض ہیں۔ آپ نے وجہ دریافت کی۔

''یا رسول اللہ ﷺ! کیا آپ مجھ سے ناراض ہیں؟''

رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا۔ ''اے عبداللہ! میں تجھ سے یہ پوچھتا ہوں کہ تو نے میری آل کے عیوب کی پردہ داری کیوں کی؟''

اسی وقت آپ کی آنکھ کھل گئی۔ آپ پریشان اور خوفزدہ اس سید کی جستجو میں نکل کھڑے ہوئے۔ یہ ابھی کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ سیّد سے ملاقات ہو گئی۔ وہ خود بھی آپ کو تلاش کر رہا تھا۔ وہ آپ کو دیکھتے ہی لپٹ گیا اور روتے ہوئے بولا۔ ''اے عبداللہ! میں نے تم سے جو کچھ کہا اس پر شرمندہ ہوں، ابھی ذرا دیر پہلے میں نے رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ وہ مجھے ڈانٹ رہے تھے کہ اگر تیرے اعمال و افعال بہتر ہوتے تو عبداللہ تیری اہانت کیوں کرتا؟''

آپ نے اپنا خواب بیان کر دیا۔ دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہو کر روتے رہے اور اپنے اپنے رویوں سے تائب ہو گئے۔

آپ کی خدمت میں ایک بدطینت حاضر ہوا اور گزارش کی۔ ''حضرت! مجھے کچھ دن اپنی صحبت میں رہنے کا شرف عطا فرمائیں تاکہ میں آپ کے فیضان روحانی سے نیک اور خدا رسیدہ بن جاؤں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''میری صحبت اختیار کرنے سے کچھ بھی حاصل نہ ہو گا جب تک کہ تو خود بھی نیک بننے کا ارادہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور کوشش نہ کرے۔ یہ تیرا خیال خام ہے کہ میری صحبت تجھے نیک اور پارسا بنا دے گی۔"

اس شخص نے کہا۔ "اگر آپ کی صحبت مجھے نیک اور پارسا نہ بنا سکی تو پھر آپ کی بزرگی اور عظمت کا فائدہ؟"

آپ نے جواب دیا۔ "بھائی! میں تو ایک معمولی انسان ہوں۔"

لیکن وہ شخص نہیں مانا اور آپ کی صحبت میں رہنے لگا لیکن اس کا عالم یہ تھا کہ وہ آپ کی نہ تو باتیں سنتا تھا اور نہ آپ کے مشاغل میں دلچسپی لیتا تھا۔ کچھ عرصہ رہ کر جانے کی اجازت طلب کی، آپ نے کہا۔ "اس میں اجازت طلب کرنے کی کیا بات ہے، تو جا سکتا ہے۔"

اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "لیکن حضرت! یہ یاد رہے کہ میں جیسا آیا تھا ویسا ہی جا رہا ہوں، اس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔"

آپ نے کہا۔ "اس میں افسوس کی کیا بات ہے۔ کوا اگر زندگی بھر بلبلوں کی صحبت میں رہے تو اس کی کائیں کائیں میں فرق نہ آئے گا۔"

جب وہ چلا گیا تو آپ نے لوگوں سے فرمایا۔ "صد حیف کہ وہ تو مجھ سے رخصت ہو گیا لیکن اس کی بری خصلتیں اس سے رخصت نہ ہو سکیں۔"

آپ کے ہم عصر ایک دوسرے بزرگ سہیل اکثر آپ کے پاس آتے رہتے تھے، لیکن ایک بار آئے تو واپس ہوتے وقت غیر متوقع شکایتاً عرض کیا۔ "عبداللہ افسوس کہ یہ ہم دونوں کی آخری ملاقات ہے، اب میں یہاں کبھی نہ آؤں گا۔"

آپ نے پوچھا۔ "خیریت تو ہے؟ آپ کو یہاں کی کوئی بات ناگوار گزری؟"

سہیل نے آزردہ خاطری سے جواب دیا۔ "میں اس گھر کو فضل و برکت کا گھر سمجھ کر آتا رہا لیکن آج یہاں میرے ساتھ جیسا سلوک کیا گیا ہے اسے میں بیان کرتے ہوئے بھی شرما رہا ہوں۔"

آپ نے کہا۔ "سہیل! تمہیں جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہو۔ آخر اس گھر میں وہ کون سی بات تمہیں ناگوار گزری ہے کہ تم یہاں آئندہ نہ آنے کی قسم کھا رہے ہو!"

سہیل نے کہا۔ "عبداللہ! آج خلاف معمول آپ کی چھت پر سے کنیزوں نے مجھے آوازیں دینا شروع کر دیں۔ وہ مجھے، سہیل یہاں آؤ میرے پاس آؤ سہیل، کہہ کر بلا رہی تھیں۔ کیا آپ یہ پسند کریں گے کہ میری زندگی بھر کا تقویٰ یوں ضائع جائے؟"

آپ نے اپنے ارادت مندوں سے کہا۔ "لوگو! اٹھو اور میرے ساتھ سہیل کی نماز جنازہ ادا کرو۔"

لوگوں نے حیرت سے سہیل کو اور سہیل نے حاضرین کو دیکھا لیکن اسی وقت سہیل گر گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کا انتقال ہو گیا۔ آپ نے ایک بار پھر اپنے ارادت مندوں سے کہا۔ "کیا میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ آؤ میرے ساتھ سہیل کی نماز جنازہ ادا کرو۔ اب اٹھو، ان کی تجہیز و تکفین کا انتظام کر کے نماز جنازہ پڑھا دیں اور پھر دفن کر دیں۔"

لوگوں نے حیرت سے پوچھا۔ "لیکن آپ کو ان کی موت کا علم کیونکر ہو گیا تھا؟"

آپ نے جواب دیا۔ "سہیل نے کہا تھا کہ میری چھت پر سے کنیزیں پکار رہی تھیں حالانکہ تم لوگ خوب اچھی طرح جانتے ہو کہ میرے یہاں ایک بھی لونڈی نہیں اس لیے یقیناً وہ حوریں تھیں جو سہیل کو بلا رہی تھیں اس لیے مجھے یقین ہو گیا کہ ان کا وقت پورا ہو چکا ہے۔"

آپ حج کرنے خانہ کعبہ تشریف لے گئے۔ بعد فراغت حج آپ بیت اللہ ہی میں سو گئے۔ آپ نے خواب میں دیکھا دو فرشتے باتوں میں مشغول ہیں۔ ایک فرشتے نے دوسرے سے پوچھا۔ "اس سال کتنے لوگ حج میں شریک ہوئے؟"

دوسرے نے جواب دیا۔ "چھ لاکھ انسانوں نے حج کیا ہے۔"

پہلے فرشتے نے پوچھا۔ "ان میں سے کتنوں کا حج قبول کیا گیا؟"

دوسرے نے جواب دیا۔ "دمشق کا ایک موچی حج میں شریک تو نہیں ہو سکا لیکن خدا نے اس کا حج قبول کر لیا اور اس کے طفیل میں دوسروں کا حج بھی قبول کر لیا گیا۔"

اس کے بعد آپ کی آنکھ کھل گئی۔ آپ نے فوراً دمشق کا رخ کیا۔ آپ اس موچی کو دیکھنا چاہتے تھے جو حج کرنے تو نہیں

آسکا تھا لیکن اس کا حج قبول کر لیا گیا اور اس کے طفیل میں دوسروں کا حج بھی قبول کر لیا گیا۔ آپ نے دمشق میں اسے تلاش کر لیا اور اس سے دریافت کیا۔ "تو حج پر کیوں نہیں جا سکا؟"

اس نے پوچھا۔ "تمہارا نام؟ تم کہاں سے آئے ہو اور مجھ سے یہ سوال کیوں کر رہے ہو؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میرا نام عبداللہ بن مبارک ہے۔"

وہ آپ کا نام سنتے ہی چیخ مار کر رو دیا۔ جب ذرا ہوش و حواس درست ہوئے تو کہا۔ "عبداللہؒ! ایک عرصے سے میں حج کی خواہش میں جی رہا تھا اور میں نے اپنے موچی کے پیشے سے اس مقصد کے لیے تین سو درہم جمع کر لیے تھے اور جب میں حج کا سفر اختیار کرنے والا تھا۔ ایک دن میرے پڑوسی کے یہاں سے کھانا پکنے کی خوشبو آئی۔ یہ خوشبو اتنی اچھی لگی کہ میری بیوی نے مجھ سے کہا کہ اپنے پڑوسی کے پاس جاؤ اور جو کچھ پک رہا ہے اس میں سے ذرا سا مانگ لاؤ۔ میں پڑوسی کے پاس پہنچا اور اس سے تھوڑا سا کھانا مانگا۔ اس نے جواب دیا، افسوس کہ وہ کھانا تیرے مطلب کا نہیں ہے ورنہ ضرور حاضر کر دیتا۔ میں نے پوچھا "وہ کیوں، میرے مطلب کا نہیں ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "میرے اہل و عیال سات دن سے مسلسل فاقہ کشی کر رہے تھے۔ آج میں نے ایک گدھے کو مرا ہوا پڑا دیکھا، میں نے اس کو غنیمت جانا اور اس مردہ گدھے کو بہ مشکل گھر تک لے آیا اور اس کا گوشت پکا رہا ہوں تا کہ کسی طرح اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا جہنم بھر سکوں۔" میں اس کی باتوں سے لرز گیا، اسی وقت گھر آیا اور حج کے لیے جمع کی ہوئی رقم اس شخص کے حوالے کر دی اور یہ تصور کر لیا کہ ایک مسلمان کی امداد میرے حج کے برابر ہے۔"

آپ نے موچی کو اپنا خواب سنایا اور کہا۔ "تیرے حج کی قبولیابی کی خوش خبری میں سن چکا ہوں اب تو بھی سن لے، واقعی اللہ تعالیٰ قضا و قدر کا مالک ہے۔"

آخری دنوں میں آپ نے لوگوں سے کہا۔ "لوگو! مشائخ نے ادب کی بہت سی تعریفیں کی ہیں لیکن میرے نزدیک ادب، نفس شناسی کو کہتے ہیں۔" مزید فرمایا۔ "قرض حسنہ میں ایک درہم دینا، خیرات میں ہزار درہم دینے سے زیادہ موجب ثواب ہے۔ لوگو! جس نے ناجائز مال کا ایک حصہ بھی لیا وہ توکل سے محروم رہے گا، اور جانتے ہو توکل کسے کہتے ہیں؟ توکل وہ نہیں ہے جس کو تمہارا نفس سمجھتا ہے بلکہ وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ توکل سمجھے۔ اہل توکل کا اتنا پس انداز کر لینا کہ بیماری اور موت میں کام آجائے معیوب نہیں ہے۔"

لوگوں نے پوچھا۔ "اگر ہم جہاد کے ثواب سے محروم رہیں تو اس کے بدلے میں ہمیں کون سا عمل اختیار کرنا چاہیے؟"

آپؒ نے جواب دیا۔ "اگر تم اپنے بال بچوں کی پرورش کے ساتھ علم دین بھی سکھلاؤ تو اس کا اجر جہاد سے فزوں تر ہے۔"

وصال سے پہلے آپؒ نے اپنا سارا اثاثہ فقراء میں تقسیم کر دیا۔ کسی ارادت مند کو اس پر اعتراض ہوا، اس نے کہا۔ "حضرت! آپؒ کی تین صاحبزادیاں ہیں آپ نے ان کے لیے کیا چھوڑا؟"

آپؒ نے جواب دیا۔ "میں نے ان کے لیے خدا چھوڑا ہے، کیونکہ جس کا کفیل اللہ ہو اس کو عبداللہؒ کی کیا حاجت؟"

موت سے تھوڑی دیر پہلے آپؒ نے آنکھیں کھولیں اور مسکراتے ہوئے فرمایا۔ "عمل کرنے والوں کو ایسے ہی عمل کرنا چاہیے۔" اس کے بعد آپؒ کا انتقال ہو گیا۔

آپؒ کو، اس عہد کے مشہور صوفی بزرگ فضیل بن عیاض اور سفیان ثوری نہایت ادب و احترام سے دیکھتے تھے۔ ایک بار آپ کو آتے دیکھ کر سفیان ثوری نے کہا تھا۔ "دیکھو مرد مشرق آ رہا ہے!"

فضیل بن عیاض نے کہا۔ "مرد مشرق ہی نہیں مرد مغرب بھی اور مشرق و مغرب کے درمیان جو کچھ ہے وہ بھی۔" بعد میں عظیم مشائخ نے متفقہ طور پر یہ کہا کہ جس کی تعریف میں فضیل بن عیاض اور سفیان ثوری جیسے بزرگوں نے اہم جذبات کا اظہار کیا ہو، اس کے اوصاف کوئی اور کیا بیان کر سکتا ہے۔

ماخذات

تذکرۃ الاولیاء، شیخ فرید الدین عطار۔ الطبقات الکبریٰ، علامہ عبدالوہاب الشعرانی۔ روضۃ الریاحین، ابی محمد عبداللہ بن اسعد یمنی۔ خزینۃ الاصفیاء، مفتی غلام سرور لاہوری۔ افانین الیاسمین، مترجمہ مولانا جعفر علی نگینوی۔ اخبار الاخیار، عبدالحق محدث دہلوی

WWW.PAKSOCIETY.COM

کلیدِ نجات

نشور ہادی

طوفان بادوباراں اور... نشیب و فراز ہر زندگی کا حصہ سہی لیکن کہیں دن اور کہیں رات کے قیام کا عرصہ بڑا طویل ہوجاتا ہے اور ان طویل لمحات کے دوران کچھ لوگ جانے کتنی آزمائشوں سے گزر جاتے ہیں، جبکہ قوتِ برداشت کے طفیل خاموشی کی چادر میں ماتم کی آوازیں بھی دب جاتی ہیں مگر... اس کے باوجود سسکیوں کی سرگوشیاں دھیرے دھیرے کچھ سماعتوں کو اپنی جانب متوجہ کرلیتی ہیں... اس کی سماعت میں بھی جب یہ سرگوشیاں اتریں تو اس کے دل ودماغ میں ایک تلاطم برپا کرگئیں۔ جس کے نزدیک زندگی ایک خوشنما تتلی کے مانند تھی... جس کی ہنسی میں جھرنوں سا ترنم تھا، جس کی آنکھوں میں ستارے جھلملاتے تھے... جس کے خوابوں کی پرواز بہت بلند تھی ایک روز اچانک زمین پر یوں گری کہ آنکھوں میں بسے خوابوں سے لے کر دلوں میں مچلتے جذبات تک سب کچھ ریزہ ریزہ ہوگیا۔ کیونکہ تلخ حقیقتوں نے بساطِ زیست پر بہت لڑکھڑاتی چالیں چل دی تھیں۔ ایسے میں کوئی کیسے اپنا توازن برقرار رکھ سکتا تھا لیکن یہ اس کا مثبت رویّہ تھا کہ تلخیوں کی بے ساکھیوں نے دھیرے دھیرے اسے چلنا سکھا دیا اور جب اسے دوڑنا آگیا تو غالب کے مصرع کے مانند تمام مشکلیں آسان ہوگئیں کیونکہ اسے بھی اس گرداب سے نجات کی کلید مل گئی تھی۔

خوب صورت رشتوں کی آزمائش اور مہکتے جذبوں کا عجیب سنگم...... زندگی کے معنی بدلنے والی اچھوتی داستان

"میں تم سے شادی نہیں کرسکتی شمعون!"

ساحرہ کے منہ سے یہ جملہ سن کر شمعون کو ایسا لگا جیسے اس پر بجلی گر پڑی ہو۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو حد درجہ پسند کرتے تھے اور یہ کوئی دو چار دن کی بات نہیں، برسوں کا قصہ تھا۔ ساحرہ اس وقت میٹرک میں تھی جب اس نے شمعون کو اور شمعون نے اسے پسند کیا تھا۔ اب تو ساحرہ گریجویشن کرچکی تھی اور شمعون ایم بی ایس کرنے کے بعد ہاؤس جاب کررہا تھا۔

ابتدا ہی میں وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے اتنے جذباتی ہوگئے تھے کہ بہت جلد ان میں عہد و پیماں بھی ہوئے، زندگی بھر ساتھ نبھانے کی قسمیں کھائی گئیں، لیکن اب اس کی زبان پر یہ بات آئی تھی کہ وہ شمعون سے شادی نہیں کرسکتی اور یہ بات کسی قیامت سے کم نہیں تھی۔

دو ڈھائی سال سے شمعون ایک بات ضرور محسوس کر رہا تھا۔ اس نے اپنے لیے ساحرہ کی محبت میں کوئی کمی تو نہیں محسوس کی تھی لیکن ایسا ضرور ہوتا رہا تھا کہ جب بھی اس نے مستقبل کی کسی منصوبہ بندی کے بارے میں بات چھیڑی، ساحرہ نے کبھی تو بڑی خوب صورتی سے گفتگو کا موضوع بدلا اور کبھی کبھی اس کی کوشش بے ڈھنگی بھی محسوس ہوئی۔ شمعون جب اس بارے میں کچھ کہتا تو وہ ہنس کر ٹال جاتی تھی۔ ایسے موقعوں پر وہ کچھ اس قسم کے جملے کہتی۔

"ابھی سے ایسی منصوبہ بندیوں کی آخر ضرورت ہی کیا ہے!"

لیکن آج جب شمعون نے اس سے کہا تھا کہ وہ گریجویشن کرچکی ہے لہٰذا اب شادی میں تاخیر کیوں کی جائے۔ شمعون یہ تو اسے پہلے ہی بتا چکا تھا کہ وہ اپنے والدین سے بات کرچکا ہے اور انہیں اس کی پسند کی شادی پر کوئی اعتراض ہی نہیں ہے۔ خود ساحرہ بھی ابتدا ہی میں کہہ چکی تھی کہ اس کے گھر والوں کو بھی اس کی خواہش پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا لیکن اب اس فیصلہ کن موڑ پر آکر اس نے یہ جملہ کہا تھا جس کی شمعون کو ذرا بھی توقع نہیں تھی۔

"نہیں کرسکتی۔" شمعون بولا۔ "یہی کہا ہے نا تم نے؟"

"ہاں۔"

"یہ نہیں کہا کہ تم مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتیں یا

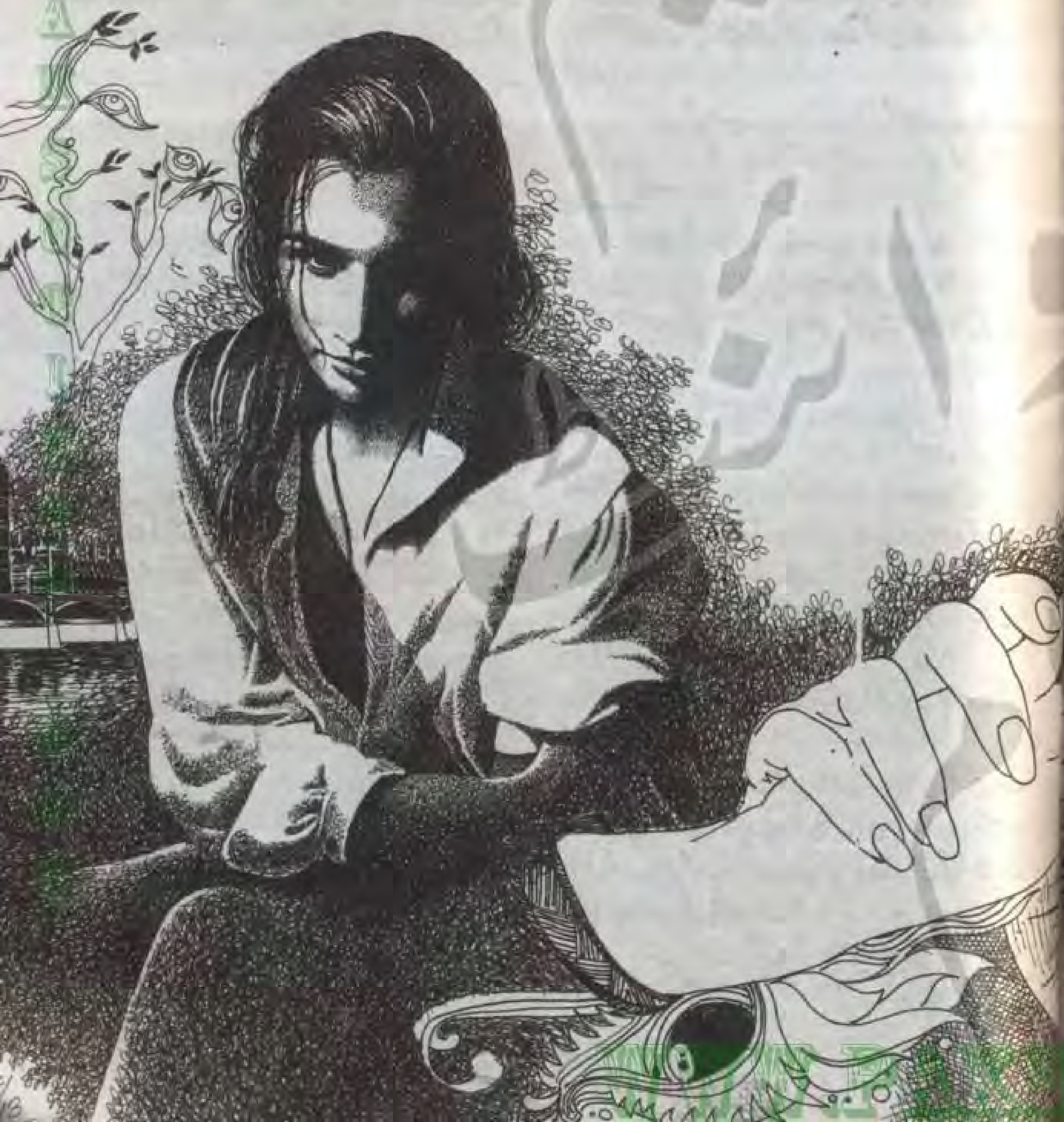

WWW.PAKSOCIETY.COM

نہیں کروگی۔"
"ہوں۔" ساحرہ کی نظریں جھک گئیں۔
"اس کا مطلب ہے کہ کوئی رکاوٹ آگئی ہے جس کے باعث تم مجھ سے شادی نہیں کرسکتیں۔ تم نے بہت ابتدا میں کہا تھا کہ تمہارے گھر والوں کو اس معاملے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ کیا اب ان کی سوچ بدل گئی ہے؟"
"یہ بات نہیں شمعون!" ساحرہ کچھ افسردہ ہوگئی۔
"انہیں اب بھی کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔ اعتراض تو تمہارے گھر والوں کو ہوگا جب وہ رشتے کی بات کرنے ہمارے گھر آئیں گے۔"
شمعون ہنس پڑا۔ "کیا بے تکی بات کر رہی ہو تم! انہیں کوئی اعتراض کیسے ہوسکتا ہے...... تم پڑھی لکھی ہو، خوب صورت ہو، آسودہ حال ہو۔ تمہارے والد لندن میں خاصا بڑا کاروبار کرتے ہیں۔ مالی طور پر ہم دونوں کے گھر ایک دوسرے کے برابر ہیں۔ اعتراض کہاں سے ٹپک پڑے گا؟"
"میرا بھائی......" ساحرہ کی آواز کانپ گئی۔ وہ اپنا جملہ پورا نہیں کرسکی تھی۔
"کیا تمہارا بھائی!...... کیا مطلب؟"
"نشاط......" ساحرہ پھر کچھ کہتے کہتے رک گئی۔
"پوری بات کہو ساحرہ!" شمعون بے چینی سے بولا۔ "نام تو میں جانتا ہوں تمہارے بھائی کا! سترہ سال کا ہوچکا ہے اب وہ......! تم اپنی بہنوں کے نام اور عمریں بھی بتا چکی ہو۔ ان کی تعلیم کے بارے میں بھی بتا چکی ہو۔ اپنے گھر کے بارے میں سبھی کچھ بتا دیا ہے تم نے، اور میں نے بھی تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے۔ نشاط کے بارے میں تم کیا کہنا چاہتی ہو؟...... وہ تمہاری صرف ایک بہن سے بڑا ہے، باقی سب سے چھوٹا ہے۔ اگر اس کی طرف سے کوئی اعتراض ہے تو یہ بات میرے لیے ناقابل فہم ہوگی۔"
"اسے بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا شمعون......! ابھی میں نے کہا نا کہ اعتراض تمہارے گھر والوں کو ہوگا نشاط کو دیکھ کر!"
"کیوں؟"
"بات کچھ ایسی ہی ہے۔ بتاتے ہوئے بھی اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ میں تم سے جو وعدہ کرچکی ہوں شمعون، یقین کرو کہ اس پر قائم رہوں گی۔ میری شادی اگر ہوگی تو صرف تم ہی سے ہوگی ورنہ کسی سے نہیں ہوگی، کبھی نہیں ہوگی۔"
ساحرہ کی آواز بھرا گئی۔
شمعون اس کا منہ تکنے لگا، پھر کچھ توقف سے بولا۔ "تم کوئی صحیح بات نہ بتا کر میری الجھن بڑھا رہی ہو ساحرہ!"
"شمعون!" ساحرہ نے اپنی آواز پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "سنتے ہیں کہ یہ دنیا، امید پر قائم ہے۔ ہمیں بھی امید رکھنا چاہیے کہ ایک آدھ سال میں نشاط ٹھیک ہوجائے گا۔"
شمعون چونکا۔ "کیا وہ بیمار ہے؟"
ساحرہ کے چہرے سے ظاہر ہوا کہ وہ سوچ میں پڑ گئی تھی، پھر اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "بیمار!...... ہاں یہ بھی کہا جاسکتا ہے۔"
"کیا بیماری ہے اسے؟ کس اسپتال میں ہے وہ؟" شمعون تیزی سے بولا۔ "اور تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟"
"وہ کسی اسپتال میں نہیں ہے۔ گھر پر ہی ہے۔ صحت بھی ٹھیک ہے اس کی۔"
"صحت بھی ٹھیک ہے اس کی!" شمعون نے حیرت سے دُہرایا۔ "تو پھر بیماری......؟ اوہ!...... کیا کوئی ذہنی معاملہ ہے؟"
"ذہنی۔" ساحرہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ "نہیں، ڈاکٹر کے خیال کے مطابق یہ ذہنی مسئلہ نہیں ہے۔"
"صحت بھی ٹھیک ہے اس کی۔" شمعون نے پھر دُہرایا۔ "یعنی وہ جسمانی طور پر بیمار نہیں ہے اور ذہنی طور پر بھی ٹھیک ہے، تو پھر یہ ڈاکٹر کا کیا معاملہ ہے؟"
"پلیز! پلیز شمعون!" ساحرہ کی آنکھوں میں پھر آنسو آگئے۔ "بات ایسی ہے کہ مجھے بتاتے ہوئے اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ پلیز! ایک آدھ سال انتظار کرلو۔ امید تو دلائی گئی ہے کہ نشاط ٹھیک ہوجائے گا۔"
"کیا ٹھیک ہوجائے گا؟ کچھ بتاؤ ساحرہ...... امیرا دماغ تو سوچ سوچ کر پھٹنے لگے گا۔"
"پلیز شمعون! میری خاطر سہی! تم یہ نہ پوچھو۔ شرم محسوس کروں گی میں!"
"کیا وہ...... معاف کرنا ساحرہ......! اس قسم کی بات مجھے زبان پر نہیں لانا چاہیے لیکن تمہاری رازداری مجھے یہ سوال کرنے پر مجبور کررہی ہے۔ کیا نشاط ڈرگس کی لت میں پڑ گیا ہے؟ ہیروئن یا ایسا کوئی نشہ......"
"نہیں شمعون، نہیں۔" ساحرہ جلدی سے بولی۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"تو پھر......" شمعون اپنی بات مکمل نہیں کرسکا۔
ساحرہ کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ ساحرہ نے میز پر رکھا ہوا موبائل اٹھایا۔ وہ دونوں اس وقت ایک ریسٹورنٹ میں تھے۔
"ممی کا فون ہے۔" ساحرہ نے شمعون کو بتانے کے بعد کال ریسیو کی۔ "میں بس آرہی ہوں ممی جی......! پندرہ منٹ میں!" وہ کھڑی ہوگئی۔ "سوری شمعون!...... مجھے فوراً جانا ہوگا ورنہ ممی ناراض ہوں گی۔ ایک تقریب میں جانا ہے۔ وہ جو تم نے فون پر کہا تھا کہ اپنے گھر والوں کو میرے گھر بھیجنے والے ہو تو میں نے تم سے فوراً ملنے کے لیے کہا اور دوڑی چلی آئی ورنہ میرا آنا فی الحال بہت مشکل تھا۔"
ساحرہ کھڑی ہوئی تھی تو شمعون بھی کھڑا ہوگیا تھا اور ان دونوں کو کھڑا ہوتے دیکھ کر ویٹر جلدی سے ان کے قریب آگیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں رکھی ہوئی پلیٹ میں چائے کا بل تھا اور چائے انہوں نے پی ہی نہیں تھی۔ وہ باتیں کرتے رہے اور پیالیوں میں چائے ٹھنڈی ہوگئی۔

☆☆☆

شمعون اور ساحرہ کی ملاقات شام ہونے سے کچھ دیر پہلے ہوئی تھی۔ شمعون جب اپنے گھر پہنچا تو شام کی سرمئی فضا میں رات کا کاجل پھیلنے لگا تھا۔
شمعون اپنے کمرے میں جاکے بستر پر گر گیا۔ ساحرہ سے جدا ہونے کے بعد سے گھر پہنچنے تک اور گھر پہنچنے کے بعد بھی اس کا دماغ اسی سوال میں الجھا ہوا تھا کہ نشاط کے ساتھ آخر ایسا کیا معاملہ ہوا ہے جو ساحرہ بتانا نہیں چاہتی تھی۔
شمعون کے لیے ایک عجیب بات یہ بھی تھی کہ ساحرہ اور اس کے گھر والوں کو کسی تقریب میں جانا تھا۔ گویا نشاط کا معاملہ ایسا تشویشناک بھی نہیں تھا کہ اس کے گھر والے اس کی وجہ سے کسی تقریب کو نظر انداز کردیتے۔
شمعون کو بستر پر پڑے ایک گھنٹا گزر چکا تھا جب اس کی والدہ اسے آواز دیتی ہوئی اس کے کمرے میں آئیں۔ شمعون جلدی سے اٹھ بیٹھا۔
"کیا بات ہے بیٹا!" والدہ بولیں۔ "آج ہوا کیا ہے؟...... باہر سے جب بھی آتے ہو تو سب سے پہلے آکر میری گردن میں بانہیں ڈالتے ہو۔ آج یہ کیا ہوا کہ سیدھے اپنے کمرے میں آگئے اور گھنٹا بھر سے باہر بھی نہیں نکلے، اچانک کوئی پریشانی ہوگئی ہے کیا؟"
"نہیں ممی!" شمعون نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "ایسی کوئی تشویش ناک بات نہیں ہے کہ آپ الجھن میں پڑیں۔"
"اچھا!" والدہ ہنس کر اس کے قریب بستر پر ہی بیٹھ گئیں۔ "اگر تم کہتے ہو تو نہیں پڑتی الجھن میں......! میں تمہیں یہ بتانے آئی ہوں کہ میں نے ذرا دیر پہلے ساحرہ کی ممی کو فون کردیا ہے۔"
شمعون چونکا۔ یہ اس کے علم میں نہیں تھا کہ اس کی والدہ اور ساحرہ کی ممی میں بھی کبھی فون پر گفتگو ہوتی رہتی

قارئین متوجہ ہوں
پرچا نہیں ملتا
کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔
☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل فون نمبر
رابطے اور مزید معلومات کے لیے
ثمر عباس
03012454188
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کرسکتے ہیں
35802552-35386783-35804200
ای میل: jdpgroup@hotmail.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھی۔ شمعون کی خواہش جاننے کے بعد اس کی والدہ ہی نے پہل کی تھی اور ساحرہ کی ممی سے فون پر اپنا تعارف، ساحرہ اور شمعون کی دوستی کے حوالے سے کرایا تھا۔ فون پر ان کی گفتگو ہمیشہ رسمی ہوا کرتی تھی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ دونوں میں سے کسی نے کبھی ایک دوسرے کو اپنے گھر مدعو کیا ہو۔ سرسری انداز میں بھی ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ ساحرہ کی والدہ نے گریز کیوں کیا تھا، اس کی وجہ کچھ بھی ہو لیکن شمعون کی والدہ چاہتی تھیں کہ لڑکی والوں کے گھر پہلے لڑکے والوں کو جانا چاہیے۔

شمعون نے چونک کر پوچھا۔ ''کیوں کیا تھا فون ممی؟''

''کچھ ہی دن پہلے، تم ہی نے تو کہا تھا کہ بس اب چند دن کے اندر اندر مجھے اور تمہارے ڈیڈی کو ساحرہ کے گھر جانا ہوگا۔ اس کے بعد تم نے اس کی کوئی بات ہی نہیں کی۔ آج تمہارے ڈیڈی نے یہ ذکر چھیڑا تو فیصلہ ہوا کہ کل اتوار ہے لہٰذا کل ہی ساحرہ کے گھر ہولیا جائے۔ بس اس کے بعد ہی میں نے ساحرہ کی ممی کو فون کیا تھا کہ کل شام کی چائے ہم ان کے گھر پر پئیں گے۔''

''وہ کیا بولیں؟'' شمعون نے جلدی سے پوچھا۔

''وہ بے چاری کیا کہتیں جب کوئی خود ہی مہمان بننے کے لیے تیار ہو۔'' شمعون کی والدہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اور بچی تو وہ بھی نہیں ہیں۔ سمجھ گئی ہوں گی کہ ہم ساحرہ کے بارے میں بات کرنے کے لیے آنا چاہتے ہیں۔''

''مجھ سے تو پوچھ لیتیں ممی!''

''پوچھنے کی ضرورت کیا تھی بیٹا! تمہاری ہی باتوں سے ظاہر ہوا تھا کہ تمہیں بہت عجلت ہے۔ تمہارے ڈیڈی کہہ رہے تھے کہ اگر کل نہیں گئے تو پھر انہیں اگلے اتوار سے پہلے اتنی فرصت نہیں ملے گی کہ شام کو کہیں جاسکیں اور رات کو زبردستی کسی کا مہمان بننا تہذیب کے خلاف ہے۔ وہ کھانے کا وقت ہوتا ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر......'' شمعون اپنی بات پوری کیے بغیر خاموش ہوگیا۔

''بات کیا ہے شمعون!'' والدہ نے تعجب سے کہا۔ ''کیا تمہیں جلدی نہیں تھی؟''

''جلدی تو تھی ممی!'' جواب دیتے ہوئے شمعون نے بڑی بے بسی محسوس کی۔ وہ اور کیا کہہ سکتا تھا۔

''تو پھر اتنے پریشان سے کیوں ہوگئے؟''

''دراصل۔'' شمعون نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''میں چاہتا تھا کہ ساحرہ کو پہلے سے بتادوں۔''

''اچانک ہم لوگوں کی آمد سے وہ زیادہ خوش ہوگی۔'' والدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اور وہ خوش ہو بھی چکی ہوگی کہ ہم کل آرہے ہیں۔ وہ بھی ساتھ تھی اپنی ماں کے۔ پہلے تو میں نے ان کے گھر ہی ٹیلی فون کیا تھا لیکن ملازمہ نے بتایا کہ گھر والے ابھی ابھی کہیں گئے ہیں۔ تب میں نے ان کے موبائل پر رابطہ کیا تھا۔ ان سے باتیں ہوئیں، تو یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ کسی کی منگنی کی تقریب میں جارہی تھیں۔ ساحرہ کے علاوہ دو اور بیٹیاں بھی ساتھ تھیں ان کے......! ایک بیٹی اور بیٹے کو وہ کسی وجہ سے ساتھ نہیں لے گئی ہوں گی۔''

شمعون اس خیال سے پریشان ہوگیا کہ ساحرہ نے جانے کیا سوچا ہوگا۔ گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا پہلے ہی تو وہ اس سے ایک سال انتظار کرنے کے لیے کہہ چکی تھی۔

''تم اتنے پریشان کیوں نظر آنے لگے شمعون!'' والدہ نے کہا۔ ''کوئی خاص حرج تو نہیں ہوا کہ تم خود ساحرہ کو پہلے سے نہیں بتاسکے۔''

''جی ممی!'' شمعون نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔ ''حرج تو کوئی خاص نہیں ہوا۔ میں پریشان بھی نہیں ہوں۔ جب آپ کہہ چکی ہیں ان سے تو پھر جانا ہی چاہیے۔ اب تو آپ کا نہ جانا اخلاق اور تہذیب کے خلاف ہوگا۔''

صورت حال اچانک ایسی بدلی تھی کہ شمعون کے اختیار میں کچھ نہیں رہا تھا۔ یہ بات طے پاگئی تھی کہ اسے ساحرہ کی خفگی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

رات ایک بجے کے قریب ساحرہ کی کال آگئی۔ وہ لوگ شاید اسی وقت تقریب سے واپس لوٹے ہوں گے۔

''مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی شمعون!'' وہ گلوگیر آواز میں کہہ رہی تھی۔ ''میری بات کو ذرا بھی اہمیت نہیں دی تم نے......! صرف ایک گھنٹے بعد ہی اپنی والدہ سے ممی جی کو فون کروا دیا کہ......''

''میں نے ممی سے نہیں کہا تھا ساحرہ!'' شمعون نے جلدی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''تم یا تمہاری کوئی بات میرے لیے کتنی اہم ہوسکتی ہے، اس کا اندازہ تو تمہیں ہونا چاہیے تھا۔''

''تو پھر ایسا کیوں ہوا؟''

جواب میں شمعون نے حقیقت بتا دی۔ ساحرہ وہ سب کچھ سن کر چپ رہ گئی۔

''اب بتاؤ!'' شمعون پھر بولا۔ ''اس میں میری کیا غلطی ہے؟...... کیا میں ممی سے کہہ سکتا تھا کہ تمہاری ممی سے بات کرلینے کے باوجود وہ کل تمہارے گھر نہ جائیں۔''

دوسری طرف ساحرہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

''جواب دو ساحرہ!'' شمعون زور دے کر بولا۔

''کیا جواب دوں!'' ساحرہ نے مردہ سے لہجے میں کہا۔ ''قدرت کو شاید یہی منظور تھا کہ میں جس بات سے ڈر رہی تھی، وہ ہوکر رہے۔ اب تو کل تمہیں جو ذہنی جھٹکا لگے گا، اس کا خیال آرہا ہے مجھے!''

''کیا ذہنی جھٹکا لگ سکتا ہے مجھے!''

''کل تمہیں اپنے ڈیڈی ممی سے وہ بات معلوم ہوجائے گی جو اگر میں تمہیں بتاتی تو بڑی خجالت کے ساتھ بتا پاتی۔''

''نشاط کے بارے میں؟''

''ہاں۔'' ساحرہ نے جواب دیا۔ پھر بولی۔ ''ابھی ذرا دیر پہلے فون پر ممی اور پاپا جی میں باتیں ہورہی تھیں۔ تمہارے ڈیڈی اور ممی کے آنے کا مقصد تو ظاہر ہی ہے۔ ممی کہہ رہی تھیں کہ اس موقع پر نشاط کو کہیں بھیج دیا جائے۔ یعنی وہ تمہارے ڈیڈی اور ممی کے سامنے نہ آسکے لیکن میں نے شدت سے اس کی مخالفت کی ہے۔ میں نے ممی سے کہہ دیا ہے کہ ایسا ہرگز نہ کیا جائے، شمعون کے والدین کو دھوکے میں رکھنا ایسا ہی ہوگا جیسے میں نے شمعون کو دھوکا دیا ہو۔ ممی نے مجھے اپنے نظریے کے مطابق سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن میں اپنی بات پر اڑی رہی کہ جو بات بھی ہے، وہ چھپانا نہیں چاہیے۔ اس کے بعد تمہارے ڈیڈی ممی جو بھی فیصلہ کریں۔''

اب شمعون نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''سوچ سوچ کر میرا دماغ پک گیا ہے کہ نشاط کا معاملہ آخر ہے کیا!''

''اب کل تو تمہیں معلوم ہو ہی جائے گا۔''

''جب مجھے معلوم ہوجائے گا تو اب تم ہی بتادو مجھے!''

''اب تو بتا ہی دوں گی۔ پوری تفصیل سے بتادوں گی۔ تفصیل تو تمہارے ڈیڈی ممی کو بھی معلوم نہیں ہوسکے گی نا!''

''تو بتاؤ۔''

''کل کے بعد ہی بتاؤں گی۔''

شمعون نے اصرار کرنا چاہا لیکن ساحرہ جلدی سے بولی۔ ''میں فون بند کررہی ہوں۔ پاپا جی کے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی ہے۔ شاید اب وہ آرہی ہیں مجھے سمجھانے۔''

شمعون کو مزید کچھ کہنے کا موقع نہیں مل سکا کیونکہ ساحرہ نے اپنی بات مکمل کرتے ہی رابطہ منقطع کردیا تھا۔

اس رات شمعون کو ٹھیک سے نیند نہیں آسکی۔ اگلا دن بھی جیسے تیسے گزرا۔ شام کو وہ اس وقت گھر پر ہی تھا جب اس کے والد اور والدہ ساحرہ کے گھر روانہ ہوئے۔ واپسی میں دو گھنٹے تو لگ جائیں گے انہیں، شمعون نے ٹہلتے ہوئے سوچا۔ اس کا دماغ سوچتے سوچتے اتنا دکھنے لگا تھا کہ اسے ''پھوڑا'' کہا جاسکتا تھا۔ کسی طرح بھی وہ یہ اندازہ لگانے سے قاصر رہا تھا کہ ساحرہ کے بھائی میں ایسی کیا بات ہوسکتی ہے جسے دیکھ کر ساحرہ سے اس کا رشتہ کرنے میں اس کے والدین کو یا ان میں سے کسی ایک کو بھی اعتراض ہو یا وہ تذبذب کا شکار ہوجائیں۔

عالم اضطراب میں اس نے ایک مرتبہ موبائل پر ساحرہ سے رابطہ کرنا چاہا لیکن بات نہیں ہوسکی۔ دوسری طرف گھنٹی تو بجتی رہی تھی مگر کال ریسیو نہیں کی گئی تھی۔

کچھ ناراض تو وہ ہے، شمعون نے سوچا۔

وہ ڈرائنگ روم میں ٹہلتا رہا لیکن جب قریب قریب دو گھنٹے بعد اس نے باہر کار رکنے کی آواز سنی تو اپنے کمرے میں آکر ٹہلنے لگا۔ اس نے انجن کی آواز سے اندازہ لگالیا تھا کہ وہ اس کے والد ہی کی کار تھی۔

ٹہلتے ہوئے اسے گمان تھا کہ اس کی والدہ اسے کچھ بتانے فوراً اس کے کمرے میں آئیں گی لیکن پندرہ منٹ گزر جانے کے بعد بھی وہ نہ آئیں تو اس کے اضطراب میں مزید اضافہ ہوگیا۔ وہ جلد از جلد کچھ نہ کچھ معلوم کرلینا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا کہ خود ہی اپنی والدہ کے پاس جائے لیکن ابھی اس نے اپنے ارادے کو عملی جامہ نہیں پہنایا تھا کہ ایک ملازم آیا۔

''آپ کو بڑے صاحب یاد کررہے ہیں۔'' اس نے کہا۔

اس اطلاع سے شمعون کی پریشانی میں اور اضافہ ہوگیا۔ ساحرہ کے معاملے میں اس کی بات چیت صرف والدہ سے ہوئی تھی لیکن اب اس معاملے میں اسے اس کے والد نے طلب کیا تھا۔ یہ پہلا موقع ہوتا جب وہ ساحرہ کے معاملے میں اپنے والد کے سامنے جاتا۔ اس کی دانست میں اس وقت اس کی طلبی کسی اور معاملے میں ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

بہرحال وہ اپنے والد کے کمرے میں پہنچا۔ اس کی والدہ بھی موجود تھیں۔ دونوں کے چہروں پر خاصی سنجیدگی تھی جس سے شمعون کی پریشانی بڑھ گئی۔ اسے ساحرہ کی بات بھی یاد آئی کہ اعتراض تو تمہارے گھر والوں کو ہوگا۔

''بیٹھو!'' اس کے والد بولے۔

شمعون بیٹھ گیا۔ اس نے ایک نظر اپنی والدہ پر ڈالی جنہوں نے اس سے نظریں نہیں ملائیں۔ وہ اپنے والد کی طرف متوجہ ہوگیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"شمعون!" اس کے والد ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ "یہ کہنے کی ضرورت تو نہیں کہ تم ہمارے اکلوتے بیٹے ہو اور ہم نے تمہاری پرورش اور تربیت بڑے ناز نعم سے کی ہے۔ تمہاری کوئی ایسی خواہش نہیں جو ہم نے پوری نہ کی ہو لیکن اس موقع پر میں اور تمہاری والدہ تذبذب کا شکار ہو گئے ہیں۔ ساحرہ کے گھر سے آنے کے بعد بھی ہم کچھ دیر تک اس معاملے پر بات کرتے رہے ہیں۔"

شمعون ساکت بیٹھا باپ کی طرف دیکھتا رہا۔

وہ کچھ توقف سے بولے۔ "ساحرہ کی والدہ بہت اچھی خاتون ہیں۔ ساحرہ کی بہنوں کے بارے میں کوئی منفی سوچ ممکن نہیں اور ساحرہ! میں سمجھتا ہوں کہ تمہارا انتخاب کسی اعتبار سے بھی غلط نہیں۔ اس کو اپنی بہو بنانے میں ہمیں تو کیا، کسی کو بھی ہچکچاہٹ نہیں ہو سکتی تھی، لیکن اس کا چھوٹا بھائی...... نشاط......" وہ چپ ہو گئے۔ شمعون نے محسوس کیا کہ وہ دانستہ خاموش ہوئے تھے اور کچھ سوچنے لگے تھے۔

اب شمعون کے دل کی دھڑکنیں کچھ اور تیز ہو گئیں لیکن اس نے نشاط کے بارے میں کوئی استفسار نہیں کیا۔ خاموشی سے والد ہی کے بولنے کا انتظار کرتا رہا جو طویل نہیں تھا۔

"نشاط تھوڑی دیر کے لیے ہمارے سامنے آیا تھا۔" وہ بولے۔ "چائے میں بھی وہ ہمارے ساتھ شریک نہیں ہوا۔ غالباً اسے پہلے سے ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ ہمارے ساتھ زیادہ نہ بیٹھے اور شاید یہ بھی ضروری سمجھا گیا تھا کہ ہم اسے دیکھ لیں۔"

شمعون کا دل دھڑکتا رہا۔ اس کے والد رک رک کر بات کر رہے تھے۔

"تم کبھی نشاط سے ملے ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی نہیں۔" شمعون پہلی مرتبہ بولا۔

"ساحرہ نے بھی تمہیں اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟"

شمعون وہ باتیں نہیں بتانا چاہتا تھا جو ساحرہ سے ہوئی تھیں۔ وہ آہستہ سے بولا۔ "بس اتنا بتایا تھا کہ نشاط کچھ بیمار رہتا ہے۔"

"بیمار۔" والد آہستہ سے بولے اور پھر انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "ہاں ایک اعتبار سے اسے بیماری بھی کہہ سکتے ہیں۔"

اب شمعون کو اپنا دماغ چٹختا ہوا سا محسوس ہونے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ جو بات بھی ہے، جلد از جلد اس کے سامنے آ جائے۔

"وہ لڑکا......" والد کچھ رک کے، پھر کہا۔ "لڑکا نہیں ہے۔"

شمعون چونکا۔ "میں سمجھا نہیں۔"

"لڑکوں جیسی کوئی بات نہیں ہے اس میں۔" والد نے کہا۔ "اس کے بال اتنے لمبے ہیں کہ اس کے شانوں سے نیچے تک ہیں، وہ سبز پھولوں کی سلکی قمیص اور سبز شلوار پہنے ہوئے تھا۔ اس کی حرکات و سکنات بالکل لڑکیوں جیسی ہیں۔ اپنا نام بتاتے ہوئے اس نے لڑکیوں کی طرح شرما کر اپنی انگلی دانتوں میں دبائی تھی۔ وہ چلتا بھی لڑکیوں کی طرح ہے۔ جتنی دیر وہ بیٹھا، اس نے کوئی بات نہیں کی۔ نظریں جھکائے خاموش رہا۔ وہ انداز بھی لڑکیوں جیسا تھا۔"

شمعون اپنے والد کا منہ تکتا رہا جو کہہ رہے تھے۔

"اس کے جانے کے بعد اگر ہم اس کے بارے میں کوئی سوال کرتے تو وہ تہذیب کے خلاف ہوتا۔ اس کی والدہ نے بھی ہمیں اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ وہ بس کچھ خجل سی نظر آنے لگی تھیں۔ ساحرہ بھی سنجیدہ اور خاموش رہی تھی۔ ہم کچھ دیر بیٹھ کر چلے آئے۔" والد خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگے۔ وہ شمعون سے نظریں نہیں ملا رہے تھے۔

شمعون نے والدہ کی طرف دیکھا۔ وہ اس وقت اسی کی طرف متوجہ تھیں۔ انہوں نے اس کی آنکھوں کا سوال سمجھ لیا اور بولیں۔ "ہاں! ہم نے ساحرہ کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔"

پھر والد بول پڑے۔ "پہلی ملاقات تھی۔ میں نے مناسب نہیں سمجھا۔"

شمعون ہمت کر کے بولا۔ "پہلی ملاقات کی وجہ سے ڈیڈی......؟ یا نشاط کی وجہ سے!"

"ہوں۔" والد نے سر ہلایا۔ "تم ٹھیک سمجھے...... ! تم خود سوچو شمعون! شادی میں خاندان کے لوگ تو شریک ہوں گے ہی۔ اس کے علاوہ میرے جاننے والوں کا حلقہ بھی بہت بڑا ہے، کسی سے یہ بات چھپ تو نہیں سکے گی کہ وہ ساحرہ کا بھائی ہے۔ بڑی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے گا شمعون!...... خاندان کے لوگ تو شاید پیٹھ پیچھے مذاق بھی اڑائیں۔ بالفرض ہم تمہاری شادی خاموشی سے کر ڈالیں، تو بھی نشاط کا اپنی بہن کے پاس آنا جانا تو ہوگا۔ خاندان کے لوگ اسے کسی نہ کسی وقت دیکھ تو لیں گے۔ ہمارے ملازمین بھی ہیں۔ انہیں ہمارے سامنے تو کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہو گی لیکن وہ اکیلے میں، آپس میں اس پر تبصرے تو کریں گے۔ کیا یہ سب کچھ ہمارے لیے شرمندگی کا باعث نہیں بنے گا؟"

شمعون خود کو بے جان سا محسوس کرنے لگا۔ اس کے والد نے جو کچھ کہا تھا، اس میں غلط بات کوئی نہیں تھی۔

"زمانہ بڑا عجیب سا آ گیا ہے۔" والد نے کچھ رک کر کہا۔ "اس معاملے میں نوجوان کبھی کبھی خودسر بھی ہو جاتے ہیں۔ خواہ وہ لڑکے ہوں...... یا لڑکیاں......! ماں باپ کی پروا کیے بغیر از خود قدم اٹھا لیتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا...... ویسے مجھے تم سے اس کی توقع تو نہیں، تاہم میں کہہ رہا ہوں کہ...... دراصل تمہاری والدہ مجھے تمہارے اس خیال سے آگاہ کر چکی ہیں کہ اگر تمہاری شادی ساحرہ سے نہ ہوئی تو پھر کسی سے بھی نہیں کرو گے۔ ایسی صورت میں تمہاری اور ساحرہ کی شادی کا صرف ایک راستہ رہ جاتا ہے۔ اگرچہ وہ راستہ ہمارے لیے تکلیف دہ ہوگا لیکن تمہاری خاطر ہم وہ تکلیف برداشت کر لیں گے۔"

شمعون سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

"تمہاری شادی میں۔" والد نے پھر کچھ رک کر کہا۔ "وہ لوگ خواہ کتنے ہی لوگوں کو مدعو کریں، میں کسی کو مدعو نہیں کروں گا۔ بس تمہاری والدہ ہوں گی اور میں ہوں گا۔ فوری طور پر میں تمہارے لیے ایک بنگلا خرید لوں گا۔ شادی کے بعد تم ساحرہ کو اسی بنگلے میں لے جاؤ گے۔ پھر جلد ہی میں یہ کوشش بھی کروں گا کہ تم دونوں کو امریکا یا برطانیہ کی شہریت دلوا دوں۔"

اس وقت شمعون کی والدہ بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔ "سال میں ایک آدھ بار تم ہم سے ملنے آ جایا کرنا۔ ایک آدھ بار ہم آ جایا کریں گے۔"

"نہیں۔" والد بول پڑے۔ "ہم ہی سال میں ایک کے بجائے دو چکر لگا لیا کریں گے۔ ان دونوں کا آنا مناسب نہیں ہوگا۔ یہ آئیں گے تو ان سے ملنے نشاط بھی آئے گا۔ ہم اس پر کوئی پابندی تو نہیں لگا سکیں گے۔ وہ آئے گا تو ملازمین کے علاوہ بھی کسی کی نظر میں آ سکتا ہے۔ باتیں تو بنیں گی۔ کہا تو جائے گا کہ اس گھر کی بہو کا بھائی......" وہ خاموش ہو گئے غالباً وہ نشاط کے لیے کوئی ایسا لفظ اپنی زبان پر نہیں لانا چاہتے تھے جو شمعون کو ذرا بھی گراں گزرے۔ فی الحال وہ اس کی بیوی کا نہ سہی، اس کی محبوبہ کا بھائی تو تھا۔

"اس راستے پر تو نہیں چلا جا سکتا ڈیڈی!" شمعون نے ہمت کر کے مضبوط لہجے میں کہا۔ "یہ نہ تو میں گوارا کروں گا اور میرے خیال میں ساحرہ کو بھی یہ منظور نہیں ہوگا۔ ساحرہ کے گھر والوں کو بھی اس سے اختلاف ہو سکتا ہے۔"

"تو پھر...... اگر تم کوئی معقول تجویز پیش کر سکو تو...... میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟"

"جی!" شمعون نے نظریں جھکا لیں۔

"جو کچھ میں نے کہا ہے، وہ صرف میرے خیالات نہیں ہیں بیٹے! تمہاری والدہ مجھ سے متفق ہیں۔ ساحرہ کے گھر سے واپسی پر...... اور واپس آنے کے بعد بھی پندرہ منٹ تک ہم یہی باتیں کرتے رہے تھے۔"

شمعون کا دماغ چکرایا ہوا تھا۔ وہ اب اس معاملے میں ساحرہ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ والدین سے اجازت لے کر وہ کمرے سے نکل آیا اور اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اس نے موبائل پر ساحرہ سے رابطہ کیا۔

اس مرتبہ ساحرہ نے کال فوراً ریسیو کی تھی۔

"کیا بتایا تمہارے والدین نے؟" ساحرہ کے لہجے میں مردنی تھی۔ اسے شروع ہی سے اندازہ تھا کہ شمعون کے والدین کا کیا ردعمل ہوگا۔

شمعون بولا۔ "میں ابھی تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے؟"

"آ جاؤں گی۔" ساحرہ نے کہا۔ "اسی ریسٹورنٹ میں؟"

"ہاں۔"

"میں پانچ منٹ میں روانہ ہو جاؤں گی۔"

"میں فوراً روانہ ہو رہا ہوں۔ انتظار کر لوں گا اگر تمہیں کچھ دیر لگی۔"

شمعون نے رابطہ منقطع کیا اور واپس مڑا۔ وہ اپنے کمرے تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ بیرونی دروازے کا رخ کرتے ہوئے اس نے موبائل پر اپنی والدہ کو مطلع کر دیا کہ وہ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے لیے کہیں جا رہا ہے۔

اس کی والدہ سمجھ گئیں اور بولیں۔ "ساحرہ کو پریشان مت کرنا۔"

"جی۔" شمعون نے اتنا ہی کہا۔ اس کے خیال میں بات ایسی تھی ہی نہیں کہ وہ ساحرہ کو پریشان کرتا اور وہ یہ بھی سمجھ چکا تھا کہ ساحرہ تو بہت عرصے سے پریشان تھی۔ نشاط میں مبینہ تبدیلی نہ جانے کب سے آئی تھی۔

ریسٹورنٹ میں ان دونوں کی ملاقات ہوئی۔

"میں تمہارے فون سے ہی سمجھ گئی تھی اور اب تمہارا چہرہ بھی بتا رہا ہے کہ میرا اندیشہ غلط نہیں تھا۔ ویسے میں جاننا ضرور چاہتی ہوں کہ کیا باتیں ہوئیں تم سے تمہارے والدین کی۔" ساحرہ نے کہا۔

شمعون نے بے کم و کاست سب کچھ بیان کر دیا۔

ساحرہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ "ہمارا گھر پہلے ہی اس قسم کی صورت حال سے دوچار ہے۔ خاندان بھر میں باتیں ہو رہی ہیں کہ نشاط مخنث بنتا جا رہا ہے یا بن گیا ہے۔"

"تمہیں مجھ سے یہ سب چھپانے کی ضرورت کیا تھی ساحرہ!"

WWW.PAKSOCIETY.COM

''کیا اپنے سگے بھائی کے بارے میں یہ سب کچھ بتاتے ہوئے شرمندگی نہیں ہوتی؟ کیا یہ ایسی بات ہے کہ بے دریغ بتائی جاسکے؟''

''کم از کم مجھے تو بتا سکتی تھیں۔ خیر چھوڑو!...... نشاط میں یہ تبدیلی کب سے آئی ہے؟''

''بچپن ہی سے وہ ایسا ہے۔'' ساحرہ نے افسردگی سے کہا۔ ''جب وہ چھوٹا تھا تو کسی نے اس بات کو اہمیت ہی نہیں دی۔ اس کی ان حرکتوں پر بس ہنس پڑتے تھے۔ بعض اوقات ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوجاتے تھے۔ خیال تھا کہ جیسے جیسے وہ بڑا ہوگا، خود ہی یہ حرکتیں چھوڑتا چلا جائے گا۔ اس پر روک ٹوک اس وقت شروع ہوئی جب وہ سات آٹھ سال کا ہوگیا لیکن اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ بس ڈر کر چھوٹی بہن کے ساتھ کمرے میں بند ہوجاتا تھا۔ وہ تعلیم بھی حاصل نہیں کرسکا۔ اسکول میں اس کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ اس لیے اس نے اسکول جانا ہی چھوڑ دیا۔ ممی جی نے گھر پر ٹیوٹر رکھا۔ بس اسی طرح پڑھا ہے اس نے، جتنا بھی پڑھا ہے۔''

''مگر وہ ایسا بن کیسے گیا؟''

''بعد میں نہیں بنا۔ پیدائشی طور پر ایسا ہے۔ تم جانتے ہو، ڈیڈی تو دس سال سے بیرون ملک ہیں۔ سال میں ایک آدھ بار آتے ہیں۔ انہوں نے فون پر یہیں کے کسی شناسا ڈاکٹر سے بات کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب گھر آئے تھے اور دو سال تک آتے رہے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ نشاط میں میڈیکل نقطۂ نظر سے بہت زیادہ مردانہ غدود... کی کمی رہ گئی ہے لیکن وہ اس کا علاج کریں گے۔ دو سال تک علاج ہوتا رہا، کوئی فرق نہیں پڑا۔ میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب صرف تجربات کرنے میں لگ گئے تھے۔ پھر کسی نے مشورہ دیا تو ان کا علاج چھڑوا کر ایک ماہر نفسیات کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اس بات کو بھی ایک سال گزر چکا ہے لیکن سائیکاٹرسٹ چاہتا ہے کہ اسے مزید ایک سال کا موقع دیا جائے۔ کیونکہ اور کوئی راستہ نظر نہیں آتا اس لیے معاملہ یوں ہی چل رہا ہے۔ بس سائیکاٹرسٹ کے کہنے کی وجہ سے امید باندھ لی ہے کہ شاید وہ سال بھر میں ٹھیک ہوجائے یا اس کے ٹھیک ہوجانے کی علامات ہی نظر آنے لگیں۔'' ساحرہ نے تفصیل سے سب کچھ بتا دیا، پھر کہا۔ ''اب ایک نئی پریشانی یہ کھڑی ہوگئی ہے کہ نہ جانے کہاں سے اسے ایک خواجہ سرا مل گیا۔ اس سے بڑی گہری دوستی ہوگئی ہے اس کی۔ خواجہ سرا کا نام زینت ہے۔''

شمعون جو بڑی تشویش سے سب کچھ سنتا رہا تھا، چونک کر بولا۔ ''تمہاری یہ آخری بات تو خاصی پریشان کن ہے۔''

''ہاں شمعون!'' ساحرہ نے دل گرفتہ آواز میں کہا۔ ''ہم بھی اس خیال سے پریشان ہیں کہ وہ کہیں خواجہ سراؤں ہی کے کسی گروپ سے نہ جا ملے...... ! ڈیڈی تو جب بھی آتے ہیں، نشاط کی حرکتیں دیکھ کر آپے سے باہر ہونے لگتے ہیں، وہ بہت غصہ ور ہیں۔ انہوں نے تو چاہا تھا کہ نشاط کو گھر سے نکال دیا جائے لیکن ممی جی نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ ان کا کہنا ہے کہ مستقبل میں نشاط کے ساتھ جو کچھ بھی ہو، وہ ہو، اس وقت دیکھا جائے گا۔ اگر نشاط کو ابھی گھر سے نکال دیا گیا تو جو کچھ عرصے بعد ہونا ہے، وہ ابھی ہوجائے گا۔''

''ماہر نفسیات کر کیا رہا ہے؟''

''ابھی تک تو نشاط کو صرف لیکچر ہی دیتا رہا تھا لیکن اب اس نے کچھ دوسرے اقدامات کا مشورہ بھی دیا ہے۔ اس کی ایک بات پر عمل بھی کیا جا رہا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ نشاط کیونکہ لڑکیوں کا نام بھی ہوتا ہے اس لیے اس کا نام بدل دیا جائے۔ اب گھر میں اسے صرف حیدر کہہ کر پکارا جاتا ہے لیکن نشاط کو یہ برا لگتا ہے۔ ماہر نفسیات کے خیال کے مطابق نشاط کو کیونکہ گھر میں صرف عورتوں کی صحبت ملی ہے لہٰذا اس پر اس کا بھی اثر ہوسکتا ہے۔ ہمارے گھر میں کوئی مرد نہیں ہے نا...... ! ڈیڈی تو پندرہ سال سے باہر ہیں۔ بس ہم بہنیں ہیں اور وہ ہے۔ اس بارے میں ڈیڈی کی بات اپنے بھائی سے بھی ہوئی تھی۔ وہ لاہور میں رہتے ہیں۔ ان کے تین بیٹے ہیں۔ انہوں نے ڈیڈی کی یہ بات مان لی ہے کہ اپنے دو بیٹوں کو سال ڈیڑھ سال کے لیے ہمارے گھر میں چھوڑ دیں۔ کل یا شاید آج رات کل ہی کسی فلائٹ سے وہ یہاں آجائیں گے۔ تعلیمی سال اب شروع ہونے والا ہے اس لیے انہیں یہاں داخلہ مل جائے گا۔ ان کی تعلیم کا حرج نہیں ہوگا۔ گھر میں زیادہ سے زیادہ مردانہ ماحول بنانے کے لیے انہوں نے چاہا تھا کہ ہم چاروں بہنیں ڈیڈی کے پاس آجائیں اور وہیں تعلیم حاصل کریں۔ میں بھی وہاں مزید کچھ پڑھ لوں لیکن ممی جی مجھے وہاں بھیجنے کے لیے آمادہ نہیں ہوئیں۔ بات ان کی بھی ٹھیک ہے کہ پھر وہ بہت زیادہ تنہائی محسوس کریں گی۔ میری بہنوں کا ویزا ابھی دو ایک دن میں ملنے والا ہے۔ انہیں روانہ کرنے کی تیاریاں کرلی گئی ہیں۔ وہ ویزے ملتے ہی چلی جائیں گی۔ چچا زاد بھائی آجائیں گے۔ اس طرح گھر کے ماحول میں کچھ بدلاؤ تو آجائے گا۔ دیکھو کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ اسی لیے میں نے تم سے ایک سال انتظار کرنے کے لیے کہا تھا۔''

''اس خواجہ سرا سے اس کی جان چھڑانا بہت ضروری ہوگا ساحرہ!''

''ہاں، ضروری تو ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ کریں کیا...... ! جب بھی نشاط سے کہا جاتا ہے کہ وہ خواجہ سرا زینت سے ملنا چھوڑ دے تو وہ آپے سے باہر ہونے لگتا ہے۔ سرکش ہوگیا ہے اب وہ!''

''اس خواجہ سرا سے اس کی دوستی کا علم کب ہوا۔ کیا وہ نشاط سے ملنے گھر پہنچ جاتا ہے؟''

''اب تو ایسا بھی ہونے لگا ہے لیکن ان دونوں کے میل جول کا پتا اتفاق سے چلا تھا۔ وہ دونوں مجھے ایک ریسٹورنٹ میں نظر آئے تھے۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ میں نظر انداز کر کے گھر آگئی اور ممی جی کو بتایا۔ پھر جب وہ گھر آیا تو ممی جی نے اسے ڈانٹا ڈپٹا۔ بس وہیں سے اس کی سرکشی شروع ہوگئی۔ وہ کہنے لگا کہ زینت اس کی بہت اچھی دوست بن گئی ہے اور اگر اسے زینت سے ملنے سے روکا گیا تو وہ گھر چھوڑ کر چلا جائے گا۔''

''غلطی کی تھی تمہاری ممی جی نے۔'' شمعون نے کہا۔ ''جس طرح تم نے اسے نظر انداز کیا تھا، اسی طرح انہیں بھی نظر انداز کردینا چاہیے تھا۔ بات کھل گئی تو نشاط شیر ہوگیا اور خواجہ سرا کو گھر بھی بلانے لگا۔ بات نہ کھلتی تو شاید وہ اسے گھر بلاتے ہوئے ہچکچاتا۔''

ساحرہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ غالباً مجھ سے ہی غلطی ہوئی جو ممی جی کو بتا بیٹھی لیکن اب ان باتوں سے کیا فائدہ! تم نے سب کچھ جان لیا ہے، کچھ مشورہ دو!''

''کسی طرح اس خواجہ سرا سے تو نشاط کی جان چھڑانا ہی پڑے گی۔ وہ ایک خطرہ ہے۔ رہی نشاط میں تبدیلی کی بات تو اسے ماہر نفسیات پر ہی چھوڑو، ویسے میں اس کے بارے میں اپنے اسپتال کے ایک ڈاکٹر سے بات کروں گا۔ وہ بہت تجربہ کار ہیں۔ کوشش کروں گا کہ ان سے بات کرنے کا موقع مل جائے۔ میں تو ابھی ہاؤس جاب کر رہا ہوں۔ تمہیں معلوم ہی ہے۔''

''ہم لوگ بہت پریشان ہیں اس معاملے کی وجہ سے۔ نشاط ہمارا اکلوتا بھائی ہے۔'' ساحرہ کی آواز بھرا گئی۔ ''اگر وہ ہاتھ سے نکل گیا تو......'' ساحرہ کی آواز گھٹ گئی۔

''ہمت رکھو۔ دیکھیں گے، کیا کیا جاسکتا ہے۔'' شمعون نے کہا، پھر پوچھا۔ ''کیا وہ...... میرا مطلب ہے خواجہ سرا...... کیا روز گھر آنے لگا ہے؟''

''نہیں، اس کا کچھ طے نہیں ہے۔ کبھی ہفتے میں ایک بار آتا ہے تو کبھی دو تین بار آجاتا ہے۔''

''کتنی دیر ٹھہرتا ہے؟''

''کبھی جلدی چلا جاتا ہے، کبھی دو دو گھنٹے تک رکتا ہے۔''

''اب وہ جس دن آئے، مجھے موبائل پر فوراً اطلاع دینا۔''

''تم کیا کرو گے؟''

''پہلے تو میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ ابھی کچھ سوچا نہیں ہے میں نے!'' اس نشست میں ان دونوں نے اپنے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔

☆☆☆

دو دن بعد ساحرہ کے گھر کا ماحول خاصا بدلا ہوا تھا۔ اس کی تینوں بہنیں باپ کے پاس چلی گئی تھیں۔ ان کے دونوں چچازاد بھائی لاہور سے آگئے تھے۔ مسعود کی عمر اٹھارہ سال کے لگ بھگ تھی۔ فاران اس سے چھ سال بڑا اور کافی خوب صورت تھا۔

''آٹھ سال پہلے دیکھا تھا تمہیں!'' ساحرہ نے اس سے کہا۔ ''آٹھ سال میں بڑی وجاہت آگئی ہے تم میں!''

فاران نے اسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھا اور شوخ لہجے میں بولا۔ ''خوب صورت تو تم بھی بہت ہوگئی ہو ساحرہ!''

''کیا بکواس ہے...... آپا کہا کرو مجھے!...... جیسے مسعود کہتا ہے۔ چھ سال بڑی ہوں تم سے!''

''بڑی تو ہو لیکن بچپن کی عادت کیسے چھوٹ سکتی ہے۔ میں تمہیں ساحرہ ہی کہا کرتا تھا۔''

''اور ڈانٹ بھی سنتے تھے چچا جان کی۔''

''لیکن پھر بھی ساحرہ ہی کہتا رہا۔'' فاران ہنسا۔

''اب عادت بدلو اپنی!'' ساحرہ نے سنجیدگی سے کہا اور اٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔ وہ اس وقت ڈرائنگ روم میں بیٹھی ایک فیشن میگزین کی ورق گردانی کر رہی تھی کہ فاران وہاں آگیا تھا۔

اپنے کمرے میں جاکر بستر پر لیٹنے کے بعد ساحرہ، فاران کے بارے میں سوچنے لگی۔ اسے وہاں آئے ابھی صرف چوبیس گھنٹے گزرے تھے اور اس وقت اس نے ساحرہ سے نہایت بے تکلف ہونے کی کوشش کی تھی۔

عورت بڑی آسانی سے مرد کی نظر میں بہت کچھ پڑھ لیتی ہے۔ ساحرہ نے بھی فاران کی آنکھوں میں وہ چمک دیکھ لی تھی جس کے معنی سمجھنا عورت کے لیے مشکل نہیں ہوتا۔ اسی لیے ساحرہ نے اس کی نگاہوں کی چبھن بھی اپنے جسم پر محسوس کی تھی۔ اسے فاران پر غصہ آنے لگا، اسے کم از کم اس کی عمر

WWW.PAKSOCIETY.COM

کالحاظ تو رکھنا چاہیے تھا۔ چھ سال بڑی تھی وہ اس سے!

سمجھانا پڑے گا اسے، ساحرہ نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے سوچا۔ اپنے غصے پر قابو پانا اس کی مجبوری بھی تھی۔ فاران اور مسعود کو نشاط کی وجہ سے بلایا گیا تھا۔ ماہر نفسیات کے مشورے کے مطابق گھر میں زیادہ سے زیادہ مردوں کی موجودگی بھی نشاط کے علاج میں سودمند ثابت ہوسکتی تھی۔ خاندان میں اور لوگ بھی تھے جن سے اس سلسلے میں مدد لی جاسکتی تھی لیکن ساحرہ کے ڈیڈی نے یہ گوارا نہیں کیا تھا۔ وہ صرف اپنے بھائی کی اولادوں پر اعتماد کرنا چاہتے تھے۔ انہیں بہرحال اس کا اندازہ نہیں ہوگا کہ فاران ان کی بیٹی ساحرہ کے لیے کسی خاص نوعیت کا مسئلہ بن سکتا ہے۔

ساحرہ اسے مسئلہ ہی سمجھ رہی تھی کیونکہ فاران دو ایک دن کے لیے نہیں آیا تھا۔

بات ایسی تھی کہ اپنی ماں کو بتاتے ہوئے اسے اچھا نہیں لگتا لیکن یہ بھی اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ فاران کو کس طرح سمجھائے گی۔ وہ اسی ذہنی اکھاڑ پچھاڑ میں تھی کہ دروازہ کھول کر نشاط مسکراتا ہوا اندر آیا۔

”حیدر!“ ساحرہ نے بگڑ کر کہا۔ ”کتنی بار سمجھایا ہے کہ بڑوں کے کمرے میں اجازت کے بغیر داخل نہیں ہوتے۔“

”میں بھول گیا تھا آپا خوشی میں!“ نشاط نے لچکتے ہوئے کہا اور نسوانی انداز میں چلتا ہوا اس کے قریب آگیا۔

”کیا خوشی مل گئی؟“ ساحرہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”فاران بھائی جب آئے تھے نا......! مجھے وہ پہلے ہی دن بہت اچھے لگے تھے۔ آج میں نے ان سے کہہ بھی دیا۔ وہ بھی کہنے لگے کہ میں بھی انہیں بہت اچھا لگتا ہوں۔“

”تو اس میں خوشی کی کیا بات ہے!“ ساحرہ نے چڑ کر کہا۔

”خوشی کی بات نہیں ہے یہ!“ نشاط نے دیدے مٹکائے۔ ”کبھی کسی نے پہلے تو مجھ سے یہ بات کہی نہیں!“

”خوب صورت ہو تم!“ ساحرہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ”کوئی بھی لڑکی تم سے یہ کہہ سکتی ہے۔“

”لڑکی!“ نشاط نے منہ بنایا۔ ”ناس جائے لڑکیوں کا...... مجھے وہ بالکل اچھی نہیں لگتیں!“

ساحرہ نے اسے تشویش سے دیکھا۔ ”مرد اچھے لگتے ہیں؟“

”سب تو نہیں۔“ نشاط نے دانتوں میں انگلی دبا کر شرماتے ہوئے کہا۔ ”بس یہ اچھے لگے مجھے!...... فاران بھائی۔“

”یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے حیدر!“

”یہ آپ لوگوں نے میرا نام کیوں بدل دیا ہے۔“ نشاط نے منہ پھلا کر کہا۔ ”کتنا اچھا نام تو ہے نشاط۔“

”اچھا اب مجھے بور مت کرو، جاؤ یہاں سے!“

ساحرہ ایک تشویش میں تو تھی۔ اب اسے ایک اور تشویش بھی ہوگئی۔ نشاط کو فاران کی بات سے ایسی خوشی ہوئی تھی جیسے کسی لڑکی کو اپنے پسندیدہ لڑکے کی طرف سے پذیرائی مل گئی ہو۔

اگلے چوبیس گھنٹوں میں ساحرہ کی کوشش رہی کہ فاران سے تنہائی میں آمنا سامنا نہ ہو۔ وہ اب تک فیصلہ نہیں کرسکی تھی کہ فاران کو کس طرح سمجھائے گی...... کھانے یا ناشتے کی میز پر فاران جان بوجھ کر اس کے سامنے کی کرسی پر بیٹھتا تھا اور ساحرہ کو اس کی نظریں اپنے جسم میں گڑتی محسوس ہوتی تھیں۔

شمعون سے موبائل پر ایک مرتبہ بات ہوچکی تھی لیکن ساحرہ کو یہ مناسب نہیں لگا تھا کہ اسے فاران کے بارے میں بتاتی۔ یہ الفاظ اس کی زبان پر آہی نہیں سکتے تھے کہ اس کا چچازاد بھائی اسے ہوس ناک نظروں سے دیکھتا ہے......

موبائل پر باتیں ہوئی تھیں تو شمعون نے خواجہ سرا زینت کے بارے میں استفسار کیا تھا کہ وہ آیا یا نہیں؟

”نہیں۔“ ساحرہ کا جواب تھا۔

لیکن یہ بات یقین سے نہیں کہی جاسکتی تھی کہ خواجہ سرا سے نشاط کی ملاقات ہی نہیں ہوئی ہوگی۔ نشاط گھر سے کئی کئی گھنٹے غائب رہا کرتا تھا اگر اسے ٹوکا جاتا تو یہ دھمکی ملتی تھی کہ وہ گھر چھوڑ کر چلا جائے گا۔ اسی شام کو ساحرہ اپنا ایک پسندیدہ پروگرام دیکھنے کے لیے ٹی وی لاؤنج کی طرف جارہی تھی کہ فاران سے سامنا ہوگیا۔ ساحرہ نے رکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس سے کترا کر گزر جانا چاہا تھا مگر فاران رکاوٹ بن گیا۔

”ایک دلچسپ منظر تو دیکھ لو چل کر!“ وہ بولا۔ ”نشاط کو اس طرح تم نے شاید نہ دیکھا ہو۔ خواجہ سرا کے ساتھ ہے وہ!“

نشاط کے ساتھ خواجہ سرا زینت کا نظر آنا ساحرہ کے لیے ہرگز کوئی دلچسپ منظر نہیں ہوسکتا تھا لیکن فاران کی اس بات نے اسے چونکا دیا کہ اس نے نشاط کو اس طرح شاید نہ دیکھا ہو۔

اس نے چونک کر پوچھا۔ ”کس طرح؟“

”بتانے کی بات نہیں ہے۔ چل کر دیکھ لو۔“ فاران نے اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے اس کا ہاتھ پکڑا۔

ساحرہ نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑایا اور فاران کو گھورتے ہوئے بولی۔ ”باز نہیں آؤ گے تم!“

”اس میں باز آنے کی کیا بات ہے ساحرہ!“ فاران بڑی معصومیت سے بولا۔

ساحرہ کے لہجے کی سختی نہیں گئی۔ ”ہاتھ کیوں پکڑا تم نے میرا!“

”اس میں کیا حرج ہے۔ ہم دو بھائیوں کی اولادیں ہیں۔ کیا ہم میں اتنی بے تکلفی نہیں ہوسکتی؟“

”اب نہیں ہوسکتی۔“ ساحرہ نے مڑ کر ڈرائنگ روم کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

”کیوں! اب کیا بات ہوگئی!“ فاران ساتھ چلنے لگا۔

”تمہاری آنکھوں میں بہت کچھ پڑھ لیا ہے میں نے!“

”اوہ! یہ تو بہت اچھا ہوا!“ فاران نے خوش ہوجانے والے انداز میں کہا۔ ”مجھے اب تم سے کچھ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔“

”کیا کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی؟“ ساحرہ رک کر اسے گھورنے لگی۔

”جو تم نے میری آنکھوں میں پڑھ لیا ہے۔“ فاران مسکرا رہا تھا۔ ”میں نے بھی تمہیں آٹھ سال بعد دیکھا ہے ساحرہ......! جس دن یہاں آیا تھا، اسی وقت تمہیں دیکھتے ہی دل ہار بیٹھا تھا۔“

”شٹ اپ......! بے ہودہ!“ ساحرہ نے غصے سے کہا اور تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔

”محبت کرنے کو بے ہودگی کہتے ہیں؟“ فاران بھی اس کے ساتھ تیز تیز چلنے لگا تھا۔

”فاران!“ ساحرہ نے دانت پیسے۔ ”کیا تمہیں پھر یاد دلاؤں کہ میں تم سے چھ سال بڑی ہوں۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیا ایسی مثالیں موجود نہیں ہیں؟“

وہ دونوں اس وقت ڈرائنگ روم کے دروازے پر پہنچ چکے تھے، ڈرائنگ روم سے نشاط کے ہنسنے کی آواز کے ساتھ سنائی دیا۔ ”یہ تو نہ کرو زینت!“

ساحرہ تیزی سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوگئی۔ شاید یہ اتفاق ہی ہوگا کہ وہ صوفہ ساحرہ کی نظروں کے بالکل سامنے تھا جس پر خواجہ سرا زینت اور نشاط تھے۔ نشاط خواجہ سرا کی گود میں لیٹا ہوا تھا اور خواجہ سرا اس کے گریبان میں ہاتھ ڈالے ہوئے تھا۔

ساحرہ کو دیکھتے ہی خواجہ سرا نے اپنا ہاتھ نشاط کے گریبان سے نکال لیا مگر اس کے چہرے سے کسی قسم کی گھبراہٹ ظاہر نہیں ہوئی۔ اس کے برخلاف اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

نشاط گھبرا کر نہیں بلکہ بڑے اطمینان کے ساتھ خواجہ سرا زینت کی گود سے اٹھا اور ہنستے ہوئے بولا۔ ”آؤ آپا!...... تم کبھی ہمارے ساتھ بیٹھیں ہی نہیں۔ ائے سچ آپا!...... بڑے مزے مزے کے لطیفے سناتی ہے میری سہیلی!“

”تم......“ خواجہ سرا کی طرف دیکھتے ہوئے ساحرہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن غصے کی شدت کے باعث بات اس کے منہ سے نہیں نکل سکی۔

”بولو آپا!“ خواجہ سرا نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔ ”رک کیوں گئیں؟ میں بڑے دھیان سے سنوں گی تمہاری بات!“

”تم نشاط کا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟“ ساحرہ نے دانت پیسے۔

خواجہ سرا فوراً سنجیدہ نظر آنے لگا اور بولا۔ ”یہ بات تو تمہیں اپنے بھائی سے کہنا چاہیے آپا......! میں یہاں خود تو نہیں آتی؟“

”آپا!“ نشاط چیخا۔ ”میری سہیلی کو کچھ مت کہو۔ چھوڑ کر چلا جاؤں گا میں یہ گھر!...... زینت کے ساتھ ہی چلا جاؤں گا۔“

اس دوران میں فاران ساحرہ سے ذرا پیچھے خاموش کھڑا رہا تھا۔ وہ دھیرے سے بولا۔ ”بات خراب نہ کرو ساحرہ!...... غلطی ہوگئی مجھ سے جو تم کو یہاں کے بارے میں کچھ بتایا۔ نشاط کو غصہ نہ دلاؤ، یہ معاملہ دھیرے دھیرے ہی ٹھیک ہوگا۔“

ساحرہ نے فوراً خود پر قابو پانے کی کوشش کی اور دھیمی آواز میں کہا۔ ”مجھے تم سے کچھ کام ہے۔“ اس کی نظریں نشاط کی طرف تھیں۔

”ابھی تو زینت ہے یہاں۔ جب یہ چلی جائے گی تو آؤں گا۔“ نشاط نے منہ پھلا کر کہا۔ ”جو کام ہو، بتا دینا!“

”واپس چلو!“ فاران پھر دھیمی آواز میں بولا۔

ساحرہ مڑی اور تیزی سے چلتے ہوئے ڈرائنگ روم سے نکل آئی۔ فاران اس کے ساتھ رہا۔

”اس طرح تو تم سارا معاملہ بگاڑ دوگی۔“ فاران نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں نشاط کو بڑی چابک دستی سے ہینڈل کر رہا ہوں۔“

”اب اس وقت تم مجھے اکیلا چھوڑ دو۔“ ساحرہ نے غصے سے کہا۔

”اچھا!“ فاران نے ایک طویل سانس لی اور جہاں تھا وہیں رک گیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

ساحرہ سیدھی اپنے کمرے میں پہنچی۔ موبائل پر اس نے شمعون سے رابطہ کیا۔ ”وہ اس وقت یہاں موجود ہے شمعون!“

”خواجہ سرا؟“ شمعون نے چونک کر پوچھا۔

”ہاں۔“

”اس کا حلیہ بتاؤ!“ شمعون نے جلدی سے کہا۔

”گلابی ساری باندھے ہوئے ہے۔ بال گھنگریالے ہیں۔ بال شاید براؤن کروائے گئے ہیں۔ وہ اس کے شانوں تک ہیں۔ عمر تیس سال کے لگ بھگ ہے۔“

”وہ آتا کیسے ہے؟ میرا مطلب ہے کنونس!“

”نہ جانے کب اور کیسے مجھے بس یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اس کے پاس کار نہیں ہے۔ ٹیکسی، رکشا سے آتا ہوگا۔“

”بس ٹھیک ہے، اتنا کافی ہے۔ میں اس وقت راستے میں ہوں۔ کہیں جا رہا تھا لیکن اب کار کا رخ تمہارے گھر کی طرف کر چکا ہوں۔ بیس منٹ لگ سکتے ہیں مجھے وہاں پہنچنے میں!...... آج میں اسے بس دیکھوں گا اور اس کے ٹھکانے کا پتا لگاؤں گا۔ وہ بیس منٹ سے پہلے چلا تو نہیں جائے گا؟“

”یہ میں کیسے جان سکتی ہوں شمعون!“

”اچھا ٹھیک ہے، اگر وہ چلا گیا تو پھر کسی دن دیکھا جائے گا۔ اگر وہ چلا جائے تو مجھے اطلاع تو دے دو گی؟“

”ہاں یہ کوشش کر سکتی ہوں۔“

”اگر تم نے اس کے چلے جانے کی اطلاع دے دی تو پھر میرا آنا فضول ہوگا۔“ دوسری طرف سے شمعون نے جواب دیا۔ ”میں نے کار کی رفتار بہت بڑھا دی ہے اور مزید بڑھاؤں گا اس لیے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالنا مشکل ہوگا۔“

”احتیاط سے چلانا شمعون!“ ساحرہ نے جلدی سے کہا۔

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کیا جا چکا تھا۔

خواجہ سرا کے چلے جانے یا موجود رہنے سے واقفیت کوئی مسئلہ نہیں تھی۔ ساحرہ نے جب نشاط سے کہا تھا کہ اسے اس سے کچھ کام ہے تو نشاط نے جواب دیا تھا کہ وہ خواجہ سرا کے جانے کے بعد اس کے پاس آئے گا لہٰذا یہ بات یقینی تھی کہ وہ آتا۔ اس کا غصہ عموماً وقتی ہوتا تھا۔ اسے نارمل ہونے میں دیر نہیں لگتی تھی لہٰذا یہ یقینی امر تھا کہ وہ آتا اور ساحرہ جان لیتی کہ خواجہ سرا چلا گیا۔ اگر نشاط بیس منٹ سے پہلے آ جاتا تو ساحرہ اگر اسے نشاط کی موجودگی میں فون نہ کر پاتی، تو بھی ایس ایم ایس تو کر ہی سکتی تھی کہ خواجہ سرا چلا گیا......

☆☆☆

تیز رفتاری کے باوجود شمعون کو ساحرہ کے گھر تک پہنچنے میں بائیس منٹ لگ گئے لیکن یہ اس کے لیے اطمینان بخش بات تھی کہ ساحرہ نے اب تک اسے خواجہ سرا کے چلے جانے کی اطلاع نہیں دی تھی۔ اس کا صریح مطلب یہی تھا کہ خواجہ سرا ابھی گھر میں موجود تھا۔

شمعون نے اپنی کار ساحرہ کے گھر سے کچھ فاصلے پر روک دی۔ ٹھیک اسی وقت اس کے موبائل پر ساحرہ کی کال آئی۔

”کہاں ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”ابھی پہنچا ہوں۔ تمہارے گھر سے کچھ ہی فاصلے پر موجود ہوں۔“

”وہ ابھی نہیں گیا۔“

”تمہاری طرف سے اطلاع نہ ملنے کے باعث یہ تو میں نے خود ہی سمجھ لیا تھا۔ اب وہ باہر آئے گا تو میں اس کا تعاقب کروں گا۔ سب سے پہلے تو میں اس کا ٹھکانا معلوم کرنا چاہتا ہوں۔“

”نہ جانے تم کیا کرنا چاہتے ہو؟ بہرحال احتیاط سے کام لینا۔ آج کل ان لوگوں نے اپنی انجمنیں بنالی ہیں۔ کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو جان کو اٹک جائیں گے۔ میڈیا والے بھی آج کل انہیں بہت کوریج دے رہے ہیں۔“

”میں جانتا ہوں۔ جو کچھ کروں گا، سوچ سمجھ کر ہی کروں گا۔“

اس گفتگو کے بعد شمعون کو آدھے گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ وہ اس وقت سنبھل کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا جب اس نے گلابی ساری میں ملبوس خواجہ سرا کو ساحرہ کے گھر سے نکلتے دیکھا۔ وہ شمعون کی مخالف سمت میں جا رہا تھا۔ شمعون اسے عورت ہی سمجھتا اگر ساحرہ اسے خواجہ سرا کی وضع قطع نہ بتا چکی ہوتی۔

شمعون نے کار کا انجن اسٹارٹ کیا اور اسے بہت دھیمی رفتار سے آگے بڑھانے لگا۔

خواجہ سرا کو غالباً یہ گمان بھی نہیں تھا کہ اس کا تعاقب کیا جاسکتا ہے اس لیے اس نے ایک بار بھی مڑ کر پیچھے نہیں دیکھا۔

کچھ راستہ پیدل چلنے کے بعد اسے ایک ٹیکسی مل گئی۔

اب شمعون نے رفتار بڑھائی اور ٹیکسی کا تعاقب کرنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسے خواجہ سرا کے چہرے پر ایک نظر تو ڈال لینا چاہیے۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ وہ ٹیکسی کے قریب سے گزرتا۔ اس صورت میں خواجہ سرا بھی اسے دیکھ سکتا تھا لیکن شمعون کے خیال کے مطابق اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ تو ممکن نہیں تھا کہ خواجہ سرا اسے جانتا ہو۔

شمعون رفتار بڑھا کر ٹیکسی کے برابر سے آگے نکلا۔ اس نے پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے خواجہ سرا کا چہرہ دیکھ لیا، اور دیکھتے ہی اس کے دماغ میں کھدبدی ہونے لگی۔ اسے محسوس ہوا تھا جیسے وہ اس خواجہ سرا کو پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہے۔

یہ اتفاق تھا کہ خواجہ سرا نے برابر سے گزرتی ہوئی کار پر توجہ نہیں دی تھی اس لیے امکان تھا کہ اس نے شمعون کو نہیں دیکھا ہوگا۔ اس کے چہرے سے شمعون کو ایسا لگا تھا جیسے وہ کسی سوچ میں ڈوبا ہوا ہو......

عقب نما آئینے کا زاویہ بدل کر شمعون نے پیچھے آتی ہوئی ٹیکسی پر نظر رکھی، پھر ایک سگنل پر اس نے اپنی کار ٹریفک کی ایسی رو میں روکی کہ پیچھے آنے والی گاڑیوں کو اس کے برابر کی رو میں آگے بڑھنے کا موقع مل سکے۔ اس کی یہ تدبیر کارگر رہی۔ ایک کار کے بعد وہ ٹیکسی بھی کچھ آگے نکلنے کے بعد سگنل بند ہونے کے باعث رک گئی۔

سگنل کھلا اور گاڑیاں حرکت میں آئیں تو شمعون اب پھر ٹیکسی کے تعاقب میں تھا۔ کچھ دیر بعد ایک رہائشی علاقہ آ گیا۔ یہاں ٹریفک بہت کم تھا۔ شمعون نے رفتار کم کر کے خود کو ٹیکسی سے خاصا دور کر لیا تاکہ ٹیکسی ڈرائیور کو بھی شبہ نہ ہو سکے کہ ایک کار اس کے پیچھے پیچھے لگی ہوئی تھی۔

اس دوران میں شمعون برابر اپنے دماغ پر زور دیتا رہا تھا کہ خواجہ سرا کو اس نے پہلے کہاں دیکھا ہوگا...... کوشش کے باوجود اسے یاد نہ آسکا۔

آخر ٹیکسی ایک ایسے بنگلے کے سامنے رکی جو اس علاقے کا شاید سب سے معمولی بنگلا تھا۔ خواجہ سرا ٹیکسی سے اتر کر بنگلے کے پھاٹک کی طرف بڑھا۔ کرایہ غالباً اس نے ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے دے دیا ہوگا کیونکہ اسے اتار کر ٹیکسی آگے بڑھ گئی تھی۔ شمعون نے کار کی رفتار بہت کم کر دی۔ وہ چاہتا تھا کہ بنگلے کے سامنے سے اس وقت گزرے جب خواجہ سرا اندر جا چکا ہو......

خواجہ سرا پھاٹک پر جھکا ہوا تھا، شمعون یہ مشکل دیکھ سکا کہ وہ پھاٹک میں پڑا ہوا تالا کھول رہا تھا۔ اس سے صرف یہی مطلب اخذ کیا جاسکتا تھا کہ اس بنگلے میں خواجہ سرا اکیلا ہی رہتا تھا۔ یہ شمعون کے لیے قدرے تعجب کی بات تھی۔ اس کی محدود معلومات کے مطابق یہ لوگ گروپ کی صورت میں قیام پذیر رہتے تھے۔

خواجہ سرا پھاٹک کھول کر اندر جا رہا تھا جب شمعون کی کار اس بنگلے کے سامنے سے گزری۔ شمعون نے دیکھ لیا کہ وہاں کوئی نیم پلیٹ نہیں لگائی گئی تھی، البتہ بنگلے کا نمبر بہت واضح دکھائی دیا تھا۔

شمعون نے عقب نما آئینے میں دیکھا کہ خواجہ سرا اندر سے پھاٹک بند کر رہا تھا۔

اب شمعون کے دماغ میں یہ سوال تھا کہ اس خواجہ سرا کے بارے میں معلومات کیسے حاصل کی جائیں؟...... یہ سوچتے ہوئے اس نے اپنی کار کی رفتار کم کر دی تھی۔ اس علاقے سے نکلنے کے بجائے وہ وہیں چکر لگا رہا تھا۔ اس کی نظر ایک اسٹیٹ ایجنسی کے بورڈ پر پڑی۔ بورڈ دیکھتا ہوا وہ آگے نکل گیا تھا۔ اس نے کار موڑی اور ایجنسی کے سامنے رک گیا۔

ایجنسی میں کام کرنے والوں میں سے ایک نے اس کی طرف توجہ دی جب وہ اندر داخل ہوا۔ شمعون نے اسے خواجہ سرا کے بنگلے کا نمبر بتانے کے بعد کہا۔ ”میں یہاں سے دو ایک مرتبہ گزرا ہوں۔ مجھے محسوس ہوا ہے کہ وہ خالی پڑا ہے۔ کیا وہ برائے فروخت یا کرائے کے لیے ہے؟“

”جی نہیں صاحب!“ متعلقہ شخص نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کچھ عرصہ ہوا وہ بک چکا ہے لیکن جس نے خریدا ہے، وہ شاید بہت کم وہاں رہتا ہے۔ اکثر پھاٹک پر تالا ہی نظر آتا ہے۔ اسی لیے آپ نے سمجھا ہوگا کہ وہ خالی پڑا ہے۔“

”اکیلا رہتا ہے کوئی؟“ شمعون نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔

”جی ہاں صاحب!“ جواب دیتے ہوئے وہ ہنسا۔ ”خواجہ سرا ہے ایک۔“

”خواجہ سرا؟“ شمعون نے حیرت کا اظہار برقرار رکھا۔ ”اتنا پیسا ہے اس خواجہ سرا کے پاس؟...... کتنے کا خریدا ہے اس نے بنگلا۔“

”اتفاق سے وہ اس نے ہماری ہی ایجنسی کے ذریعے خریدا ہے اس لیے مجھے معلوم ہے۔ چالیس لاکھ کا خریدا ہے۔“

”چالیس لاکھ!“ شمعون اس مرتبہ واقعی حیران ہوا۔ ”خواجہ سرا کے پاس چالیس لاکھ؟“

”اب ان لوگوں کا وقت بدل رہا ہے صاحب!...... ہمارے بعض بڑے بڑے تاجر اس قسم کے شوق بھی رکھنے لگے ہیں۔ خوب صورت ہیجڑوں پر بہت مہربان ہو جاتے ہیں اور یہ خواجہ سرا زینت ہے بھی خوب صورت۔“

شمعون کو اس سے زیادہ معلومات نہیں ہو سکیں۔ وہ ایجنسی کے دفتر سے نکل آیا۔ دماغ میں پھر وہی سوال تھا کہ اب کیا کرے؟

WWW.PAKSOCIETY.COM

فی الحال یہی خیال آرہا تھا کہ وقتاً فوقتاً اس بنگلے کے چکر لگا تا رہے اور مناسب موقع پر اس خواجہ سرا سے تعلقات پیدا کر کے اسے کوئی بڑی رقم دے کر نشاط سے کنارہ کشی پر آمادہ کرے......

اس طرح نشاط کی نسوانیت تو ختم نہیں ہوسکتی تھی لیکن یہ خطرہ ٹل سکتا تھا کہ وہ بھی کہیں خواجہ سرا نہ بن جائے، خواجہ سرا زینت ہی کے گروپ میں شامل نہ ہوجائے۔

لیکن ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ جس خواجہ سرا پر کوئی بہت امیر آدمی اتنا مہربان ہو کہ اسے چالیس لاکھ کا بنگلا دلا دے وہ خواجہ سرا کتنی بڑی رقم کے عوض نشاط سے کنارہ کشی اختیار کرسکتا ہے۔

اگر وہ زیادہ بڑی رقم کا مطالبہ کر دیتا تو شمعون کے لیے مشکل کھڑی ہوجاتی۔ وہ ایک بڑے باپ کا بیٹا ضرور تھا لیکن اس کی ذاتی مالی حیثیت ابھی کچھ نہیں تھی۔ رقم کے لیے اسے اپنے باپ کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا اور یہ بھی بتانا پڑتا کہ اتنی رقم کی ضرورت کیوں ہے۔

کیوں نہ اسے ایک مرتبہ سمجھانے بجھانے کے بعد کسی پولیس کیس میں پھنسوا دیا جائے، پولیس کو رشوت دے کر اس قسم کے کام کروانا مشکل نہیں ہوتا۔

پولیس کا خیال ذہن میں آیا تو شمعون کو سب انسپکٹر ابرار بھی یاد آ گیا۔ ابرار اسی اسکول میں پڑھتا تھا جہاں سے شمعون نے میٹرک کیا تھا۔ ابرار نے میٹرک کے بعد مزید تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ وہ پولیس میں اسسٹنٹ سب انسپکٹر کی حیثیت سے ملازم ہوگیا تھا۔ اس سے شمعون کی زیادہ ملاقاتیں بھی نہیں ہوتی تھیں۔ مہینوں میں کبھی کہیں آمنا سامنا ہوجاتا تھا۔ اس قسم کی ''سرسری دوستی'' کے باوجود شمعون اس سے جب بھی ملا بے تکلفانہ انداز میں ملا تھا۔ اس سے شمعون کی آخری ملاقات آٹھ دس ماہ قبل ہوئی تھی۔ ابرار نے اسے بتایا تھا کہ اب وہ سب انسپکٹر بن گیا ہے۔

اب شمعون کے لیے مسئلہ یہ تھا کہ ابرار کو تلاش کہاں کیا جائے؟ وہ ابرار کے پتے سے واقف تھا، نہ اس نے کبھی ابرار سے اس کا کنٹیکٹ نمبر پوچھا تھا۔ بس ابرار نے اس کا موبائل نمبر لے لیا تھا لیکن اس نے کبھی شمعون کو کال کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی یا اسے کوئی ضرورت محسوس ہی نہیں ہوئی تھی۔

ان خیالات کے ساتھ شمعون کی کار اسی علاقے میں چکراتی رہی تھی جہاں خواجہ سرا زینت کا بنگلا تھا۔ شمعون دو مرتبہ اس کے بنگلے کے سامنے سے گزر بھی چکا تھا۔ اتفاق سے وہ تیسری مرتبہ بھی گزرا اور چونک پڑا۔ بنگلے کے پھاٹک پر تالا پڑا ہوا تھا۔ شمعون کو اسٹیٹ ایجنسی کے آدمی کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا، وہ شاید بہت کم وہاں رہتا ہے، اکثر پھاٹک پر تالا ہی نظر آتا ہے۔

شمعون کو خیال آیا کہ اگر وہ اس علاقے میں چکر لگاتے رہنے کے بجائے آس پاس ہی کہیں اپنی کار کھڑی رکھتا تو وہ خواجہ سرا زینت کو وہاں سے نکلتے دیکھ لیتا اور اس کا دوبارہ تعاقب کر کے یہ بھی جان لیتا کہ وہاں سے نکل کر اس نے کہاں کا رخ کیا ہوگا؟ شاید اس امیر شخص کے گھر کا جو اس پر مہربان تھا۔

سوچ میں ڈوبا ہوا شمعون اب دھیمی رفتار سے کار چلا رہا تھا۔ رات ہوچکی تھی۔ شمعون نے ہیڈ لائٹس روشن کرلی تھیں۔ اس کی نظر اس علاقے کے پولیس اسٹیشن کی عمارت پر پڑی۔ شمعون کے دماغ میں ایک خیال آیا اور اس نے اپنی کار پولیس اسٹیشن کے احاطے میں داخل کر دی۔ اس نے سوچا کہ یہاں کسی سے سب انسپکٹر ابرار کے بارے میں پوچھا جائے۔

پولیس اسٹیشن میں وہ ایس ایچ او سے ملا اور اپنا مدعا زبان پر لایا۔

''کمال کرتے ہیں صاحب آپ بھی!'' ایس ایچ او نے مسکرا کر کہا۔ ''میرے محکمے میں اس نام کے سب انسپکٹر تو نہ جانے کتنے ہوں گے۔ دو کو تو میں جانتا ہوں۔ کوئی خاص پہچان بتایئے اس کی تو شاید میں کچھ بتا سکوں۔''

شمعون نے جواب میں کچھ نہیں کہا تھا کہ موبائل پر ساحرہ کی کال آ گئی۔

''کہاں ہو تم! میں بڑی بے چینی سے تمہارے فون کا انتظار کر رہی ہوں۔ سب خیریت ہے نا؟''

''میں تمہیں تھوڑی دیر بعد فون کروں گا۔ ابھی ایک صاحب کے ساتھ ہوں۔ سب ٹھیک ہے۔'' شمعون نے جواب دیا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ وہ ایس ایچ او کے سامنے خواجہ سرا زینت کی کوئی بات نہیں کرسکتا تھا۔

''سب ٹھیک ہے۔'' ایس ایچ او نے شمعون کے آخری الفاظ دہرائے۔ ''یہ کسی سے کہا ہے ابھی آپ نے! کیا میں اس سے یہ سمجھوں کہ آپ کسی خاص صورت حال سے دوچار ہیں اور اسی سلسلے میں سب انسپکٹر ابرار سے ملنا چاہتے ہیں۔ اگر مناسب سمجھیں تو مجھے بتایئے۔ ممکن ہے کہ میں آپ کی کوئی مدد کرسکوں۔''

''نہیں انسپکٹر صاحب!'' شمعون نے ہنس کر کہا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس آپ کے پولیس اسٹیشن کے سامنے سے گزرا تو ابرار کا خیال آ گیا۔ میں نے سوچا، شاید ابرار آج کل اسی پولیس اسٹیشن میں مامور ہو۔ ملتا چلوں اس سے...... کبھی کبھی اسکول کے پرانے ساتھیوں سے بھی ملنے کو جی چاہتا ہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ بہرحال اس نام کا کوئی سب انسپکٹر میرے پولیس اسٹیشن میں نہیں ہے۔ کیا آپ اس کا پورا نام بھی نہیں بتا سکتے۔''

''ابرار عاقل۔'' شمعون نے بتایا۔

''ہاں یہ کچھ بات ہوئی۔ ویسے شاید ابرار عاقل بھی دو تین ہوں لیکن ایک ابرار عاقل کو میں جانتا ہوں۔ چند ماہ قبل میں ایک اور پولیس اسٹیشن کا انچارج تھا۔ وہاں اس نام کا ایک سب انسپکٹر تھا۔ شاید اب بھی ہو۔ آپ وہاں کوشش کر لیجیے۔''

''آپ کس پولیس اسٹیشن میں تھے؟'' شمعون نے پوچھا۔

انسپکٹر نے پولیس اسٹیشن کا نام بتایا۔

''اچھا!'' شمعون مسکراتے ہوئے کھڑا ہوگیا۔ ''وہ تو یہاں سے بہت دور ہے۔ اب اس وقت تو میں بھی وہاں نہیں جاؤں گا۔ پھر کبھی سہی!...... آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اتنا وقت دیا۔''

اپنے تئیں شمعون فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ اسی وقت ابرار کی تلاش میں جائے گا۔ انسپکٹر کو اس نے اپنے ارادے سے آگاہ کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

انسپکٹر نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ کہیں تو میں ابھی وہاں فون کر کے وہاں کے ایس ایچ او سے بات کرلیتا ہوں۔ اگر ابرار اب بھی اسی پولیس اسٹیشن میں ہوا اور اس وقت وہاں موجود بھی ہوا تو اس سے پوچھ لیا جائے گا کہ وہ آپ سے واقف ہے یا نہیں!''

''ہاں اگر ایسا ہوجائے تو کیا بات ہے۔ میں آپ کا مزید شکر گزار ہوں گا۔''

''ارے نہیں صاحب! شکریے وغیرہ کی ضرورت نہیں۔'' انسپکٹر نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھاتے ہوئے کہا، پھر بولا۔ ''آپ کے لیے چائے یا......''

''کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔'' شمعون نے اس کی بات کاٹتے ہوئے ہوئے کہا۔ ''یہی بہت ہوگا، اگر معلوم ہوجائے کہ آپ نے جس ابرار کا ذکر کیا ہے، وہی مجھے مطلوب ہے۔''

انسپکٹر نے ہنس کر نمبر ملائے۔ بہت مختصر بات کی، پھر ریسیور رکھ کر بولا۔ ''سوری جناب......! وہ ابرار ہے تو اب بھی اسی پولیس اسٹیشن میں لیکن ابھی اس سے کوئی بات نہیں ہوسکتی۔ کل فون کر لیجیے گا آپ وہاں۔ میں آپ کو نمبر دیے دیتا ہوں۔ وہ ایک ہفتے سے چھٹی پر ہے۔ کل آئے گا نواب شاہ سے!''

''نواب شاہ۔'' شمعون چونکا۔ ''اوہ!...... پھر تو یہ وہی ہوگا۔ مجھے یہ خاص بات بتانے کا خیال نہیں رہا تھا آپ کو...... ! ابرار عاقل کا خاندان نواب شاہ ہی میں رہتا ہے۔''

''چلیں تو پھر آپ کا مسئلہ حل ہوا۔ کل آپ وہاں فون کر کے معلوم کر لیجیے گا۔ تین بجے آئے گا وہ ڈیوٹی پر!''

انسپکٹر نے شمعون کو اس تھانے کا فون نمبر دیا۔ شمعون اس کا شکریہ ادا کر کے پولیس اسٹیشن سے نکل آیا۔ اب اسے ایک دن انتظار تو کرنا ہی پڑتا۔

کار میں بیٹھ کر شمعون نے انجن اسٹارٹ کرنے سے پہلے ساحرہ کو کال کی۔ ''تم اتنی پریشان کیوں ہو؟'' اس نے ساحرہ سے کہا۔

''پریشانی کی بات تو ہے نا! مجھے کچھ معلوم ہی نہیں کہ تم کرنا کیا چاہتے ہو۔''

''پہلے تو میرے ذہن میں صرف یہ تھا کہ اس کا ٹھکانا معلوم کرلوں مگر اب ایک منصوبہ آیا ہے ذہن میں!''

''وہ کیا ہے؟''

شمعون نے اسے پہلے تو خواجہ سرا کے بنگلے کے بارے میں بتایا، پھر جو بھی تگ و دو کی، وہ بھی بیان کر دی اور ابرار کے بارے میں بتانے کے بعد کہا۔ ''اس کے ذریعے خواجہ سرا پر دھونس بھی جمائی جاسکتی ہے۔ اس سے کہا جاسکتا ہے کہ اگر اس نے نشاط کا پیچھا نہیں چھوڑا تو اسے کسی کیس میں پھنسا دیا جائے گا۔''

''ایسا تو نہ کرو شمعون!'' ساحرہ جلدی سے بولی۔ ''اس طرح تو معاملہ خطرناک بھی ہوسکتا ہے۔ غلط یا صحیح، میں نے کسی سے سنا تھا کہ اب بعض خواجہ سرا جرائم پیشہ بھی بن گئے ہیں اور ان کے اس قسم کے کاموں کی بھنک بھی ان کے گرو کے کانوں میں نہیں پڑتی ہے۔ ان خواجہ سراؤں کے گرو ہوتے ہیں، تم جانتے ہوگے۔''

''ہاں جانتا ہوں لیکن تم ضرورت سے زیادہ سوچنے لگی ہو۔ ایسی کوئی بات نہیں ہوگی جسے تم خطرناک کہہ رہی ہو۔''

''خطرناک تو ہوسکتا ہے یہ معاملہ......! بڑے جذباتی ہوتے ہیں یہ خواجہ سرا۔ خون خرابے کی نوبت نہ آ جائے...... نہ جانے کیا کر بیٹھے وہ!...... موت سے بہت ڈر لگتا ہے مجھے! تم جانتے ہو۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

"تم تو پاگل ہوئی جارہی ہو۔ اب موت تک بھی پہنچ گئیں۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا ساحرہ!"

"نہیں نہیں، کچھ اور سوچو! تم نے تو مجھے ڈرا دیا ہے اپنا منصوبہ بتا کر!"

"اچھا ٹھیک ہے۔ میں کچھ اور بھی سوچوں گا۔"

"کچھ اور بھی نہیں، کچھ اور ہی سوچو!" ساحرہ نے "بھی" اور "ہی" پر زور دیا تھا۔

"چلو ٹھیک ہے۔ کل ابرار سے مل تو لوں پھر تم سے بات کرکے ہی کوئی قدم اٹھاؤں گا۔"

"ہاں۔ پہلے مجھ سے بات کرلینا۔"

"ٹھیک ہے۔"

"ابھی کہاں ہو؟"

"ابھی پولیس اسٹیشن سے نکلا ہوں۔ کار اسٹارٹ نہیں کی ہے۔ بس اب گھر ہی جاؤں گا۔"

شمعون کو واقعی اب کوئی کام نہیں تھا، گھر ہی جانا تھا۔ ساحرہ سے بات ختم کرکے اس نے کار اسٹارٹ کی اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ لاشعوری طور پر اس نے ایسا راستہ اختیار کیا کہ ایک مرتبہ پھر خواجہ سرا کے بنگلے کے سامنے سے گزرے۔ پھاٹک میں اس وقت بھی تالا پڑا ہوا تھا اور بنگلے کے کسی بھی حصے میں روشنی کی ہلکی سی کرن تک نظر نہیں آرہی تھی۔

گھر جاتے ہوئے ساحرہ کی باتیں اس کے ذہن میں چکراتی رہیں۔ اس کی باتوں کا انداز انتہا پسندانہ تھا جو شمعون کے لیے تعجب خیز نہیں تھا۔ ساحرہ موت سے بہت ڈرتی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے بتایا تھا کہ اگر کبھی اسے خیال بھی آجائے کہ سب انسانوں کی طرح ایک دن وہ بھی مرجائے گی تو اسے اس خیال ہی سے بخار آجاتا ہے۔

جس دن اس نے شمعون سے یہ بات کی تھی، اسی شام اسے واقعی بخار آگیا تھا جس پر شمعون بہت جھنجلایا تھا۔ ایسا بھی کیا خوف موت کا!

شمعون گھر پہنچا تو اس کے والدین کھانے کے لیے اس کا انتظار کررہے تھے۔

"کہاں رہ جاتے ہو کبھی کبھی!" والد بولے۔ "تم جانتے ہو کہ ہم لوگ تو ساڑھے نو کے درمیان کھانا کھا لیتے ہیں۔ میں ابھی تمہیں فون کرتے ہی والا تھا۔"

شمعون کوئی بہانہ تراشتا لیکن وہ تو دم بہ خود رہ گیا تھا۔ ڈرائنگ روم میں اس کے والدین کے ساتھ ایک جوان العمر، خوب صورت اور ماڈرن لڑکی بھی موجود تھی۔ وہ جینز اور شرٹ میں ملبوس تھی۔

لیکن شمعون کے دم بہ خود رہ جانے کی وجہ اس لڑکی کی موجودگی یا اس کی وضع قطع نہیں، ساحرہ سے اس کی حیرت انگیز مشابہت تھی۔ ناک نقشہ اسی فیصد ساحرہ جیسا تھا، واضح ترین فرق اس کے بال اور آنکھیں تھیں۔ ساحرہ کی آنکھیں سیاہ اور اس لڑکی کی آنکھیں گہری نیلی تھیں۔ ساحرہ کے بال بھی سیاہ اور بڑے بڑے تھے جبکہ اس لڑکی کے سنہرے بال اس کے شانوں تک تھے۔ شمعون کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی تھی۔

"بت کیوں بن گئے اس بچی کو دیکھ کر!" شمعون کے والد ہنس کر بولے۔ "یہ ثمرین ہے۔ میرے ایک دوست کی بیٹی ہے جو لندن میں رہتا ہے۔ ثمرین کی خواہش تھی کہ اپنے باپ کا ملک دیکھے، باپ کی مصروفیات بہت ہیں اس لیے اس نے فون پر مجھ سے بات کی تھی۔ میں اس سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں اس کی بیٹی کو کچھ عرصے اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتا چنانچہ یہ آگئی۔ ہم ابھی گھنٹا بھر پہلے اسے ایئرپورٹ سے لے کر آئے ہیں۔"

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی شمعون صاحب!" ثمرین مسکراتے ہوئے بولی۔

اس کی وضع قطع اور یہ جان لینے کے بعد کہ وہ لندن سے آئی تھی، شمعون اس سے "گلیڈ ٹو میٹ یو" جیسے کسی فقرے کی توقع کرسکتا تھا لیکن وہ اردو بولی تھی اور نہایت نستعلیق لہجے میں بولی تھی۔

"میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔"

شمعون نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی تھی۔ زبردستی اس لیے کہ وہ اس ذہنی جھٹکے سے فوری طور پر نہیں سنبھل سکا تھا جو اسے ثمرین اور ساحرہ کی مشابہت کے باعث لگا تھا۔

"چلو بھئی اب دیر نہ کرو۔" شمعون کے والد نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "بہت زور کی بھوک لگنے لگی ہے۔"

وہ چاروں، ڈائننگ روم میں پہنچے۔ شمعون کے والد ٹیبل کے سرے کی کرسی کے بجائے اس کرسی پر بیٹھے جس کے سامنے بھی کرسی تھی۔ اس پر شمعون کی والدہ بیٹھیں۔ ثمرین کو انہوں نے اپنے برابر میں بٹھایا۔ شمعون کو والد کے پہلو میں اور ثمرین کے سامنے بیٹھنا پڑا۔ وہ یہ بدتمیزی تو کر نہیں سکتا تھا کہ باپ کی موجودگی میں ٹیبل کے سرے کی کرسی پر بیٹھتا۔ وہ سوچے بغیر نہیں رہ سکا کہ نشست کے انداز میں یہ تبدیلی جان بوجھ کر کی گئی تھی۔ مقصد یہی ہوسکتا تھا کہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

کھانے کے دوران میں ثمرین اور شمعون ایک دوسرے کے سامنے رہیں اور ایک دوسرے کو دیکھ سکیں، یا شاید اس لیے کہ شمعون ثمرین کو دیکھتا رہے۔

''واؤ!'' کوفتوں کی ڈش دیکھ کر ثمرین کے منہ سے نکلا۔ ''کوفتے تو مجھے بہت پسند ہیں۔'' ثمرین نے ''واؤ'' کے بعد کہا تھا۔ ''مام کو تو مشرقی کھانا پکانا آتا ہی نہیں تھا۔ ڈیڈ کے ایک دوست ہیں۔ ان کی بیگم بھی یہیں کی ہیں۔ وہ دونوں جب بھی ہمارے گھر آتے ہیں، کوئی مشرقی ڈش ضرور ساتھ لاتے ہیں۔ میں تو اس وقت صرف کوفتے کھاؤں گی۔''

''تم روز کوفتے کھانا۔'' شمعون کی والدہ نے ہنس کر کہا۔ ''خانساماں سے کہہ دیا جائے گا کہ جب تک تم یہاں ہو، کوفتے ضرور ہوں میز پر!''

''مجھے زردہ بھی بہت اچھا لگتا ہے۔''

''کل سے وہ بھی ہوگا۔ دراصل تمہارے انکل اور شمعون کو زردہ پسند نہیں ورنہ وہ بھی ہوتا میز پر! مجھے تو پسند ہے۔''

شمعون کا دماغ اس وقت بری طرح الجھا ہوا تھا۔ یہ بات اسے اتفاقی محسوس نہیں ہو رہی تھی کہ ثمرین کے والد نے اپنی بیٹی کو لندن سے ان کے گھر بھیج دیا تھا اور ساحرہ سے اس کی مشابہت تو حیرت انگیز تھی ہی! شمعون مسلسل سوچتا رہا کہ اس معاملے کو کس رخ سے دیکھے!

''آپ بہت خاموش طبع ہیں شمعون!'' ثمرین اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

شمعون سے پہلے اس کی والدہ ہنس کر بول پڑیں۔ ''ارے نہیں ثمرین!...... خاموش طبع نہیں ہے یہ...... بس تمہیں دیکھ کر حیران رہ گیا ہے۔ جب نیٹ پر تمہارے ڈیڈ نے تم سے ہماری بات کرائی تھی، اس وقت میں اور تمہارے انکل بھی بہت حیران ہوئے تھے۔''

''مجھ میں ایسی کیا بات ہے آنٹی؟''

''دراصل شمعون کے کالج کے زمانے کی ایک دوست ہے۔ ساحرہ نام ہے اس کا...... تم اس سے بہت زیادہ مشابہ ہو۔''

''واقعی؟'' ثمرین حیرت سے بولی۔ ''بہت زیادہ مشابہ؟''

''حیرت انگیز حد تک!''

''واؤ۔'' ثمرین نے شمعون کی طرف دیکھا۔ ''مجھے ان سے ضرور ملائیے گا۔''

''ضرور۔'' شمعون کی آواز دھیمی رہی۔

اس کی والدہ بولیں۔ ''ثمرین کو شہر گھمانا اب تمہاری ہی ذمے داری ہوگی شمعون!''

''ضرور۔'' شمعون یہ جواب دینے پر مجبور تھا۔ ''ہاؤس جاب کے بعد میں کوشش کروں گا کہ انہیں زیادہ سے زیادہ وقت دے سکوں۔''

ثمرین بولی۔ ''انکل بتا چکے ہیں کہ آپ نے ایم بی بی ایس کیا ہے۔ آج کل ہاؤس جاب کر رہے ہیں۔''

''جی۔''

ثمرین نے لندن کے معاشرے کی باتیں شروع کر دیں جو اسے بس گوارا تھا، پسند نہیں تھا۔ شمعون نے ان باتوں میں بہت کم حصہ لیا۔ اس کے دماغ میں کئی سوالات بیک وقت گردش کر رہے تھے۔

ثمرین خود یہاں آنے کی خواہش مند تھی یا اس کے باپ سے بات کر کے اسے بلایا گیا تھا؟...... اگر بلایا گیا تھا تو مقصد؟...... شمعون تصور بھی نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ ساحرہ کا مقام کسی اور لڑکی کو دے گا۔ خواہ وہ ساحرہ سے مشابہ کیا، مکمل ساحرہ جیسی ہو۔

ثمرین کو بلانے کا مقصد یہ ہو سکتا تھا کہ شمعون ساحرہ کو بھول جائے لیکن یہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ ساحرہ سے ثمرین کی حیرت انگیز مشابہت بھی شمعون کو چکرائے ہوئے تھی۔ اس نے اس قسم کی مشابہت کہانیوں میں پڑھی تھی یا فلموں میں دیکھی تھی۔ زندگی میں اس نے اس قسم کی مشابہت صرف ایک بار دیکھی تھی لیکن وہ دونوں سگے بھائی تھے۔

ان خیالات نے شمعون کے دماغ میں کچھ اور سوالات بھی کھڑے کیے، وہ سوچنے لگا کہ اس معاملے میں ساحرہ سے جلد از جلد ملاقات ضروری ہے۔

☆☆☆

دوسرے دن وہ اسپتال میں صرف تین گھنٹے رکا اور ناسازی طبع کے بہانے وہاں سے نکل آیا۔ موبائل پر ساحرہ سے اس کی بات صبح ہی ہو چکی تھی کہ وہ کہاں ملیں گے۔

ملاقات ہوئی تو ساحرہ نے چھوٹتے ہی کہا۔ ''اگر تم فون نہ کرتے تو میں کرتی۔ کل سے ہی بہت بے چین تھی۔ فون پر تو بات ہو چکی تھی مگر میں سامنے بیٹھ کر تمہیں سمجھانا چاہتی تھی کہ اس معاملے میں کوئی خطرناک قدم نہ اٹھا بیٹھنا۔''

''میں نہ تو بچہ ہوں ساحرہ اور نہ جرائم پیشہ ہوں کہ خطرناک اقدامات کے بارے میں سوچوں۔ فون پر میں نے تم سے کہہ دیا تھا کہ جو کچھ کروں گا، پہلے تمہیں بتا دوں گا۔ اس بات کے بعد تمہارے ذہنی انتشار کا کوئی جواز نہیں تھا۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن میں بے چین رہی تھی۔ ابرار سب انسپکٹر سے تم کب ملو گے؟''

''ابھی اس میں دیر ہے۔'' شمعون نے گھڑی پر نظر ڈال کر کہا۔

''اس سے تمہیں جو بات کرنا ہے، اسی کے بارے میں مشورہ کرنے کے لیے بلایا ہے نا تم نے مجھے!''

''نہیں۔'' شمعون نے سنجیدگی سے کہا۔ ''کچھ اور بات ہے؟...... یہ عجب سا اتفاق ہے کہ اتنے برسوں میں نہ تم نے کبھی بتایا، نہ میں نے کبھی پوچھا کہ تمہارے والد کا کیا نام ہے۔ اب میں تم سے پہلا سوال یہی کروں گا کہ ان کا نام مبشر احسان تو نہیں؟''

ساحرہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''جب میں نے تمہیں ان کا نام نہیں بتایا تو تمہیں کیسے معلوم ہوا؟...... اوہ!'' اس نے کسی خیال سے رک کر کہا۔ ''تمہارے والدین آئے تھے میرے گھر! میں ذرا دیر کے لیے وہاں سے ہٹی بھی تھی۔ اسی وقت انہوں نے ممی جی سے پوچھا ہوگا۔''

''مجھے علم نہیں کہ انہوں نے پوچھا تھا یا نہیں!''

''تو پھر......''

''پہلے تم میری باتوں کا جواب دیتی رہو، تمہارے والد کب سے برطانیہ میں ہیں؟''

''وہ وہیں کے شہری تھے جب ممی جی سے ان کی شادی ہوئی تھی۔''

''انہوں نے شادی کے بعد تمہاری ممی کو وہاں نہیں لے جانا چاہا؟''

''نہیں۔'' ساحرہ نے جواب دیا۔ ''دراصل ڈیڈی تو اس شادی کے لیے تیار ہی نہیں تھے۔ میں نے سنا ہے کہ اس شادی کے سلسلے میں ان پر ان کے مرحوم والد کا دباؤ تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کے پوتے پوتیاں مشرقی ہوں۔ انہوں نے کسی طرح ممی جی کے والدین کو بھی آمادہ کر لیا تھا کہ شادی کے بعد ممی جی یہیں رہیں گی، ڈیڈی ان کو لندن نہیں لے جائیں گے لیکن سال دو سال ایک ڈیڑھ ماہ کے لیے یہاں کا چکر لگا لیا کریں گے۔''

''ایسی صورت میں ان کے اور تمہاری ممی کے تعلقات کچھ زیادہ مستحکم تو نہیں ہوں گے۔''

ساحرہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''مستحکم تو کیا، بس اتنا تعلق ہے کہ میاں بیوی کا رشتہ نبھتا رہا ہے۔ نہ انہیں ممی جی سے کوئی لگاؤ ہے، نہ ممی جی کو ان سے ہے۔ آج تم نے یہ بات چھیڑی ہے تو بتا دیا میں نے ورنہ ایسی باتیں بتاتے ہوئے اچھا نہیں لگتا، دکھ ہوتا ہے۔''

''کیا تمہارے ڈیڈی نے وہاں بھی شادی کر لی ہے؟''

ساحرہ چونکی۔ ''آج تم اس قسم کے سوالات کیوں لے بیٹھے شمعون!''

''وجہ ہے کچھ......! بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے تم میرے سوالات کا جواب دیتی رہو۔''

''ممی جی سے تو ڈیڈی کی شادی بعد میں ہوئی تھی۔'' ساحرہ نے نظریں جھکا کر کہا۔ ''دو سال پہلے وہ لندن میں ایک عیسائی لڑکی سے شادی کر چکے تھے جو شادی کے وقت مسلمان ہو گئی تھی۔''

''اس بیوی سے بھی تمہارے ڈیڈی کی اولادیں ہوں گی۔''

''دو ہیں۔'' ساحرہ نے جواب دیا۔ ''بڑا تو لڑکا ہے...... اس سے کئی سال چھوٹی ایک بیٹی ہے۔''

شمعون نے اس طرح سر ہلایا جیسے اس کے دماغ میں آئے ہوئے خیالات کی تصدیق ہوتی جا رہی ہو۔

''کیا وہ دونوں کبھی یہاں آئے ہیں؟'' شمعون نے پوچھا۔

''نہیں۔'' ساحرہ نے جواب دیا۔ ''یہی بہت ہے کہ ڈیڈی نے یہ بات ممی جی کو بتا دی۔''

''ان دونوں کی تصویریں دکھائیں کبھی؟''

''کبھی نہیں۔ نہ اپنی پہلی بیوی کی دکھائی، دراصل......'' ساحرہ کچھ افسردہ نظر آئی۔ ''سچی بات تو یہ ہے کہ یہاں کے گھر کو انہوں نے شاید اپنا گھر ہی نہیں سمجھا ہے۔ ایک سرائے سا ہے یہ ان کے لیے......! ہم بہنوں اور بھائی سے بھی انہیں کوئی خاص لگاؤ نہیں۔ ممی جی کے منہ سے ایک بار بے ساختہ ایک بات نکل گئی تھی جس سے میں نے یہ مطلب نکالا ہے کہ میری پیدائش پر تو وہ ممی جی سے بہت ہی ناخوش تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی پہلی اولاد لڑکا ہو لیکن اس کے برخلاف ہوتا رہا۔ مجھ سے پہلے اور بعد بھی بیٹیاں ہوئیں۔ اس کے بعد نشاط پیدا ہوا تھا، پھر اس سے چھوٹی۔ میں اب تمہیں سب کچھ تفصیل سے بتا رہی ہوں تاکہ تم بار بار سوال نہ کرو۔ نشاط کی پیدائش پر وہ کچھ خوش ہوئے تھے اور خوشی ہی کی وجہ سے اس کا نام نشاط رکھا تھا مگر ان کی وہ خوشی بھی اس وقت ختم ہو گئی جب نشاط میں نسوانیت آ گئی۔ آ کیا گئی، وہ تو پیدائشی ہی ایسا تھا۔ بس جب ڈاکٹر نے یہ بتایا کہ اس میں...... رپورٹ کے مطابق مردانہ غدود

WWW.PAKSOCIETY.COM

کی کمی ہے تو ڈیڈی کا موڈ بہت خراب ہوا۔ اس کی ذمے داری بھی انہوں نے ممی پر ڈال دی تھی کہ ایک بیٹا بھی پیدا کیا تو ایسا!'' ساحرہ سانس لینے کے لیے ذرا سا رکی۔

شمعون کو بولنے کا موقع مل گیا۔ ''اگر انہیں تم لوگوں سے لگاؤ نہیں ہے تو انہوں نے تمہاری تین بہنوں کو اپنے پاس کیسے بلا لیا؟''

''یہ میری سمجھ میں بھی نہیں آیا۔ بس قیاس کر سکتی ہوں کہ وہ نشاط کی یہ خرابی ختم کرنے کے شدید خواہش مند ہیں۔ بہر حال بیٹا تو یہ بھی انہی کا ہے۔''

''تمہاری بہنوں سے ان کا رویہ اب کیسا ہے۔ ان سے فون پر بات تو ہوئی ہوگی تمہاری!''

''ہاں۔'' ساحرہ نے کہا۔ ''جو مجھ سے چھوٹی ہے، وہ بتا رہی تھی کہ ڈیڈی کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں، البتہ رامش بھائی تینوں ہی بہنوں کو بہت چاہنے لگے ہیں۔''

''رامش...... ظاہر ہے کہ ان کا بیٹا!''

''جب میری بہنیں اسے رامش بھائی کہیں تو اس کا مطلب یہی ہوگا۔''

''اور رامش کی بہن کا رویہ؟'' یہ سوال کرتے ہوئے شمعون کے دماغ میں بہت کچھ تھا۔

''اس سے ابھی ان کی ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ میری بہن کے اندازے کے مطابق ڈیڈی نے اسے کافی چھوٹ دی ہوئی ہے۔ بہت آزاد خیال ہے وہ! غالباً اپنی ماں کا مزاج پایا ہوگا اس نے۔ سیاحت کا بہت شوق ہے اسے! ڈیڈی نے بتایا تھا کہ وہ مصر کے اہرام دیکھنے گئی ہوئی ہے، اس کی تصویریں دیکھی ہیں میری بہنوں نے۔ مجھ سے چھوٹی والی بتا رہی تھی کہ وہ مجھ سے بہت مشابہ ہے۔''

شمعون نے طویل سانس لی۔ ''اور اس کا نام ثمرین ہے۔''

ساحرہ چونکی۔ ''کیا میں ابھی تمہیں اس کا نام بتا چکی ہوں؟'' وہ کچھ حیرت سے بولی۔

''نہیں۔'' شمعون نے سنجیدگی سے کہا۔ ''دراصل کل شام سے وہ میرے گھر میں ہے۔''

''کیا!'' ساحرہ کا انداز ایسا تھا جیسے اچھل پڑی ہو۔

شمعون نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''کل جب میں گھر پہنچا تو وہ موجود تھی۔'' پھر اس نے وہ سب باتیں دہرا دیں جو ثمرین نے کی تھیں یا اس کی موجودگی میں شمعون کے والدین نے کی تھیں۔

ساحرہ دم بہ خود بیٹھی سب کچھ سنتی رہی۔ جب شمعون خاموش ہو گیا تو بھی وہ کچھ نہیں بولی۔

شمعون بولا۔ ''نقش و نگار میں تو معمولی سا لیکن آنکھیں اور بال تم سے بالکل مختلف ہیں اس کے۔''

''افسوس ہوا ہے مجھے یہ سب کچھ سن کر۔'' ساحرہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اسے ہمارا شہر یا ملک دیکھنے کا شوق ہے تو ڈیڈی اسے ہمارے پاس بھی بھیج سکتے تھے۔ شاید انہیں یہ خیال ہو کہ ہم ثمرین سے اچھا سلوک نہیں کریں گے۔ ان کی یہ سوچ میرے لیے ایک صدمہ ہے۔ میں تو ثمرین کا اتنا خیال رکھتی جتنا شاید اپنا بھی نہیں رکھتی۔''

''تمہیں یہ افسوس ہے کہ وہ تمہارے گھر کیوں نہیں آئی لیکن مجھے یہ سوچنا پڑ رہا ہے کہ وہ میرے ہی گھر کیوں آئی!''

ساحرہ نے اسے غور سے دیکھا۔ ''کیا وہ بہت خوب صورت ہے شمعون!'' اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔

''ہو سکتا ہے، وہ ہو، دوسروں کی نظر میں۔'' شمعون نے سنجیدگی سے کہا۔ ''مجھے تم سے زیادہ خوب صورت کبھی کوئی نہیں لگا۔ تمہاری خاطر میں کسی سے بھی ٹکرا سکتا ہوں ساحرہ!...... بات آ گئی ہے تو آج بتاتا ہوں تمہیں! اسکول کا زمانہ یاد ہے؟''

''خاصی حد تک، کیوں؟''

''منظور نام کا بھی ایک لڑکا پڑھا کرتا تھا وہاں۔''

''میں اس کے بارے میں کبھی نہیں سوچتی تھی اس لیے اب اس کی شکل بھی یاد نہیں رہی۔ بس اتنا یاد ہے کہ وہ ملک کے چند بڑے تاجروں میں سے ایک کا بیٹا تھا۔ اس کی غنڈا گردی سے ماسٹر حضرات تک ڈرتے تھے۔ ریوالور رکھتا تھا وہ ہر وقت اپنے پاس۔''

''ایک مرتبہ پیٹ ڈالا تھا میں نے اسے!''

''کیا!'' ساحرہ حیرت زدہ رہ گئی۔

''ہاں۔'' شمعون نے جواب دیا۔ ''جس دن تم میٹرک کا آخری پرچہ دے کے اسکول سے گئی تھیں، اسی دن!...... وہ چند چاپلوس لڑکوں کے ساتھ ڈینگیں ہانک رہا تھا۔ اس نے تمہارا نام بھی لیا۔ تمہاری خوب صورتی کے بجائے اس نے تمہارے...... بس کیا کہوں...... بڑے بے ہودہ الفاظ تھے اس کے......! کہہ رہا تھا کہ وہ کسی نہ کسی دن تمہارے ساتھ...... خیر چھوڑو!...... بس...... اس کی وہ بکواس ایسی تھی کہ مجھے خود پر قابو نہیں رہا۔ میں نے ان لڑکوں کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کے دو فقرے سنے تھے۔ میں نے آؤ دیکھا، نہ تاؤ، پلٹ کر اس کے جبڑے پر گھونسا رسید کر دیا۔ اس کے گال کے اندر سے خون باہر آ گیا تھا۔ اس نے مجھے گالی دے کر ریوالور نکالا......''

''ریوالور؟ تم پر؟'' ساحرہ کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔

''ہاں ساحرہ! لیکن میں نے ٹھوکر مار کر اس کے ہاتھ سے ریوالور گرا دیا۔ اسکول کے احاطے میں جو کیاریاں لگی تھیں، ان میں کہیں جا کے گرا تھا ریوالور! وہ بزدل مجھ سے دست بہ دست لڑنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ ریوالور ڈھونڈنے کے لیے لپکا۔ اس وقت میرے دو ایک دوست وہاں سے گھسیٹ کر اسکول سے باہر لے آئے اور مجھے برا بھلا کہنے لگے کہ مجھے اس لوفر سے نہیں بھڑنا چاہیے تھا۔''

''ٹھیک ہی کہہ رہے تھے وہ......! اس کے بعد وہ تم سے......''

''نہیں۔ پھر کبھی اس سے میرا آمنا سامنا نہیں ہوا۔ کسی سے اس نے میرا موبائل نمبر لے لیا تھا۔ وہ مجھے کچھ دن تک دھمکیوں کے ایس ایم ایس کرتا رہا، پھر ایس ایم ایس آنا بند ہو گیا۔''

ساحرہ نے طویل سانس لی۔ ''اچھا ہوا کہ اس سے تمہاری دشمنی زیادہ عرصے تک نہیں چلی۔''

''چلتی بھی تو کیا فرق پڑتا! جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں!...... ریوالور جیب سے نکالنے کے لیے تو وہ ہر وقت ادھار کھائے بیٹھا رہتا تھا لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اس نے گولی چلا کر کسی کو زخمی بھی کیا ہو!''

''اچھا چھوڑو......! اس بے ہودہ کا قصہ کہاں لے بیٹھے!''

''بات سے بات نکل آئی۔ میں بس یہ بتا رہا تھا کہ میں تمہارے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ کوئی ہتھیار بھی مجھے تمہارے معاملے میں ڈرا نہیں سکتا۔ تم نے جس انداز میں ثمرین کی خوب صورتی کے بارے میں پوچھا تھا، اس کی وجہ سے بتایا میں نے یہ سب کچھ...... جب تم میرے لیے اتنی اہمیت رکھتی ہو تو کوئی دوسری لڑکی مجھے کیا خاک اچھی لگے گی......؟ ثمرین کا معاملہ میرے لیے بس اتنا تھا کہ وہ ڈیڈی کے دوست کی بیٹی ہے۔ اب میری نظر میں اس کی اہمیت تھوڑی سی بڑھ گئی۔ وہ تمہاری بہن ہے۔ سوتیلی سہی لیکن...... بہن تو ہے!''

''اس کا موبائل نمبر ہے تمہارے پاس؟''

''ہاں۔ کل اس نے خود ہی دیا تھا مجھے!...... یہاں آتے ہی اس نے ائرپورٹ سے مقامی موبائل خرید لیا تھا۔''

''مجھے دو اس کا نمبر۔''

''کیوں؟ بات کرو گی اس سے؟''

''ہاں۔''

''جب اس نے تم سے رابطہ نہیں کیا تو تمہیں کیا ضرورت ہے۔''

''ہو سکتا ہے ڈیڈی نے اس کے دل میں ہم لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہ بننے دی ہو لیکن میرے ساتھ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے اچھا لگے گا اس سے بات کر کے۔''

''اس نے بھی کہا تھا کہ میں اسے تم سے ملاؤں۔ یہ کہتے وقت کیا اسے معلوم نہیں ہوگا کہ تم اس کی کون ہو!''

''ہو سکتا ہے کہ ڈیڈی نے اسے ہم لوگوں کے نام بھی نہ بتائے ہوں، یا شاید کچھ بھی نہ بتایا ہو۔'' ساحرہ نے افسردگی سے کہا۔

شمعون نے اپنا موبائل نکالا۔ اس نے ثمرین کا نمبر فیڈ کر لیا تھا۔ وہ اس نے ساحرہ کے نمبر پر ایس ایم ایس کر دیا۔

بات آگے بڑھی۔ شمعون نے کہا۔ ''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرے ڈیڈی اور تمہارے ڈیڈی اتنے قریبی دوست ہوں گے۔ جب تمہاری بات چھڑی تھی تو ڈیڈی کو بتانا چاہیے تھا کہ تم ان کے ایک بہت قریبی دوست کی بیٹی ہو!''

''ڈیڈی نے ممی جی سے شادی کے وقت اپنے کسی دوست کو نہیں بلایا تھا۔ ممکن ہے کہ بعد میں بھی اپنی اس شادی کے بارے میں خاموش رہے ہوں۔''

''ہو سکتا ہے۔'' شمعون نے سوچتے ہوئے آہستہ سے سر ہلایا۔ ''لیکن مجھے اس معاملے میں کچھ گڑبڑ محسوس ہو رہی ہے۔''

''کیسی گڑبڑ؟''

''اس بارے میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بس الجھن سی ہے۔ بات شاید صرف اتنی نہیں ہوگی جتنی ظاہر ہو رہی ہے۔''

ساحرہ سوچتے ہوئے بولی۔ ''کیا تم یہ سوچ رہے ہو کہ ثمرین اس شہر کی سیاحت کے لیے نہیں، کسی اور مقصد سے آئی ہے۔''

''یا شاید اسے بھیجا گیا ہو!''

''مگر......'' ساحرہ اپنی بات مکمل نہیں کر سکی۔ اس معاملے میں ذہن اس کا بھی الجھ گیا تھا۔

''میں نے سوچا ہے، بات کروں گا ڈیڈی یا ممی سے......! بہت کھل کر بات کروں گا۔ اسی طرح شاید وہ بات سامنے آ سکے جو دماغ میں ایک بے بنیاد سی گڑبڑ کر رہی ہے۔''

''ثمرین۔'' ساحرہ کچھ سوچتے ہوئے آہستہ سے بولی اور چپ ہو گئی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

شمعون اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ”بات پوری کرو اپنی۔ ثمرین کے بارے میں کہنا چاہتی تھیں کچھ!“

”ارے نہیں۔“ ساحرہ دھیرے سے ہنس پڑی۔ ”بس نام آگیا اس کا زبان پر! اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی نا میں...... سوچ یہ رہی تھی کہ اسے رات گئے فون کروں، جب وہ اکیلی ہو۔“

”جو مناسب سمجھو!“

مزید کچھ وقت ان دونوں نے باتوں میں گزارا، پھر ساحرہ اپنے گھر چلی گئی۔ شمعون اپنی کار ادھر ادھر دوڑاتا رہا۔ آدھا گھنٹا اس طرح گزارنے کے بعد اس نے کار کا رخ اس تھانے کی طرف موڑا جہاں وہ توقع کررہا تھا کہ اس کا دوست مل جائے گا۔

لیکن پولیس اسٹیشن پہنچ کر اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ ابرار ڈیوٹی پر نہیں آیا تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی اسی پولیس اسٹیشن میں اے ایس آئی تھا۔ اس نے بتایا کہ ابرار کی طبیعت کچھ خراب ہوگئی تھی اس لیے وہ دن میں نواب شاہ سے نہیں آسکا لیکن کل دوپہر تک کسی ٹرین سے آجائے گا۔

شمعون نے اس سے ابرار کا موبائل نمبر لے لیا لیکن پولیس اسٹیشن سے نکلنے کے بعد اسے فون کرنے کا ارادہ ترک کردیا۔ اسے جو باتیں کرنا تھیں، وہ فون پر مناسب نہیں رہتیں۔ اس نے مزید ایک دن انتظار کرنے کا فیصلہ کیا اور گھر کی طرف چل پڑا۔ اس وقت از خود ثمرین کا سراپا اس کے تصور میں آگیا۔

کچھ اندازہ تو کیا جاسکتا ہے، اس سے باتیں کرکے بھی! شمعون نے سوچا...... کیونکہ اس دن وہ اسپتال نہیں گیا تھا اس لیے جلدی گھر پہنچ گیا جس پر اس کی والدہ نے کہا۔ ”خیریت تو ہے؟ اتنی جلدی آگئے؟“

اس وقت ڈرائنگ روم میں اس کی والدہ کے ساتھ ثمرین بھی تھی۔

والدہ کے سوال کے جواب میں شمعون نے کچھ عذر پیش کردیا۔

والدہ بولیں۔ ”تو پھر آج ہی ثمرین کو کہیں گھما لاؤ!“

”جی بہتر۔“ شمعون نے کہا، پھر ثمرین کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”میں تھوڑی دیر آرام کرکے تیار ہوجاؤں گا۔ چلی چلیے گا آپ!“

”آپ مجھے تم کہہ کر بھی مخاطب کرسکتے ہیں۔“ ثمرین نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

شمعون رسماً مسکرایا۔ ”بے تکلفی دھیرے دھیرے ہی پیدا ہوتی ہے۔“

اس کی والدہ بھی مسکرا رہی تھیں۔

شمعون ایک گھنٹے بعد ثمرین کو اپنی کار میں لے کر گھر سے روانہ ہوا۔ کار کا رخ سی ویو کی طرف تھا۔

”آپ کے والد......“ شمعون نے کہنا چاہا۔

”پھر وہی آپ!“ ثمرین نے اس کی بات کاٹی۔ ”آپ مجھے تم کہہ کر مخاطب کریں، مجھے خوشی ہوگی۔“

”اچھا!“ شمعون نے طویل سانس لی۔ ”اگر ایسی بات ہے تو میں خیال رکھوں گا۔ تمہارے والد......“

”گڈ!“ ثمرین چہکی۔ ”یہ ہوئی نا بات!“

شمعون نے اپنا جملہ پورا کیا۔ ”تمہارے والد محترم احسان صاحب سے میرے ڈیڈی کی دوستی کب سے ہے؟ مجھے اس بارے میں کچھ نہیں معلوم!“

”مجھے بھی علم نہیں تھا۔ میں تو تقریباً مصر گئی ہوئی تھی۔ وہاں ڈیڈی کا فون آیا۔ انہیں علم تھا کہ مجھے وہ شہر دیکھنے کا بہت شوق ہے جہاں وہ پیدا ہوئے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ فوراً یہاں کے لیے روانہ ہوجاؤں اور یہاں مجھے ان کے دوست جسٹس انعام کے گھر میں رہنا ہے۔“

شمعون کے والد کا نام انعام حیدر تھا اور وہ ہائی کورٹ کے جسٹس تھے۔

ثمرین نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”فون پر ہی ڈیڈی نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کے والد اور وہ ایک ہی اسکول میں پڑھے تھے اور ان کی دوستی سات آٹھ سال کی عمر سے تھی۔ پھر میرے دادا، مطلب یہ کہ ڈیڈی کے والد نے انہیں اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر بھیج دیا۔ وہاں ڈیڈی کو میری ماں پسند آگئیں۔ میری ماں عیسائی تھیں مگر انہوں نے شادی سے پہلے اسلام قبول کرلیا تھا۔ اس کے باوجود ڈیڈی نے یہاں اپنے والد کو اپنی شادی سے بے خبر رکھا تھا۔ وہ ڈرتے تھے کہ ان کے والد ان کی اس شادی کو پسند نہیں کریں گے۔ جب ان کی تعلیم مکمل ہوگئی تو وہ یہاں آئے۔ مام کو وہ ساتھ نہیں لائے تھے۔ وہ اپنے والد کو یہ تجویز پیش کرنا چاہتے تھے کہ وہ اپنے کاروبار کی ایک شاخ برطانیہ میں بھی قائم کریں جس کو سنبھالنے کی ذمے داری ان کی ہوگی۔ انہوں نے مام کو بھی یقین دلایا تھا کہ وہ اپنے والد سے اپنی بات منوا لیں گے اور پھر ہمیشہ کے لیے برطانیہ آجائیں گے، بعد میں ایسا ہو تو گیا لیکن حالات بدل گئے۔ دادا نے ڈیڈی سے شادی کے لیے ایک لڑکی منتخب کرلی تھی۔ ان دنوں دادا کچھ بیمار بھی رہنے لگے تھے۔ کچھ کیا، اچھے خاصے بیمار ہوگئے تھے۔ ڈیڈی ان کے حکم کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہوگئے۔ انہوں نے یہاں بھی شادی کرلی، مام کو انہوں نے بے خبر نہیں رکھا تھا، اپنی مجبوری بتادی تھی...... پھر یہ ہوا کہ شادی کے ایک ماہ بعد ہی دادا کا انتقال ہوگیا۔ ڈیڈی نے کچھ عرصہ یہاں رہنے کے بعد سارا کاروبار ہی برطانیہ منتقل کردیا۔ خود بھی مام کے پاس پہنچ گئے لیکن انہوں نے اپنی دوسری بیوی کو یہیں چھوڑ دیا تھا۔ سال میں ایک آدھ بار ان سے ملنے یہاں آتے رہتے ہیں۔“

شمعون نے بڑے تحمل سے ثمرین کی ساری باتیں سنیں۔ جب ثمرین خود ہی سب کچھ بتا رہی تھی تو اسے سوال کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی، جب وہ خاموش ہوگئی تو شمعون بولا۔

”یہاں وہ لوگ کہاں رہتے ہیں؟“

”یہ مجھے نہیں معلوم...... جانے کیوں ڈیڈی نے یہ بات راز میں ہی رکھی، لیکن اب شاید یہ بات کھل جائے۔ فون پر میری بات اپنے بڑے بھائی سے بھی ہوئی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ ڈیڈی نے اپنی تین بیٹیوں کو کسی وجہ سے اپنے پاس بلالیا ہے۔ بس ایک بیٹی کو یہاں ماں کے پاس چھوڑ دیا ہے اور کسی خاص وجہ سے چھوٹے بیٹے کو بھی!“

”تمہاری خواہش ہے ان لوگوں سے ملنے کی؟“

”خواہش تو ہے لیکن ڈیڈی کی وجہ سے ڈر لگتا ہے۔“

یہاں اس گفتگو میں رکاوٹ آگئی کیونکہ وہ سی ویو پہنچ چکے تھے۔ ثمرین نے ساحل سمندر کی چہل پہل پر تبصرے شروع کردیے، یہ بھی کہا کہ یہ مغربی ساحلوں سے یکسر مختلف ہے جہاں عورتیں، مرد، جوان لڑکے لڑکیاں بھی سن باتھ لیتے نظر آتے ہیں۔

”یہ معاشرے کا فرق ہے۔“ ثمرین نے خود ہی تبصرہ کیا۔

شمعون نے اس تبصرے پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اس کا دماغ اور کئی سوالوں میں الجھا ہوا تھا۔ وہ ان سوالوں پر ثمرین سے بات کرنا چاہتا تھا۔ یہ موقع اسے سی ویو پر ایک گھنٹا گزارنے کے بعد ملا، لیکن اس سے پہلے ثمرین کی ایک بات بھی بیچ آگئی تھی۔

”میں قائداعظم کا مزار بھی دیکھنا چاہتی ہوں۔ ڈیڈی نے بتایا تھا کہ وہ جگہ رات کے وقت بہت خوب صورت نظر آتی ہے اور اب رات ہونے والی ہے۔“

”اچھا! وہیں چلتے ہیں۔ اس کے بعد گھر چلیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔ باقی مقامات کل سہی!“

کار اب قائداعظم کے مزار کی طرف رواں دواں تھی اور شمعون کا دماغ کوئی ایسا جملہ سوچ رہا تھا کہ ثمرین سے ان باتوں کا آغاز کرسکے جو اب بھی اس کے دل و دماغ میں سرسراہٹ سی پیدا کررہی تھیں۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ ثمرین کی یہاں آمد کا مقصد شوق سیاحت ہی تھی لیکن اسے یہاں اس کے والد نے بھیجا تھا اور بھیجا بھی اپنے دوست، یعنی شمعون کے والد کے گھر!

یہ صورت حال سامنے بھی اس وقت آئی تھی جب شمعون اور ساحرہ کی شادی کا معاملہ نشاط کی وجہ سے گرداب میں پھنس گیا تھا۔ یہ بات بھی غالباً شمعون اور ثمرین کے والد کے درمیان ہوئی ہو کہ شمعون ساحرہ کو پسند کرتا تھا لیکن اس کی شادی وہاں ممکن نہیں تھی اور ثمرین چونکہ بڑی حد تک ساحرہ کی ہم شکل تھی لہٰذا اسے ساحرہ کے متبادل کے طور پر شمعون کے سامنے لایا گیا تھا۔

مگر یہ سب باتیں جاننے کے لیے شمعون کی سمجھ میں کوئی ابتدائی مناسب جملہ نہیں آسکا اور کار قائداعظم کے مزار تک پہنچ گئی۔ اس دوران میں ثمرین وہاں کی عمارتوں، سڑکوں اور ٹریفک کے بارے میں کچھ نہ کچھ کہتی رہی تھی اور شمعون سرسری جواب دیتا رہا تھا۔

کار پارک ہوئی، انجن بند کیا گیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ دونوں کار سے اترتے، ثمرین کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔

”کیا لندن سے ڈیڈی کا فون آگیا!“ ثمرین نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور موبائل نکالا، پھر اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”یہ تو کوئی اجنبی نمبر ہے۔“

اس نے موبائل کی اسکرین شمعون کے سامنے کی۔

شمعون نے اسکرین پر ساحرہ کا نمبر دیکھا۔

ساحرہ نے شمعون ہی سے ثمرین کا نمبر لیا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ وہ زیادہ رات گزرنے پر ہی ثمرین کو فون کرے گی لیکن ابھی رات کا آغاز ہی ہوا تھا۔

”یہ ساحرہ کا نمبر ہے۔“ شمعون نے سنجیدگی سے کہا۔ ”تمہیں اس سے ملنے کی خواہش بھی تھی۔ تم نے کہا تھا کہ تمہیں اس سے ملاؤں۔ میں نے ساحرہ سے بھی تمہارا ذکر کیا تھا۔ اس نے مجھ سے ہی تمہارا نمبر لیا تھا۔ اگر اسے تمہارا نمبر بتانا میری غلطی ہے تو کال ریسیو مت کرو۔“

”ارے نہیں۔“ ثمرین بولی۔ ”میں خود اس سے ملنا چاہتی ہوں اور وہ بھی مجھ سے بات کرنا چاہتی ہے تو میں کیوں بات نہ کروں۔“

اس دوران میں کئی گھنٹیاں بج چکی تھیں۔ شاید اب رابطہ منقطع ہی ہوجاتا کہ ثمرین نے کال ریسیو کرلی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"ہیلو!" وہ مسکراتے ہوئے بولی اور ساتھ ہی اس نے اسپیکر بھی آن کر دیا۔ وہ شمعون کو بھی ساحرہ کی آواز سنانا چاہتی تھی۔

"ثمرین! میرا نام ساحرہ ہے، میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ سوچا تھا کہ تمہیں رات کو فون کروں گی لیکن بے تابی بڑھ گئی۔ شمعون نے تم سے میرا ذکر تو کیا ہوگا، تمہارا نمبر میں نے اسی سے لیا تھا۔"

"ملنا تو میں بھی چاہتی ہوں ساحرہ! بہت خوشی ہوگی مجھے!"

"میں تمہیں دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتی ثمرین!...... میرے بارے میں جاننے کے بعد تم شاید مجھ سے ملنا پسند نہ کرو۔ مجھے اس کا افسوس تو ہوگا لیکن میں تمہیں بے خبر نہیں رکھنا چاہتی، میں......"

ثمرین نے تیزی سے بات کاٹی۔ "ایسی تو کوئی بات نہیں ہوسکتی کہ میں تم سے ملنا نہ چاہوں۔"

"بات کچھ ایسی ہے ثمرین!...... میں تمہاری بہن ہوں۔ مبشر احسان میرے بھی والد ہیں۔"

ثمرین کے دماغ کو شاید جھٹکا لگا تھا۔ وہ فوراً کچھ نہیں بول سکی۔ اس نے شمعون کی طرف دیکھا تھا جس کے چہرے پر سنجیدگی تھی وہ بہ غور ثمرین کا جائزہ لے رہا تھا۔

ساحرہ پھر بولی۔ "ڈیڈی نے جانے کیوں نہیں چاہا کہ تم بہن بھائی ہم سے ملو۔ یہی وجہ ہوسکتی ہے کہ انہوں نے تمہیں ہمارے پاس بھیجنے کے بجائے اپنے دوست کے گھر بھیج دیا۔ اسی لیے میں نے کہا تھا کہ ڈیڈی کی خفگی کے ڈر سے تم مجھ سے نہ ملو۔"

"میں تم سے ضرور ملوں گی میری اچھی بہن!" ثمرین یک بہ یک پرجوش ہوگئی۔ "ڈیڈی سے کوئی بھی بہانہ کردوں گی لیکن تم سے ضرور ملوں گی، میں ابھی آتی ہوں تمہارے پاس! شمعون سے کہوں گی کہ وہ مجھے تمہارے گھر لے چلیں۔"

"تم اس وقت کہاں ہو!"

"شہر گھومنے نکلی تھی۔ شمعون میرے ساتھ ہیں۔ مجھے امید ہے کہ تم برا نہیں مانو گی اگر میں تمہیں بتادوں کہ میں نے اپنے موبائل کا اسپیکر آن کر دیا تھا، یہ باتیں شمعون نے بھی سنی ہیں۔"

"کوئی حرج نہیں، مجھے خیال بھی تھا کہ شاید تم شمعون کے ساتھ ہوگی، چلو اچھا ہے...... میں شمعون سے کچھ کہوں؟"

"ہاں ہاں، کیوں نہیں!"

دوسری طرف سے پکارنے والے انداز میں کہا گیا۔

"شمعون!"

"بولو ساحرہ!" شمعون نے کہا۔

"تم ثمرین کو جلد از جلد لاؤ میرے پاس...... میں اپنی بہن کو سینے سے لگانے کے لیے بے چین ہوں۔"

"میں آتا ہوں ساحرہ!"

"آؤ، جلدی آؤ......"

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ ثمرین نے بھی اپنا موبائل بند کیا۔ شمعون نے کار اسٹارٹ کی۔ ثمرین کسی سوچ میں تھی۔ اچانک اس نے موبائل پر نمبر ملایا۔ شمعون یہ بعد میں سمجھ سکا کہ اس نے کس کا نمبر ملایا تھا۔ اس نے اسپیکر پھر آن کیا۔

"ساحرہ!" ثمرین نے موبائل میں کہا۔ "میں نے تم سے ایک بات پوچھنے کے لیے فون کیا ہے، کوئی خیال آیا ہے میرے ذہن میں، لیکن میں تم سے پہلے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ تم ممی سے میرا ذکر کر چکی ہو یا نہیں؟"

"ممی سے تمہاری مراد میری ممی ہی ہیں نا؟"

"وہ میری بھی ممی ہیں۔" ثمرین جذباتی ہوگئی۔ "مجھے تو ڈیڈی کے اس رویے پر افسوس ہے جو انہوں نے تم لوگوں کے ساتھ روا رکھا ہے۔"

ساحرہ نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔

"چپ کیوں ہوگئیں ساحرہ!" ثمرین بولی۔

"جذباتی کر دیا ہے تمہارے جواب نے مجھے!" اس مرتبہ ساحرہ کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ "خیر!...... نہیں ثمرین!...... ابھی تک میں نے ممی کو تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ انہیں افسوس ہوتا کہ تم ہمارے گھر نہیں آئیں۔"

"میں انہیں افسوس نہیں کرنے دوں گی۔ اچھا کیا تم مجھے معاف کر دو گی اگر میں کہوں کہ میں ابھی نہیں، کل آؤں گی۔"

"میں تو بہت بے چین ہوگئی تھی ثمرین، لیکن اگر تمہیں کوئی زیادہ ضروری کام یاد آگیا ہے تو پھر کل سہی!"

"اس وقت تم سے ملنے سے زیادہ ضروری کام میرے لیے کچھ نہیں۔ سبب کچھ اور ہے، میں تمہیں کل بتاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے ثمرین!...... کل آجانا۔"

"ممی سے اب بھی میرا ذکر نہیں کرنا۔ میں انہیں سرپرائز دینا چاہتی ہوں۔"

"اچھا!" ساحرہ ہنسی۔ "یہ بات ہے تو میں ابھی کچھ نہیں بتاؤں گی۔"

"تھینکس سویٹ ہارٹ!" ثمرین نے ماؤتھ پیس چوم کر رابطہ منقطع کر دیا۔

شمعون نے ثمرین کا ارادہ تبدیل دیکھ کر کار کی رفتار کم کردی تھی۔

"کل صبح تم مجھے بازار لے جاسکتے ہو نا شمعون!...... دراصل میں دو ایک چیزیں خریدنا چاہتی ہوں۔ ان میں سے ایک چیز کی خریداری کے سلسلے میں تو تمہارا تعاون بہت ضروری ہے۔"

"کیا خریدنا ہے؟ ابھی خرید لو، کل تو مجھے اسپتال جانا ہوگا۔"

"کیا اب دکانیں بند نہیں ہوں گی۔"

"تمہیں خریدنا کیا ہے؟"

ثمرین نے دو چیزوں کے نام لیے۔ شمعون حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا، پھر یکایک مسکرا دیا۔ ثمرین کا مقصد اس کی سمجھ میں آگیا تھا۔

"چلو ابھی دیکھ لیتے ہیں۔" شمعون نے کار ایک جانب موڑتے ہوئے کہا۔ "بعض دکانیں کچھ دیر تک کھلی رہ جاتی ہیں۔"

لیکن ثمرین کو جو کچھ چاہیے تھا، وہ اس وقت نہیں مل سکا۔ ثمرین نے ضد کی۔ "کل اسپتال سے چھٹی کر لو شمعون!"

"میں آج بھی جلدی آگیا تھا۔ اچھا خیر! میں کل ڈیڑھ بجے تک گھر پہنچ جاؤں گا۔ میرے پاس صرف ایک گھنٹا ہوگا۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ تم ہارن کی آواز سن کر فوراً باہر آجانا۔ دراصل مجھے بھی کل ایک ضروری کام ہے، تین بجے کہیں پہنچنا ہے مجھے!"

"میں بالکل تیار رہوں گی چلنے کے لیے۔" ثمرین نے کہا۔

شمعون کار اب گھر کی طرف موڑ چکا تھا۔

☆☆☆

دوسرے دن شمعون نے ثمرین کو شاپنگ کروائی اور پھر اسے ایک ٹیکسی دلا دی۔ اس نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اس کے پاس وقت بہت کم ہوگا، وہ اسے واپس گھر یا ساحرہ کے گھر چھوڑنے نہیں جاسکے گا۔ ثمرین نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ رات کو ہی اس نے ثمرین کے گھر کا پتا اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔

شمعون پولیس اسٹیشن روانہ ہوگیا جہاں اسے سب انسپکٹر ابرار سے ملاقات کرنا تھی۔

ملاقات ہوگئی۔ دونوں گرم جوشی کے ساتھ ایک دوسرے سے ملے۔ شمعون جلد از جلد اس سے اپنے مقصد کی بات شروع کرنا چاہتا تھا لیکن ابرار نے ضد کی کہ اطمینان سے بیٹھ کر گفتگو کریں گے اور پولیس اسٹیشن میں رہتے ہوئے اطمینان نصیب نہیں ہوسکتا۔ وہ شمعون کو قریب کے ایک صاف ستھرے ریسٹورنٹ میں لے گیا۔ چائے اور کچھ اسنیکس کا آرڈر کرنے کے بعد شمعون سے بولا۔

"ہاں اب کہو، کیا بات ہے؟ کیوں ڈھونڈ نکالا تم نے مجھے!"

"کچھ کام آپڑا ہے تم سے...... شرمندہ ہوں کہ اپنے ایک کام ہی کی وجہ سے تم مجھے یاد آئے!"

"شرمندگی کی کوئی بات نہیں اس میں...... وقت ہی ایسا آگیا ہے جسے مشینی کہتے ہیں۔ ہر شخص مشین بنا ہوا ہے، کسی سے کوئی کام پڑ جائے، تبھی اس سے ملنے کے لیے وقت نکالنا پڑتا ہے۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو بھی یہی بات ہوتی...... تم اپنا مسئلہ بتاؤ۔"

شمعون نے اسے خواجہ سرا زینت اور اس کے گھر کے بارے میں بتایا۔

ابرار ہنس پڑا۔ "اس چکر میں تم کہاں پڑ گئے۔"

"پوری بات تو سنو!" شمعون نے کہا۔ "وہ خواجہ سرا میرے ایک جاننے والے کے لیے پریشانی کا سبب بن گیا ہے۔"

"اوہ!...... تب تو میرے ایک دوست کا خیال ٹھیک ہی نکلا۔"

"کیا مطلب!"

"وہ اسی پولیس اسٹیشن میں ہے جہاں سے تم نے میرا سراغ لگایا۔ اس نے ابھی کچھ ہی دن ہوئے مجھے اس خواجہ سرا کے بارے میں بتایا تھا...... اپنے علاقے کے لوگوں سے تو پولیس والے واقف ہی ہوتے ہیں۔ میرے اس دوست کو شبہ ہوگیا ہے کہ وہ خواجہ سرا اس بنگلے میں کیوں رہتا ہے۔ اس کے پاس ایک کار بھی ہے لیکن کبھی کبھی وہ ٹیکسی میں سفر کرتا ہے، یہ بات تو معنی خیز ہے ہی لیکن اس نے دو مرتبہ ایک اجنبی شخص کو بھی خواجہ سرا کے گھر میں جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ میرا دوست آج کل ایک کیس میں الجھا ہوا ہے ورنہ وہ اس خواجہ سرا کے بارے میں چھان بین شروع کر چکا ہوتا۔ ایک کام اس نے بہرحال کرلیا ہے۔ اپنے موبائل سے اس نے خواجہ سرا کی تو کئی تصویریں بنالی ہیں اور جو شخص اس سے ملنے آتا ہے، اس کی بھی دو تصویریں اتار لی ہیں۔"

یہ بات شمعون کے لیے بھی معنی خیز تھی کہ خواجہ سرا زینت سے کوئی ملنے آتا تھا۔ یہ بات تو سامنے آچکی تھی کہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس خواجہ سرا پر کوئی امیر آدمی مہربان ہوگیا ہے لیکن شمعون کے خیال کے مطابق اس آدمی کو ضرورت نہیں تھی کہ وہ خواجہ سرا سے ملنے اس کے گھر جاتا۔ وہ خود خواجہ سرا کو کہیں بھی طلب کرسکتا تھا۔

''وہ تصویریں مل سکتی ہیں؟'' شمعون نے جلدی سے پوچھا۔

اسے یہ خواہش اس لیے ہوئی تھی کہ اس نے خواجہ سرا کو قریب سے نہیں دیکھا تھا۔

''مل جائیں گی۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں ابھی اپنے دوست سے فون پر بات کیے لیتا ہوں۔ اس سے کہہ دوں گا کہ تصویریں وہ میرے موبائل پر ایم ایم ایس کردے۔''

''میرے ہی موبائل پر کروادو۔''

''یہ بھی ہوجائے گا، لیکن مسئلہ کیا ہے، یہ تم نے اب تک نہیں بتایا۔''

''پہلے تم تصویروں کا کام تو کرو۔ وہ تو منگواؤ......''

اس وقت ویٹر آرڈر کی ہوئی مطلوبہ اشیا لے آیا۔ ابرار نے موبائل پر اپنے دوست کا نمبر ملاتے ہوئے کہا۔ ''تم چائے بناؤ، میں بات کرتا ہوں۔''

شمعون پیالیوں میں چائے بنانے لگا، مگر اس کی توجہ ابرار کی طرف رہی۔ دوسری طرف سے غالباً استفسار کیا گیا کہ ابرار کو اچانک اس خواجہ سرا سے کیا دلچسپی ہوگئی۔ ابرار نے فوری طور پر تو اسے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ وہ اگلے دن اس سے ملنے آئے گا تو سبب بتائے گا۔ اس نے اپنے دوست کو شمعون کا نمبر بھی دیا۔ خود اس کا نمبر اس کے دوست کے پاس تھا ہی! ان نے دونوں نمبروں پر تصویریں بھیجنے کی بات کی تھی اور رابطہ منقطع کردیا۔

چائے پینے کے دوران ہی دونوں کو ایم ایم ایس مل گئے۔ چائے سے شمعون کی دلچسپی یکسر ختم ہوگئی۔ وہ اپنے موبائل کی اسکرین پر یکے بعد دیگرے وہ سب تصویریں دیکھنے لگا جو بھیجی گئی تھیں۔ خواجہ سرا کی چار تصویریں تھیں مگر ان میں اس کے چہرے کے نقوش واضح نہیں تھے۔ مرد کی دو تصویریں کچھ قریب سے لی گئی تھیں۔ ان میں بھی نقش ونگار زیادہ واضح نہیں تھے۔ پھر بھی شمعون کو محسوس ہوا کہ وہ چہرہ اس نے شاید پہلے بھی کبھی دیکھا تھا۔

''نقش ونگار واضح نہیں ہیں۔'' ابرار نے شمعون کے دل کی بات کہی، پھر بولا۔ ''لیکن کمپیوٹر پر انہیں کچھ بڑا کرکے دیکھا جاسکتا ہے۔''

''مجھے بھی یہی خیال آیا ہے۔'' شمعون نے کہا۔ ''میں اب چلتا ہوں۔''

''چائے تو پی لو بھائی!...... مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے تم ان تصویروں کو دیکھ کر ہیجان میں مبتلا ہوگئے ہو۔''

''ٹھیک سمجھے......! یہ مرد کی تصویر...... مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں اسے پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہوں۔ کمپیوٹر پر بڑا کرکے دیکھوں گا تو شاید کچھ یاد آجائے!...... چائے پھر کبھی آکر اور پی لوں گا۔'' شمعون کھڑا ہوگیا۔ ''تم سے دوبارہ ملاقات تو کرنا ہی ہوگی۔ تبھی میں تم کو بتاؤں گا کہ میں اس خواجہ سرا کے بارے میں کیا چاہتا ہوں۔''

ابرار کے اصرار کے باوجود شمعون نہیں رکا اور تیزی سے اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ گھر پہنچ کر اس نے اپنے کمرے کا رخ کیا تھا۔ والدہ سے غیر متوقع طور پر مڈبھیڑ ہوگئی۔

''جب فارغ ہی تھے تو ثمرین کو کہاں چھوڑ آئے۔'' انہوں نے پوچھا۔

''کیا وہ آئی نہیں؟ مجھے ایک ضروری کام تھا ممی! میں نے ثمرین کو ٹیکسی دلادی تھی۔''

''فون آیا تھا اس کا...... بتایا تھا اس نے کہ تم ایک ضروری کام سے چلے گئے ہو اور اب وہ ٹیکسی میں خود ہی ادھر ادھر گھومنے کے بعد گھر آئے گی۔ مجھے تمہاری اس حرکت پر بہت غصہ آیا تھا۔ فون کرتے کرتے رہ گئی تمہیں! نہ جانے کیا کہہ ڈالتی غصے میں۔''

''معاف کردیں ممی...... دراصل کام بہت ضروری تھا۔ میں نے ثمرین کو بتا بھی دیا تھا پہلے سے!''

''اس کو سمجھنے کی کوشش کرو شمعون!...... خوامخواہ نہیں بلایا گیا ہے اسے یہاں۔''

شمعون چونکا۔ ''بلایا گیا ہے؟''

''ہاں، تمہارے ڈیڈی کو جب ساحرہ کے والد کا نام معلوم ہوا تھا تو وہ چونکے تھے۔ لندن میں مقیم ان کے ایک دوست کا نام بھی یہی ہے۔ انہوں نے مبشر بھائی سے فون پر بات کرکے جب تمہارے اور ساحرہ کے بارے میں بتایا تو وہ کھل گئے۔ ساحرہ ان کی دوسری بیوی کی بیٹی ہے۔ جب ساری بات ان کے علم میں آئی اور خاص طور سے یہ بات کہ نشاط کی وجہ سے یہ شادی ہمارے لیے مسئلہ بن جائے گی تو مبشر بھائی نے اس کا برا نہیں مانا۔ انہوں نے یہ تجویز رکھی کہ تمہاری شادی ثمرین سے کی جاسکتی ہے۔''

شمعون کو اس بات کا شک تھا لیکن بات واضح طور پر

سامنے آئی تو اسے جھٹکا سا لگا۔ اس کی والدہ اس کی کیفیت سے بے خبر کہتی رہیں۔ ''مبشر بھائی نے کہا تھا کہ ثمرین حیرت انگیز حد تک ساحرہ سے مشابہ ہے اس لیے شمعون کو پسند آسکتی ہے۔''

وہ خاموش ہوکر شمعون کو ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھنے لگیں۔

''نہیں ممی! ساحرہ کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ آپ اور ڈیڈی یہ خیال اپنے ذہن سے نکال دیں۔'' شمعون نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا اور تیزی سے چلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اس کی والدہ اپنی جگہ کھڑی اسے جاتے دیکھتی رہیں۔ وہ فکرمند نظر آنے لگی تھیں۔

شمعون جھنجلاہٹ کا شکار ہوجانے کے باوجود اپنے کمرے میں پہنچ کر سیدھا کمپیوٹر کے سامنے جا بیٹھا۔ موبائل کی تصویریں اس نے کمپیوٹر میں منتقل کیں اور انہیں بڑا کرکے دیکھا۔

تصویریں بڑی ہوئیں تو شمعون جیسے پلکیں جھپکانا بھول گیا۔ خواجہ سرا اور اس مرد میں بھی غیر معمولی مماثلت تھی جو خواجہ سرا کے گھر آتے جاتے دیکھا گیا تھا۔ ایک پل کو شمعون کے دماغ میں یہ بات بھی آئی کہ وہ دونوں شاید سگے بھائی تھے جن میں سے ایک خواجہ سرا بن گیا تھا......

اور پھر اس وقت تو اس کے جسم میں سنسناہٹ سی پھیل گئی جب اسے یاد آیا کہ مرد کو اس نے پہلے کہاں دیکھا تھا۔ اگرچہ برسوں گزر چکے تھے لیکن چہرے کے نقش ونگار اس عرصے میں بہت زیادہ نہیں بدلتے۔ شمعون کے یقین کے مطابق وہ منظور ہی ہوسکتا تھا۔ وہی منظور جسے شمعون نے اسکول کے زمانے میں اس کی بدتمیزی پر گھونسا مارا تھا۔ اتفاق سے یہ یاد اسے گزشتہ روز بھی آئی تھی اور اس نے ساحرہ سے اس کا ذکر کیا تھا لیکن اس نے ساحرہ کو یہ نہیں بتایا تھا کہ منظور نے بعد میں اسے جو ایس ایم ایس کیے تھے، ان میں اس نے شمعون کو جو دھمکیاں دی تھیں، ان میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ اگر اسے کبھی مناسب موقع ملا تو ساحرہ کو چھوڑے گا نہیں!......

''چھوڑے گا نہیں۔'' کا مطلب اتنا صاف تھا کہ اس کی صراحت ووضاحت کی ضرورت نہیں تھی۔

شمعون کرسی سے اٹھ کر بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ دو باتیں اس کے ذہن میں چکرا رہی تھیں۔ ایک امکان تو یہ تھا کہ منظور اپنے خواجہ سرا بھائی کے ذریعے کوئی ایسا چکر چلوانا چاہتا ہو کہ ساحرہ اس کے ہاتھ لگ جائے اور دوسری صورت یہ بھی ممکن تھی کہ اس نے خود ہی خواجہ سرا بن کر نشاط سے دوستی کی ہو۔ اس طرح اسے ساحرہ کے گھر میں قدم رکھنے کا موقع مل گیا تھا۔ گھر میں آمدورفت ہوجانے کے باعث وہ ساحرہ کی تاک میں رہ سکتا تھا۔

شمعون نے فیصلہ کیا کہ خواجہ سرا اور منظور اگر ایک شخصیت نہیں تو بھی یہ ضروری ہے کہ کوئی خاص قدم اٹھانے سے پہلے وہ ساحرہ کو چوکنا کردے۔

☆☆☆

جس وقت شمعون پولیس اسٹیشن میں ابرار سے ملا تھا، اس وقت ساحرہ کے گھر میں ایک اندوہناک واقعے کے لیے زمین ہموار ہونا شروع ہوچکی تھی۔ نشاط ڈرائنگ روم میں ٹہلتے ہوئے موبائل پر خواجہ سرا زینت کے موبائل کا نمبر ملا رہا تھا۔ رابطہ قائم ہوجانے پر دوسری طرف سے آواز آئی۔

''کیا بات ہے نشاط میری جان!''

''گھبراہٹ سی ہورہی ہے جانی!'' نشاط نے کہا۔ ''تم سے ملنے کو جی چاہ رہا ہے۔''

''میں ایک کام سے جارہی ہوں جان!''

''مجھ سے بڑھ کر بھی کوئی کام ہوسکتا ہے تمہارے لیے؟'' نشاط نے منہ پھلا کر کہا۔

''تم سے بڑھ کر تو میرے لیے کچھ بھی نہیں ہے لیکن بات کچھ ایسی ہے جان کہ میں مجبور ہوں۔ تم کچھ وقت اپنی باجی یا والدہ سے گپ شپ میں گزار لو۔ تمہاری تو بوا سے بھی گاڑھی چھنتی ہے۔''

''بوا کو ممی اپنے ساتھ لے گئی ہیں۔ جانے کون مرگیا ہے، اسی کے گھر گئی ہیں۔ بس چوکیدار اور مالی ہیں۔ ان سے میں بات نہیں کرتا، گھر میں بس میں ہوں اور باجی ہیں اور تمہیں تو پتا ہے کہ وہ مجھ سے اچھی طرح بات نہیں کرتیں۔ فاران اور مسعود بھی شاپنگ کرنے گئے ہوئے ہیں۔''

دوسری طرف سے فوراً جواب نہیں آیا۔

''ہیلو!'' نشاط بولا۔ ''چپ کیوں ہوگئیں جانی؟''

''سوچنے لگی تھی کہ اپنا کام کیسے ٹالوں۔ اچھا خیر! میں آتی ہوں۔''

''کتنی دیر لگے گی؟'' نشاط نے بے چینی سے پوچھا۔

''کوشش کرتی ہوں جلدی آنے کی۔'' جواب ملا۔ ''تیس چالیس منٹ لگ جائیں گے۔''

''اتنی دیر؟'' نشاط نے منہ بنایا۔ ''ہائے اللہ، تم تو......''

''فاصلہ بھی تو کوئی چیز ہے جان!...... بہت دور ہوں اس وقت!'' جواب آیا۔ ''ٹیکسی مل جائے فوراً تو آدھے

WWW.PAKSOCIETY.COM

گھنٹے کا راستہ ہے۔ ٹیکسی یہاں فوراً نہیں ملتی۔ اس میں بھی پانچ دس منٹ لگ سکتے ہیں۔ تمہاری والدہ کب آئیں گی۔"

"اللہ جانے!...... کچھ بتا کر نہیں گئیں، بس تم آجاؤ۔ جتنی جلدی ہوسکے، بہت یاد آرہی ہو تم اس وقت۔"

"اچھا میں آتی ہوں۔ جتنی جلدی بھی ہوسکا۔"

نشاط نے ماؤتھ پیس کو بوسہ دے کر رابطہ منقطع کردیا۔ خواجہ سرا زینت سے اس کی قربت بڑھتی ہی جارہی تھی۔ اس کا جی چاہنے لگا تھا کہ اپنی باقی زندگی خواجہ سرا زینت ہی کے ساتھ گزارے۔ اس نے اپنی اس خواہش کا اظہار خواجہ سرا سے بھی کردیا تھا۔

"مجھ جیسے ہوجاؤ، تبھی یہ ہوسکتا ہے۔" خواجہ سرا زینت نے کہا تھا۔ "اس کے لیے تمہیں کچھ قربانی دینا ہوگی!"

"کیسی قربانی؟"

جواب میں خواجہ سرا نے ایک ایسی بات کہی تھی کہ نشاط ڈر سا گیا تھا لیکن اس نے خواجہ سرا سے وعدہ کرلیا تھا کہ وہ اپنے دل سے وہ خوف نکالنے کی کوشش کرے گا۔

"کرلیا جائے ایسا" نشاط اس وقت سوچ رہا تھا۔ اس نے اپنا خوف بڑی حد تک کم کرلیا تھا اور آج وہ خواجہ سرا سے اس بارے میں تفصیلی بات کرنا چاہتا تھا۔

گھر والے چھوٹ جائیں تو چھوٹ جائیں، وہ سوچ رہا تھا، انہیں کون سی پروا ہے میری!...... یہ فاران مجھے تھوڑا سا اچھا لگا تھا مگر وہ بھی...... ہونہہ!

نشاط نے ٹہلتے ہوئے سر جھٹکا۔ پندرہ منٹ اس نے ٹہلتے ہوئے ہی گزار دیے تھے۔ اس کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ وہ ڈرائنگ روم سے برآمدے میں نکل آیا۔ وہاں سے وہ پھاٹک پر نظر رکھ سکتا تھا۔ برآمدے میں دو کرسیاں پڑی ہوئی تھیں لیکن وہ اتنا بے چین تھا کہ وہاں بھی ٹہلتا ہی رہا۔

فاران اور مسعود آدھے گھنٹے پہلے ہی کہیں شاپنگ کے لیے گئے تھے۔ گھر میں کار ایک ہی تھی۔ نشاط کی والدہ کہیں جاتی تھیں تو ساحرہ کو ساتھ لے جاتی تھیں۔ ساحرہ ہی ڈرائیونگ کرتی تھی، شوفر نہیں رکھا گیا تھا۔ ساحرہ اس دن گھر سے کہیں نہیں جانا چاہتی تھی۔ ویسے بھی موت کے کسی گھر میں جاکر اس کا بلڈ پریشر ہائی ہونے لگتا تھا۔ یہ بات اس کی والدہ بھی جانتی تھیں۔ اس وقت فاران نے ان سے کہا کہ وہ اور مسعود کچھ شاپنگ کرنے کے لیے جانا چاہتے ہیں اس لیے انہیں بھی کار کی ضرورت ہے وہ انہیں کار میں وہاں چھوڑ دیں گے جہاں انہیں جانا ہے۔ پھر شاپنگ کے لیے چلے جائیں گے اور واپسی پر انہیں لیتے آئیں گے۔ اگر اس وقت تک ان کی واپسی ممکن نہیں ہوئی تو فاران کار کے ساتھ مسعود کو وہیں چھوڑ دے گا اور خود ٹیکسی کرکے گھر آجائے گا۔ مسعود کی عمر اگرچہ کم تھی لیکن وہ ڈرائیونگ جانتا تھا۔

انہی سب واقعات کی وجہ سے گھر میں اس وقت صرف ساحرہ اور نشاط تھے۔ برآمدے میں ٹہلتے ہوئے نشاط کو قریب قریب پندرہ منٹ اور گزر رہے تھے کہ اس نے ایک ٹیکسی کی جھلک دیکھی جو آکر پھاٹک کے باہر رکی تھی۔ نشاط اس خیال سے خوش ہوگیا کہ خواجہ سرا زینت کو ٹیکسی فوراً مل گئی تھی۔

چوکیدار نے پھاٹک کا ذیلی دروازہ کھولا۔ اس وقت نشاط کو بڑی کوفت ہوئی جب اس نے خواجہ سرا زینت کے بجائے ساحرہ کو اندر آتے دیکھا۔ کوفت کے ساتھ اسے کچھ تعجب بھی ہوا۔ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ ساحرہ گھر میں ہی تھی۔

وہ سیدھی برآمدے کی طرف آئی۔

اس کے قریب آجانے پر نشاط حیرت سے بولا۔ "باہر سے؟...... گھر میں ہی تو تھیں......! باہر کب؟" حیرت کی وجہ سے نشاط کے جملے غیر مربوط تھے۔

ساحرہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ قدم بڑھا کر اندر چلی گئی۔

چلی گئی ہوں گی کسی وقت، نشاط نے سوچا اور بے پروائی سے شانے جھٹک کر پھر ٹہلنے لگا۔ اسے بہ دستور خواجہ سرا زینت کی ٹیکسی کا انتظار تھا۔

جسے اس نے ساحرہ سمجھا تھا، وہ دراصل ثمرین تھی۔ اس نے شمعون کے ساتھ شاپنگ صرف دو چیزوں کی، کی تھی۔ کنٹیکٹ لینس جو ساحرہ کی آنکھوں کی رنگت کے تھے اور بالوں کی ایک وگ...... ایسی وگ اسے شمعون ہی دلا سکتا تھا جس کی رنگت ساحرہ کے بالوں کی رنگت کے عین مطابق تھی۔

ثمرین چاہتی تھی کہ وہ ساحرہ اور اس کی والدہ کو حیرت زدہ کرے۔ شمعون سے جدا ہوکر اس نے ایک بیوٹی پارلر کا رخ کیا تھا۔ کنٹیکٹ لینس تو اس نے خود ہی لگا لیے تھے۔ وگ اس نے اپنے سر پر بیوٹی پارلر میں سیٹ کروائی اور ٹیکسی کرکے ساحرہ کے گھر پہنچ گئی۔ پتا اس نے شمعون سے اچھی طرح سمجھ لیا تھا اس لیے اسے وہاں تک پہنچنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی لیکن گھر میں داخل ہونے کے بعد اس کے لیے ایک مسئلہ تھا کہ ساحرہ یا اس کی والدہ کے کمرے کیسے تلاش کرے۔ اس نے شمعون سے ساحرہ کے

گھر کا اندرونی نقشہ بھی جاننا چاہا تھا لیکن شمعون نے اسے بتایا تھا کہ وہ ساحرہ کے گھر کبھی نہیں گیا۔

برآمدے میں اس کی مڈبھیڑ جس نوجوان سے ہوئی تھی، اس کے بارے میں تو اس نے سمجھ لیا تھا کہ وہ ساحرہ کا چھوٹا بھائی ہوگا۔ وہ بس متعجب ہوئی تھی نشاط کی وضع قطع اور انداز واطوار دیکھ کر...... شمعون نے اسے نشاط کی ان تبدیلیوں کے بارے میں نہیں بتایا تھا جو اس کی شخصیت میں آئی تھیں لیکن ثمرین نے اس کے بارے میں زیادہ نہیں سوچا، زیادہ کیا، کم بھی نہیں سوچا۔ اسے تو یہ فکر لاحق تھی کہ ساحرہ یا اس کی والدہ کے کمرے تک کیسے پہنچے! اچانک ہی ایک تدبیر اس کے ذہن میں آگئی۔ اس نے ایک جگہ رک کر اپنے موبائل پر ساحرہ سے رابطہ قائم کیا۔

"کہاں ہو ثمرین؟" دوسری طرف سے ساحرہ بے تابی سے بولی۔ "صبح سے انتظار کررہی ہوں کہ کب تمہارا فون آئے اور کب تم مجھے بتاؤ کہ کب آرہی ہو۔"

"میں آگئی ہوں ساحرہ!" ثمرین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کہاں آگئی ہو؟" ساحرہ نے حیرت سے کہا۔

"تمہارے گھر میں!" ثمرین کے ہونٹوں پر مسکراہٹ قائم رہی۔ "برآمدے میں مجھے جو نوجوان نظر آیا تھا، وہ نشاط ہی ہوسکتا ہے۔ میں اس سے بات کیے بغیر اندر آگئی ہوں لیکن اب مجھے یہ نہیں معلوم کہ تمہارا کمرا کون سا ہے یا ممی کہاں ہیں۔"

"مائی گاڈ!" ساحرہ ہنس پڑی۔ "گھر میں کس جگہ ہو تم؟"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم۔" ثمرین نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "بس یہ بتا سکتی ہوں کہ یہاں کس قسم کا سامان ہے۔"

"وہی بتاؤ۔ میں سمجھ لوں گی۔" ساحرہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

ثمرین نے اسے بتایا کہ اس کے اردگرد کیا سامان ہے۔

"ٹھیک ہے، میں سمجھ گئی۔" ساحرہ نے کہا۔ "میں آتی ہوں۔"

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کردیا گیا۔ ثمرین دروازے کی طرف پیٹھ کرکے کھڑی ہوگئی۔ ساحرہ کی آمد پر وہ اچانک اس کی طرف مڑ کر اسے حیرت زدہ کرنا چاہتی تھی۔ ساحرہ کو یہی محسوس ہوتا کہ وہ آئینے میں خود کو دیکھ رہی ہے۔

ثمرین اپنی ایکٹیوٹی پر بہت خوش تھی۔ ساحرہ کو حیرت زدہ کرنے کے لیے اسے ایک منٹ سے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اس نے دروازے کے باہر تیز تیز چلتے ہوئے قدموں

"وہ ٹاپ ٹین حالات"

جب خوامخواہ غصہ آتا ہے

(1) ڈاکٹر سے ملاقات کے لیے طویل انتظار۔

(2) ٹریفک کی بھیڑ بھاڑ۔

(3) مسافروں سے بھری بسیں۔

(4) کوئی دوست جب آپ کی رقم آپ کو لوٹانے سے کترائے۔

(5) کوئی دوست جب کسی حساس موضوع پر مذاق کرے۔

(6) جب آپ پر کوئی غلط الزام لگایا جائے۔

(7) کسی اور کا کیا دھرا آپ کو بھگتنا پڑے۔

(8) ٹیلی فون پر بات چیت کے لیے بہت دیر تک ہولڈ کرنا پڑے۔

(9) جب غلط رہنمائی یا غلط مشورے دیے جائیں۔

(10) رقم یا جائداد آپ سے چرالی جائے۔

مرسلہ: مہرین ناز، حیدرآباد، کینٹ

کی آہٹ سنی اور پھر وہ آہٹ کمرے میں آگئی۔

"ثمرین!" ساحرہ کی آواز میں مسرت تھی۔

ثمرین فوراً اس کی طرف مڑی اور اس کی توقع کے مطابق اسے دیکھ کر ساحرہ کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ جہاں تھی وہیں کھڑی رہ گئی۔

"حیران کردیا نا تمہیں!" ثمرین ہنستے ہوئے بولی۔ "اسی طرح ممی بھی حیران ہوں گی جب ہم دونوں ساتھ ساتھ ان کے کمرے میں جائیں گے۔"

"مم...... مگر......" ساحرہ ہکلائی۔

"میں تمہیں زیادہ حیران نہیں کروں گی۔" ثمرین نے کہا۔ "میں نے ایسے بالوں کی وگ لگائی ہے جس کی رنگت تمہارے بالوں جیسی ہے اور کنٹیکٹ لینس بھی لگائے ہیں تاکہ آنکھوں کا فرق بھی غور کیے بغیر محسوس نہ ہوسکے۔"

"مائی...... مائی گاڈ!" ساحرہ ایسے انداز میں ہنسی جیسے خود کو بے وقوف محسوس کررہی ہو، پھر وہ تیزی سے آگے بڑھ کر ثمرین سے لپٹ گئی۔ "میری بہن......! میری پیاری بہن......! اتنی شریر ہو تم!"

WWW.PAKSOCIETY.COM

''غالباً یہ میری زندگی کی پہلی شرارت ہے۔''

''اچھا آؤ۔ میرے کمرے میں چلو۔'' ساحرہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔ ''نشاط بھی تمہیں دیکھ کر حیران ہوا ہوگا۔ وہ تو سمجھ رہا ہوگا کہ میں گھر میں ہی ہوں۔''

''چوکیدار بھی حیران ہوا تھا۔'' ثمرین نے بتایا۔ ''لیکن وہ کوئی سوال کرنے کی ہمت اس لیے نہیں کرسکا ہوگا کہ وہ بہرحال ملازم ہے، البتہ نشاط نے کچھ استفسار کرنا چاہا تھا۔ میں نے اسے جواب ہی نہیں دیا۔ بس مسکراتی ہوئی اندر آگئی۔ اگر بولتی تو آواز کا فرق وہ محسوس کرہی لیتا۔ اچھا تم مجھے اپنے کمرے میں لے جانے سے پہلے ممی کے کمرے میں لے چلو۔''

''وہ تو گھر میں نہیں ہیں ثمرین!...... ان کی کسی بچپن کی دوست کے شوہر کا انتقال ہوگیا ہے۔ وہیں گئی ہیں۔''

''ارے!...... تو ان سے ملاقات نہیں ہوسکے گی؟''

''ہوگی کیوں نہیں! دو ڈھائی گھنٹے میں آجائیں گی وہ...... تمہیں کہیں اور جانے کی جلدی تو نہیں ہوگی۔''

''ہاں جلدی تو نہیں ہے۔ بس آنٹی کو فون کرنا پڑے گا، یا شمعون کو۔''

ساحرہ اسے لیے ہوئے اپنے کمرے میں داخل ہوئی اور بستر پر ہی جا بیٹھی۔ ثمرین کو اس نے اپنے قریب بٹھالیا تھا اور اس کے دونوں ہاتھ بڑی محبت سے اپنے ہاتھوں میں لے لیے تھے۔

''تمہیں پہلی بار اپنے قریب دیکھ رہی ہوں لیکن بہت پیار آرہا ہے تم پر!'' ساحرہ نے کہا۔ ''کاش ہم دونوں ہمیشہ......'' ساحرہ جذباتی ہوگئی تھی۔ اس کی آواز بھرا گئی۔

''میں واپس جب لندن جاؤں گی نا!...... بات کروں گی ڈیڈی سے! سمجھاؤں گی انہیں...... وہ ہم بھائی بہنوں کو ایک دوسرے سے دور نہ رکھیں...... مجھے امید ہے، میں انہیں منالوں گی۔''

''کاش ایسا ہوجائے...... کاش!''

''مایوس نہ ہو اور اب مایوسی کی باتیں بھی نہ کرو۔ ہم آج پہلی بار ملے ہیں۔ ہمیں یہ وقت ہنسی خوشی گزارنا چاہیے۔ مجھے اپنے گھر کے بارے میں بتاؤ، اپنے بارے میں بتاؤ...... ممی کے بارے میں بتاؤ اور ہاں...... شمعون کے بارے میں بھی!''

''شمعون کے بارے میں کیا بتاؤں...... ان دو ایک دنوں میں تم نے شمعون کو اچھی طرح جان ہی لیا ہوگا۔''

''میں اسے تمہارے حوالے سے بھی جاننا چاہتی ہوں۔ تم اس کی...... صرف دوست ہو...... یا......'' ثمرین نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا، پھر ساحرہ کے جواب سے پہلے ہی بول پڑی۔ ''مجھے کچھ شبہ ہے...... جانے کیوں!''

''تمہارا شبہ درست ہے ثمرین!'' ساحرہ نے جواب دیا۔ ''ہم ابتدا میں تو شاید صرف دوست ہی تھے لیکن پھر جانے کیسے...... یوں سمجھو کہ اب میں شمعون کے لیے اور شمعون ہی میرے لیے سب کچھ ہے۔''

''اوہ!'' ثمرین یک بہ یک سنجیدہ ہوکر کچھ سوچنے لگی۔

''کیوں؟'' ساحرہ نے اسے غور سے دیکھا۔ ''تم اتنی سنجیدہ کیوں ہوگئیں؟''

ثمرین ہنس پڑی۔ ''سوچنے لگی تھی، ڈیڈی کا منصوبہ چوپٹ ہوگیا۔''

''کیا مطلب؟''

''میں یقینی طور پر تو نہیں کہہ سکتی کہ بات وہی ہوگی جو میں سمجھی ہوں لیکن ڈیڈی نے مجھے یہاں بھیجتے وقت خاص طور پر تاکید کی تھی کہ میں شمعون کو سمجھنے کی کوشش کروں۔''

''اوہ......!'' اب ساحرہ سنجیدہ ہوئی۔

''اس تاکید کا مطلب میں یہی سمجھ رہی ہوں کہ شاید انہوں نے میرے اور شمعون کے بارے میں کچھ سوچا ہے لیکن اگر یہ حقیقت ہے تو اب ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ اچھا ہوا تم نے مجھے صاف صاف بتادیا۔ ڈیڈی کو میں یہ ہرگز نہیں کرنے دوں گی کہ وہ اپنی ایک بیٹی کے ساتھ زیادتی کریں اور دوسری کا گھر بسانا چاہیں۔''

ساحرہ کے چہرے سے افسردگی ظاہر ہونے لگی۔

''کیوں؟'' ثمرین نے اسے غور سے دیکھا۔

ساحرہ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ ''ڈیڈی کے علم میں ہے کہ میں شمعون کو چاہتی ہوں مگر انہوں نے اس کی پروا نہیں کی...... میں ان کی سوتیلی بیٹی تو نہیں ہوں ثمرین!''

''ڈیڈی کو اس کا علم کیسے ہوگیا کہ تم شمعون کو......''

''میں نے ممی کو بتادیا تھا۔ انہوں نے ڈیڈی کو بھی بتایا ہوگا۔ شمعون کے والدین رشتے کی بات کرنے آئے بھی تھے۔ کیسے ممکن ہے کہ ڈیڈی کو یہ سب کچھ معلوم نہ ہو۔''

''تب پھر تمہیں افسوس نہیں کرنا چاہیے۔ میرا شک غلط ہی ہوگا۔ ڈیڈی اس حد تک آگے تو نہیں جاسکتے کہ ایک بیٹی کا رشتہ تڑوا کر دوسری بیٹی کے لیے راہ ہموار کریں۔''

''رشتہ ہی تو نہیں ہوسکا۔'' ساحرہ آہستہ سے بولی۔

''شمعون کے والدین کو یہ رشتہ منظور نہیں۔''

''تو پھر وہ تمہارے گھر آئے کیوں تھے!'' ثمرین نے حیرت سے کہا۔

''نشاط کو انہوں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ نہ اس کے بارے میں کچھ جانتے تھے۔ یہاں آنے کے بعد ہی انہوں نے نشاط کو دیکھا تھا۔''

''تو اس سے کیا فرق پڑ گیا؟''

ساحرہ نے ٹھنڈی سانس لی اور پھر ثمرین کو نشاط کے بارے میں سب کچھ بتادیا۔ اس ذیل میں خواجہ سرا زینت کی بات بھی آئی۔ ساحرہ نے یہ بھی بتایا کہ شمعون کے والدین نے کیا سوچ کر اس رشتے سے لاتعلقی اختیار کی ہے۔

ثمرین سنجیدہ نظر آئی اور سوچتے ہوئے بولی۔ ''پھر تم دونوں نے کیا سوچا ہے؟''

''میں شمعون کے علاوہ کسی سے شادی کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔ یہی سوچ شمعون کی بھی ہے۔ ممکن ہے کہ سال بھر بعد شمعون کے والدین کو اس شادی پر اعتراض نہ رہے۔ نشاط کا علاج کرنے والے سائیکاٹرسٹ نے یہی امید ظاہر کی ہے کہ نشاط کو وہ ایک سال میں ٹھیک کردے گا۔''

''تمہیں یقین ہے؟...... اور ایک سال تو بہت ہوتا ہے ساحرہ!...... جب لڑکوں میں یہ خصلت ہو اور کسی خواجہ سرا سے ان کا تعلق بھی بڑھ جائے تو بات کسی وقت بھی ہاتھ سے نکل سکتی ہے۔''

ثمرین نے مبہم بات کی تھی لیکن ساحرہ نے اس کا مطلب سمجھ لیا اور ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ''امید پر دنیا قائم ہے...... امید، بس امید!''

''ڈیڈی کو چاہیے تھا کہ نشاط کو بھی اپنے پاس بلا لیتے۔'' ثمرین نے سنجیدگی سے کہا۔ ''وہاں کیا اچھے سائیکاٹرسٹ نہیں ہیں......؟ پھر یہ کہ اس طرح تم دونوں کی شادی میں رکاوٹ بھی نہیں پڑتی۔''

''ڈیڈی ہم بہن بھائیوں کے لیے ایک دردمند باپ نہیں ہیں ثمرین!'' ساحرہ جواب دیتے ہوئے مغموم تھی۔ ''میری پیدائش کے بعد ہی وہ ممی کو...... میری سمجھ میں نہیں آرہا، کیا لفظ استعمال کروں۔ یوں سمجھ لو کہ ناپسند کرنے لگے تھے۔ میرے بعد بھی ممی نے دو بیٹیوں ہی کو جنم دیا جبکہ ڈیڈی لڑکے کے خواہش مند تھے۔ پھر جب ممی چوتھی بار ماں بننے والی تھیں تو مجھے یاد ہے کہ وہ بہت خوف زدہ رہنے لگی تھیں۔ ویسے تو وہ میری دو بہنوں کی پیدائش کے وقت بھی پریشان تھیں لیکن نشاط کی پیدائش سے پہلے تو ان کا خوف بہت بڑھ گیا تھا۔ وہ شدید خواہش مند تھیں کہ لڑکا پیدا ہو مگر انہیں یہ ڈر تھا کہ لڑکی ہی پیدا ہوگی۔ میں نے کہیں پڑھا ہے ثمرین کہ ماں کی ذہنی کشمکش کا اثر پیدا ہونے والی اولاد پر بھی پڑتا ہے۔ میں نفسیات کی طالبہ نہیں ہوں ثمرین لیکن بس یوں ہی خیال آرہا ہے کہ شاید ممی کی اسی ذہنی کشمکش کا اثر نشاط پر پڑا ہو۔ وہ نہ پورا لڑکا بن سکا نہ پوری لڑکی۔''

''ہوسکتا ہے تمہارا خیال درست ہو۔ میں بھی نفسیات کی طالبہ نہیں رہی اس لیے یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔'' ثمرین نے جواب دیا، پھر کہا۔ ''تم نے سائیکاٹرسٹ کو اپنے اس خیال سے آگاہ کیا؟''

''نہیں۔'' ساحرہ نے جواب دیا۔ ''مجھے تو یہ خیال ابھی تم سے باتیں کرتے ہوئے آیا ہے۔''

''سائیکاٹرسٹ کو تم اپنے اس خیال سے آگاہ کردو تو اچھا ہے، لیکن یہ کوشش ضرور کرو کہ کسی طرح جلد از جلد نشاط کا پیچھا چھڑاؤ اس خواجہ سرا سے!''

''شمعون اس سلسلے میں کچھ کرنا چاہتا ہے لیکن یہ اس نے مجھے نہیں بتایا کہ وہ کیا کرے گا۔'' ساحرہ نے جواب دیا، پھر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ''اچھا یہ بتاؤ، شمعون تمہیں کیسا لگا؟''

ثمرین ہنسی۔ ''سچ سچ بتادوں؟''

''ہاں۔''

''وعدہ کرو کہ دل پر کوئی بوجھ نہیں لوگی۔ خیر!...... وعدہ کرو، یا نہ کرو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بوجھ دل پر لوگی تو وہ میں خود اتار دوں گی۔ سچی بات یہ ہے کہ شمعون مجھے بہت اچھے لگے...... میں اگر یہ بات ڈیڈی کو بتادوں تو وہ میری اور شمعون کی شادی پکی کرنے کے لیے سرگرداں ہوجائیں گے۔''

ساحرہ کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

''پگلی!'' ثمرین نے اس کے گال پر پیار سے چپت لگائی۔ ''لے لیا نا بوجھ دل پر...... حالانکہ ابھی میں کہہ چکی ہوں کہ اگر ڈیڈی کا پلان یہ ہے تو وہ چوپٹ ہوگیا۔ تم نے مجھے اپنی اور شمعون کی محبت کے بارے میں بتادیا تو اب ڈیڈی کچھ نہیں کرسکتے۔ شمعون مجھے اچھے لگے لیکن میں نے تم سے یہ نہیں کہا کہ مجھے ان سے محبت ہوگئی ہے۔ مجھے شمعون کے علاوہ بھی کوئی اچھا لگ سکتا ہے۔''

ساحرہ کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک گئے لیکن پھر اس نے اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر تمہیں شمعون سے محبت ہوجاتی تو میں تمہاری خاطر اپنی محبت

WWW.PAKSOCIETY.COM

قربان کردیتی تم پر!"

ثمرین نے منہ بنایا۔ "مجھے ضرورت نہیں ہے تمہاری قربانی کی...... اچھا چھوڑو یہ ذکر...... نشاط کے بارے میں سوچو۔ اس کی جان چھڑوانا ضروری ہے اس خواجہ سرا سے!"

"میں نے بتایا نا کہ شمعون اس سلسلے میں کچھ کرنا چاہتے ہیں۔"

اس وقت جب ان دونوں میں خواجہ سرا زینت کے بارے میں یہ باتیں ہو رہی تھیں، خواجہ سرا زینت ڈرائنگ روم میں نشاط کے ساتھ موجود تھا۔

"واقعی گھر میں تمہاری باجی کے علاوہ کوئی نہیں؟" وہ نشاط سے پوچھ رہا تھا۔

نشاط ہنسا۔ "اس وقت جب میں نے تم سے کہا تھا کہ گھر میں میرے اور باجی کے علاوہ کوئی نہیں، اس وقت تو باجی بھی نہیں تھیں۔ مجھے معلوم ہی نہیں ہوسکا تھا کہ وہ کب باہر چلی گئی تھیں لیکن اب وہ ہیں، آ گئی تھیں کچھ دیر بعد۔"

"اب کہاں ہیں؟" خواجہ سرا زینت کے انداز میں بے تابی تھی۔

"اپنے کمرے ہی میں ہوں گی۔" نشاط نے جواب دیا۔ "گھر میں ہوتی ہیں تو ان کا دل ہی نہیں چاہتا اپنے کمرے سے نکلنے کو۔ بس شام کو ذرا دیر کے لیے ٹی وی لاؤنج کا رخ کرتی ہیں یا کبھی ممی کے پاس چلی جاتی ہیں۔"

"کہاں ہے ان کا کمرا؟"

"کیا تم پاگل ہو گئی ہو جان!" نشاط ہنسا۔ "ان کا کمرا گھر میں نہیں ہوگا تو اور کہاں ہوگا۔"

"میرا مطلب ہے، تم چل کر مجھے ان کا کمرا دکھاؤ۔"

"کیوں؟" نشاط کو حیرت ہوئی۔

"مجھے ان سے تمہارے بارے میں کوئی بات کرنا ہے۔"

"ارے دفع کرو!" نشاط نے ہاتھ نچا کر کہا۔ "اپنا فیصلہ مجھے خود کرنا ہے اور فیصلہ میں نے کر بھی لیا ہے۔ آج تم سے تھوڑی سی بات اور کرلوں۔"

"جلدی کرو!" خواجہ سرا زینت نے نشاط کا ہاتھ پکڑ کر اسے جھٹکے کے ساتھ صوفے سے اٹھالیا۔

"یہ تمہیں آج کیا ہو رہا ہے جانی!" نشاط نے حیرت سے کہتے ہوئے جھٹکے ہی سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوسکا۔ خواجہ سرا زینت کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ نشاط کے منہ سے کراہ نکل گئی۔

"یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے جانی!" نشاط کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، پھر وہ سر جھٹک کر بولا۔ "میں نہیں لے جاؤں گا تمہیں ان کے پاس!"

"نہیں لے جاؤ گے تو تمہاری کھوپڑی میں سوراخ ہو جائے گا۔" خواجہ سرا زینت نے کہا اور اپنی ساڑی میں کہیں چھپا ہوا ریوالور نکال کر نشاط کی کنپٹی سے لگا دیا۔

"جانی!" نشاط کی آواز کانپ گئی۔

"جلدی کرو ورنہ دب جائے گا ٹریگر!" خواجہ سرا زینت نے دانت پیسے۔

اس وقت وہ نشاط کو بہت خوفناک نظر آنے لگا تھا۔ اس کے ریوالور کی نال بھی نشاط کی کنپٹی پر تھی۔ نشاط حد درجہ خوف زدہ ہو گیا۔

"چلو۔" خواجہ سرا زینت نے غراتے ہوئے کہا۔

اس وقت نشاط کے قدم اس طرح اٹھے جیسے وہ اس کی مشینی حرکت ہو۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔

"تم خود آواز دو گے اپنی باجی کو، کمرے کا دروازہ کھلوانے کے لیے!" خواجہ سرا زینت نے تاکید کی۔ "دروازہ بھی تھپتھپاؤ گے۔"

نشاط نے خوف سے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اپنے خشک ہوتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا تھا۔

نشاط نے ایک کمرے کے دروازے پر رک کر خائف نظروں سے خواجہ سرا زینت کی طرف دیکھا۔ خواجہ سرا نے اسے اشارہ کیا جو نشاط کی سمجھ میں اس لیے آ گیا کہ یہ بات اس سے پہلے ہی کہی جا چکی تھی۔

دروازہ تھپتھپاتے ہوئے نشاط نے آواز دی۔

"باجی!" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

خواجہ سرا کے لیے جواب غیر ضروری ہو گیا کیونکہ دروازہ اندر سے بند نہیں کیا گیا تھا، صرف بھیڑ دیا گیا تھا جس پر خواجہ سرا کا دھیان نہیں گیا تھا۔ نشاط کے تھپتھپانے سے دروازہ اندر کی طرف کھل گیا تھا۔

خواجہ سرا زینت نشاط کو اس کے بازو سے پکڑے تیزی سے اندر داخل ہوا۔

ثمرین خواجہ سرا کو اور خصوصاً اس کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر بری طرح بوکھلا گئی۔ وہ اس وقت بستر پر نیم دراز ایک رسالے کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ ساحرہ اس وقت وہاں نہیں تھی۔ اسے ٹوائلٹ جانا پڑا تھا جو اسی کمرے میں تھا۔

خواجہ سرا زینت نے تیزی سے دروازہ اندر سے بند کیا اور پھر ریوالور کا دستہ شاید پوری طاقت سے نشاط کے سر پر مارا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ نشاط تیورا کر گرا اور بے حس

و حرکت ہو گیا۔

اب خواجہ سرا زینت بستر کی طرف جھپٹا۔ ثمرین نے اس سے پہلے ہی گھبرا کر بستر سے اٹھنا چاہا تھا لیکن خواجہ سرا زینت نے اسے دھکا دے کر بستر پر گرا دیا۔

"آج موقع مل ہی گیا مجھے!" خواجہ سرا زینت کا انداز فاتحانہ تھا۔

ثمرین اس بری طرح بوکھلائی تھی کہ چیخ کر ساحرہ کو آواز بھی نہیں دے سکی تھی اور جب اس نے ایسا کرنا چاہا تو خواجہ سرا زینت نے اسے اس کا موقع نہیں دیا۔ اس نے ایک چوڑا ٹیپ ثمرین کے منہ پر چپکا کے اسے بستر پر اوندھا کر دیا تھا۔ پھر اس نے دو ہتھکڑی نما آہنی کڑے بھی نکالے۔ وہ اپنے پیٹی کوٹ کی بیلٹ میں نہ جانے کیا کیا چھپا کر لایا تھا...... اس نے ثمرین کے دونوں ہاتھ مروڑ کر پیچھے کیے اور آہنی کڑے اس کی کلائیوں میں ڈال کر اسے دوبارہ چت کر دیا...... اب ثمرین کے دونوں ہاتھ اس کی کمر پر تھے جو اس کے گوشت میں گڑ بھی رہے ہوں گے۔

یہ شاید ثمرین کی بدقسمتی تھی کہ اس دھینگا مشتی میں بھی وگ اس کے سر سے الگ نہیں ہوئی تھی جبکہ خواجہ سرا زینت کے سر سے لمبے بالوں کی وگ ایک طرف جا گری تھی۔ مردانہ وضع کے تراشیدہ بال نظر آنے لگے تھے۔

یہ دیکھ کر ثمرین کا خوف اور بڑھ گیا کہ وہ خواجہ سرا نہیں، کوئی مرد تھا جس کے چہرے پر غازہ، ہونٹوں پر لپ اسٹک اور آنکھوں میں کاجل تھا۔

ہونٹوں پر ٹیپ کی وجہ سے ثمرین کی چیخ پکار "غوں غوں" کی آواز سے زیادہ نہ بڑھ سکی جو ٹوائلٹ میں ساحرہ کو بہت مدھم سنائی دی تاہم وہ اس کے لیے تعجب خیز تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آسکا کہ ثمرین اس قسم کی آوازیں کیوں نکال رہی تھی۔ اس نے کوشش کی کہ جلد از جلد ٹوائلٹ سے نکل سکے۔ جب وہ ٹوائلٹ سے نکلی تو ٹھٹک کر اس طرح رکی جیسے سکتہ ہو گیا ہو۔

ثمرین کو اس وقت تک اتنا بے ستر کیا جا چکا تھا کہ اب خواجہ سرا کچھ بھی کرسکتا تھا۔ اس نے ثمرین کے گھٹنوں پر اپنے گھٹنے رکھ کر اسے بالکل بے بس کر دیا تھا۔ ثمرین بری طرح مچل رہی تھی مگر اس سے زیادہ کچھ کرنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اس کی کمر کے نیچے دبے ہوئے تھے۔

خواجہ سرا کی وگ اس کے سر پر نہیں تھی۔ بوکھلاہٹ کے باوجود ساحرہ کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ خواجہ سرا نہیں، کوئی مرد تھا اور ثمرین اس کی ہوس کی بھینٹ چڑھنے والی تھی۔

"کمینے!" ساحرہ چیختی ہوئی یکبارگی بستر کی طرف جھپٹی۔

اس کی آواز نے خواجہ سرا کو چونکا دیا۔ ساحرہ کو دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرت بھی نظر آئی۔ اس نے دوبارہ ثمرین کی طرف دیکھا۔ یقیناً اس کی سمجھ میں نہیں آسکا ہوگا کہ ساحرہ وہ تھی جسے اس نے بے بس کر لیا تھا یا وہ جو اس کی طرف جھپٹی تھی۔

خواجہ سرا کی حیرت کا یہ عالم ہی اس کی موت کا سبب بن گیا۔ وہ سمجھ ہی نہیں سکا ہوگا کہ وہ سب کچھ کیا اور کیسے ہو گیا۔ خود ساحرہ کو بھی ہوش نہیں تھا کہ وہ کس طرح کیا کر بیٹھی تھی۔

بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر پھلوں کا باؤل اور اس کے ساتھ پھل تراشنے کی چھری رکھی ہوئی تھی جو ساحرہ نے خواجہ سرا کی گردن پر اتنی زور سے ماری تھی کہ وہ آر پار ہو گئی تھی۔ خواجہ سرا تڑپ کر بستر سے نیچے جا گرا تھا۔

ساحرہ نے کسی پہاڑ کی چوٹی سر نہیں کی تھی لیکن اس کا چہرہ پسینے میں ڈوب گیا تھا اور اس کی سانسیں اتنی تیزی سے چل رہی تھیں کہ اس کا سینہ دھونکنی کی طرح پھول پچک رہا تھا۔ دل کی دھڑکنیں بھی اتنی تیز تھیں جیسے دل پسلیاں توڑ کر باہر آ جانا چاہتا ہو۔

"یہ...... یہ......" ثمرین کی طرف دیکھتے ہوئے ساحرہ نے کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہ سکی۔

ثمرین کے منہ سے پھر "غوں غوں" کی آوازیں نکلیں تو بوکھلائی ہوئی ساحرہ نے کچھ سمجھا۔ اس نے جلدی سے ثمرین کے ہونٹوں سے ٹیپ اس طرح ہٹایا جیسے نوچ لیا ہو......

"ساحرہ!" ثمرین سسک پڑی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اب تک وہ صرف خوف زدہ رہی تھی۔ وہ اٹھ بیٹھی تو ساحرہ نے اس کی کلائیوں میں آہنی کڑے دیکھے۔ اس نے پہلے تو ثمرین کے جسم پر بستر کی چادر الٹ دی، پھر اس کے ہاتھوں کو بھی کڑوں کی قید سے نجات دی۔

اس دوران میں خواجہ سرا فرش پر تڑپتے تڑپتے ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گیا۔

"مر گیا یہ کمینہ۔" ثمرین نے خواجہ سرا کی لاش کی طرف دیکھتے ہوئے لرزیدہ آواز میں کہا۔

"مر گیا!" ساحرہ کے منہ سے نکلا اور اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ موت سے خوف زدہ رہنے والی ساحرہ لاش کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں کرسکی۔ اس نے اب تک جو کچھ کیا تھا، وہ کچھ سوچے سمجھے بغیر کر ڈالا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"نشاط۔" ثمرین نے آنکھوں سے اشارہ کیا۔

اب تک ساحرہ کی نظر فرش پر پڑے نشاط کی طرف گئی ہی نہیں تھی۔ اب جو ثمرین نے اشارہ کیا تو اس نے چونک کر نشاط کی طرف دیکھا۔

"نشاط!" وہ چیختے ہوئے نشاط کی طرف گئی۔

نشاط بہ دستور بے حس و حرکت تھا اور لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا اس کے سر کے کسی حصے سے رستا ہوا خون فرش پر بھی نظر آرہا تھا۔

اسی وقت کسی نے زور سے دروازہ پیٹا اور فاران کی پکارتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "ساحرہ!"

ساحرہ چونکی۔ اسی وقت اس کے موبائل فون کی گھنٹی بھی بجی۔ ساحرہ گھنٹی کی آواز سے بھی خوف زدہ ہوگئی تھی۔ اسے یہ احساس بہرحال تھا کہ وہ ایک قتل کر چکی تھی۔

"ساحرہ!" فاران کی آواز پھر آئی۔

ساحرہ اس طرح دروازے کی طرف بڑھی جیسے خواب میں چل رہی ہو۔ اس وقت اتفاقاً اس کی نظر خواجہ سرا کی لاش پر پڑ گئی۔

"نہیں!" وہ چیخنے کے سے انداز میں سسک پڑی۔

"ساحرہ!" اس مرتبہ فاران نے بڑی بے تابی سے پکارا تھا اور اس کی بے تابی کی وجہ یہ تھی کہ خواجہ سرا کی گردن سے بہنے والے خون کی ایک لکیر دروازے تک تو ساحرہ کو بھی نظر آگئی تھی اور غالباً وہ خون دروازے کے باہر بھی چلا گیا تھا جس پر فاران کی نظر پڑ چکی تھی۔

ساحرہ اس مرتبہ جیسے خواب سے چونکی اور تیزی سے دروازے کے قریب پہنچ گئی۔ اسے شدت سے احساس ہوا تھا کہ اس وقت اسے کسی سہارے کی، کسی مددگار کی ضرورت تھی، خواہ وہ فاران ہی کیوں نہ ہو جس کی بعض باتوں نے ساحرہ کو پریشان کیا تھا۔

ساحرہ نے دروازہ کھولا اور روتے ہوئے فاران سے لپٹ گئی۔ اس وقت وہ کسی سہمی ہوئی چڑیا کے مانند تھی جو خود کو کہیں چھپا لینا چاہتی تھی۔ اس وقت اسے فاران کی کسی بات کا خیال بھی نہیں رہا تھا۔

فاران ساحرہ کو سنبھالے ہوئے کمرے میں آگیا۔ اس کے چہرے سے پریشانی صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ خواجہ سرا کی لاش دیکھ کر اس کی پریشانی میں اور اضافہ ہوا۔ اس کی ایک نظر فرش پر پڑے ہوئے نشاط کی طرف بھی گئی تھی اور اس نے ثمرین کی طرف بھی دیکھا تھا جو اس وقت اپنا سر دونوں گھٹنوں میں چھپائے ہوئے تھی۔

ساحرہ کے موبائل کی گھنٹی متعدد بار بجنے کے بعد بند ہو چکی تھی۔ ساحرہ نے یہ بھی نہیں دیکھا تھا کہ وہ کال کس کی تھی۔

فاران ساحرہ کو چھوڑ کر نشاط کے قریب گیا۔ اس نے جھک کر نشاط کا جائزہ لیا اور اس کے منہ سے نکلا۔ "بے ہوش ہے، اس کی وجہ سر پر لگنے والی چوٹ ہی ہو سکتی ہے لیکن ...... یہ سب کیا ہے؟ یہ کیسے ہوا ہے ساحرہ؟" سوال کرتے ہوئے اس کی نظر ایک بار پھر خواجہ سرا کی لاش کی طرف گئی تھی۔ "اور یہ کون ہیں؟" اس نے ثمرین کی طرف دیکھا۔

"میری...... میری...... دوست!" فوری طور پر ساحرہ کچھ نہیں بول سکی اور پھر اس نے کم از کم الفاظ اور اشاروں کنایوں میں فاران کو بتایا کہ وہ سب کیسے ہوا تھا۔

"قتل کر بیٹھی ہو تم!" فاران کے لہجے میں تشویش بھی تھی اور بے حد پریشانی بھی......

"مجھے بچا لو فاران!" ساحرہ سسک پڑی۔

فاران اپنا کوٹ اتارتے ہوئے تیزی سے دروازے کی طرف گیا۔ اس نے اپنے کوٹ سے ہی فرش کا وہ خون صاف کیا جو دروازے کے باہر تک چلا گیا تھا۔ پھر اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

"کسی طرح یہ لاش ٹھکانے لگانا ہوگی!" اس نے ساحرہ کی طرف مڑتے ہوئے کہا تھا۔ اس وقت اسے ثمرین دکھائی نہیں دی۔ وہ بہت تیزی سے اٹھ کر چادر لپیٹے ہوئے باتھ روم میں چلی گئی تھی۔

فاران چونکا۔ "تمہاری دوست کہاں گئی؟"

ساحرہ نے باتھ روم کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کیا۔ اسی وقت اس کے موبائل فون کی گھنٹی پھر بجنے لگی۔

"اس وقت کوئی کال ریسیو مت کرنا۔" فاران جلدی سے بولا۔ "تم ایک سنگین جرم کر بیٹھی ہو، اس کا علم کسی کو نہیں ہونا چاہیے۔"

ساحرہ نے موبائل کی اسکرین پر شمعون کا نام دیکھ لیا۔ وہ جلدی سے بولی۔ "یہ شمعون ہے، یہ تو میرے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

"میں بھی تمہارے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں۔ بہتر ہوگا کہ یہ بات اب کسی کو بھی معلوم نہ ہو۔"

"اچھا!" ساحرہ کے انداز میں بے بسی تھی۔ حقیقتاً اس وقت اس کا دماغ کوئی صحیح فیصلہ کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

"کوئی بڑا سوٹ کیس ہے؟" فاران نے پوچھا۔

"اتنا بڑا کہ یہ لاش اس میں آجائے!"

ساحرہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"جلدی سے دو!" فاران نے کہا۔

"یہ...... یہ...... نشاط!"

"وہ صرف بے ہوش ہے۔ شاید خود ہی ہوش میں آجائے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو اسے اسپتال لے جانا پڑے گا لیکن پہلے اس لاش کا بندوبست کرنا ضروری ہے۔"

اس وقت بھی ساحرہ کا جسم کانپ رہا تھا۔ اس کی حالت بہت غیر تھی لیکن اس نے سوٹ کیس نکال کر فاران کو دے دیا۔

فاران نے اس کی وارڈ روب سے کئی چادریں بھی نکالیں اور پھر ساحرہ سے بولا۔ "کیا تمہاری دوست باتھ روم میں ہی رہے گی؟"

ساحرہ چونکی اور پھر باتھ روم کی طرف گئی۔

"ثمرین!" اس نے دروازہ تھپتھپایا۔

باتھ روم کا دروازہ تھوڑا سا کھلا۔

"اندر آؤ ساحرہ!" ثمرین کی آواز میں بھی کپکپاہٹ تھی۔

ساحرہ کی سمجھ میں تو نہیں آسکا کہ ثمرین اسے باتھ روم میں کیوں بلا رہی تھی لیکن وہ اندر داخل ہوگئی۔ ثمرین اس سے لپٹ کر روتے ہوئے بولی۔ "میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی، تم نے مجھے بے آبرو ہونے سے بچا لیا ساحرہ...... میری خاطر تم ایک قتل بھی کر بیٹھیں۔"

"کاش تم میری جیسی بن کر نہ آتیں!" ساحرہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "وہ دراصل مجھے...... لیکن یہ ساری بات میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے، اب تم باہر تو آؤ۔"

"وہ تمہارا چچا زاد بھائی ہے نا؟ تم نے بتایا تھا مجھے...... یہ فاران ہوگا۔" ثمرین نے یہ اندازہ فاران کی عمر سے لگایا ہوگا۔

ساحرہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

ثمرین بولی۔ "اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی ہے مجھے!"

"تو کب تک باتھ روم میں رہو گی۔ اب میں اسے بتا دوں گی تم دراصل کون ہو۔ میری سہیلی نہیں، میری بہن ہو۔"

ثمرین اس وقت اپنے اصل روپ میں تھی، وگ اتار کر باتھ روم میں ہی پھینک دی تھی اور اب اس کی آنکھوں پر کنٹیکٹ لینس بھی نہیں تھے۔

وہ ہچکچاتے ہوئے ساحرہ کے ساتھ باتھ روم سے نکلی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ فاران اسے دیکھ کر چونک گیا۔ ثمرین کی نظریں جھکی ہونے کے باعث وہ اس کی آنکھوں کا رنگ تو نہیں دیکھ سکا تھا لیکن اس کے بغیر بھی وہ ساحرہ ہی کی طرح نظر آرہی تھی۔

فاران اس وقت خواجہ سرا کی لاش چادروں میں لپیٹ کر سوٹ کیس میں ٹھونس رہا تھا۔ چھری اس نے لاش کی گردن ہی میں رہنے دی تھی۔ اگرچہ فرش پر خاصا خون پھیل چکا تھا لیکن قیاس کیا جا سکتا تھا کہ وہ خواجہ سرا کے جسم کا سارا خون نہیں ہوگا۔ اگر اس کی گردن سے چھری نکالی جاتی تو خون کا بہاؤ یک لخت بڑھ جاتا۔

فاران کے چونکنے پر ساحرہ نے اسے مختصر الفاظ میں ثمرین کے بارے میں بتا دیا۔

فاران تشویش سے بولا۔ "کیا یہ اس بات کو راز رکھ سکیں گی؟"

ثمرین کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں ساحرہ کے خلاف کچھ سوچ بھی نہیں سکتی۔ سوچنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔"

فاران نے سوالیہ نظروں سے ساحرہ کی طرف دیکھا۔

ساحرہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

فاران کے چہرے پر سوچ بچار کے آثار تھے۔ اس نے چرمی سوٹ کیس بند کیا۔ اس کا اندیشہ نہیں تھا کہ خون سوٹ کیس سے باہر نکل سکے گا۔

"نشاط کو اب تک ہوش نہیں آیا۔" ثمرین کے لہجے میں تشویش تھی۔

فاران نے اس کی بات پر دھیان نہیں دیا۔ "یہ سوٹ کیس فی الحال تو کمرے ہی میں کہیں چھپانا ہوگا۔ رات کو اس کا کچھ اور بندوبست کروں گا۔ ابھی فرش سے خون بھی صاف کرنا ہے۔ یہ بڑا اچھا ہوا کہ میں اکیلا آیا تھا ٹیکسی کر کے۔ مسعود کو آنٹی کے پاس چھوڑ آیا تھا۔ انہیں ابھی ڈیڑھ دو گھنٹے اور لگیں گے۔"

اس وقت ساحرہ کے موبائل کی گھنٹی پھر بجی۔ کال کرنے والا شمعون ہی تھا۔ فاران نے اس بار بھی ساحرہ کو کال ریسیو کرنے سے روک دیا۔

"نشاط کی طرف سے بے پروا رہنا ٹھیک نہیں ہے۔" ثمرین پھر بولی۔

"مجھے ابھی یہاں سب ٹھیک کرنا ہے اس لیے میں یہاں سے نہیں ہٹ سکتا۔" فاران نے کہا۔ "نشاط کے اب تک ہوش میں نہ آنے سے تشویش مجھے بھی ہو رہی ہے۔ کیا آپ دونوں اسے اسپتال لے جا سکتی ہیں؟"

"میرے تو ہاتھ پیر کانپ رہے ہیں فاران!" ساحرہ بولی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"میری بھی کچھ ایسی ہی حالت ہے۔" ثمرین بولی۔
"کسی ڈاکٹر کو بلا سکتی ہو؟" فاران نے ساحرہ سے پوچھا۔
"یہاں؟" ساحرہ گھبرا گئی۔
"کسی ڈاکٹر کو یہاں بلا کر میں تمہیں پھانسی کے تختے کی طرف نہیں دھکیل سکتا۔"
"پھاں...... پھانسی!" موت سے خوف زدہ رہنے والی ساحرہ کی آواز اس کے حلق میں اٹکنے لگی۔
"ڈاکٹر کو اس کمرے میں نہیں۔" فاران نے اپنی بات مکمل کی۔ "پہلے نشاط کو یہاں سے اس کے کمرے میں لے جانا ہوگا لیکن یہ کام تم دونوں ہی کو کرنا ہوگا۔ میرے ہاتھ بھی خون سے بھرے ہوئے ہیں اور میرے کپڑے بھی خون آلود ہو چکے ہیں۔ میرے لیے مناسب نہیں ہے کہ نشاط کو ہاتھ بھی لگاؤں اور ڈاکٹر کو بھی یہ بتانا ہوگا کہ نشاط کے سر پر کوئی وزنی چیز گر پڑی تھی۔ یہ اسی کی ضرب سے بے ہوش ہو گیا ہے۔"

اس وقت فاران لاش ٹھکانے لگانے کے لیے چاق و چوبند تو نظر آ رہا تھا لیکن بالکل ٹھیک سوچنے کی صلاحیت اس کی بھی کسی نہ کسی حد تک مفلوج تھی۔ اسے یہ خیال نہیں آیا کہ ہوش میں آنے کے بعد نشاط کا بیان کچھ اور ہی ہوگا۔

ساحرہ کے موبائل کی گھنٹی بند ہونے کے چند ہی لمحے بعد ثمرین کے موبائل پر فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ فاران نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ثمرین کو بھی شمعون ہی نے کال کی تھی۔

"شمعون ہے۔" ثمرین نے دھیمی آواز میں کہا۔ اس کی مخاطب ساحرہ تھی۔ اب فاران نے ساحرہ کی طرف دیکھا۔ یقیناً وہ چاہتا تھا کہ اس وقت ثمرین بھی کال ریسیو نہ کرے لیکن وہ ثمرین سے کچھ کہنے کی ہمت نہ کر سکا۔ اس نے کچھ توقعات کے ساتھ ساحرہ کی طرف دیکھا تھا لیکن وہ خاموش رہی اور ثمرین نے کال ریسیو کر لی۔
"ہاں شمعون!" اس کی آواز کی کپکپاہٹ اب بھی قائم تھی۔
دوسری طرف سے کچھ نہیں کہا گیا۔
"ہیلو شمعون!" ثمرین پھر بولی۔
"تم نے تو پریشان کر دیا ہے مجھے!" اس مرتبہ دوسری طرف سے شمعون بولا۔ "تمہاری آواز...... تم دوسری بار بولیں، تب بھی...... کیا بات ہے؟ سب خیریت ہے نا...... تم پر لرزہ کیوں طاری ہے؟"

"ایک واقعہ ہو گیا ہے۔" ثمرین نے کہا۔
ساحرہ اس کا منہ تکنے لگی۔ فاران پریشان ہو گیا تھا۔ اس نے اس طرح ہاتھ اٹھایا جیسے ثمرین کو بولنے سے روکنا چاہتا ہو۔
ثمرین بولتی رہی۔ "میں ساحرہ کے پاس ہوں۔ اس کے بھائی کے سر پر کوئی وزنی چیز گر پڑی جس کی ضرب سے وہ بے ہوش ہو گیا ہے۔"
اب فاران کے چہرے پر اطمینان نظر آیا۔
"نشاط کی بات کر رہی ہو تم؟" شمعون نے جلدی سے پوچھا تھا۔
"ہاں۔" ثمرین نے جواب دیا۔ "ابھی فون کر دیا گیا ہے ایک ڈاکٹر کو! وہ آتا ہی ہوگا۔"
"کیا تشویش ناک صورتِ حال ہے؟"
"یہ تو ڈاکٹر ہی بتا سکے گا۔ ساحرہ اس کی وجہ سے بہت پریشان ہے۔ اسی لیے اس نے تمہاری کال بھی ریسیو نہیں کی۔"
"ٹھیک ہے۔ معاملہ واقعی پریشانی کا ہے لیکن مجھے بھی ساحرہ کو ایک ضروری بات بتانا ہے۔ اس سے کہو کہ وہ مجھ سے بس آدھے منٹ کے لیے بات کر لے۔"
"وہ تم سے بات نہیں کر سکے گی شمعون!...... وہ نشاط کا سر اپنی گود میں رکھے بیٹھی ہے اور بہت فکر مند ہے۔ آنکھوں میں آنسو ہیں۔ اگر مناسب ہو تو مجھے بتا دو، کیا بات ہے۔ میں بتا دوں گی ساحرہ کو!"
ساحرہ نے ثمرین کی بات سے اطمینان محسوس کیا۔ وہ واقعی محسوس کر رہی تھی کہ شمعون سے بات نہیں کر سکے گی۔ وہی تو ایک تھا جسے وہ اپنا سب کچھ سمجھتی تھی۔ اس سے بات کرتے ہوئے وہ شاید بلک بلک کے رو پڑتی اور شمعون کو شبہ ہو جاتا کہ بات صرف نشاط کی نہیں ہو سکتی۔
ثمرین کو جواب دیتے ہوئے شمعون نے دوسری طرف سے کہا۔ "بات تمہیں بتاؤں گا ثمرین تو تم سمجھ نہیں سکو گی۔ اچھا خیر! دو تین جملے کہے دیتا ہوں۔ ساحرہ سے کہہ دینا کہ میں نے خواجہ سرا زینت کے بارے میں خاصا کچھ معلوم کر لیا ہے۔ ساحرہ اس کی طرف سے بہت ہوشیار رہے۔"
ثمرین کا دل بڑی زور سے دھڑکا۔ شمعون نے غالباً جان لیا تھا کہ وہ خواجہ سرا دراصل ایک مرد ہے جو کسی وجہ سے ساحرہ کے لیے خطرے کا سبب بن سکتا ہے، مگر شمعون کو اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ ساحرہ کے بجائے خود ثمرین ہی اس کا ہدف بن چکی تھی۔ اگرچہ ساحرہ نے اسے بے آبرو

ہونے سے بچا لیا تھا اور اسے بچانے کے لیے ایک سنگین جرم تک کر بیٹھی تھی، لیکن بے آبرو ہونے سے بچ جانے کے باوجود ثمرین اس صدمے سے نہیں نکل سکی تھی کہ ایک شخص نے اسے بے آبرو کرنے کے لیے ایک خاص حد تک تو بات پہنچا ہی دی تھی۔
"میں بتا دوں گی۔" ثمرین بہ مشکل بول سکی اور پھر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔
"شکر ہے۔" فاران نے اطمینان کی سانس لی۔ "آپ نے خاصی حد تک بہتر انداز میں بات کر لی۔ اب آپ دونوں نشاط کی فکر کیجیے۔"
ساحرہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھی کہ شمعون نے ثمرین کو کیا بتایا تھا، مگر جانے کیوں اس نے مناسب نہیں سمجھا کہ فاران کے سامنے ثمرین سے اس بارے میں پوچھے۔

☆☆☆

شمعون گھر پر ہی تھا اور بہت پریشان تھا۔ ایک گھنٹے بعد اس نے پھر ثمرین ہی سے موبائل پر رابطہ کیا۔
"اب کیسا ہے نشاط؟" اس نے پوچھا۔
"صورتِ حال کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی ہے شمعون!" ثمرین نے جواب دیا۔ "نشاط کو اب تک ہوش نہیں آیا ہے۔ ڈاکٹر نے اسے فوراً اسپتال منتقل کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ ایمبولینس منگوائی تھی۔ آنٹی کہیں گئی ہوئی تھیں، انہیں فون کر کے بلوا لیا گیا ہے۔ میں اس وقت انہی کی کار میں ہوں۔ ایمبولینس آگے آگے جا رہی ہے۔ نشاط کے ساتھ ساحرہ ہے۔ آنٹی تو نشاط کی وجہ سے اتنی ہلکان ہو گئی ہیں کہ انہیں ایمبولینس میں نشاط کے ساتھ نہیں بھیجا جا سکتا تھا۔"
شمعون نے شدید ذہنی انتشار میں وہ سب کچھ سنا، پھر ثمرین کے خاموش ہوتے ہی بولا۔ "ساحرہ کے چچا زاد بھائی بھی تو ہوں گے!"
"مسعود ہے ہمارے ساتھ کار میں۔" ثمرین نے جواب دیا۔ "فاران نہ جانے کہاں ہے۔ اسے بھی اطلاع دینے کی کوشش کی گئی تھی لیکن اس کا موبائل بند مل رہا ہے۔"
"نشاط کے سر پر کوئی گہری چوٹ لگی ہوگی۔"
"ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ ایک گھنٹے سے زیادہ گزرنے کے باوجود اسے ہوش نہیں آیا ہے۔ ساحرہ نے شاید لندن فون کر کے اپنے والد کو بھی اطلاع دے دی ہو۔"
"اچھا وہ جو کچھ میں نے کہا تھا، ساحرہ کو بتا دیا تم نے؟"
"بتا چکی ہوں۔"

"اچھا میں تھوڑی دیر بعد پھر فون کروں گا۔"
"تم مت کرنا۔ مناسب موقع ملتے ہی میں خود کر لوں گی۔"
"اچھا ٹھیک ہے...... میں تمہاری کال کا بے چینی سے انتظار کروں گا۔"
دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔
شمعون پریشان بھی رہا اور سوچتا بھی رہا۔ اس نے خواجہ سرا زینت اور منظور کی تصویروں کے پرنٹ بھی نکال لیے تھے۔ یہ تصویریں وہ سب انسپکٹر ابرار کو دکھانا اور اپنے شبہات سے آگاہ کرنا چاہتا تھا لیکن ساحرہ سے رابطہ نہ ہونے اور پھر ثمرین سے بات کرنے کے بعد ارادہ ملتوی کر دیا، اس نے سوچا کہ ساحرہ کو یہ سب باتیں بتانے کے بعد ہی وہ ابرار سے رابطہ کرے گا۔
پریشانی ہی میں ایک گھنٹا گزر گیا۔ وہ ثمرین کو کال کرتا لیکن ثمرین نے اس سے کہا تھا کہ مناسب موقع ملتے ہی وہ خود فون کر لے گی۔ اب شمعون کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایک گھنٹا گزر جانے کے باوجود اسے موقع کیوں نہیں مل سکا؟
مزید پندرہ منٹ گزرنے کے بعد جب انتظار کرتے کرتے صبر کرنا اس کے لیے مشکل ہو چکا تھا، ثمرین کی کال آ گئی۔
"تم پریشان ہو گے اس لیے میں نے باتھ روم میں آ کر تمہیں فون کیا ہے۔" وہ بولی۔ "میں ساحرہ، مسعود اور ممی کے ساتھ ہوں۔ ان کے سامنے تمہیں فون نہیں کر سکتی تھی۔"
"نشاط کو ہوش آ گیا؟" شمعون نے جلدی سے پوچھا۔
"نہیں۔" ثمرین نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "ڈاکٹروں نے ابھی ابھی یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ کوما میں چلا گیا ہے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کب......"
"ارے!" شمعون کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "اتنی شدید چوٹ لگی تھی اس کے سر پر؟"
"ایک وزنی گل دان گرا تھا اس کے سر پر۔" ثمرین نے جواب دیا۔ "لیکن اہمیت اس بات کی ہے کہ ضرب کہاں لگی تھی کہ وہ کوما میں چلا گیا۔ ڈاکٹروں نے ابھی اس کی مکمل رپورٹ نہیں دی ہے۔"
"ساحرہ کیسی ہے؟"
"اس کی حالت پہلے سے زیادہ خراب ہے۔ آنٹی نے تو رو رو کر اپنا بہت برا حال کر لیا ہے۔ ابھی کوئی بھی اسپتال سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ مسعود تو ہمارے ساتھ تھا ہی۔ ابھی ابھی فاران بھی آ گیا ہے۔ ہمارا یہ خیال غلط تھا کہ فاران اس وقت گھر میں نہیں تھا۔ وہ اپنے کمرے میں سو رہا

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھا۔ جب جاگا تو اسے چوکیدار سے بات معلوم ہوئی۔ اس نے ساحرہ کو فون کیا اور اب وہ بھی اسپتال آچکا ہے۔"

شمعون نے ٹھنڈی سانس لی۔ "کاش میں اسپتال آسکتا۔"

"آ بھی سکتے تو کیا کر لیتے! تم تو نشاط کو باہر نہیں لا سکتے کوما سے۔" ثمرین نے کہا۔ "میں ابھی آدھے گھنٹے تو یہیں ہوں۔ پھر ساحرہ اور آنٹی سے اجازت لے کر آؤں گی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد ہی گھر پہنچ سکوں گی اور......" وہ یک لخت خاموش ہوئی۔

"اور؟" شمعون نے پوچھا۔

"وہیں آکر بتاؤں گی۔"

شمعون کے مزید کچھ کہنے سے قبل دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کیا جاچکا تھا۔ شمعون کے لیے ایک اور اُلجھن پیدا ہوگئی۔ ثمرین اسپتال سے آنے کے بعد کیا بتانا چاہتی تھی!

موبائل کی گھنٹی نے شمعون کو چونکایا۔ اس نے اسکرین پر نظر ڈالنے کے بعد کال ریسیو کی۔ کال کرنے والا ابرار تھا۔

"تصویریں بڑی کر کے دیکھیں؟" اس نے پوچھا۔

"دیکھ چکا ہوں۔ میں اس بارے میں تم سے بات کرنے آؤں گا۔ فی الحال کچھ دوسری مصروفیت ہوگئی ہے۔"

"میں نے اس لیے فون کیا کہ اُلجھن میں ہوں۔ مجھے تم نے یہ نہیں بتایا کہ تم اس خواجہ سرا میں کیوں دلچسپی لینے لگے۔"

"تم سے اب دوبارہ ملاقات ہوئی تو بتاؤں گا۔"

ابرار نے اصرار کیا لیکن شمعون نے اسے کچھ نہیں بتایا۔ اس نے ساحرہ سے وعدہ کرلیا تھا کہ وہ کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے اسے ضرور بتائے گا اور اسے بتانے کی نوبت آنا فی الحال فوری طور پر مشکل تھا۔

کسی طرح ابرار کو ٹالنے کے بعد شمعون بستر پر لیٹ گیا۔ وہ ٹہلتے ٹہلتے بہت تھک گیا تھا۔

ثمرین اپنے کہنے کے مطابق ایک گھنٹے بعد آئی۔ وہ شمعون کو مغموم اور متفکر نظر آئی۔ شمعون اندازہ بھی کیا لگاتا، وہ تصور بھی نہیں کرسکتا کہ ثمرین کن حالات سے گزر کر آئی تھی، جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا، وہ اتنی جلدی تو کیا، شاید ساری زندگی نہیں بھول سکتی تھی۔

"میں اپنا سامان لینے آئی ہوں شمعون!" وہ دھیمی آواز میں بولی۔ "میں نے ممی سے کہہ دیا ہے کہ اب میں جب تک پاکستان میں ہوں، انہی کے ساتھ رہوں گی۔ تم سے یا انکل اور آنٹی سے مجھے کوئی شکایت نہیں۔ شکایت ہے تو مجھے اپنے ڈیڈی سے ہے جو اپنی ایک بیٹی کو نظرانداز کر کے اپنی دوسری بیٹی...... یعنی میرے بارے میں سوچنے لگے تھے۔ ان کی خواہش یہی تھی کہ اگر تم مجھے پسند آؤ تو وہ میری شادی تم سے کروادیں لیکن یہ ناممکن ہے۔ تم ساحرہ کے لیے اور ساحرہ تمہارے لیے ہے۔ میں اس معاملے میں ڈیڈی سے لڑ بھی سکتی ہوں۔ خدا کرے کہ نشاط جلد کوما سے باہر آجائے۔ میں ڈیڈی کو مجبور کردوں گی کہ وہ کسی بھی طرح اسے بھی لندن میں اپنے پاس بلالیں۔ میں فون پر اپنے بھائی سے ابھی یہاں آتے ہوئے بات کر چکی ہوں۔ انہیں سب کچھ بتادیا ہے، انہیں میرے خیالات سے اتفاق ہے۔ اس معاملے میں ہم دونوں ہی ڈیڈی کے سامنے ڈٹ جائیں گے۔ انہیں ہماری بات ماننا ہی پڑے گی۔ نشاط کے یہاں نہ ہونے کی صورت میں تمہارے والدین کو ساحرہ سے تمہاری شادی پر کوئی اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔"

ثمرین بولتی چلی گئی تھی اور شمعون اس کا منہ تکتا رہا تھا۔

"جانے سے پہلے مجھے آنٹی سے بھی بات کرنا ہے۔ یہ تہذیب کے خلاف ہوگا، اگر میں انہیں کچھ بتائے بغیر یہاں سے چلی جاؤں۔ وہ کہاں ہیں؟"

"اپنے کمرے ہی میں ہوں گی۔" شمعون کی آواز دھیمی رہی تھی۔

ثمرین مزید کچھ کہے بغیر کمرے سے چلی گئی۔ شمعون کی تھکن کا احساس مٹ گیا۔ وہ پھر ٹہلنے لگا۔ وہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ ساحرہ اور ثمرین میں کیا باتیں ہوئی ہوں گی۔ یہ صورت حال شمعون کے حق میں ہوتی، اگر واقعی نشاط لندن چلا جاتا۔ اسے اس بات سے بھی اطمینان ہوا تھا کہ ثمرین اس کے گھر سے جارہی تھی۔ اس کی موجودگی کے باعث شمعون ذہنی دباؤ محسوس کرتا رہا تھا۔ دس منٹ بعد اچانک اسے کچھ خیال آیا تو وہ اپنے کمرے سے نکلا۔ وہ چاہتا تھا کہ ثمرین کا سامان اپنی کار میں ساحرہ کے گھر چھوڑ آئے۔ وہ کمرے سے نکلا تو اس کا سامنا اپنی والدہ سے ہوگیا۔ وہ اسی کی طرف آرہی تھیں۔

"ثمرین یہاں سے جارہی ہے شمعون!" وہ بولیں۔ غالباً ثمرین نے انہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ شمعون سے بات کرچکی تھی۔ شمعون نے ہی انہیں بتایا کہ وہ سب کچھ جان چکا ہے۔ پھر اس نے پوچھا۔ "کیا وہ چلی گئی؟"

"ابھی تو نہیں گئی۔ اپنا سامان پیک کررہی ہوگی۔ ابھی میں نے فون کر کے تمہارے ڈیڈی کو بھی بتادیا ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ایسی صورت میں ہم ثمرین کے لیے رکاوٹ بننے کا کوئی حق نہیں رکھتے لیکن وہ اس سلسلے میں مبشر بھائی کو فون ضرور کریں گے۔ ویسے ثمرین مجھے بتا چکی ہے کہ وہ پہلے ہی اپنے ڈیڈی سے فون پر بات کرچکی ہے اور کہہ چکی ہے کہ وہ ہمارے گھر سے ساحرہ کے پاس منتقل ہورہی ہے۔"

شمعون سنجیدگی سے بولا۔ "مجھے امید ہے، آپ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا کہ میں کار میں ثمرین کو چھوڑ آؤں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" اس کی والدہ بولیں۔ "وہ کار میں ہی آئی ہے۔ ساحرہ کا چچازاد بھائی مسعود آیا ہے اس کے ساتھ۔"

"اوہ!" شمعون کے منہ سے اتنا ہی نکل سکا۔

ذرا دیر بعد ثمرین ان کے گھر سے رخصت ہورہی تھی۔ شمعون اور اس کی والدہ بھی اس کے ساتھ باہر نکل آئے تھے۔ کار میں بیٹھنے سے قبل ثمرین، شمعون کی والدہ سے گلے ملی۔

"خوش رہو۔" والدہ نے اسے دعا دی۔ وہ کار میں بیٹھ کر چلی گئی۔

شمعون پھر اپنے کمرے میں آگیا۔ اس نے اپنی والدہ سے یہ تلخ گفتگو کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا کہ ان لوگوں نے ثمرین کو اپنے گھر میں رکھنے پر آمادگی کیوں ظاہر کی تھی۔

ثمرین کا یہ کہنا بھی شمعون کے لیے تعجب خیز نہیں تھا کہ وہ ان تمام معاملات میں اپنے ڈیڈی کے سامنے ڈٹ جانے کا فیصلہ کرچکی تھی اور اس معاملے میں اس نے فون کر کے اپنے بڑے بھائی کی حمایت حاصل کرلی تھی۔ یہ امر شمعون کے لیے تعجب خیز نہیں تھا کیونکہ ثمرین کی پیدائش ہی مغرب میں ہوئی تھی اور اس کی ماں تو تھی ہی مغرب کی جہاں بالغ اولاد کے سامنے والدین کو بے بس ہونا پڑتا تھا۔ وہ بس یہ سوچ رہا تھا کہ ثمرین ان معاملات میں اپنے ڈیڈی سے کیا کہے گی لیکن ثمرین کے لیے وہ سب کچھ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ مگر اس کے ساتھ جو کچھ ہو گزرا تھا وہ بھی کسی صدمے سے کم نہ تھا۔ مغرب میں پرورش پانے کے باوجود اس میں مشرقی حیا موجود تھی۔

ان خیالات کے ساتھ ثمرین کو یہ اُلجھن بھی لاحق تھی کہ وہ شخص آخر تھا کون جس نے خواجہ سرا کا روپ دھار کر نشاط سے دوستی کی تھی اور اس دوستی کا مقصد یہی ہوسکتا تھا کہ اس طرح اسے ساحرہ کے گھر میں آنے جانے کا راستہ مل جائے۔ اس کا ہدف دراصل ساحرہ تھی لیکن ساحرہ کے روپ میں ثمرین ہی کو ساحرہ سمجھ بیٹھا تھا۔ اگر ثمرین نے ساحرہ بننے کی شرارت نہ کی ہوتی تو سب کچھ نہ ہوتا۔

ثمرین کو یہ اُلجھن بھی تھی کہ وہ شخص ساحرہ کو بھی کیوں شکار کرنا چاہتا تھا......؟ شمعون کے گھر سے رخصت ہونے کے بعد ثمرین ساحرہ کے گھر پہنچی اور سامان وہاں چھوڑ کر مسعود کے ساتھ پھر اسپتال پہنچی کیونکہ ساحرہ اور اس کی والدہ بہ دستور اسپتال میں تھے۔

اب ثمرین نے وہاں فاران کو بھی دیکھا اور اس کے ذہن میں یہ سوال ابھرا کہ فاران نے لاش کا کیا کیا ہوگا؟"

فاران نے جو کچھ کیا تھا، وہ اس کے لیے فکرمند بھی تھا لیکن سبھی نے اس کی فکرمندی کا سبب صرف نشاط کی حالت سمجھا ہوگا۔

رات خاصی گزر چکی تھی جب ڈاکٹر نے ساحرہ اور اس کی والدہ سے کہا کہ وہ لوگ آخر کب تک اسپتال میں رہیں گے۔ بہتر ہوگا کہ وہ بھی گھر چلے جائیں۔ اگر نشاط کی حالت میں کوئی تبدیلی آئی تو انہیں فون پر مطلع کردیا جائے گا اور اگر وہ بہت ضروری سمجھیں تو ان میں سے کوئی ایک آدھ فرد وہاں رک جائے۔

ساحرہ دیکھ رہی تھی کہ اس کی والدہ بیٹے کی وجہ سے خاصی ہلکان ہوچکی تھیں اور انہیں آرام کی شدید ضرورت تھی اس لیے ساحرہ نے ڈاکٹر کے مشورے پر عمل کرنا ہی مناسب سمجھا۔ خود مسعود نے اسپتال میں رہ جانے پر آمادگی ظاہر کی تو اسے وہاں چھوڑ کر سب لوگ گھر آگئے۔ ساحرہ نے اپنی والدہ کو ایک مسکن دوا دے کر سلادیا۔ ثمرین اس کے ساتھ تھی۔ والدہ کو سلانے کے بعد ساحرہ، ثمرین کو اپنے کمرے میں لے آئی۔ اس نے ثمرین کا سامان بھی اپنے کمرے میں منگوالیا تھا۔

"آج تو تم میرے ساتھ ہی آرام کرو۔" ساحرہ نے اس سے کہا۔ "کل تمہارے لیے دوسرا کمرا ٹھیک کروادیا جائے گا۔"

"ساحرہ!" ثمرین کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ "مجھے اب تک یوں محسوس ہورہا ہے جیسے میں کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی ہوں۔"

"تم سے مختلف نہیں ہے میری حالت۔" ساحرہ نے کہا اور پھر بہت غور سے کمرے کا جائزہ لیا۔ بہ طور خاص فرش پر اسے خون کا کوئی معمولی سا دھبا بھی نظر نہیں آیا۔

"فاران بہت کام آیا۔" ثمرین بولی۔ "معلوم ہی نہیں ہورہا ہے کہ یہاں کوئی قتل ہوا ہے۔ لاش کا اس نے جانے کیا کیا! آخر وہ شخص تھا کون جس نے خواجہ سرا بن کر......"

WWW.PAKSOCIETY.COM

"اب مجھے شمعون سے بات کر لینا چاہیے۔" ساحرہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "وہ اس بارے میں کچھ جان چکا ہے شاید۔"

ثمرین کچھ نہیں بولی۔ ساحرہ نے موبائل پر شمعون سے رابطہ کیا۔ رات کے دو بج چکے تھے لیکن شمعون جاگ رہا تھا۔ اس نے فوراً کال ریسیو کی۔

ثمرین خود سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ اندازہ نہیں لگا سکی کہ دوسری طرف سے شمعون کیا کہہ رہا تھا۔ اس کی باتوں کے جواب میں ساحرہ اتنی مبہم بات کر رہی تھی کہ شمعون کی باتوں کا اندازہ لگایا ہی نہیں جا سکتا تھا۔

پانچ منٹ کی گفتگو کے بعد ساحرہ نے رابطہ منقطع کیا اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر ثمرین سے بولی۔ "اسکول کے زمانے میں ایک لڑکے منظور نے میرے بارے میں کچھ نازیبا باتیں کی تھیں، شمعون برداشت نہیں کر سکا تھا اور اس نے منظور کی پٹائی کر دی تھی۔"

ساحرہ نے وہ سب کچھ بتا دیا جو اسے شمعون سے معلوم ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ "اب وہ اس شبے میں گرفتار ہے کہ خواجہ سرا زینت اور منظور شاید سگے بھائی ہونے کے باعث ایک دوسرے سے مشابہ ہیں اور منظور خواجہ سرا زینت کے ذریعے مجھے اپنے کسی جال میں پھنسانا چاہتا ہے لیکن یہ بات بھی اس کے ذہن میں ہے کہ کہیں خواجہ سرا زینت ہی منظور نہ ہو۔ اسی خیال کے تحت اس نے مجھ سے وہی بات کہی جو تمہارے ذریعے کہلوائی بھی تھی کہ میں خواجہ سرا زینت کی طرف سے ہوشیار رہوں۔" ساحرہ نے پھر ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولی۔ "اسے کیا معلوم کہ خواجہ سرا زینت سے ہوشیار رہنے کا وقت گزر چکا ہے۔ میں تم سے بہت شرمندہ ہوں ثمرین! میرے بجائے تم ہی ......"

"تم کو شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔" ثمرین نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "غلطی تو میری ہی تھی۔ اگر میں نے تمہارا روپ نہ دھارا ہوتا تو وہ سب کچھ نہ ہوتا۔"

ساحرہ چپ رہ گئی۔

"فاران نے تمہیں موت کی سزا سے بچا لیا۔" ثمرین بولی۔ "مگر......" وہ یک لخت چپ ہو گئی۔ اس نے ساحرہ کے چہرے کا بدلتا ہوا رنگ محسوس کر لیا تھا۔

"میرے سامنے ...... یہ لفظ نہ لایا کرو ثمرین!" وہ اس طرح بولی جیسے الفاظ اس کے حلق میں اٹکنے لگے ہوں۔ "بہت ڈر لگتا ہے مجھے...... یہ سوچ کر بھی میرا دل بہت زور سے دھڑک جاتا ہے کہ میں ایک دن اس دنیا میں نہیں رہوں گی۔" یہ سب کچھ کہتے ہوئے اس کے چہرے کا رنگ مزید پھیکا پڑ گیا تھا۔

ثمرین اس کا منہ تکتی رہ گئی۔ اس نے زندگی میں کبھی کسی کو موت سے اتنا زیادہ خائف نہیں دیکھا تھا۔ وہ مزید جو بات کہنا چاہتی تھی، وہ بھی اس نے اب اپنی زبان پر لانا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ فاران نے اس لاش کا کیا کیا تھا۔

یہ بات اسے دوسرے دن فاران ہی سے معلوم ہو سکی۔ اگرچہ وہ فاران سے بات کرتے ہوئے بھی خجالت محسوس کر رہی تھی کیونکہ فاران بھی جان چکا تھا کہ اس پر کیا گزری تھی۔

فاران نے بتایا کہ لاش وہ فوری طور پر تو سوٹ کیس میں بند کر کے اپنے کمرے میں لے گیا تھا۔ پھر رات کو اس نے بنگلے کے عقب میں جا کر پائیں باغ کی ایک کیاری اس طرح کھودی تھی کہ پہلے وہاں لگے ہوئے پودے، مٹی سمیت نکال کر کئی خالی گملوں میں رکھ دیے تھے۔ زمین اس نے خاصی گہرائی تک کھودنے کے بعد سوٹ کیس وہاں اس طرح دفن کیا تھا کہ بعد میں سارے پودے بھی گملے سے نکال کر وہیں لگا دیے تھے جہاں سے انہیں نکالا تھا۔ کھدی ہوئی مٹی اس نے پائیں باغ کی ساری کیاریوں میں پھیلا دی تھی۔ پھر صبح بہت جلدی اٹھ کر اس نے پائیں باغ کے پودوں کو پانی دینا بھی شروع کر دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مالی وہاں کسی قسم کی معمولی سی تبدیلی بھی محسوس کرے۔ مالی جب وہاں پہنچا تھا تو فاران نے اس سے کہا تھا کہ کبھی کبھی اس کا دل چاہتا ہے کہ باغبانی کرے......

بعد میں ثمرین نے یہ باتیں بھی ساحرہ کو نہیں بتائیں۔ اس کا خیال تھا کہ ساحرہ ان باتوں سے بھی خوف زدہ ہو گی جن میں لاش کا ذکر آتا جو سوٹ کیس سمیت پائیں باغ کی کیاری میں دفن کی گئی تھی۔

اسی دن مبشر احسان انگلینڈ سے آ گئے۔ خوش قسمتی سے انہیں فوری طور پر فلائٹ مل گئی تھی۔ اسپتال میں انہوں نے ڈاکٹروں سے نشاط کے بارے میں تفصیلی بات چیت کی۔

"مایوس کن صورت حال ہے۔" اسپتال سے واپس آ کر انہوں نے گھر کے سب لوگوں کو جمع کر کے کہا۔ "ڈاکٹرز کچھ بھی یقین سے نہیں کہہ سکتے۔ نشاط ایک آدھ دن میں بھی کوما سے باہر آ سکتا ہے اور اس میں طویل عرصہ بھی لگ سکتا ہے۔ میں نے فوری طور پر یہاں آنے کا فیصلہ تو کر لیا تھا لیکن اب ڈاکٹروں سے بات کرنے کے بعد میں

سمجھ رہا ہوں کہ میرا یہاں زیادہ دن تک رکنا لاحاصل ہو گا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ آج رات تک اگر کوئی فلائٹ مل جائے تو واپس چلا جاؤں۔ انگلینڈ میں میرے بہت سے کام ٹھپ ہو جائیں گے اگر میں یہاں رکا رہا۔"

"ہمیشہ کام ہی کی فکر رہی ہے آپ کو!" ساحرہ کی والدہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ "نشاط سے کوئی لگاؤ تو آپ کو کبھی رہا بھی نہیں۔ کہتے بھی تھے کہ نکال دو اسے گھر سے...... اب نکل گیا وہ گھر سے...... شاید سکون مل گیا ہو گا آپ کو!"

مبشر احسان نے گھور کر بیوی کی طرف دیکھا۔ اگر سب لوگ موجود نہ ہوتے تو شاید وہ بیوی پر برس ہی پڑتے۔ انہوں نے ان کی طرف سے رخ پھیر کر ثمرین کی طرف دیکھا۔ ان کی نگاہوں میں سختی تھی۔

"کیا بات ہے ڈیڈی؟" ثمرین بولی۔ "آپ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں۔ مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے کیا؟"

"ضروری نہیں کہ میں تمہارے سوال کا جواب دوں۔" مبشر احسان نے کھردرے لہجے میں کہا۔ "میں ابھی انکوائری سے معلوم کرتا ہوں۔ اگر کوئی فلائٹ مل جاتی ہے تو دو ٹکٹ بنوا لیے جائیں گے۔ میرے ساتھ تم بھی چلو۔"

"میں ابھی نہیں جاؤں گی ڈیڈی!" ثمرین نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ "زندگی میں پہلی بار تو اپنے بہن بھائیوں اور ممی سے ملی ہوں۔"

"یہ ممی ہیں تمہاری؟" مبشر احسان کی آواز میں غصہ تھا۔

"میں یہی سمجھتی ہوں۔" ثمرین نے سنجیدگی سے کہا۔

مبشر احسان غصے میں تیزی سے چلتے ہوئے ڈرائنگ روم سے نکل گئے۔

"ثمرین!" ساحرہ کی والدہ بولیں۔ "میری بات اور ہے۔ تمہیں ان سے اس انداز میں بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔"

"کیوں نہیں کرنا چاہیے تھی ممی!" ثمرین بولی۔ "میں اب بچی نہیں ہوں، بالغ ہو چکی ہوں۔ اپنی زندگی کے تمام فیصلے مجھے اب خود ہی کرنا ہیں تو میں ان کی ایک ایسی بات کیوں مانوں، کیوں چلی جاؤں اپنی ممی کو غمزدہ چھوڑ کر!" ثمرین نے ان کے گلے میں بانہیں ڈالیں تو وہ اسے لپٹا کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

مبشر احسان اسی رات کی ایک فلائٹ سے لندن واپس چلے گئے۔ انہوں نے لاہور فون کر کے اپنے بھائی سے بھی کہہ دیا تھا کہ وہ اپنا کام چھوڑ کر نشاط کی وجہ سے کراچی نہ آئیں۔ یہی بہت تھا کہ انہوں نے اپنے دو بیٹوں کو یہاں چھوڑ دیا تھا۔

گھر کی اداسی کچھ اور بڑھ گئی۔ ایک طرف نشاط کا معاملہ تو تھا ہی، مبشر احسان کی اس بے گانگی کا بھی اثر پڑا۔

مبشر احسان نے فون پر شمعون کے والد سے بھی بات کی تھی۔ اس کا علم ساحرہ کو موبائل پر شمعون سے باتیں کرتے ہوئے ہوا۔ شام کا وقت تھا جب وہ لان میں ٹہلتے ہوئے شمعون سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کا علم شمعون کو بھی نہیں تھا کہ اس کے والد اور مبشر احسان نے ایک دوسرے سے کیا بات چیت کی تھی۔

☆☆☆

بعد کے تین دن بھی اس طرح گزرے کہ سارا گھر صبح سے رات تک اسپتال میں موجود رہا کہ شاید نشاط کے بارے میں کوئی اچھی خبر ملے مگر ایسا نہیں ہوا۔ اسپتال کے بڑے ڈاکٹر نے ان لوگوں کو سمجھایا کہ وہ سب خود کو اس طرح ہلکان کرتے رہیں گے تو اس کا حاصل کچھ نہیں ہو گا۔ نشاط کو جب کوما سے باہر آنا ہے، تبھی آئے گا، اس سے پہلے کوئی بھی کوشش کارگر نہیں ہو سکتی۔ نیز یہ کہ نشاط کے جسم میں کسی بھی بیماری کے جراثیم نہیں تھے جن کی وجہ سے کسی وقت اس کی حالت بگڑ سکتی۔

آخر فیصلہ ہوا کہ سب گھر والے بیک وقت اسپتال نہ جائیں، صبح کوئی ایک اسپتال جا کر نشاط کو دیکھ آئے، شام کو کوئی دوسرا چلا جائے اور کسی بھی وقت کے لیے کسی خاص فرد کی ڈیوٹی نہ ہو۔ بس جب کسی کا دل چاہے اور اسے اس وقت کوئی کام نہ ہو، وہ چلا جایا کرے۔

ساحرہ ذہنی انتشار سے نجات حاصل نہیں کر سکی تھی اس لیے ایک بار بھی شمعون سے ملنے نہیں جا سکی تھی۔ بس کبھی فون پر بات ہو جاتی تھی اور وہ بھی مختصر!

نشاط کی والدہ اپنے کمرے کی ہو کر رہ گئی تھیں۔ ان کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔ انہیں ڈاکٹر کو دکھایا گیا تھا لیکن اس کے خیال کے مطابق نشاط کی والدہ کسی بیماری میں مبتلا نہیں ہوئی تھیں۔ صرف ڈپریشن کا شکار تھیں اس لیے ڈاکٹر نے انہیں مسکن دوائیں دینے پر اکتفا کی تھی۔ ان دواؤں کی وجہ سے ان کا زیادہ وقت سونے یا غنودگی کے عالم میں گزرنے لگا تھا۔ ساحرہ اور ثمرین دونوں ہی ان کا ہر وقت خیال رکھتی تھیں۔

پانچویں دن جب ساحرہ نے محسوس کیا کہ وہ دوا کھانے کے تھوڑی دیر بعد گہری نیند سو گئی ہیں تو وہ اپنے کمرے میں چلی آئی اور بستر پر آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

ثمرین اس وقت اسپتال گئی ہوئی تھی ورنہ وہ بھی اس کے ساتھ ہوتی۔ ان دونوں کا وقت زیادہ تر ساتھ ہی گزرتا تھا حالانکہ ثمرین کے لیے دوسرا بیڈ روم ٹھیک کر دیا گیا تھا۔

ساحرہ کو لیٹے ہوئے مشکل سے پانچ منٹ گزرے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ''کون؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔

''فاران!'' باہر سے مدھم آواز آئی۔

وہ ساحرہ سے کچھ دن پہلے جو باتیں کر چکا تھا، ان کے باعث ساحرہ تنہائی میں اس سے ملنے سے گریزاں رہنے لگی تھی لیکن اب اس پر فاران کا دباؤ پڑ گیا تھا۔ وہ ایک قتل کی مرتکب ہو چکی تھی اور فاران نے اسے اس جرم میں قانون کی دسترس سے بچایا تھا۔ وہ مجبوراً اٹھی اور اس نے دروازہ کھولا۔

''کیا بات ہے فاران؟'' اس نے آہستہ سے پوچھا۔

''اندر تو آنے دو۔'' فاران نے کہا اور خود ہی اندر آ گیا اور دروازہ بولٹ کرنے لگا۔

''اس کی کیا ضرورت ہے؟'' ساحرہ جلدی سے بولی۔

''مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں اور مناسب نہیں ہوگا کہ کوئی اچانک آ جائے اور ہماری باتیں سن لے۔''

''لیکن......'' ساحرہ گھبرا رہی تھی۔

''تم آ کے بیٹھو تو اطمینان سے!'' اس نے بے تکلفی سے ساحرہ کا ہاتھ پکڑا لیکن اس کی گرفت سخت نہیں تھی۔

وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

''میں تمہیں خواجہ سرا کی لاش کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے اس کا کیا کیا۔''

''میں اس قسم کی باتیں نہیں سننا چاہتی۔'' ساحرہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور وہ جلدی سے بولی۔ ''جو ہونا تھا، وہ ہو گیا، میں اسے بھول جانا چاہتی ہوں۔ خلجان ہونے لگتا ہے مجھے اس قسم کی باتوں سے۔''

''میں اتنے دن یہاں رہا ہوں تو مجھے اندازہ ہو چکا ہے، تمہارے مزاج کا...... ایک دن اسپتال میں کسی کی لاش اسٹریچر پر لے جائی جا رہی تھی تو تم اس سے بھی خوف زدہ ہو گئی تھیں۔ آنٹی سے بات کی تھی میں نے تمہارے بارے میں...... تم موت سے بہت خوف زدہ رہتی ہو۔ تمہیں نفسیاتی علاج کی ضرورت ہے۔ اس بارے میں کچھ سوچنا پڑے گا لیکن اس وقت میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ خواجہ سرا کی لاش......''

''میں یہ سب کچھ نہیں سننا چاہتی۔'' ساحرہ نے ہیجانی سے انداز میں کہا۔

''تم ایک سنگین جرم کر چکی ہو ساحرہ...... تمہیں اس بارے میں تمام حالات سے واقف رہنا چاہیے۔ میں تو ایک نہ ایک دن یہاں سے چلا جاؤں گا۔ تم ہی اس بات کا خیال رکھ سکتی ہو کہ راز آشکارا نہ ہو جائے۔ اگر کبھی پائیں باغ کی کھدائی کروا کے اسے ازسرنو بنانے کے بارے میں کوئی سوچے تو اس میں تم ہی رکاوٹ ڈال سکتی ہو ورنہ خواجہ سرا کی لاش سامنے آ جائے گی، میں نے اسے پائیں باغ میں ہی دفن کیا ہے۔''

ساحرہ منہ کھولے اور پلکیں جھپکائے بغیر فاران کی طرف دیکھنے لگی۔ موت اور خواجہ سرا کی لاش کے ذکر سے اس کا جسم ٹھنڈا پڑنے لگا تھا لیکن جسم میں اندرونی ٹھنڈک کے باوجود اس کے چہرے پر پسینا چمکنے لگا تھا۔

''ثمرین کو میں سب کچھ بتا چکا ہوں۔'' فاران نے بات جاری رکھی۔ ''اس نے تمہارے مزاج کو سمجھتے ہوئے وہ سب کچھ نہیں بتایا ہوگا تمہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان باتوں کا تمہارے علم میں ہونا ہی تمہارے حق میں بہتر ہوگا ورنہ اگر لاش دریافت ہو گئی تو تم موت کی سزا سے نہیں بچ سکو گی۔''

اب ثمرین کے تنفس کی رفتار بھی بڑھ چکی تھی لیکن فاران نے اسے اس طرح ڈرا دیا تھا کہ وہ اس سے ساری باتیں سننے کے لیے خود کو مجبور پا رہی تھی۔ فاران اسے بتا رہا تھا کہ اس نے لاش کب، کہاں اور کس طرح دفن کی تھی۔

وہ بولا۔ ''اگر کبھی لان کھدوایا گیا اور لاش سامنے آ گئی تو تم پھنس جاؤ گی، میں نے خواجہ سرا کی گردن سے چھری اس لیے نہیں نکالی تھی کہ اس کا خون کمرے ہی میں زیادہ بہہ جاتا لیکن اس طرح ایک گڑبڑ ہو گئی۔ چھری پر تمہاری انگلیوں کے نشانات ہوں گے۔ لاش دریافت ہونے کی صورت میں تم پھنس جاؤ گی۔''

اب ساحرہ کے چہرے کا رنگ بالکل پھیکا پڑ چکا تھا۔

''لیکن مجھ پر کوئی حرف نہیں آ سکے گا۔'' فاران مسلسل بول رہا تھا۔ ''تمہیں شاید یاد ہو کہ جب میں خواجہ سرا کی لاش سوٹ کیس میں ٹھونس رہا تھا تو میرے ایک ہاتھ پر رومال اور دوسرے ہاتھ پر بھی ایک چھوٹا سا کپڑا لپٹا ہوا تھا جو میں نے تمہاری وارڈ روب سے ہی نکالا تھا۔ فرش سے خون کا ایک ایک داغ مٹاتے ہوئے بھی میں نے خیال رکھا تھا کہ میری انگلیوں کے نشانات کہیں نہ رہنے پائیں۔ خون سے بھری ہوئی ہر چیز میں نے یہاں سے لے جا کر اپنے کمرے کے باتھ روم میں ڈال دی تھی۔ ان میں میرے خون آلود کپڑے بھی تھے۔ ان سب کو جلا کر راکھ کرنا اور راکھ فلیش میں بہانا آسان کام نہیں تھا، اس میں میری دو راتیں لگی تھیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' ساحرہ ہانپتے ہوئے بولی۔ ''سب بتا دیا نا تم نے...... بس اب ختم کرو یہ باتیں۔''

''آخر میں میرا ایک سوال باقی رہ جاتا ہے۔''

''وہ بھی کر ڈالو جلدی سے ورنہ میرے دل کی دھڑکن رک جائے گی۔''

''ایسا نہیں ہوگا۔'' فاران نے کہا۔ ''بعض اوقات انسان خوف زدہ ہو کر محسوس یہی کرتا ہے لیکن اس کے دل کی دھڑکن تیز تو ہو جاتی ہے لیکن بند نہیں ہوتی۔ تم سے میرا سوال یہ ہے ساحرہ کہ یہ سب کچھ میں نے تمہاری ہی خاطر کیا تھا نا؟''

''ہاں۔ ہاں۔'' ساحرہ جلدی جلدی بولی۔ ''میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھول سکتی۔''

''میں چاہتا ہوں کہ تم بھی مجھ پر ایک احسان کرو تا کہ بات برابر ہو جائے۔ تم بس ایک بار میری ہو جاؤ۔''

''نہیں۔'' ساحرہ کا انداز ہیجانی ہو گیا۔

''یقین کرو، میں دوبارہ اس خواہش کا اظہار نہیں کروں گا۔ پہلے بھی ایسا کبھی نہیں ہوا۔ جو لڑکی بھی مجھے پسند آئی ہے، اسے میں نے ایک ہی بار اپنایا ہے۔''

''یہ...... یہ...... یہ نہیں...... نہیں ہو سکتا۔'' ساحرہ جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔

''تو پھر تمہارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔'' فاران بھی کھڑا ہو گیا اور نہایت پرسکون لہجے میں بولا۔ ''میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔ میرے خلاف کسی کا بیان بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ پولیس تو ثبوت چاہتی ہے، قانون ثبوت چاہتا ہے اور چھری پر تمہاری انگلیوں کے نشانات اور تمہارا سوٹ کیس تمہارے خلاف ناقابلِ تردید ثبوت ہوگا۔ اگر تم ایک بار بھی میری بننے کے لیے آمادہ نہیں ہو تو میں گمنام کال کر کے پولیس کو بتا دوں گا کہ خواجہ سرا کی لاش کہاں دفن ہے۔''

''تم...... تم......'' ساحرہ کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ ''تم ایسا...... ایسا کر سکتے ہو...... فاران؟''

''کیوں نہیں کر سکتا۔'' فاران نے کہا۔ ''میں بہت ضدی ہوں۔ اپنی ہر خواہش ہر قیمت پر پوری کرتا ہوں۔ تم کو یا تو میرا ہونا پڑے گا یا موت کا......! دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لو۔''

اب ساحرہ اس طرح کھڑی تھی جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔

فاران فاتحانہ انداز میں مسکراتے ہوئے اس کے قریب پہنچ گیا اور دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ کر بولا۔

''موت...... یا میری خواہش؟ کیا قبول کرو گی تم......''

''فاران!'' ساحرہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''رحم کرو مجھ پر!''

''تم پر میں یہ رحم کر سکتا ہوں کہ تمہارا راز اپنے سینے میں دفن رکھوں گا۔ تم مجھ پر رحم کرو کیونکہ میں تمہیں حاصل کرنے کے لیے تڑپ رہا ہوں۔''

''نہیں فاران، نہیں۔'' ساحرہ باقاعدہ رو پڑی کیونکہ اب فاران کے دونوں ہاتھ بے قابو ہونے لگے تھے۔

''ہاں ساحرہ! ہاں!'' فاران نے اسی کے سے انداز میں کہا۔ ''موت تو بہت زیادہ خوف ناک ہوتی ہے۔''

ساحرہ کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ بے جان ہو گئی ہو۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ فاران کی خواہش پوری ہو لیکن موت کا خوف اسے مزاحمت کرنے سے روک رہا تھا۔

اس وقت صرف قدرت ہی اس کی کوئی مدد کر سکتی تھی اور وہ مدد ہو گئی۔ دروازے پر دستک ہوئی۔

''ساحرہ!'' ثمرین نے پکارا تھا۔

فاران گھبرا گیا۔ اس نے ساحرہ کو چھوڑ دیا اور دانت پیس کر بڑبڑایا۔ ''یہ اسپتال سے اتنی جلدی کیسے آ گئی۔''

''ساحرہ!'' ثمرین کی آواز پھر آئی۔

''میں پھر کسی وقت آؤں گا تمہارے پاس! تیار رہنا میری خواہش پورے کرنے کے لیے۔'' فاران نے ساحرہ کو گھورتے ہوئے کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ ساحرہ دروازے تک نہیں جا سکے گی اور اس کا یہ احساس درست بھی تھا۔ ساحرہ بے جان سی ہو کر وہیں بیٹھ گئی تھی جہاں پہلے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے سر جھکا کر اپنی پیشانی تھام لی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو اب بھی بہہ رہے تھے۔

فاران نے دروازہ کھولا۔ ''بڑی جلدی آ گئیں!'' وہ اس طرح مسکرایا جیسے کوئی خاص بات نہ ہو۔

''میں شاید اپنا موبائل بھول گئی ہوں یہاں۔'' ثمرین نے اندر آتے ہوئے کہا اور پھر ساحرہ کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت سے بولی۔ ''اسے کیا ہو گیا؟''

''نشاط کی وجہ سے رونے لگی ہے۔'' فاران نے کہا۔ ''میں اسے سمجھا رہا تھا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا، خدا پر بھروسا رکھے لیکن...... اچھا خیر، اب تم سمجھاؤ اسے، مجھے

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایک کام سے جانا ہے۔ اس کی وجہ سے رک گیا تھا۔" اس نے ساحرہ کی طرف اشارہ کیا اور پھر کمرے سے چلا گیا۔
ثمرین نے غصے سے اس کو جاتے ہوئے دیکھا۔ اس نے کمرے میں ہونے والی ساری گفتگو تو نہیں مگر کچھ نہ کچھ سن لی تھی۔ اپنا موبائل ساحرہ کے کمرے میں بھول جانے کے باعث جب وہ واپس آئی تھی تو اس نے فاران کو ساحرہ کے کمرے میں جاتے دیکھ لیا تھا اور چونک گئی تھی۔ چونکنے کا ایک سبب تھا، ان دنوں میں اس نے شدت سے یہ بات محسوس کی تھی کہ ساحرہ کی طرف دیکھتے ہوئے فاران کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک پیدا ہو جاتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ساحرہ کو کھا جائے گا۔
اسی لیے اس نے فاران کو ساحرہ کے کمرے میں جاتے دیکھا تھا اور دبے قدموں آ کر دروازے سے کان لگا دیے تھے۔ آوازیں اس کے کانوں تک مدھم ہو کر پہنچی تھیں مگر اس نے ان سے ہی صورت حال کا اندازہ لگا لیا تھا۔
"کیوں خود کو ہلکان کر رہی ہو ساحرہ!" اس نے ساحرہ کو اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا۔"
ساحرہ اب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "مجھے موت سے بہت ڈر لگتا ہے ثمرین!" ساحرہ ہچکیاں لینے لگی۔
"کوئی ایسی بات ہی نہیں۔" ثمرین نے کہا۔ "نشاط کو ایسی کیا، کسی بھی قسم کی بیماری نہیں، وہ ٹھیک ہو جائے گا۔"
وہ ساحرہ پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ اس نے صورت حال کو سمجھ لیا تھا۔
ساحرہ روتی رہی۔
"میں نے کہا نا...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔" ثمرین پھر بولی لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ سب کچھ کیسے ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ بہ مشکل تمام ہی ساحرہ کا رونا دھونا بند کرا سکی۔
اس کے اگلے دن ساحرہ شمعون سے ملی۔ جو غیر معمولی دن گزر چکے تھے، ان کے بعد یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔
"یہ تم نے اپنا کیا حال بنا لیا ہے ساحرہ!" شمعون حیرت سے بولا۔ "نشاط کی وجہ سے تم اس حال کو پہنچ گئی ہو۔"
لیکن جو حالت زار اس وقت ساحرہ کی تھی، وہ نشاط کی وجہ سے نہیں تھی۔ اس کا یہ حال صرف یہ سوچ سوچ کر ہوا تھا کہ وہ خود کو فاران سے نہیں بچا سکے گی۔ موت کا خوف اس کا جسم شل کر کے رکھ دے گا اور وہ فاران کے مقابل آنے پر ذرا بھی مزاحمت کرنے کے قابل نہیں رہ جائے گی۔
یہ سب کچھ شمعون پر ظاہر کرنا بھی اس کے لیے ممکن نہیں تھا، اس نے کسی طرح شمعون کی بات ٹالی اور کہا۔
"تم مجھے منظور کے بارے میں بتاؤ۔"
شمعون سوچتے ہوئے بولا۔ "میٹرک کرنے کے بعد منظور امریکا چلا گیا تھا۔ اسے وہیں تعلیم حاصل کرنے کے لیے اس کے باپ نے بھیجا تھا۔ اب سے دو سال پہلے وہ امریکا سے واپس آیا تھا۔ اس کے چند ماہ بعد ہی اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔ کاروبار منظور نے سنبھال لیا۔ پولیس کی تفتیش کے مطابق وہ ایک عیاش طبع شخص تھا۔"
پولیس کا نام آتے ہی ساحرہ چونک پڑی۔
"پولیس!" اس کے منہ سے نکلا۔
"ہاں۔" شمعون کے لہجے میں تشویش تھی۔ "وہ اسی روز سے غائب ہے جس دن سے نشاط کے سر پر چوٹ لگی تھی۔ منظور کی ماں زندہ ہے۔ اس نے اپنے بیٹے کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرا دی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس نے منظور کی تصویر بھی پولیس کو دی ہوگی، یہ خبر میڈیا پر آ چکی ہے۔ میرا خیال تھا کہ تمہیں اس کا علم ہو گیا ہوگا۔"
"اتنا ہوش نہیں رہا ان دنوں کہ اخبار پڑھوں یا ٹی وی کی خبریں سنوں۔ گھر میں کبھی کا یہی حال ہے۔ شاید فاران یا مسعود کو معلوم ہو لیکن انہوں نے اسے کوئی اہمیت ہی نہیں دی ہوگی۔ منظور کے بارے میں انہیں کچھ علم ہی نہیں، میرا مطلب ہے کہ وہ واقعات جو مجھ سے، تم سے اور منظور سے وابستہ رہے۔"
شمعون نے سر ہلایا، پھر بولا۔ "اس بارے میں جو تفتیش آگے بڑھی، اس نے کل رات ایک نیا رخ اختیار کیا ہے جس سے میرے اس شبہے کی تصدیق ہو گئی ہے کہ منظور ہی نے خواجہ سرا بن کر نشاط سے دوستی کی تھی۔"
ساحرہ دھڑکتے دل کے ساتھ سوالیہ نظروں سے شمعون کی طرف دیکھتی رہی جس نے کچھ رک کر کہا۔ "کل منظور کی تصویر اس پولیس آفیسر کے سامنے آئی تھی جو ابرار کا دوست ہے۔ اسی نے خواجہ سرا زینت اور منظور کی تصویریں مجھے اور ابرار کو ایم ایم ایس کی تھیں۔ ابرار نے اپنی معلومات منظور کی گمشدگی کی تفتیش کرنے والے آفیسر کو مہیا کیں۔ اسی وجہ سے خواجہ سرا زینت کے بنگلے کے آس پاس رہنے والوں سے پوچھ گچھ کی گئی۔ معلوم ہوا کہ خواجہ سرا کو بھی اسی دن سے آتے جاتے نہیں دیکھا گیا جس دن منظور غائب ہوا تھا۔ اس کے بعد پولیس نے منظور کی ماں سے پوچھ گچھ کی تو معلوم ہوا کہ منظور کا کوئی بھائی نہیں تھا۔ اسی وجہ سے شبہ پیدا ہوا کہ منظور کسی وجہ سے خود ہی تو خواجہ سرا کا روپ نہیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

دھارتا تھا...... اس شبہے کے بعد کل رات مجسٹریٹ کی اجازت لے کر پولیس خواجہ سرا زینت کے بنگلے میں گھسی۔ وہاں انہوں نے فنگر پرنٹس بھی لیے۔ ابرار نے مجھے بتایا ہے کہ وہ فنگر پرنٹس صرف منظور کے ہیں۔ اس بنگلے میں اگر کوئی خواجہ سرا بھی ہوتا تو اس کے فنگر پرنٹس بھی ملتے۔ اسی بنیاد پر پولیس کا یہ شبہہ یقین میں بدل چکا ہے کہ منظور ہی خواجہ سرا کا روپ دھارا کرتا تھا۔ اسی مقصد کے لیے اس نے وہ بنگلا خریدا تھا۔ وہیں سے وہ خواجہ سرا بن کر کہیں جاتا تھا۔ اب پولیس یہ جاننے کی فکر میں ہے کہ وہ کہاں جاتا ہوگا اور کیوں جاتا ہوگا؟"

ساحرہ کے دل کی دھڑکنیں اور تیز ہوگئیں۔ اسے خیال آیا تھا کہ پولیس تفتیش کرتے ہوئے اس کے گھر تک پہنچ سکتی ہے اور پھر سارا معاملہ اپنے منطقی انجام تک بھی پہنچ سکتا ہے۔

منطقی انجام......! ساحرہ کانپ گئی۔

"ابرار میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔" شمعون پھر بولا۔ "وہ جاننا چاہتا ہے کہ میں خواجہ سرا زینت کے سلسلے میں اس سے کیوں ملا تھا۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں اسے سچ سچ بتا دوں تو منظور کا کیس شاید آسانی سے حل ہوجائے۔ میں اس سے یہی کہتا رہتا ہوں کہ بس خواجہ سرا مجھے اچھا لگا تھا۔ ابرار کو میری اس بات پر یقین نہیں آرہا ہے لیکن اب جبکہ یہ طے پاگیا ہے کہ خواجہ سرا زینت اور منظور کے روپ ایک ہی شخصیت کے تھے تو شاید ان دونوں کی تصاویر اخبارات اور ٹی وی چینلز کو دے دی جائیں۔ اس صورت میں تمہارے گھر کے آس پاس رہنے والے لوگ پولیس کو بتا سکتے ہیں کہ انہوں نے اس خواجہ سرا کو تمہارے گھر آتے جاتے اور نشاط کے ساتھ گھومتے پھرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس صورت میں پولیس یقیناً پوچھ گچھ کرنے تمہارے گھر پہنچے گی اور پھر انہیں یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ جس دن منظور غائب ہوا، اسی دن نشاط کو اسپتال میں داخل کرایا گیا جو سر پر لگنے والی چوٹ سے کوما میں چلا گیا ہے۔ پولیس اس معاملے کو خاصا معنی خیز سمجھے گی اور سچ پوچھو تو یہ مجھے بھی معنی خیز لگ رہا ہے۔ آخر یہ کیسے ہوا کہ نشاط کے سر پر چوٹ اسی دن لگی۔"

"اتفاق ہی کہہ سکتے ہیں اسے......"

"یہ جواب دیتے ہوئے تمہاری آواز کیوں کانپ گئی؟" شمعون نے اسے غور سے دیکھا۔

"اسی اتفاق کی وجہ سے جسے پولیس کوئی معنی پہنانے کی کوشش کرے گی۔" ساحرہ نے جواب دیا۔ "ایسا بہرحال ہے کہ خواجہ سرا زینت اس دن نشاط سے ملنے آیا تھا۔" یہ بات کیونکہ کھل سکتی تھی اس لیے اس نے اظہار کر دینا ضروری سمجھا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ "لیکن اس وقت وہ جاچکا تھا جب نشاط کے سر پر چوٹ لگی۔ اس کے سر پر ایک بڑا گلدان گر پڑا تھا۔"

اسپتال میں ڈاکٹروں سے بھی گلدان ہی کی بات کہی گئی تھی۔

ساحرہ کو اس کا بھی یقین تھا کہ وہ شمعون سے جو کچھ بھی کہے گی، وہ شمعون ازخود پولیس کو ہرگز نہیں بتائے گا۔

"بہرحال۔" شمعون نے فکرمندی سے کہا۔ "مجھے اندیشہ ہے کہ یہ معاملہ تم لوگوں کے لیے کچھ پریشانی ضرور لائے گا۔"

شمعون کا یہ خیال بالکل درست ثابت ہوا۔ پولیس نے ان تصاویر کی تشہیر کردی۔ ساحرہ کے گھر کے آس پاس رہنے والوں میں سے کسی نے پولیس کو یہ اطلاع بھی دے دی کہ وہ خواجہ سرا نشاط کا دوست بن گیا تھا اور ان کے گھر آیا جایا کرتا تھا۔

پولیس ان کے گھر پر آدھمکی...... ساحرہ کی والدہ اور مسعود تو حقائق سے بے خبر ہی تھے لیکن چوکیدار اور مالی سے پولیس کو معلوم ہوگیا کہ اس دن خواجہ سرا زینت وہاں آیا تھا۔

"اسے واپس جاتے ہوئے مالی نے دیکھا، نہ چوکیدار نے۔" پولیس آفیسر نے یہ بات بھی سے کہی۔ "پھر وہ کہاں چلا گیا؟"

"یہ اتفاق ہوسکتا ہے آفیسر کہ مالی اور چوکیدار نے اسے واپس جاتے ہوئے نہ دیکھا ہو۔"

فاران اور ثمرین نے پولیس آفیسر کے سامنے بڑے مضبوط لہجے میں جواب دیے تھے لیکن ساحرہ نروس رہی تھی۔ ثمرین نے پولیس آفیسر سے کہا تھا کہ ساحرہ کمزور دل کی مالک ہے اور اپنے بھائی کے لیے فکرمند ہے۔ اس کے نروس ہونے کی وجہ اور کچھ نہیں۔

پولیس آفیسر بولا۔ "اور یہ بھی اتفاق ہے کہ نشاط کے سر پر اسی دن گلدان گر پڑا۔"

"ایسے اتفاقات زندگی میں پیش تو آتے رہتے ہیں آفیسر!" ثمرین نے بے خوفی سے جواب دیا تھا۔

"آفیسر!" فاران بولا۔ "نشاط کی شخصیت میں نسوانیت آجانے سے اور خواجہ سرا سے اس کی دوستی کے باعث ہم سبھی لوگ پریشان رہتے تھے لیکن کیا ہم لوگ ایسا کرسکتے ہیں کہ اسے غائب کردیں یا کروادیں۔"

"یہ بات تو تفتیش مکمل ہونے پر ہی سامنے آئے گی۔" پولیس آفیسر نے کہا تھا۔

اس طرح ساحرہ کے گھر پر تو پولیس کی تفتیش آگے نہیں بڑھ سکی لیکن اسپتال میں پولیس کا ایک آدمی ہر وقت تعینات رہنے لگا تاکہ نشاط جب بھی کوما سے باہر آئے، فوری طور پر اس کا بیان لیا جاسکے۔

یہ ساحرہ، ثمرین اور فاران، تینوں ہی کے لیے تشویش ناک بات تھی۔ ہوش میں آنے پر نشاط وہی سب کچھ بتاتا جو ہوا تھا۔

"آخر میرا اندیشہ درست ثابت ہوا نا ساحرہ!" اسی رات شمعون نے موبائل پر اسے کال کر کے کہا۔

"ہاں۔" ساحرہ مردہ سی آواز میں بولی۔ "کل شاید اخبار میں بھی یہ بات آجائے۔ بدنامی ہمارے گھر کا مقدر بن گئی ہے۔ کاش میرا بھائی ایسا نہ ہوتا۔"

"اب دیکھنا یہ ہے کہ نشاط جب بھی کوما سے باہر آیا تو اس کا بیان کیا ہوگا۔"

ثمرین اس وقت ساحرہ کے قریب ہی موجود تھی۔ اسی کے اشارے پر ساحرہ نے اسپیکر آن کردیا تھا۔ شمعون کی آواز ثمرین کو بھی سنائی دے رہی تھی۔ اسے ڈر ہوا کہ کمزور اعصاب کی ساحرہ جواب میں نہ جانے کیا کہہ بیٹھے، اس لیے وہ جلدی سے بول پڑی۔ "تمہیں یہ شک کیوں ہو رہا ہے شمعون کہ نشاط کوئی اور بیان دے گا۔ تم ہم سب پر شک کیوں کررہے ہو؟"

"اوہ!" شمعون کی آواز آئی۔ "تم بھی سن رہی ہو ہماری باتیں۔"

"چھپ کر نہیں سن رہی ہوں۔" ثمرین نے جواب دیا۔ "ساحرہ نے موبائل کا اسپیکر آن کر رکھا ہے۔"

"خیر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم بھی سن رہی ہو۔ اچھا ہے کہ تم ہر وقت ساحرہ کے ساتھ رہو۔ اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔"

شمعون کا یہ مشورہ اس اعتبار سے بعد از وقت تھا کہ ثمرین اس دن سے ہر وقت ساحرہ کے ساتھ رہنے لگی تھی جب سے اسے فاران کی نیت اور اس کے ارادوں کا علم ہوا تھا۔

پھر تین دن بعد یہ دھماکا ہوا کہ نشاط کوما سے باہر آگیا۔ اطلاع ملتے ہی گھر کے سب لوگ اسپتال کی طرف بھاگے۔ ساحرہ کی والدہ تو بہت ہی زیادہ خوش تھیں لیکن ساحرہ، ثمرین اور فاران خاصے پریشان تھے۔ انہیں یہ فکر تھی کہ ان کے اسپتال پہنچنے سے قبل پولیس نشاط کا بیان لے چکی ہوگی۔

فاران کے خیال کے مطابق پولیس سے یہ بات کہی جاسکتی تھی کہ کوما سے نکل آنے کے بعد نشاط کے حواس درست نہیں ہیں اور اسی لیے اس نے ایک بے سروپا بیان دیا ہے۔ یہ بات اس نے کسی نہ کسی طرح ثمرین اور ساحرہ سے بھی کہہ دی تھی تاکہ وہ تینوں ہی پولیس سے ایک ہی قسم کی بات کہیں۔

اسپتال پہنچنے کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ نشاط کسی قسم کا بیان نہیں دے سکا تھا۔ اس نے اپنی یادداشت اس حد تک کھودی تھی کہ بولنا بھی بھول گیا تھا۔ وہ بستر پر پڑا اس طرح مچل رہا تھا جیسے چند ہی دن پہلے پیدا ہوا ہو۔ اس کے منہ سے نوزائیدہ بچوں کی طرح "غوں غاں" کی آواز نکل رہی تھی۔

اس کی یہ حالت دیکھ کر نشاط کی والدہ رونے لگی تھیں۔ مسعود گم صم نظر آنے لگا تھا۔ ثمرین اور ساحرہ کی قلبی کیفیت کیا تھی؟ اس کا اندازہ ان کے چہروں سے نہیں کیا جاسکتا، البتہ فاران نے یقیناً اطمینان کی سانس لی ہوگی۔

ڈاکٹر ان لوگوں کو اپنے کمرے میں لے گیا۔

"کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے۔" اس نے ان لوگوں سے کہا۔ "کوما سے باہر آنے کے بعد انسان کی یادداشت چلی جاتی ہے اور...... میرا ذاتی مشاہدہ تو یہ پہلا ہے لیکن میں سن چکا ہوں کہ کوما سے باہر آنے والے افراد بول چال بھی بھول جاتے ہیں۔ ان سے بات بھی کی جائے تو ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ نوزائیدہ بچے ہوں۔"

"کیا وہ ہمیشہ ایسا ہی رہے گا؟" نشاط کی والدہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولیں۔

"یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ کبھی کبھی کسی قسم کا شاک انسان کی یادداشت بحال کردیتا ہے لیکن یہ بات ایک آدھ بار ہی سننے میں آئی ہے۔ آپ تو اسی پر شکر کیجیے کہ آپ کا بچہ کوما سے باہر آگیا ورنہ بعض لوگ تو اسی حالت میں دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں۔"

"اگر اس کی یادداشت بحال نہ ہوسکی ڈاکٹر؟" فاران بولا۔

"تو......" ڈاکٹر نے سوچتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "اب آپ لوگوں کو نشاط کی پرورش اس طرح کرنا ہوگی جیسے وہ واقعی ایک نوزائیدہ بچہ ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ابھی تو وہ اپنے پیروں پر چل ہی نہیں سکتا۔ اسے چلنا پھرنا، بولنا چالنا، سبھی کچھ سکھانا پڑے گا۔ تعلیم بھی اسی طرح دلوائی جاسکتی ہے۔ نشاط کو ذہنی بلوغت بھی اسی طرح حاصل ہوگی

WWW.PAKSOCIETY.COM

جس طرح کسی نوزائیدہ بچے کو حاصل ہوتی ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ پھر فوراً ہی بولا۔ ''آپ لوگ مناسب سمجھیں تو ابھی چند روز اسے اسپتال ہی میں رہنے دیں۔ ہم اس پر کچھ تجربات کریں گے۔ ممکن ہے کامیابی ہو جائے ورنہ پھر آپ لوگ اسے گھر لے جایئے گا۔''

''ابھی کیوں نہ لے جائیں!'' فاران بولا۔

''اگر آپ لوگ نہیں چاہتے کہ اس کی یادداشت واپس لانے کی کوشش کی جائے تو ابھی لے جایئے!''

''ہاں میں ابھی لے جاؤں گی اپنے بچے کو۔'' نشاط کی والدہ بول پڑیں۔ ''آپ لوگوں کے تجربات کی بھینٹ نہیں چڑھاؤں گی اسے۔''

ڈاکٹر کے لیے یہ خاصا سخت جملہ تھا لیکن اس نے ایک غمزدہ ماں کے اس ردعمل کو نظر انداز کر دیا۔ ''شوق سے لے جایئے!'' اس نے کہا۔

نشاط کو فوری طور پر اسپتال سے گھر لے آیا گیا۔ یہ سچویشن پیدا ہو جانے سے پولیس کو بے حد مایوسی ہوئی تھی۔ وہ تو یہ آس لگائے بیٹھی تھی کہ نشاط کوما سے باہر آنے کے بعد کوئی اہم انکشاف کر سکتا ہے۔

گھر پر نشاط کی والدہ نے نشاط کا بستر اپنے کمرے ہی میں لگوا لیا۔

''میں ایک بار پھر پرورش کروں گی اپنے بچے کی۔'' انہوں نے بھرائی آواز میں کہا تھا۔

اس نئی صورت حال کی اطلاع فون پر مبشر احسان کو بھی دی گئی۔ انہوں نے بیوی کو مبارک باد دی کہ ان کے بچے کی زندگی بچ گئی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اب وہ ساحرہ کی تینوں بہنوں کو واپس بھیج دیں گے۔ ان کے خیال کے مطابق اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی کہ انہیں انگلینڈ ہی میں رکھا جاتا۔ انہوں نے ایسا کوئی اشارہ نہیں دیا کہ وہ خود بھی آئیں گے، البتہ ان کے بھائی ایک دن کے لیے لاہور سے آئے تھے اور نشاط کی حالت دیکھ کر واپس چلے گئے تھے۔ جاتے جاتے انہوں نے اشارتاً اپنے دونوں بیٹوں سے بھی کہا تھا کہ اب انہیں بھی یہاں رکنے کی ضرورت نہیں ہے۔

شام کو ثمرین اور ساحرہ ڈرائنگ روم میں تھیں کہ فاران وہاں آیا اور نشاط کے بارے میں چند رسمی باتیں کرنے کے بعد بولا۔ ''اب مجھے اور مسعود کو بھی دو ایک دن میں یہاں سے چلا جانا ہے لیکن۔'' اس نے ساحرہ کی طرف دیکھا۔ ''میں یہاں سے مایوس نہیں جانا چاہتا۔''

ساحرہ کا رنگ پھر فق پڑ گیا۔

''مایوسی؟'' ثمرین سنجیدگی سے سوالیہ انداز میں بولی۔ ''کس مایوسی کی بات کر رہے ہو تم فاران؟''

''ساحرہ سے ایک کام کے لیے کہا ہے میں نے!'' فاران ہنس کر بولا۔ وہ نشاط کی موجودہ حالت سے بہت خوش تھا۔ قتل کے معاملے میں وہ خود کو محفوظ سمجھ رہا تھا لیکن یہ بات بھی اس کے ذہن میں تھی کہ اگر ''راز'' منکشف ہو جاتا تو اس کے لیے کچھ نہ کچھ پریشانی ضرور کھڑی ہوتی۔

''کیا کام ہے تمہیں ساحرہ سے؟'' ثمرین نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''ساحرہ نے اگر مناسب سمجھا تو یہ آپ کو بتا دیں گی۔'' فاران نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اسے یقین ہوگا کہ ساحرہ وہ بات کسی پر بھی ظاہر نہیں کر سکتی اور یہ تو اس کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ ثمرین اس بات سے واقف ہو چکی تھی۔

دوسری طرف شمعون کو ابرار سے اس صورت حال کا علم ہو چکا تھا۔ نشاط کا بچہ بن جانا اس کے لیے کوئی خوشی کی بات تو نہیں تھی لیکن اب یہ اندیشہ ختم ہو گیا تھا کہ ساحرہ سے شادی کی صورت میں نشاط اس کے والدین کے لیے شرمندگی کا سبب بنے گا۔

اس نے اپنے والدین کو بھی اس صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ دونوں ہمدردی کا اظہار کرنے کے لیے بھی ساحرہ کی ماں سے ملنے گئے۔

دوسرے دن ساحرہ نے شمعون کی کال ریسیو کی۔

''نئی صورت حال بھی افسوس ناک ہی ہے ساحرہ!'' اس نے کہا۔ ''لیکن جب تم لوگ اس صدمے سے باہر نکل آؤ گے اور حالات سے سمجھوتا کر لو گے تو ہم دونوں کی شادی بھی ہو جائے گی۔ اب ڈیڈی کو اس شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

''شمعون!'' ساحرہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''جب نشاط کے اسپتال جانے کے بعد میں ایک بار تم سے ملی تھی، تو ایک بات کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہیں سکی تھی۔''

''تو اب کہہ دو!'' شمعون نے کہا۔

''اب بھی کہنے کی ہمت نہیں پڑ رہی ہے۔'' ساحرہ کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔

''ایسی کیا بات ہے ساحرہ!'' شمعون بے تابی سے بولا۔

''بہت غیر معمولی بات ہے شمعون!...... میں شدید ذہنی انتشار میں ہوں۔ ایک ایسی جگہ کھڑی ہوں جہاں دونوں جانب کھائی ہے، مجھے ان میں سے کسی ایک کھائی میں گرنا ہے اور یہ بھی طے ہے کہ تم اب میرے کبھی نہیں ہو سکو گے۔''

''ایسی کون سی کھائیاں ہیں ساحرہ!'' شمعون بہت بے چین ہو گیا۔

''یہ میں نہیں بتا سکتی شمعون! کوشش کرنا کہ مجھے بھول جاؤ۔'' ساحرہ نے ایک سسکی لے کر رابطہ منقطع کر دیا اور بستر پر گر کر رونے لگی۔

ثمرین اس وقت بھی وہاں موجود تھی۔ اس نے ساحرہ کے موبائل کا اسپیکر تو آن نہیں کروایا تھا لیکن غور سے ساحرہ کی باتیں سنتی اور اس کا چہرہ تکتی رہی تھی۔

اس نے ساحرہ کو رونے سے روکنے کی کوشش تو نہیں کی لیکن اسے اس طرح تھپکتی رہی جیسے اس کی ڈھارس بندھانا چاہتی ہو۔ پھر وہ کھوئے کھوئے سے انداز اور دھیمی آواز میں بولی۔ ''تم کسی کھائی میں نہیں گرو گی، میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔''

اس کی آواز دھیمی تھی یا ساحرہ جذبات کی رو میں بہے جا رہی تھی کہ اس نے ثمرین کی بات سنی ہی نہیں!...... خاصی دیر بعد اس کے آنسو خود ہی رکے۔ اس دوران میں شمعون نے وقفے وقفے سے تین مرتبہ فون کیا لیکن ساحرہ نے کال ریسیو نہیں کی تھی۔

''پرسوں مجھے جانا ہے ساحرہ!'' ثمرین بولی۔

ساحرہ چونکی۔ ''تم نے تو کہا تھا کہ......''

''میں نے نشاط کی وجہ سے کہا تھا۔'' ثمرین نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''اب میں سوچ رہی ہوں کہ ڈیڈی کو زیادہ ناراض نہ کروں۔''

ساحرہ کا دل بیٹھنے لگا۔ ان دنوں ثمرین مسلسل اس کے ساتھ رہنے لگی تھی۔ اس طرح وہ فاران سے بچی رہی تھی۔

''تھوڑی دیر پہلے ڈیڈی سے فون پر بات ہوئی تھی میری!'' ثمرین نے کہا۔ ''پرسوں ہی وہ تینوں بہنوں کو واپس بھیج رہے ہیں۔ میرے جانے کے بعد تمہیں تنہائی کا احساس نہیں ہوگا۔''

ساحرہ اس سے نہیں کہہ سکی کہ اس کی بہنیں ہر وقت تو اس کے ساتھ نہیں رہیں گی۔ فاران نے کہا تھا کہ دو ایک دن میں اسے لاہور واپس جانا ہوگا لیکن وہ اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے مزید بھی رک سکتا تھا۔ اپنے والد سے کوئی بہانہ بنانا اس کے لیے مشکل نہیں ہوتا۔

''جانے سے پہلے میں یہاں کچھ شاپنگ کرنا چاہتی ہوں۔'' ثمرین پھر بولی۔ ''ابھی بازار بند نہیں ہوں گے کیوں نہ شاپنگ اسی وقت کر لوں، اور تم بھی میرے ساتھ چلو۔''

ساحرہ تو چاہتی ہی یہ تھی کہ وہ اکیلی نہ رہے۔ لہٰذا فوری راضی ہو گئی۔

روانگی کے وقت کار میں وہی دونوں تھیں، ڈرائیونگ ثمرین کر رہی تھی۔ ساحرہ کھوئی کھوئی سی خاموش بیٹھی رہی۔ اپنا مستقبل اسے بہت غیر یقینی نظر آ رہا تھا۔ موت سے خائف ہونے کے باعث اسے یہی نظر آ رہا تھا کہ اسے فاران کی بات ماننا پڑے گی، لیکن اس کے بعد وہ تصور بھی نہیں کرنا چاہتی تھی کہ شمعون سے شادی کرے گی۔ یہی بات اس نے شمعون سے کہہ بھی دی تھی۔

ثمرین بھی ڈرائیونگ کرتے ہوئے کسی سوچ میں گم تھی۔ اس نے کار ایک بہت بڑے شاپنگ پلازا کے سامنے روکی اور انجن بند کرتے ہوئے بولی۔ ''تم بہت تھکی تھکی سی نظر آ رہی ہو ساحرہ!...... تم کار میں ہی بیٹھو۔ مجھے کچھ زیادہ شاپنگ نہیں کرنا ہے۔ پندرہ بیس منٹ میں واپس آ جاؤں گی۔''

ساحرہ نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ وہ اس وقت ذہنی طور پر اتنی ہی غیر حاضر تھی کہ کچھ بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

ثمرین نے شاپنگ کرنے میں واقعی زیادہ دیر نہیں لگائی۔ وہ بیس منٹ میں واپس آ گئی تھی۔ اس نے چھوٹا سا شاپنگ بیگ پچھلی نشست پر ڈالنے کے بعد ایک بار پھر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

''نشاط کو دودھ پلانے کے لیے آنٹی کو فیڈر استعمال کرنا پڑ رہا ہے۔'' وہ بولی۔ ''لیکن وہ اتنا بڑا ہو گیا ہے کہ اسے صاف ستھرا رکھنا اور اس کے کپڑے بدلنا ان کے لیے ممکن نہیں ہے۔ وہ مالی کے چودہ سالہ لڑکے کو ملازم رکھ رہی ہیں اس کام کے لیے۔''

''ہاں۔'' ساحرہ نے سر ہلایا۔ ''وہ لڑکا آ چکا ہوگا شاید اس وقت۔'' جب وہ دونوں گھر پہنچیں تو وہ لڑکا واقعی آ چکا تھا۔

''میرے دماغ سے یہ بوجھ تو کم ہوا۔'' ساحرہ بولی۔ ''وہ سب کچھ کرنا ممی کے لیے ممکن نہیں تھا۔''

ثمرین نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ساحرہ کسی سہمی ہوئی چڑیا کی طرح اس کے ساتھ رہی۔ شاپنگ بیگ الماری میں رکھ کر ثمرین ساحرہ کے ساتھ اس کی والدہ کے کمرے میں آ گئی۔

نشاط بستر پر لیٹا فیڈر سے دودھ پی رہا تھا، فیڈر ملازم لڑکے کے ہاتھ میں تھا۔ قریب ہی اپنے بستر پر بیٹھی ساحرہ کی والدہ غم واندوہ کی تصویر بنی نشاط کی طرف ہی دیکھ رہی

WWW.PAKSOCIETY.COM

گئیں۔ ساحرہ اور ثمرین کو دیکھ کر وہ ان دونوں کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ نشاط نے ان کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں دی تھی۔

"دیکھ رہی ہو ثمرین!" والدہ اداس لہجے میں بولیں۔ ان کا اشارہ نشاط ہی کی طرف تھا۔

"خدا آپ کو ہمت دے گا ممی!" ثمرین نے ان کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ "مجھے امید ہے کہ آپ اس امتحان سے گزر جائیں گی۔ ڈیڈی میری تینوں بہنوں کو واپس بھیج رہے ہیں۔ وہ بھی آپ کا ہاتھ بٹائیں گی۔ ساحرہ تو ہے ہی...... میں البتہ پرسوں چلی جاؤں گی۔ پہلے تو حالات غیر یقینی تھے۔ میں نے رکنا ضروری سمجھا تھا لیکن اب صورت حال جیسی بھی ہے، سامنے ہے۔ اب میں یہاں رکنے کی ضد نہ کروں تو اچھا ہے۔ ڈیڈی کی ناراضی بڑھے گی۔"

"صحیح فیصلہ ہے تمہارا۔" ساحرہ کی ممی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "میں تو پہلے بھی چاہتی تھی کہ تم انہیں ناراض نہ کرو۔ ابھی فاران گیا ہے یہاں سے...... وہ بھی کہہ رہا تھا کہ مسعود کے ساتھ پرسوں جا رہا ہے۔ صبح کی فلائٹ ہے اس کی۔ تم کس وقت جاؤ گی؟"

"ابھی میں فلائٹ انکوائری کو فون کروں گی تو مجھے معلوم ہوگا کہ مجھے پرسوں کس وقت کی فلائٹ مل سکتی ہے۔ مجھے ابھی تو صرف اتنا معلوم ہے کہ پرسوں لندن کی دو فلائٹس ہیں۔"

اس وقت ملازم لڑکے نے اس طرف توجہ دلائی کہ نشاط نے بستر گیلا کر دیا تھا۔ ساحرہ کی والدہ ٹھنڈی سانس لے کر اپنی جگہ سے اٹھیں۔ ان کے ساتھ ساحرہ اور ثمرین بھی کمرے سے نکل آئیں تاکہ ملازم لڑکا بستر ٹھیک کر دے اور نشاط کے کپڑے بھی بدلوا دے۔ اس وقت اس کی والدہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ ثمرین نے ان کی ڈھارس بندھائی۔

رات کو کھانے کی میز پر فاران، مسعود، ثمرین اور ساحرہ موجود تھے پہلے ساحرہ کی والدہ بھی ہوا کرتی تھیں لیکن اب نشاط کی وجہ سے یہ ممکن نہیں رہا تھا۔ اب وہ اپنے کمرے ہی میں کھانا کھا سکتی تھیں۔

"ساحرہ!" ثمرین نے کھانے کے دوران میں کہا۔ "آج رات کو میں تمہارے کمرے میں نہیں سوؤں گی۔"

ساحرہ چونکی اور کچھ گھبرائی بھی۔ ثمرین کا مسلسل ساتھ ہونے کی وجہ سے اسے تحفظ کا احساس رہتا تھا اور شاید اس طرح ثمرین کی وجہ سے فاران اس سے تنہائی میں نہیں مل پا رہا تھا۔

"دراصل۔" ثمرین نے اپنی بات مکمل کی۔ "ایک تو یہ کہ ابھی میں شمعون کے گھر جاؤں گی۔ انکل سے فون پر بات ہوئی تھی میری...... وہ کہہ رہے تھے کہ جا رہی ہو تو آج آ کر مل لو۔ کل صبح وہ کہیں جا رہے ہیں۔ رات گئے واپسی ہوگی ان کی، اس لیے آج ہی ان سے ملاقات ہو سکتی ہے۔"

"رات کو وہاں رہو گی تو نہیں نا!" ساحرہ جلدی سے بولی۔

"رہوں گی تو نہیں لیکن اب جاؤں گی تو پہنچتے پہنچتے دس بج جائیں گے، ایک ڈیڑھ گھنٹا تو رکنا ہی پڑے گا۔ واپس آتے آتے بارہ سے زیادہ بھی بج سکتے ہیں پھر میں سوچ رہی ہوں کہ اپنا سامان آج رات ہی درست کر لوں۔ کل وقت نہیں ملے گا۔ میں چاہتی ہوں کہ کل تمہارے ساتھ آخری بار شہر گھوم لوں۔"

"لیکن آج رات......" ساحرہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ اس وقت اسے گھورتے ہوئے فاران کی آنکھوں میں دھمکی تھی۔

ثمرین بولی۔ "میں تو اب چلی ہی جاؤں گی ساحرہ!...... اکیلے سونے کی عادت ڈالو۔ پہلے بھی تو آخر اکیلی سوتی تھیں۔"

"ہوں۔" ساحرہ نے نظریں جھکا لیں۔ اسے اپنا دل ڈوبتا محسوس ہونے لگا تھا۔

فاران نے ثمرین سے کہا۔ "ڈرائیونگ کے لیے مسعود کو ساتھ لے جایئے گا۔"

"مجھے ڈرائیونگ آتی ہے فاران!" ثمرین نے ہنس کر کہا۔ "میں اور ساحرہ شاپنگ کے لیے گئے تھے، تب بھی میں نے ہی ڈرائیونگ کی تھی۔"

"لیکن اب رات......"

"میں کوئی بزدل لڑکی نہیں ہوں۔" ثمرین نے اس کی بات کاٹ دی۔

فاران چپ ہو گیا۔ غالباً وہ مسعود کو صرف اپنی معلومات کے لیے بھیجنا چاہتا تھا کہ ثمرین کس وقت گئی۔ وہ مسعود سے فون پر رابطہ رکھ کر ہر لمحے کی صورت حال سے باخبر رہنا چاہتا تھا۔

کھانے کے بعد جب سب لوگ میز سے اٹھے تو ساحرہ بولی۔ "میں ممی کے پاس جا رہی ہوں۔ انہوں نے کہا تھا کہ کھانے کے بعد میرے پاس آنا۔"

لیکن یہ سفید جھوٹ تھا۔ بس وہ تنہائی سے بچنے کا بہانہ ڈھونڈ رہی تھی۔

"جاؤ۔" ثمرین نے اس سے کہا۔ "میں اپنے

کمرے سے کچھ لے کر شمعون کے گھر چلی جاؤں گی۔"

اس طرح اس وقت ان سب کے راستے جدا ہو گئے لیکن اس وقت ساحرہ کا دل اچھل پڑا جب وہ اپنی والدہ کے کمرے کے قریب تھی اور فاران لپکتا ہوا اس کے قریب پہنچا تھا۔

"ساحرہ!" فاران سخت لہجے میں بولا۔ "اگر تم اس طرح مجھ سے بچنے کی کوشش کرو گی تو پولیس کو گمنام کال کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ تم آنٹی سے ملنے کے بعد جلد ہی اپنے کمرے میں پہنچ جاؤ۔ میں موقع دیکھتے ہی وہاں آؤں گا۔ اگر تم نے پھر کوئی چکر چلایا تو......" اس نے دھمکی آمیز انداز میں اپنی بات ادھوری چھوڑی اور تیزی سے واپس لوٹ گیا۔

اس وقت ساحرہ یوں محسوس کر رہی تھی جیسے اچانک اس کی ٹانگوں کی جان نکلتی جا رہی ہو۔ بہ مشکل تمام ہی وہ خود کو قابو میں رکھ سکی ورنہ ہذیانی انداز میں چیخ چیخ کر رونے لگتی، اس عالم میں اس کی ہمت نہیں ہو سکی کہ وہ اپنی والدہ کے سامنے جا سکے۔ ویسے بھی اس نے جھوٹ ہی بولا تھا کہ اس کی والدہ نے اسے بلایا ہے۔

بے جان ہوتی ہوئی ٹانگوں کے باعث اس نے دروازے کے قریب ہی دیوار سے ٹیک لگا لی۔ اس کے تنفس کی رفتار بڑھ گئی تھی اور دماغ میں بھونچال سا آیا ہوا تھا۔

اب کیا کرے؟ اب کیا کرے؟ یہ سوال اس کے دماغ میں دھماکے کرنے لگا تھا۔ موسم گرما نہ ہونے کے باوجود اس کے چہرے پر پسینے کی نمی چمکنے لگی تھی۔ اس وقت اگر اسے کوئی دیکھتا تو حیرت زدہ رہ جاتا۔ وہ گزرے ہوئے چند لمحوں میں برسوں کی بیمار نظر آنے لگی تھی۔

اپنی حالت سنبھالنے میں اسے پندرہ منٹ سے کچھ زیادہ ہی لگ گئے اور پھر وہ مڑ کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگی۔ اس کے چلنے کا انداز ایسا تھا جیسے گھسٹ رہی ہو، جیسے کسی جانور کو زبردستی مذبح کی طرف لے جایا جا رہا ہو۔ اس نے اپنا موبائل نکال کر شمعون کا نمبر ملایا۔ رابطہ ہوتے ہی اس نے پاگلوں کی طرح کہا۔ "اب مجھے بھول جاؤ شمعون!...... مجھے ہمیشہ کے لیے بھول جاؤ۔"

اس سے پہلے کہ شمعون کچھ کہتا، ساحرہ نے رابطہ منقطع کیا اور وحشت زدہ انداز میں بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔

کمرے میں قدم رکھتے ہی اس کے ذہن کو جھٹکا لگا۔ اس نے ثمرین کو دیکھا تھا جو اس کے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ

دونوں ساتھ ہی سونے لگی تھیں۔

"اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو ساحرہ؟" ثمرین قدرے حیرت زدہ لہجے میں بولی، پھر اس نے کہا۔ "دروازہ تو بند کر دو!"

لیکن ساحرہ اپنی جگہ کھڑی اس کی طرف دیکھتی رہی۔

"اف فوہ!" ثمرین کہتی ہوئی خود اٹھی اور قریب آ کر اس نے دروازہ بولٹ کیا، پھر ساحرہ کا ہاتھ پکڑ کر بستر پر لے گئی۔

"دراصل میں شمعون کے گھر نہیں جا سکی۔" اس نے جانے کیوں بہت دھیمی آواز میں کہا۔ "بروقت ہی انکل کا فون آ گیا تھا۔ وہ کہنے لگے کہ اتنی رات کو تمہارا آنا ٹھیک نہیں، کل صبح کسی وقت آ کر مل لینا۔ میری وجہ سے انہوں نے اپنا پروگرام تبدیل کر دیا ہے، اب وہ کل صبح کے بجائے دوپہر کو جائیں گے جہاں انہیں جانا ہے۔"

"تو مسعود کے ساتھ چلی جاؤ۔" ساحرہ نے پاگلوں کی طرح کہا۔ "تمہیں جانا چاہیے ثمرین!"

"نہیں۔ اب تو بات ہو چکی ہے۔ میں کل صبح ہی جاؤں گی۔"

"پھر تو...... پھر تو موت ہی میرا مقدر ہے۔" لفظ "موت" کہتے ہوئے اس کا سارا جسم کانپ گیا تھا۔

ثمرین نے سرہانے رکھے ہوئے جگ فلاسک سے گلاس میں ٹھنڈا پانی نکالا۔ "لو یہ پیو۔ خود کو سنبھالو۔ نہ جانے تمہیں کیا ہو گیا ہے مجھے دیکھ کر۔"

ساحرہ محسوس بھی کر رہی تھی کہ اس کے حلق میں کانٹے پڑ گئے ہیں۔ اس نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔

"بس اب لیٹ جاؤ۔ جانے کیا ہو گیا ہے تمہیں۔" ثمرین نے اپنا جملہ دہرایا اور ساحرہ کو زبردستی لٹا دیا۔

ساحرہ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے دماغ میں اب بھی ایک بھونچال برپا تھا۔ وہ پریشان تھی کہ اسے اکیلا نہ پا کر فاران کا ردعمل کیا ہوگا۔

پھر اچانک جانے کیا ہوا کہ اس کے دماغ کے بھونچال پر اندھیرا چھانے لگا۔ وہ اندھیرا دبیز ہوتا چلا گیا اور دبیز...... اور دبیز! وہ بے سدھ پڑی لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔

ثمرین نے ہمدردانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور اپنی پیشانی مسلنے لگی۔ اس نے صرف فاران کو دھوکا دینے کے لیے کہا تھا کہ وہ شمعون کے گھر جائے گی جبکہ اس کا منصوبہ کچھ اور ہی تھا۔ اسے یہ ڈر بھی تھا کہ اسے دیکھ کر ساحرہ شاید یہی چاہے گی کہ وہ اس کے کمرے سے چلی جائے۔ اس معاملے میں تکرار بھی ہو سکتی تھی۔ آوازیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

کمرے کے باہر تک بھی جاسکتی تھیں۔ اس لیے ثمرین نے فلاسک جگ کے پانی میں خواب آور دوا خاصی مقدار میں ڈال دی تھی لیکن وہ خاصی مقدار اتنی بھی نہیں تھی کہ ساحرہ کی زندگی کے لیے خطرہ بن سکتی۔

اب کمرے میں سکوت تھا۔ ثمرین ساحرہ کے برابر میں لیٹ گئی۔ اس کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہ تھا۔ اس کی نظر کبھی گھڑی کی طرف جاتی اور کبھی دروازے کی طرف!

آدھا گھنٹا گزرا تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ ثمرین جلدی سے اٹھ کر دروازے کے قریب گئی۔

"کون؟" اس نے سرگوشی کرنے والے انداز میں پوچھا۔ وہ سرگوشی کوئی بھی سنتا، ہرگز یہ اندازہ نہ لگا پاتا کہ وہ آواز ساحرہ کی تھی یا کسی اور کی!

"فاران۔" باہر سے سرگوشی کرنے والے انداز میں جواب دیا۔

ثمرین کا ہاتھ وہ آواز سننے سے پہلے ہی بولٹ پر جاچکا تھا۔ آواز سننے کے بعد اس نے فوراً دروازہ کھول دیا۔

"تم!" فاران کے منہ سے نکلا اور وہ بھونچکا رہ گیا۔

"میں انکل سے ملنے نہیں جاسکی فاران!" ثمرین نے بڑے سکون سے کہا۔ "تمہیں شاید ساحرہ سے کوئی کام تھا لیکن وہ سو چکی ہے۔ خیر!...... اچھا ہوا تم اس وقت آگئے۔ مجھے بھی تم سے کچھ بات کرنا ہے۔"

ثمرین کمرے سے نکلی اور اس نے آہستگی سے دروازہ بند کیا۔

فاران حد درجہ حیران و پریشان سا کھڑا تھا۔ ثمرین نے بڑی بے باکی سے اس کا ہاتھ پکڑا۔ "آؤ۔"

"لیکن......"

"چپ رہو۔" اس مرتبہ ثمرین نے دھیمی آواز میں کہا۔ "کوئی ہماری آوازیں نہ سن لے۔ کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ میں تمہیں اپنے کمرے میں لے گئی ہوں۔"

حیرت سے فاران کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

☆☆☆

جب ساحرہ کی آنکھ کھلی تو صبح ہوچکی تھی۔ آنکھ کھلنے پر اس کا پہلا احساس یہ تھا کہ اس کا سر بھاری تھا۔ وہ اپنی کنپٹیاں دباتی ہوئی اٹھی اور پھر اسے یک لخت سب کچھ یاد آگیا۔ وہ چونک پڑی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ ثمرین نظر نہیں آئی۔

کیا ہوا تھا رات کو؟ اس کے دماغ میں سوال ابھرا۔ وہ حیران بھی ہوئی کہ اسے اچانک نیند کیسے آگئی تھی۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ آٹھ بجنے والے تھے۔ عام طور پر سات یا زیادہ سے زیادہ ساڑھے سات بجے تک اس کی آنکھ کھل جاتی تھی۔ اس گھر کا رواج تھا کہ ساڑھے آٹھ بجے تک سب ناشتے کی میز پر پہنچ جاتے تھے۔ ایک باورچن ملازم تھی جو صبح کے ناشتے کے بعد دوپہر کا کھانا تیار کر کے اپنے گھر واپس چلی جاتی تھی۔ رات کا کھانا تیار کرنے کے لیے وہ شام کو چھ بجے تک آتی تھی اور آٹھ بجے تک چلی جاتی تھی۔ ناشتا میز پر لگانا تو اس کی ذمے داری تھی لیکن کھانا میز پر لگانے کا کام ساحرہ، اس کی والدہ یا اس کی بہنیں کیا کرتی تھیں جو لندن گئی ہوئی تھیں۔

ساحرہ پریشانی کے عالم میں بستر سے اٹھی۔ اس کے دماغ میں بہت سے خیالات چکرا رہے تھے۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ اس نے ثمرین کی موجودگی پر شاید کوئی سخت رویہ اختیار کیا تھا جس کی وجہ سے ثمرین چلی گئی تھی۔ پھر اس کے جانے کے بعد کیا فاران آیا ہوگا؟

نہیں، اس نے سوچا، ثمرین گئی تھی تو پھر دروازہ اندر سے بند نہیں رہا ہوگا۔ فاران آتا تو کسی رکاوٹ کے بغیر کمرے میں آجاتا اور اسے جگا دیتا!

ساحرہ غسل کر کے ہی اپنے کمرے سے باہر قدم رکھا کرتی تھی لیکن اس وقت اسے کسی بات کا بھی خیال نہیں آیا۔ وہ کمرے سے نکلی۔ اس خیال سے اس کا دل دھڑک رہا تھا کہ رات کو جانے کیا ہوا ہوگا۔

سب سے پہلے اس کا سامنا ثمرین سے ہوا۔ اسے ایسا لگا جیسے ثمرین کہیں آس پاس اسی انتظار میں موجود تھی کہ وہ کمرے سے نکلے۔

"ارے!" ثمرین نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "ایسا لگ رہا ہے کہ تم بستر سے اٹھ کر فوراً کمرے سے نکل آئی ہو...... بال بکھرے ہوئے ہیں۔ کپڑے بھی وہی پہنے ہوئے ہو جو رات کو......"

ساحرہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے پوچھا۔ "رات کو کیا ہوا تھا ثمرین؟ مجھے بس اتنا یاد ہے کہ تم شمعون کے گھر نہیں گئی تھیں، میرے کمرے میں تھیں۔ میری تم سے کچھ باتیں ہوئی تھیں اور پھر نہ جانے کیا ہوا تھا۔ مجھے اچانک نیند آگئی تھی۔"

"تم شاید بہت تھکی ہوئی تھیں اس لیے تمہیں لیٹتے ہی نیند آگئی تھی۔" ثمرین نے سنجیدگی سے کہا۔ "پھر میں تمہارے ساتھ ہی لیٹی رہی۔ مجھے دیر سے نیند آئی تھی لیکن جاگی میں بہت جلدی...... کوئی ایک گھنٹے پہلے نکلی تھی میں

تمہارے کمرے سے۔"

"تم کب تک جاگتی رہی تھیں؟" ساحرہ نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

"شاید ایک بجے کے قریب نیند آئی تھی مجھے...... کیوں؟"

"کوئی آیا تھا رات کو؟" ساحرہ نے پوچھا۔

"کون آتا رات کو تمہارے کمرے میں؟" ثمرین نے حیرت ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا آنا تھا کسی کو؟"

"نن...... نہیں۔" ساحرہ ہکلا گئی۔ "ایسے ہی...... بس ایسے ہی پوچھ بیٹھی میں۔"

"اچھا تو اب جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لو۔" ثمرین اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے واپس کمرے میں لے آئی۔ "شاور لوگی تو دیر لگے گی۔ ساڑھے آٹھ بجے تو ناشتا لگ جائے گا میز پر!" پھر اس نے ساحرہ کو خود ہی باتھ روم کا دروازہ کھول کر اندر دھکیل دیا۔

ساحرہ منہ دھو کر باتھ روم سے نکلی تو ثمرین اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو خشک کرچکی تھی۔

"اب کپڑے نہیں بدلوں گی۔" ساحرہ نے کہا۔ "یہی ٹھیک ہیں۔"

"تو چلو، ڈائننگ روم کی طرف چلتے ہیں۔ سات آٹھ منٹ رہ گئے ہیں ساڑھے آٹھ بجنے میں...... ناشتا لگ ہی رہا ہوگا۔"

وہ دونوں ڈائننگ روم کی طرف بڑھیں۔ ساحرہ سوچ رہی تھی کہ فاران کو کسی طرح اس کے کمرے میں ثمرین کی موجودگی کا علم ہوگیا ہوگا۔ اب اس کے تیور جانے کیا ہوں۔

"رات کو جب تم سو گئی تھیں تو شمعون کا فون آیا تھا۔" ثمرین نے کہا۔ "تم نے شاید اپنے موبائل کا سوئچ آف کر دیا تھا۔"

ساحرہ کو کچھ کچھ یاد آیا کہ شمعون سے صرف ایک بات کہنے کے بعد اس نے رابطہ تو منقطع کیا ہی تھا لیکن ساتھ ہی موبائل سوئچ آف بھی کر دیا تھا۔

"کیا کہہ دیا تھا تم نے فون پر شمعون سے؟" ثمرین نے پوچھا۔ "بہت پریشان تھا وہ...... تمہیں فون کرتا رہا تھا۔ جب تم سے رابطہ نہیں ہوسکا تو اس نے مجھے فون کیا۔ اس نے یہ تو نہیں بتایا کہ تم نے اس سے کیا کہا تھا لیکن کوئی ایسی بات تھی جس نے اسے پریشان کر دیا تھا۔"

"مجھے کچھ یاد نہیں۔" ساحرہ کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"خیر!" ثمرین بولی۔ "میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ وہ پریشان نہ ہو۔ ساحرہ بہت جذباتی ہوتی جارہی ہے۔ کچھ بھی بک دیا ہوگا اس نے!"

وہ دونوں ڈائننگ روم میں داخل ہوئیں۔ مسعود ڈائننگ روم کی ایک کرسی پر بیٹھ رہا تھا۔

"کیا بات ہے مسعود؟" ثمرین بولی۔ "فاران نہیں آیا؟"

"ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔" مسعود کا جواب ساحرہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ سنا تھا۔

"ارے......! کیا ہوا؟" ثمرین نے پوچھا۔

"کہہ رہے تھے کہ طبیعت کچھ ڈل ہے۔ میں ان کا ناشتا ان کے کمرے میں پہنچا دوں۔"

"تو پہنچا دو۔" ثمرین نے کہا اور ایک ٹرے لے کر اس میں چائے اور ناشتے کا سامان رکھنے لگی۔

ساحرہ کے دماغ میں اس خیال کی گونج تھی کہ رات سے اب تک کچھ عجیب ہی ہو رہا ہے۔

اور "عجیب" کا یہ سلسلہ جاری ہی رہا۔ ناشتے کے بعد ثمرین اسے ساتھ لے کر ایک بینک تک گئی۔ ساحرہ کو فوری طور پر تعجب ہوا۔ اس کے خیال کے مطابق ثمرین نے اس شہر میں آکر کوئی اکاؤنٹ نہیں کھولا تھا۔

وہ ساحرہ کو کار ہی میں چھوڑ کر بینک میں چلی گئی تھی۔ اس کی واپسی شاید آدھے گھنٹے میں ہوئی لیکن ساحرہ خیالات میں اس بری طرح گھری ہوگئی تھی کہ اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا تھا۔

پھر واپسی پر جب وہ دونوں گھر میں داخل ہو رہی تھیں تو فاران سے سامنا ہوگیا۔ وہ باہر نکل رہا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا، پھر تیزی سے نکلتا چلا گیا۔ اس نے ان دونوں ہی سے نظریں چرانے کی کوشش کی تھی۔

"جانے کہاں گیا ہے اتنی جلدی میں!" ثمرین نے سر جھٹکا۔

اس دن پھر ثمرین کی کوشش رہی کہ وہ ساحرہ کے ساتھ ساتھ رہے۔ ساحرہ اپنی والدہ کے کمرے میں گئی تو وہ تب بھی ساتھ ہی تھی۔

"فاران کو اچانک کیا ہوگیا!" ساحرہ کی والدہ ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت سے بولیں۔ "مسعود نے ابھی بتایا ہے کہ وہ اور فاران آج ہی لاہور جا رہے ہیں۔ اس کا پروگرام تو کل کا تھا۔ مسعود نے یہ بھی بتایا تھا کہ فاران ابھی کسی ٹریولنگ ایجنسی میں جا کر جلد از جلد جانے والی کسی فلائٹ میں سیٹیں ریزرو کرائے گا۔"

"ہاں ابھی دیکھا تو تھا اسے باہر جاتے ہوئے۔" ثمرین نے سرسری انداز میں کہا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"لاہور میں تو سب خیریت ہے!" ساحرہ کی والدہ پھر بولیں۔ "مسعود کہہ رہا تھا کہ ایسی ویسی کوئی اطلاع تو نہیں ہے۔ اس نے فاران کا ارادہ جاننے کے بعد لاہور فون کر کے اپنے باپ سے بات کی تھی۔ انہیں بھی اس نے بتا دیا ہے کہ وہ دونوں آج ہی کی فلائٹ سے واپس آرہے ہیں۔ مسعود نے فاران کی ہدایت پر سب سامان بھی پیک کرلیا ہے۔"

"آپ کیوں فکر مند ہوتی ہیں ممی!" ثمرین نے کہا۔ "ان دونوں کو جانا تو تھا ہی...... فاران کا کوئی ذاتی مسئلہ ہوگا جس کی وجہ سے اس نے فوری طور پر جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ آپ تو اس بات سے خوش ہوں کہ آپ کی تینوں بیٹیاں پرسوں لندن سے واپس آرہی ہیں۔ فون پر بتایا تو ہوگا ڈیڈی نے آپ کو!"

"ہاں۔" ساحرہ کی والدہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "لیکن یہ افسوس بھی ہے کہ تم کل ہی جارہی ہو۔"

"میں نے کہا تھا نا ممی...... ! ڈیڈی کو زیادہ ناراض کرنا میرے لیے مناسب نہیں ہوگا۔"

"ہاں بیٹی!" ساحرہ کی والدہ نے پھر ٹھنڈی سانس لی اور جلدی سے نشاط کی طرف متوجہ ہوگئیں جس نے غوں غاں کرتے ہوئے رونا شروع کر دیا تھا۔

ساحرہ اس دوران میں دم بہ خود ہی رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ فاران اپنا مقصد حاصل کیے بغیر چلا جائے گا۔

لیکن ایسا ہی ہوا تھا۔ تین بجے کی فلائٹ سے فاران اور مسعود لاہور چلے گئے۔ ساحرہ حیران ہی رہی۔ جانے سے پہلے دو مرتبہ آمنا سامنا ہونے پر فاران نے اس سے اور ثمرین سے نظریں چرانے کی کوشش کی تھی۔

یہ سب کچھ عجیب ہی تھا لیکن ساحرہ کو ایک اطمینان سا محسوس ہونے لگا تھا، جیسے اس کے سر سے کوئی بھاری بوجھ اتر گیا ہو۔

رات سے اس کا موبائل بند ہی تھا۔ فاران کے جانے کے بعد اس نے شام کو موبائل کھولا اور خود شمعون سے رابطہ کیا۔

"شکر ہے۔" شمعون اس کی آواز سن کر بولا۔ "مجھے ایسا لگنے لگا تھا کہ میرے دماغ کی نسیں پھٹ جائیں گی۔ کیا ہوگیا تھا کل تمہیں؟ کیوں کہا تھا تم نے کہ میں تمہیں ہمیشہ کے لیے بھول جاؤں؟"

"شاید میں پاگل ہوگئی تھی۔" ساحرہ نے بجھی ہوئی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "مجھے بھولنے کے بجائے اب تم میری یہ بات ہی بھول جاؤ۔"

"حد کرتی ہو تم بھی...... آج ہی کہیں مجھ سے ملو۔ میں بہت پریشان ہوں۔"

"پولیس کی وجہ سے؟" ساحرہ چونک کر بولی۔ "ابرار نے......"

"وہ بات نہیں۔ میں تمہاری اس بے تکی جذباتی کیفیت کی وجہ سے پریشان ہوں۔ پولیس کا معاملہ تو شاید ٹھنڈا ہی پڑ جائے۔ ابرار بتا رہا تھا کہ متعلقہ پولیس آفیسر مایوس سا ہو گیا ہے۔ اب نہیں تو شاید ایک آدھ ماہ میں اس کیس کی فائل ہی بند کر دی جائے۔"

ساحرہ نے فاران کے چلے جانے سے تو سکون محسوس کیا ہی تھا، اب شمعون کی بات سے اسے مزید سکون ملا۔

"اب تو رات ہونے والی ہے۔" ساحرہ نے کہا۔ "آج نہیں مل سکوں گی۔ کل کا دن بھی مجھے ثمرین کے ساتھ گزارنا ہے۔ وہ کل رات جا رہی ہے نا!"

"ہاں۔ بتایا تھا اس نے مجھے...... ڈیڈی نے مجھے ہدایت کی ہے کہ اسے الوداع کہنے کے لیے میں بھی ائرپورٹ جاؤں۔ میں فلائٹ کے وقت سے خاصا پہلے وہاں پہنچ جاؤں گا۔ اگر تم کل دن میں بھی نہیں مل سکتیں تو پھر کل ائرپورٹ پر ہی ملاقات ہوگی۔"

"شکر ہے کہ تم نے میری بات مان لی۔ ضد نہیں کی کہ میں تم سے ابھی نہیں مل سکتی تو کل دن میں ملوں۔"

ساحرہ بتدریج خود کو ہلکا پھلکا ہوتا ہوا محسوس کر رہی تھی لیکن یہ سوال اس کے دماغ میں بہر حال چکراتا رہا کہ آخر یہ سب کیا ہوا ہے؟

اگلی رات کو وہ ائرپورٹ پر ہی ملے۔

"تم لوگ مجھے ہمیشہ یاد رہو گے۔" ثمرین نے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کہا۔

ساحرہ جذباتی ہو کر اس سے لپٹ گئی اور باقاعدہ رونے لگی۔ ثمرین نے فوراً خود کو سنبھالا اور ساحرہ کو پیار کرنے لگی۔

"نہیں میری پیاری!" اس نے کہا۔ "تم کو اب ہمیشہ خوش رہنا ہے۔ کوئی بھی تمہاری اور شمعون کی خوشیوں میں رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔ سب حالات ٹھیک ہیں، کل جب ہم دونوں ممی کے کمرے میں تھے اور تم باتھ روم گئی تھیں تو ممی نے کہا تھا کہ نشاط کے ساتھ جو کچھ ہونا تھا، ہوگیا۔ اب انہیں ان حالات سے سمجھوتا کرنا ہی پڑے گا۔ انہیں

اپنی ذمے داریاں تو پوری کرنا ہی ہیں۔ تمہاری شادی کے بعد باقی تینوں بیٹیوں کا مستقبل بھی سوچنا ہے۔ شاید وہ جلد ہی تم دونوں کی شادی کرنا چاہیں گی۔"

پھر جب تک ڈیپارچر لاؤنج میں جانے کا وقت نہیں آگیا، ثمرین اسی قسم کی باتیں کرتی رہی۔ ڈیپارچر لاؤنج میں جانے سے پہلے ثمرین، ساحرہ کو شمعون سے ذرا دور لے گئی اور بڑی پھرتی کے ساتھ ایک لفافہ نکال کر ساحرہ کے وینٹی بیگ میں ڈالتے ہوئے بولی۔ "یہ گھر جا کر دیکھنا اور کبھی کسی کو نہ بتانا۔ شمعون کو بھی نہیں۔"

"کیا ہے یہ؟" ساحرہ نے حیرت سے پوچھا۔

"گھر جا کر دیکھنا۔ اچھا اب اجازت دو۔" ثمرین نے ساحرہ کو اپنے گلے لگا لیا۔

انہی جذباتی لمحات میں ثمرین نے شمعون سے بھی بڑی گرمجوشی کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے خوشی ہوگی اگر تم مجھے یاد رکھ سکے۔"

اس وقت شمعون بھی جذباتی ہوگیا۔ "تم ایسی نہیں ہو ثمرین کہ تمہیں بھلایا جاسکے۔"

"خدا حافظ۔" ثمرین نے کہا اور جانے کے لیے بہت تیزی سے مڑ گئی۔

وہ اس وقت اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں اور اپنے چہرے کے تاثرات شمعون اور ساحرہ کو نہیں دکھانا چاہتی تھی۔

"میں شوفر کو ساتھ لایا ہوں۔" شمعون نے ساحرہ سے کہا۔ "وہ ہمارے پیچھے لے آئے گا میری گاڑی۔ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ مجھے گھر پر اتارتی ہوئی چلی جانا تم!"

ساحرہ نے سر ہلا دیا۔ وہ ثمرین کے جانے سے اداس ہوگئی تھی اور اس کے ساتھ یہ الجھن بھی برقرار تھی کہ اس لفافے میں کیا ہوگا جو ثمرین اسے دے گئی تھی۔

ائرپورٹ سے کار روانہ ہوئی تو شمعون نے پوچھا۔ "ثمرین تمہیں الگ کیوں لے گئی تھی؟ کوئی خاص بات کہہ گئی ہے؟"

"یہ نہ پوچھو شمعون!" ساحرہ نے سنجیدگی سے کہا۔ "ثمرین نے مجھ سے وعدہ لیا ہے کہ وہ میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ اس بات سے تمہارا کوئی تعلق بھی نہیں ہے۔"

"اچھا!" شمعون نے طویل سانس لی۔ "اگر وہ تم سے وعدہ لے چکی ہے تو اب میں تم سے وہ بات کبھی نہیں پوچھوں گا۔"

"تھینک یو شمعون!"

"اچھا اب یہ بتاؤ کہ میں اپنے ڈیڈی اور ممی کو تمہارے گھر کب بھیجوں؟" شمعون مسکرایا۔

"اب اتنی جلدی نہ کرو شمعون! ثمرین نے بتایا تو تھا کہ ممی اب حالات سے سمجھوتا کرنا چاہتی ہیں اور اپنی بیٹیوں کے مستقبل کے بارے میں سوچنا چاہتی ہیں لیکن میں خود بھی تو دیکھ لوں کہ ممی نشاط کے معاملے میں خود کو کب تک سنبھال سکیں گی۔ میں ان کے چہرے پر کچھ بشاشت دیکھ لوں، پھر تمہیں بتا دوں گی۔"

"اچھا بھئی!" شمعون نے شرارتی انداز میں کہا۔ "ہجر کی کچھ راتیں اور سہی!"

اس کے انداز پر ساحرہ کو ہنسی آگئی اور ساتھ ہی اسے خیال آیا کہ خواجہ سرا بنے ہوئے منظور کے قتل کے بعد وہ پہلی مرتبہ کھل کر ہنسی تھی۔ شمعون کو اس کے گھر پر چھوڑ کر ساحرہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ راستے میں اسے بار بار خیال آتا رہا کہ کار روک کر ثمرین کا دیا ہوا لفافہ دیکھے لیکن اس نے ایسا کیا نہیں، جذبات کو قابو میں رکھا۔

گھر پر اپنے کمرے ہی میں جا کر اس نے وہ لفافہ نکالا۔ اس نے محسوس کیا کہ لفافے میں کوئی چھوٹی سی سخت چیز بھی تھی۔ لفافہ کھولنے پر اسے معلوم ہوا کہ وہ ایک چابی تھی۔ چابی کے ساتھ ثمرین کا خط بھی تھا۔

"میری بہت پیاری بہن!" اس نے لکھا تھا۔ "یہ چابی بہت احتیاط سے رکھنا۔ یہ اس بینک کے ایک لاکر کی چابی ہے جہاں میں تمہیں بھی اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ اس لاکر میں تمہارے محفوظ مستقبل کی ضمانت ہے۔ اب فاران تمہیں کبھی تنگ نہیں کرسکتا۔ ہاں میری جان! میں جان گئی تھی کہ وہ تم سے کیا چاہتا تھا۔ تم موت سے خوف زدہ رہتی ہو۔ میرے خط میں یہ لفظ پڑھ کر بھی شاید کانپ جاؤ لیکن ضروری تھا کہ میں یہ بات لکھوں۔ تمہارے اسی خوف کی وجہ سے وہ تمہیں بلیک میل کر رہا تھا۔ اب وہ کبھی ایسا نہیں کرسکے گا۔ پرسوں رات میں اسے اپنے کمرے میں لے گئی تھی۔ مجھے اس نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اس نے خواجہ سرا کی لاش کہاں دفن کی ہے لیکن پرسوں میں نے اسے پھر یہ سب کچھ بتانے کے لیے کہا۔ اس کے اعترافات میں نے وڈیو کیمرے سے ریکارڈ کر لیے تھے۔ کیمرا میں نے اپنے کمرے میں پہلے ہی لگا دیا تھا لیکن اس طرح کہ وہ اسے نہ دیکھ سکے۔ کیمرا آن بھی میں نے بہت ہوشیاری سے کیا تھا۔ اسے شبہ بھی نہیں ہوسکا کہ اس کے وہ اعترافات ریکارڈ ہو رہے ہیں۔ جب وہ میرے کمرے سے چلا گیا تو میں نے وڈیو نکال کر اس کی دو

WWW.PAKSOCIETY.COM

کاپیاں بنائیں۔ اس میں مجھے خاصا وقت لگا۔ تمہیں یاد ہوگا، میں شاپنگ کے لیے تمہیں اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ میں نے وڈیو کیمرا اور وی سی آر خریدے تھے۔ اصل وڈیو کی کاپیاں بنانے میں مجھے خاصا وقت لگا۔ اس میں سے ایک کاپی میں نے صبح ہونے سے پہلے ہی فاران کے کمرے میں جا کر اسے دے دی تھی اور اس سے کہا تھا کہ یہ وڈیو دیکھنے کے بعد وہ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کرسکتا۔ اب تم اس کی خواہش کو ٹھوکروں میں رکھ سکتی ہو۔ وہ اگر پولیس کو کچھ بتانا چاہے گا تو اسے یہ بھی سوچ لینا پڑے گا کہ اب اس کی گردن بھی پھنس سکتی ہے۔ تم اسے بتا دینا کہ اس وڈیو کی ایک کاپی تمہارے پاس بھی ہے۔

اسی وڈیو کی وجہ سے وہ اتنا پریشان ہوا کہ فوراً ہی لاہور بھاگ گیا۔ وہ وڈیو دیکھ کر بہت نروس ہوگیا تھا۔ اس کے اعترافات بھی ہیں اس میں اور...... ہمت نہیں ہو رہی ہے کہ سب کچھ لکھوں۔ عورت کے معاملے میں اس کی کمزوری سے میں نے فائدہ اٹھایا۔ اس سے وہ اعتراف کرانے کے لیے مجھے جس کرب سے گزرنا پڑا، اس کا بیان کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ وہ اعترافات کرتا رہا تھا اور میرے وجود میں انگارے بھرتا جا رہا تھا۔ وہ آگ مجھے اب بھی جلا رہی ہے اور جب تک زندہ رہوں گی، جلاتی رہے گی۔ وہ وڈیو ایسی ہے کہ میں نہیں چاہوں گی کہ تم بھی اسے دیکھو۔ ہاں اگر فاران ڈھٹائی پر آمادہ ہوجائے تو تمہیں وہ وڈیو سامنے لانا ہی پڑے گی لیکن مجھے توقع نہیں کہ ایسا ہوگا۔ اسی لیے میں تم سے پھر التجا کرتی ہوں کہ تم وہ مت دیکھنا۔ بس اس لاکر کی چابی محفوظ رکھنا۔ پھر لکھ رہی ہوں کہ یہ تمہارے محفوظ مستقبل کی ضمانت ہے۔ اس کی دوسری کاپی میں اپنے ساتھ لے جا رہی ہوں مگر ایسا میں کیوں کر رہی ہوں، اس کا جواز خود میری سمجھ میں بھی نہیں آرہا ہے۔

اب بس آخری بات......! میں نے جو قربانی دی ہے، وہ صرف تمہارے لیے ہی نہیں، اپنے محبوب کے لیے بھی دی ہے۔ ہاں ساحرہ!...... میں نے بہت کم وقت شمعون کے ساتھ گزارا لیکن مجھے اس سے محبت ہوگئی تھی اور جب تمہاری بات سامنے آئی تو میں نے فیصلہ کیا کہ خود کو تم دونوں کے بیچ سے ہٹالوں۔ میں نے قربانی اس لیے بھی دی ہے کہ میرے محبوب کی محبوبہ پر کوئی آنچ نہ آسکے۔ میں نے شدید جذبات میں بہہ کر یہ فیصلہ کیا تھا۔ شاید اس مسئلے کا کوئی اور حل بھی ہو جو میرے دماغ میں نہیں آسکا تھا۔ بس جو فوری طور پر دماغ میں آیا، وہی کر گزری...... میری آخری بات

لیکن اس سطر تک پہنچ کر پھر ایک بات ذہن میں آرہی ہے۔ مجھے امید کرنا چاہیے کہ تمہیں برا نہیں لگے گا۔ جب شمعون سے تمہاری شادی ہوجائے اور تم اسے پیار کیا کرو تو کبھی کبھی میری طرف سے بھی ایک آدھ پیار کرلیا کرنا...... اور ہاں!...... پھر ایک بات...... یہ خط پڑھ کر فوراً جلا دینا۔"

ساحرہ نے یہ خط دو مرتبہ پڑھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔ ثمرین کے لیے اس کا دل بری طرح تڑپنے لگا تھا۔

خط کو جلاتے ہوئے اس کی راکھ بہاتے ہوئے بھی وہ روتی رہی تھی۔

پھر کچھ ہی دن بعد اسے ایک مرتبہ پھر رونا پڑا جب لندن سے اطلاع آئی کہ پاکستان سے واپس آنے کے بعد ثمرین اپنے گھر سے غائب ہوگئی تھی۔ لندن جیسے ملک کی پولیس بھی اسے تلاش نہیں کرسکی۔ جانے سے پہلے اس نے اپنے باپ کے نام ایک پرچہ چھوڑا تھا۔ مختصر سی تحریر تھی۔

"پیارے ڈیڈی! زندگی میں کبھی کچھ ایسا بھی ہوجاتا ہے کہ انسان خود اپنی ہی نظروں سے گر جاتا ہے۔ کسی وجہ سے میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ اب لوگوں کی نظروں میں بھی مجھے یوں محسوس ہونے لگا ہے جیسے وہ مجھ پر ہنس رہے ہوں۔ یہ میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔ میں اب یہاں سے اتنی دور جا رہی ہوں کہ وہ استہزائی نظریں میرا تعاقب نہ کریں۔ خدا کرے آپ مجھے آسانی سے بھول جائیں اور صبر کرلیں...... ثمرین۔"

کچھ اسی قسم کی سطریں بعد میں ساحرہ کو بھی موصول ہوئیں لیکن یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ وہ مختصر خط کہاں سے بھیجا گیا تھا۔

پھر کچھ سطریں شمعون کو بھی ملیں۔ ان میں لکھا تھا۔

"شمعون!...... ساحرہ کا نفسیاتی علاج بہت ضروری ہے۔ موت سے اس کا خوف اتنا بڑھا ہوا ہے کہ شاید دنیا میں کسی کو نہ ہو۔"

شمعون کو یہ سطریں اس دن ملی تھیں جب ساحرہ سے اس کی شادی کو صرف ایک دن گزرا تھا۔

ساحرہ کھوئے کھوئے سے انداز میں بولی۔ "کیا وہ ہمارے آس پاس ہی کہیں موجود ہے شمعون؟"

اور شمعون اس کا منہ تکتا رہ گیا تھا۔

دنیا میں بہت سے قتل ایسے ہوتے ہیں جن کے قاتل کا سراغ کبھی نہیں ملتا۔ یہ ایک ایسے ہی قتل کی کہانی ہے۔

✹

WWW.PAKSOCIETY.COM